اپریل 2013
دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
سالگرہ نمبر
دو سلسلے وار تحریریں
تم سے دور نہیں ۔ جاؤگے
اسلم راہی کی تاریخی کہانی
شاہ جہاں
معاشرتی ناول
انڈر اسٹینڈنگ
PAKISTANI POINT
AIK RABTA APNO SE
پاکستانی پوائنٹ

MEMBER
APNS رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
CPNE رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

دُنیا بھر سے مُنتخب معیاری اَدب

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیر اعلیٰ: عامر محمود
مدیر: محمد شفیع

باتیں آپ سے
مدیر
قارئین کے محبت نامے گزشتہ شمارے پر تبصرہ اپنی پسند، ناپسند، چاہتیں مدیر کے نام!! آپ کی آراء پسند، ناپسند مشورے
8

سُنہری بالا
معین کمالی
عورت کی یہی فطرت ہے۔ اس دن کے بعد سے کنسولیتا نے نہ صرف کہ خود کو میری منگیتر سمجھنا چھوڑ دیا بلکہ اس کی خواہش یہ رہی کہ !!
109

شاہجہاں
اسلم راہی
اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ معروف مصنف کے قلم سے
10

مونچھیں کیوں؟
شازیہ رانا
اس نے امی کو منہ پہ دے دیا تھا اور باہر فضا کی حوریہ تو جیسے کسی نے دیوار میں چنوا دیا تھا اسے اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔
114

ماسٹر
احمد صغیر صدیقی
جس وقت وہ گلی کے اس پار واقع اس مکان کے گیٹ پر پہنچے انہوں نے دیکھا کہ بنگلے کے دوسری طرف لان کے بیچ گھاس کے اندر کوئی راستہ نہیں بنایا گیا ہے۔
38

احساسِ جرم
محمد صدیق طاہر
کمار نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ سب کچھ سچ بیان کر دے گا۔ اسے اپنی بات کا آغاز کرنے میں قدرے دشواری ہوئی لیکن !!
120

بھیڑیا
ایم الیاس
میں نے سارے خیالوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے بیگ سے کچی کہانیوں کا ایک رسالہ نکالا کہ اس میں اپنے دل کی الجھن کو بھلا دینے کی کوشش کرنے لگی۔
56

ریت کا گھر
عالیہ توصیف
زمانہ اسے جتنا سمجھا سکتی تھی۔ سمجھا چکی تھی۔ زمانہ نے شاید ہی کوئی اچھی نصیحت، اچھی دلیل چھوڑی ہو جو اسے نہیں دی ہو۔
126

جانگوکر
ایم اے راحت
ایک پریشان حال نوجوان کی داستانِ حیات جسے جنون سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ پراسرار واقعات سے اٹی ہوئی دلچسپ سلسلے وار داستان۔
70

سُہاگ کی قیمت
آغا دلاور
ٹھیک اسی وقت خندق سے ایک اور دیہاتی وہاں سے گزرا۔ اس نے بوڑھے کسان کی موت کا دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔
137

رُوح کا قرب
ایس اے ہاشمی
دیوار نے قلعہ میں پر گزشتہ ادوار کے اثرات موجود تھے۔ تاہم سنگ تراش کا فن ابھری ہوئی ہیولوں کی صورت میں زندہ تھا۔ ایک حیرت انگیز تحریر
94

مشن
محمد اکبر
پھر ادھر گھوڑے نے چھوٹی آنکھیں اسی طرف مرکوز ہو گئیں اور اس نے پہلی بار محسوس ہوا کہ اسے جنگ کے لیے قوتیں مجتمع کرنی ہوں گی۔
145

❖ اپریل 2013ء ❖ قیمت 40 روپے ❖ جلد 42 ❖ شمارہ 12

کنواری
سید ذوالفقار حیدر — 157

ایک گرم ویک اینڈ پر مس نے اور ڈان نے بچوں کے ساتھ قریبی جھیل پر پکنک کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ جھیل پر ایک جگہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے لگے۔

واپسی
محمد مقصود خان — 168

قوت ارادی مضبوط ہو تو انسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔ قبر سے بھی واپس آ سکتا ہے بشرطیکہ اسے زندہ دفن کیا گیا ہو۔ خوفناک کہانی۔

رعایتی سیل
حسن علی خان — 176

رعایتی سیل کا زمانہ ہے۔ ہر چیز میں رعایت دی جا رہی ہے جہیز کا سامان بھی با رعایت دستیاب ہے۔ آپ بھی اس سیل سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

پس پردہ
کرم الٰہی چوہدری — 180

بہر حال نبیل نے اپنی کتاب پہاڑی کے دامن میں خطے میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا۔ مگر اس کے بعد یہ کتاب گمنامی میں چلی گئی۔

تم سے کوئی نہیں
نوالہ جلیل راؤ — 188

میں قلم ہوں۔ کائنات کی بیش قیمتی شے ہوں نہیں بلکہ کائنات نے مجھے عزت عطا کی ہے۔ مجھے اس کائنات سے شناسائی کی خدمت سونپی گئی ہے۔

اجنبی
شوکت صدیقی — 210

لیکن یہ اس کا خیال ہے کہ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوں۔ میں فطرتاً خوش ہوں واقعی ہوا ہوں اور ہر وہ شخص جو اس جہان میں مطمئن نہیں ہے اور !!

مٹی کی مونالیزا
اے حمید — 224

یہ ہوٹل تو بالکل جنت ہے۔ ایک جوڑا سب سے الگ بیٹھا ہے۔ لڑکی دبلی پتلی سی ہے۔ چست کپڑوں نے اسے اور دبلا بنا دیا ہے۔

صاحباں مرزا
علی حیدر ملک — 232

صاحباں نے الف لیلہ مرزا کو نشانی کے طور پر دی تھی۔ جب بھی مرزا اس کی کہانی پڑھتا اسے محسوس ہوتا کہ وہ شہزادہ بن گیا ہے اور اس کا جی چاہتا کہ۔۔۔!

قبر کا بچھو
نازش شاہین — 243

جن دوستوں نے لوازمات کا انتظام کیا تھا ان نے پہلے ہی ترکیب بدل دی اور وہ ہمیں وہاں سے نکال دیے۔ ایک خوفناک حقیقت

مجھے عورت بنا جاؤ
ہما شاہین — 248

حاجی صاحب کی صحبت نے ان کے ایمان کو اور بھی بہت پختہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اجازت دے دی۔ ایک سچی داستان

وہ آدھا چہرہ
صائمہ کاردار — 257

وہ بھی یہی چاہتا تھا مگر کیوں۔ ایک مردہ شخص کو زندہ لڑکی میں کیا دلچسپی تھی۔ اس کے ان کی زندگی میں وہ پودا ایسا تھا ؟

انڈر اسٹینڈنگ
عطیہ زاہرہ — 266

میں دنگ رہ گیا۔ یہ فلسفیانہ بات تھی جو ان جیسے شخص کی زبان سے نکل رہی تھی لیکن ایک ٹھوس حقیقت تھی بہر حال اب یہ حادثات زندگی بن چکے تھے۔

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار کراچی

قارئین محترم ..... سلام مسنون!

عمران ڈائجسٹ کا سالنامہ حاضر ہے..... اس میں تینوں سلسلے وار تحریروں کے علاوہ ملکی و غیر ملکی کہانیاں شامل ہیں..... ان میں سے آپ کو کیا پسند آتا ہے اور کس چیز کی خامی ہے..... اس کے بارے میں تو آپ کے محبت ناموں سے ہی پتا چلے گا..... جو آپ اس شمارے کو پڑھنے کے بعد ہمیں روانہ کریں گے۔

چلئے جناب ایک حکومت کا دور ختم ہوا..... دوسرا آنے والا ہے..... ہر دور میں حکمرانی کے خواہش مند لوگ آتے رہے ہیں اور اسی طرح آتے رہیں گے..... نت نئے مسائل جنم لیں گے اور نت نئی تراکیب پیش ہوں گی..... سب کچھ چلتا رہے گا..... ہنگامے بھی..... مہنگائی بھی..... بے روزگاری بھی..... لوگوں کی بے زاری بھی..... کسی میں حالات کی وجہ سے کمی ہوگی تو کسی میں بیشی..... معاملات اور معمولات جاری رہنے والی چیزیں ہیں۔ انتظار اور بہت ہی طویل انتظار..... ہم سب کو کرنا ہی ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں، اپنی محفل کی جانب کہ جہاں آپ کے محبت نامے منتظر ہیں۔

☆..... پہلا خط لاہور سے محمد اکرم راجا لکھتے ہیں کہ موجودہ شمارے میں تینوں سلسلے وار تحریروں کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''نرالی مخلوق''، ایم الیاس کی ''قاتل مسیحا''، شازیہ رانا کی ''عکس برعکس''، سیما کاجل کی ''دھوکہ''، ایس اے ہاشمی کی ''آئینے کا سچ''، محمد مقصود خان کی ''انگوٹھی''، محمد صدیق طاہر کی ''فرار''، آغا دلاور کی ''تنہا گاہک''، حسن علی خان کی ''محور''، عابد علی سید کی ''شک کا فائدہ''، محمد سلیم اختر کی ''کب صبح ہوگی''، دانش کمال کی ''بیسوا''، سجاد خالد کی ''رنگین کیک''، نعیمہ ضیاء الدین کی ''خطرناک رجحان''، نازش شاہین کی ''اصل نقل''، ہما شاہین کی ''سن میری بہنا'' اور ایم اے راحت کی ''نادیدہ دروازے'' بہت اچھی تھیں۔

☆..... لاہور سے صنم ممتاز صاحبہ لکھتی ہیں کہ ایک عرصے سے عمران ڈائجسٹ ہمارے گھر میں آرہا ہے، کبھی کبھار پڑھنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ سوچا کہ اس مرتبہ آپ کو اپنی پسند کے حوالے سے خط بھی لکھ دیا جائے۔ اس شمارے میں ہمیں احمد صغیر صدیقی کی ''نرالی مخلوق''، ایم الیاس کی ''قاتل مسیحا''، شازیہ رانا کی ''عکس برعکس''، سیما کاجل کی ''دھوکہ''، ایس اے ہاشمی کی ''آئینے کا سچ''، محمد مقصود خان کی ''انگوٹھی''، محمد صدیق طاہر کی ''فرار''، آغا دلاور کی ''تنہا گاہک''، حسن علی خان کی ''محور''، عابد علی سید کی ''شک کا فائدہ''، محمد سلیم اختر کی ''کب صبح ہوگی''، دانش کمال کی ''بیسوا''، سجاد خالد کی ''رنگین کیک''، نعیمہ ضیاء الدین کی ''خطرناک رجحان''، نازش شاہین کی ''اصل نقل''، ہما شاہین کی ''سن میری بہنا'' اور ایم اے راحت کی ''نادیدہ دروازے'' بے حد پسند آئیں۔ کوئی شمارہ ناول نمبر کے طور پر بھی شائع کریں۔

☆..... محترمہ صنم صاحبہ..... آپ کے خط کا شکریہ..... آپ کی فرمائش نوٹ کرلی ہے، جلد ہی اس پر بھی کام کریں گے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی رائے سے نوازیں گی۔

☆..... حیدرآباد سے محمد شفیق لکھتے ہیں کہ عمران ڈائجسٹ میں سائنسی موضوعات پر کہانیوں کو شامل کیا کریں۔ اس ماہ ہمیں تینوں سلسلے وار تحریروں کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''نرالی مخلوق''، ایم الیاس کی ''قاتل مسیحا''، شازیہ رانا

کی ''عکس بر عکس'' سیما کاجل کی ''دھوکہ'' ایس اے ہاشمی کی ''آئینے کا سچ'' محمد مقصود خان کی ''انگوٹھی'' محمد صدیق طاہر کی ''فرار'' آغا دلاور کی ''تنہا گاہک'' حسن علی خان کی ''محور'' عابد علی سید کی ''شک کا فائدہ'' محمد سلیم اختر کی ''کب صبح ہوگی'' دانش کمال کی ''بیسوا'' سجاد خالد کی ''رنگین کیک'' نعیمہ ضیاء الدین کی ''خطرناک رجحان'' نازش شاہین کی ''اصل نقل'' ہما شاہین کی ''سن میری بہنا'' اور ایم اے راحت کی ''نادیدہ دروازے'' بہت اچھی لگیں۔

◆.....خان پور سے کلیم احمد لکھتے ہیں کہ اس ماہ ساری تحریریں ہی جاندار اور شاندار تھیں۔ جن میں تینوں سلسلے وار تحریروں کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''نرالی مخلوق'' ایم الیاس کی ''قاتل مسیحا'' شازیہ رانا کی ''عکس بر عکس'' سیما کاجل کی ''دھوکہ'' ایس اے ہاشمی کی ''آئینے کا سچ'' محمد مقصود خان کی ''انگوٹھی'' محمد صدیق طاہر کی ''فرار'' آغا دلاور کی ''تنہا گاہک'' حسن علی خان کی ''محور'' عابد علی سید کی ''شک کا فائدہ'' محمد سلیم اختر کی ''کب صبح ہوگی'' دانش کمال کی ''بیسوا'' سجاد خالد کی ''رنگین کیک'' نعیمہ ضیاء الدین کی ''خطرناک رجحان'' نازش شاہین کی ''اصل نقل'' ہما شاہین کی ''سن میری بہنا'' اور ایم اے راحت کی ''نادیدہ دروازے'' بہت اچھی تھیں۔

☆.....کلیم احمد صاحب! آپ کی تجاویز نوٹ کر لی گئی ہیں۔ ان پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

◆.....ملتان سے سید ارشاد حسین شاہ لکھتے ہیں کہ اس ماہ کی تحریروں میں سے احمد صغیر صدیقی کی ''نرالی مخلوق'' ایم الیاس کی ''قاتل مسیحا'' شازیہ رانا کی ''عکس بر عکس'' سیما کاجل کی ''دھوکہ'' ایس اے ہاشمی کی ''آئینے کا سچ'' محمد مقصود خان کی ''انگوٹھی'' محمد صدیق طاہر کی ''فرار'' آغا دلاور کی ''تنہا گاہک'' حسن علی خان کی ''محور'' عابد علی سید کی ''شک کا فائدہ'' محمد سلیم اختر کی ''کب صبح ہوگی'' دانش کمال کی ''بیسوا'' سجاد خالد کی ''رنگین کیک'' نعیمہ ضیاء الدین کی ''خطرناک رجحان'' نازش شاہین کی ''اصل نقل'' ہما شاہین کی ''سن میری بہنا'' اور ایم اے راحت کی ''نادیدہ دروازے'' بہت اچھی تھیں۔ اس ماہ کا شمارہ مجموعی طور پر اپنی تحریروں کی وجہ سے اچھا لگا۔

◆.....محمد سلیم بخاری' کوئٹہ سے لکھتے ہیں کہ اس مہینے میں احمد صغیر صدیقی کی ''نرالی مخلوق'' ایم الیاس کی ''قاتل مسیحا'' شازیہ رانا کی ''عکس بر عکس'' سیما کاجل کی ''دھوکہ'' ایس اے ہاشمی کی ''آئینے کا سچ'' محمد مقصود خان کی ''انگوٹھی'' محمد صدیق طاہر کی ''فرار'' آغا دلاور کی ''تنہا گاہک'' حسن علی خان کی ''محور'' عابد علی سید کی ''شک کا فائدہ'' محمد سلیم اختر کی ''کب صبح ہوگی'' دانش کمال کی ''بیسوا'' سجاد خالد کی ''رنگین کیک'' نعیمہ ضیاء الدین کی ''خطرناک رجحان'' نازش شاہین کی ''اصل نقل'' ہما شاہین کی ''سن میری بہنا'' اور ایم اے راحت کی ''نادیدہ دروازے'' بہت اچھی تھیں۔

◆.....لاہور سے خرم سلطان لکھتے ہیں کہ اس ماہ احمد صغیر صدیقی کی ''نرالی مخلوق'' ایم الیاس کی ''قاتل مسیحا'' شازیہ رانا کی ''عکس بر عکس'' سیما کاجل کی ''دھوکہ'' ایس اے ہاشمی کی ''آئینے کا سچ'' محمد مقصود خان کی ''انگوٹھی'' محمد صدیق طاہر کی ''فرار'' آغا دلاور کی ''تنہا گاہک'' حسن علی خان کی ''محور'' عابد علی سید کی ''شک کا فائدہ'' محمد سلیم اختر کی ''کب صبح ہوگی'' دانش کمال کی ''بیسوا'' سجاد خالد کی ''رنگین کیک'' نعیمہ ضیاء الدین کی ''خطرناک رجحان'' نازش شاہین کی ''اصل نقل'' ہما شاہین کی ''سن میری بہنا'' اور ایم اے راحت کی ''نادیدہ دروازے'' بہت اچھی تھیں۔

قارئین.....! آئندہ ماہ تک کے لیے اجازت اللہ حافظ مدیر

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے، بطور خاص

شاہ جہاں

اسلم راہی

Pakistanipoint
Waqar Azeem

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں۔ اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے، وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل رہی ہے۔ اچھے برے ہر قوم، ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

ہندوستان کا شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں ایک روز اپنے قصر میں بیٹھا تھا کہ اس کے سامنے بنگال کے حاکم قاسم خان کی طرف سے آنے والے ایک قاصد کو پیش کیا گیا۔ اس وقت شاہ جہاں کے بائیں جانب مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ اس کے ساتھ امبر کا راجہ جے سنگھ دائیں جانب شاہ جہاں کا بہنوئی آصف خان' شاہ جہاں کا ماموں شائستہ خان سالاروں میں سے عبداللہ خان' سیابت خان' سعداللہ خان اور دیگر سالاروں کے علاوہ کمرے کے اندر بہت سے امراء اور سالار بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے میں شاہ جہاں نے بنگال کی طرف سے آنے والے بنگال کے عالم قاسم خان کے قاصد کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''کیا تم قاسم خان کی طرف سے کوئی اہم پیغام لے کر آئے ہو۔'' اس پر قاصد بولا اور کہنے لگا۔

''شہنشاہ عالم میں قاسم خان کی طرف سے ہی ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں۔ بنگال میں پرتگالیوں کی روش سخت ہوگئی ہے وہ مسلمانوں پر مظالم کرنے لگے ہیں جس مسلمان کو چاہیں اٹھا کر لے جاتے ہیں' کسی کو غلام بنا کر بیچ دیتے ہیں کسی کو اپنے پاس رکھ کر مشقت کرواتے ہیں یہاں تک کہ وہاں کی عورتوں کی عزت اور آبرو بھی ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ قاسم نے مجھے آپ کی طرف اس غرض سے روانہ کیا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اسے اجازت دی جائے تاکہ پرتگالیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں راہ راست پر لایا جائے یا ان سرزمینوں سے دھتکارے ہوئے ابلیس کی طرح انہیں نکال باہر کیا جائے۔''

یہ خبر سن کر شاہ جہاں غیض وغضب کا شکار ہوگیا تھا اس لیے کہ پرتگالیوں کے خلاف اسے پہلے بھی بہت سی شکایات مل چکی تھیں۔

یہ پرتگالی تقریباً ایک سو سال سے بنگال کے شہر میں اپنے قدم جمائے ہوئے تھے وہ وہاں سے مختلف ممالک کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے' نمک بنانے میں ان کی اجارہ داری قائم تھی اپنے علاقوں کا انتظام اور انصرام تقریباً ان کے اپنے ہاتھ میں تھا نئی بندرگاہ سنارگاؤں اور سلت گاؤں کی قیمت پر تعمیر کی گئی تھی۔

جہانگیر کے دور حکومت میں مغل حاکموں نے پرتگالیوں کی سرگرمیوں پر کوئی توجہ نہ دی اور سن سولہ سو آٹھ میں اپنا صدر مقام سنارگاؤں سے ڈھاکہ منتقل کرلیا۔ بادشاہ کے نام پر انہوں نے ڈھاکہ کا نام جہانگیر نگر رکھ لیا۔

لیکن جب شاہ جہاں کی تخت نشینی کے بعد قاسم خان کو بنگال کا حاکم مقرر کیا گیا تو اس نے شاہ جہاں کو اطلاع بھی دی کہ پرتگالی مملکت کے لیے بڑا خطرہ بن سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی آبادیوں کی قلعہ بندی کرلی ہیں بحری جہازوں کی آمدورفت پر ٹیکس عائد کردیا ہے اور سات گاؤں کو بالکل تباہ کردیا ہے اس کے علاوہ قاسم خان نے شاہ جہاں کو ان لوگوں کی قذاقی کی بھی اطلاع دی اور بتایا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو اغواء کر کے یا خرید کر غلام بنا لیتے ہیں کیونکہ شاہ جہاں بھی خود بھی غیر ملکیوں کی اس نوع کی سرگرمیوں سے واقف تھا لہٰذا اس نے ذاتی دلچسپی کا اظہار شروع کردیا۔

شاہ جہاں کو یاد تھا کہ پرتگالیوں نے اس کے بھائی پرویز کی بھی مدد کی تھی شاہ جہاں کی تخت نشینی کے وقت بھی انہوں نے رسم و رواج کے مطابق تحائف روانہ نہیں کیے تھے۔

شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل کو بھی پرتگالیوں سے رنجش رہی تھی اس لیے کہ ایک بار فرار کے وقت ایک پرتگالی نے پہلے تو شاہی خاندان کو تھوڑی بہت مدد کی لیکن بعد ازاں کشتیاں لے کر بھاگ گیا اور اس طرح شاہی خاندان کو بے آسرا چھوڑ گیا۔

ان کشتیوں میں سے بقول مورخین دو

کنیزیں بھی تھیں جو ممتاز محل کی ذاتی خدمت گار تھیں اس طرح سولہ سو انتیس میں پرتگالیوں نے ڈھاکہ کے قریب نا صرف گاؤں آلوٹا بلکہ ایک مغل عورت کی آبروریزی کی بعدازاں اسے زبردستی عیسائی کر کے اس کی شادی ایک پرتگالی سے کردی۔

چنانچہ یہ سارے حالات اور واقعات یاد کر کے بنگال کے قاسم خان کے بھیجے ہوئے پیغام کے بعد شاہ جہاں کے ذہن میں پرتگالیوں کی ان مضموم حرکات کی یاد تازہ ہوگئی اور اس کی سرکوبی کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ساری سوچوں سے فارغ ہونے کے بعد شاہ جہاں نے بنگال کے حاکم قاسم خان کی طرف سے آنے والے قاصد کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''کیا اس کے علاوہ بھی تم کچھ کہنا چاہتے ہو یا جو پیغام قاسم نے بھیجا وہ یہیں تک ہے۔''

جواب میں وہ قاصد کہنے لگا۔

''شہنشاہ معظم میرے پاس ایک اور خبر بھی ہے جو افسوس ناک ہے وہ یہ کہ قاسم خان کی بیوی فوت ہوچکی ہے اب قاسم خان اور اس کا سالار بہادر خان دونوں پرتگالیوں کو بنگال سے نکالنے یا ان کی سرکوبی کرنے کے لیے بالکل تیار اور مستعد ہیں۔''

اس قاصد کے اس انکشاف پر شاہ جہاں چونکا تھا پر اپنے پہلو میں بیٹھے ماروا ڑ کے راجہ جسونت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جسونت قاسم خان ماں باپ آگرہ میں اپنی حویلی میں قیام رکھتے ہیں آج ان کی طرف پیغام بھجوا دینا کہ ان کی بہو اور قاسم خان کی بیوی فوت ہوچکی ہے۔'' اس کے بعد شاہ جہاں نے کچھ سوچا اور آنے والے قاصد کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''کیا قطب خان کا پوتا بہادر خان جسے قاسم خان کی تربیت میں دیا گیا تھا جوان ہوچکا ہے اور وہ اپنے محسن قاسم خان کے ساتھ پرتگالیوں کے خلاف حرکت میں آنے کے قابل ہوچکا ہے۔''

قاصد کے بجائے شاہ جہاں کے پاس بیٹھا ماروا ڑ کا راجہ جسونت سنگھ بولا اور کہنے لگا۔

''شہنشاہ معظم قاسم خان میرا بہترین دوست بلکہ میرا بھائی بنا ہوا ہے' میں اس کے منہ بولے بھتیجے بہادر خان کو اچھی طرح جانتا ہوں خوب دراز قد کڑیل جسم والا جوان ہے لیکن ابھی نابالغ ہے اس کے باوجود ہمت بالغوں سے بھی اعلیٰ درجے کی رکھتا ہے اور مجھے امید ہے کہ اگر قاسم خان اور بہادر خان کو پرتگالیوں کے خلاف حرکت میں آنے کی اجازت مل گئی تو دونوں پرتگالیوں کو فنا کر کے بنگال کو سنوار دیں گے۔''

ہلکا سا تبسم اس موقع پر شاہ جہاں کے چہرے پر نمودار ہوا پھر قاصد کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''دو دن مکمل یہاں آرام کرو اس کے بعد واپسی کا سفر شروع کرو اور میری طرف سے قاسم کان اور اس کے سالار بہادر خان سے کہنا کہ بنگال میں رہتے ہوئے تم وہاں کے حالات کو تم مجھ سے بہتر جانتے ہو لہٰذا جس طرح تم بہتری اور سلامت کی بھلائی چاہتے ہو ویسے کرو کوئی تمہارے خلاف احتجاج یا اعتراض نہیں کرے گا۔''

اس کے ساتھ ہی شاہ جہاں نے وہ اجلاس ختم کردیا تھا تھوڑی دیر بعد ماروا ڑ کا راجہ جسونت سنگھ آگرہ میں اپنی محفل نما حویلی میں داخل ہوا حویلی کے دیوان خانے میں اس وقت اس کی بیوی سرس وتی دو بیٹے رویا ناتھ قوی راج اور حسین اور پرجمال بیٹی اور راج کماری رتن مالا بیٹھے کسی موضوع پر گفتگو کررہے تھے جسونت سنگھ آگے بڑھ کر ان کے اندر بیٹھ گیا یہاں تک کہ اس کی سرسوتی بولی اور کہنے لگی۔

''آپ نے قصر میں بہت دیر لگادی۔'' اس پر جسونت سنگھ بولا اور کہنے لگا۔

''دراصل ایک پیچیدہ معاملہ آ گیا تھا قاسم خان کی طرف سے بنگال سے ایک قاصد آیا تھا

جس نے بنگال میں پرتگالیوں کی زیادتیوں کا پیغام شہنشاہ تک پہنچایا ہے ساتھ ہی قاسم کی بیوی کی افسوس ناک خبر لے کر وہ آیا تھا لہٰذا میں قاسم خان کے ماں باپ کی طرف چلا گیا اور ان سے قاسم خان کی بیوی کا بھی افسوس کیا اور اسے قاسم خان کی بیوی کے مرنے کی بھی اطلاع دی اس بنا پر مجھے دیر ہوگئی۔''

یہ خبریں سن کر سرسوتی وریا ناتھ اور قوی راج کچھ اداس سے ہوگئے تھے یہاں تک کہ سرسوتی بولی۔

''قاسم خان کی بیوی کے مرنے کا مجھے بڑا دکھ اور صدمہ ہے پر شہنشاہ نے بنگال سے آنے والے قاصد کو کیا جواب دیا ہے۔''

اس پر جسونت کہنے لگا۔''شہنشاہ نے قاصد سے کہہ دیا ہے کہ وہ قاسم خان اور اس کے سالار بہادر خان سے جا کر کہہ دے کہ بنگال کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے شہنشاہ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ شہنشاہ پوری طرح ان کی پشت پناہی کرے گا۔''

اس موقع پر جسونت سنگھ کی حسین اور خوبصورت اور پرکشش راج کماری رتن مالا اپنی جگہ سے اٹھی اور جسونت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''پتا جی میں کھانا یہیں لگاتی ہوں سب یہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی رتن مالا جب اٹھ کر باہر جانے لگی تو اس کی ماں سرسوتی بھی کھانے کے برتن لگانے کے لیے اس کے ساتھ ہولی تھی۔

☆☆

گو بنگال میں پرتگالیوں نے بڑی طاقت اور قوت جمع کرلی تھی ان کا ایک خاصا بڑا لشکر بنگال میں تھا جسے وہ جنگ کرنے کی بہترین تربیت بھی دے چکے تھے ان حالات میں پرتگالیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں سیدھا کرنا یا انہیں بنگال سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن یہ شاہ جہاں کا حوصلہ تھا کہ اس نے قاسم خان کی طرف پیغام بھجوا دیا کہ وہ پرتگالیوں کے خلاف جو چاہے کرے اس لیے کہ وہ شاہ جہاں ماضی میں اپنے باپ جہانگیر کے دور میں بھی ایسی بہت سی بغاوتوں اور ایسے بہت سے حادثات اور لمحوں سے جنوبی ہندوستان میں نبٹ چکا تھا شاہ جہان سن پندرہ سو بانوے میں اپنے دادا اکبر کی زندگی ہی میں ایک راجپوت خاتون جگت گوسائیں کے بطن سے پیدا ہوا وہ جہانگیر کا تیسرا بیٹا تھا جگت گوسائیں کو مارواڑ کے راجہ اودھے سنگھ کی بیٹی تھی اکبر کو شاہ جہاں سے بچپن ہی سے بہت محبت تھی اس کے خیال میں وہ جہانگیر کے تینوں بیٹوں میں سے سب سے زیادہ ذہین اور عقل تھا یہ بات درست بھی تھی شاہ جہاں جس کا اصل نام خرم تھا وہ اس نے بہت جلد تعلیم حاصل کی اور دوران تعلیم قدم قدم پر اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کیا۔

قدرت کی طرف سے اسے مضبوط قوت ارادی اور اعلیٰ کردار سے نوازا گیا تھا دوسرے شہزادے ناؤ نوش میں مصروف رہتے لیکن اس نے شراب سے ہمیشہ گریز کیا اس کا بڑا بھائی خسرو شہنشاہ کا اعتماد کھو چکا تھا دوسرا بھائی پرویز ضدی اور صلاحیتوں سے عاری شہزادہ تھا چنانچہ برصغیر پر حکمرانی کے لیے بطور وارث سب کی نظریں خرم یعنی شاہ جہاں پر ہی گڑی ہوئی تھیں جہانگیر کا اپنا رجحان بھی شاہ جہان کی ہی طرف تھا شروع میں ہی جہانگیر نے اس کے تحت دس ہزار پیدل اور پانچ ہزار سواروں کا شکریہ کیا تھا سن بلوغت کو پہنچتے ہی سن سولہ سو بارہ میں اس کی شادی ارجمند بانو سے کردی گئی ارجمند بانو نور جہاں کے بھائی آصف خان کی لڑکی تھی بعد ازاں نور جہاں کی سفارش پر سن سولہ سو سترہ میں شاہ جہاں کو تیس ہزار کے لشکر کا منصب دیا گیا' یہ بلند منصب محدود سے چند لوگوں کو ملا جن سے بادشاہ کا مقصد اپنی

خوشنودی کا اظہار ہوتا تھا۔

شاہ جہاں ایک کامیاب سالار تھا اس نے راجپوتوں کے خلاف میواڑ کی مہم میں کامیابی حاصل کی تو جہانگیر نے قریب نشست والی کی اس طرح شاہ جہاں اپنے باپ جہانگیر کے دل میں گھر کرتا چلا گیا تھا۔

لیکن شاہ جہاں آئی روز افروز مقبولیت نے بعض حلقوں کو اس کی دشمن بنا دیا چنانچہ شاہ جہاں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا نور جہاں نے اپنے داماد شیر یار کو تخت نشین کرانا چاہا اس کا واضح مطلب تخت سے شاہ جہاں کی محرومی تھا چنانچہ جب شاہ جہاں کو نور جہاں کے ان ارادوں کا علم ہوا تو اس نے قندھار کی اس مہم پر جانے سے انکار کر دیا جس کا حکم اس کے باپ جہانگیر جہاں اپنے تمام بیٹوں پر ترجیح دیتا تھا بلکہ قلبی طور پر بھی اس سے بہت نزدیک تھا۔ بغاوت کے نتیجہ میں شاہی افواج کے ساتھ جو جنگ ہوئی شاہ جہاں اس کی افواج سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا آخر اس نے جہانگیر سے معافی مانگ لی۔

اس کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا نور جہاں کو فکر یہ تھی کہ جہانگیر کی وفات کے بعد ہر طرف اس کی گرفت کمزور ہو جائے گی لہٰذا شاہ جہاں کی تخت نشینی پر پیش بندی ضروری تھی۔

شاہ جہاں بھی یہ جانتا تھا کہ تاج و تخت کے معاملے میں نور جہاں اس کی سب سے بڑی رقیب ہے لہٰذا اس نے بھی اپنے طور پر تیاری شروع کر دی۔ دونوں کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہ تھا نور جہاں اگر خائف تھی تو شاہ جہاں کی صلاحیتوں اور اس کی مقبولیت سے۔

اکتوبر سولہ سو ستائیس میں جہانگیر کی وفات کے بعد نور جہاں نے شہر یار کی تخت نشینی کا منصوبہ بنایا نور جہاں کا خیال یہ تھا کہ تخت نشینی کے بعد شہر یار اس کے آلہ کار کی حیثیت سے حکومت کرتا رہے گا لیکن نور جہاں کا بھائی آصف خان اپنے داماد شاہ جہاں کو تخت پر دیکھنا چاہتا تھا۔

تاہم آصف خان کو کامیابی حاصل ہوئی یہ کامیابی انسانی خون کی قیمت پر حاصل ہو سکی کیونکہ ملک خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا اس کشمکش میں شاہی خاندان کے بہت سے شہزادوں اور ان کے حامیوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا کہا جاتا ہے کہ اس خونی المیے کو دیکھ کر حرم کی بہت سی ایسی خواتین جن کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔

آخر شاہ جہاں ہی تخت نشین ہوا اور چھ فروری سولہ سو اٹھائیس کو شاہ جہاں کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی اس طرح وہ ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قراں ثانی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکے جاری کر دیے گئے نور جہاں کے نام کے سکے واپس لے لیے گئے اور اسے میدان سیاست سے فوری طور پر دستبردار ہونے کا حکم دیا گیا اس موقع پر پرتکلف دعوتوں کا اہتمام کیا گیا اور بہت سے امراء کو خطابات سے بھی نوازا گیا۔

شاہ جہاں نے تخت نشین ہوتے ہی تمام بدعتوں کے خاتمے کے لئے قانون شریعت کی ترغیب شروع کر دی کو ینہ ملک اکبر ہی کے وقت میں قانون شریعت سے محروم ہو چکا تھا سب سے پہلے شاہی حکومت کے تحت شمسی سن ختم کر کے قمری سن استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی اور تمام سرکاری اور غیر سرکاری تقاریب کا اندراج بھی تحری مہینوں اور تاریخوں کے اعتبار سے مرتب کرنے کا حکم دیا گیا اکبر اور جہانگیر کے دور حکومت میں جو سجدہ کی بدعت موجود رہی تھی فوراً منسوخ کر دی گئی کیونکہ شاہ جہاں ایک مسلمان کی حیثیت سے بجا طور پر سمجھتا تھا کہ خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ شرک ہے' اس موقع پر مہابت خان اور خان خاناں نے تجویز پیش کی کہ سجدہ کی جگہ زمین بوسی کو رواج دیا جائے کیونکہ رعایا اور حکومت کے

درمیان امتیاز قائم رکھنا بہرحال ضروری تھا شاہ جہاں نے زمین بوسی کی تو اجازت نہ دی البتہ دربار میں حاضری کے وقت ایک ہاتھ زمین سے چھوکر اسی ہاتھ کو چومنے کا حکم دے دیا۔

شاہ جہاں نے متقول دانشوروں اور عبادت گزار لوگوں کو اس علامت اطاعت اور تکریم سے مستثنیٰ قرار دے دیا کچھ ہی عرصہ بعد اس نے محسوس کیا کہ بادشاہ کی عزت کا یہ انداز بھی یعنی زمین بوسی سجدہ سے مشابہہ ہے لہٰذا اس نے اسے بھی منسوخ کر دیا۔ چہار تسلیم کو ترویج دی۔ یہ چار تسلیم کچھ اس طرح تھی کہ زمین کو دونوں ہاتھوں سے چھونا ضروری تھا لیکن امیر قزوینی جس نے شاہ جہاں کے دور کے ابتدائی دس برس کی تاریخ مرتب کی اس کے مطابق ایک یعنی دایاں ہاتھ زمین کے چھونے کا حکم تھا۔

چہار تسلیم کا مطلب کمر کو ہلکا سا خم دے کر ہاتھ سے آداب بجالانا تھا ہر آنے والے کو چار بار یہ تسلیم بجالانا پڑتا۔

شاہ جہاں نے اپنے دادا اکبر کے ام پر آگرہ کو اکبر آباد کا نام دیا برسراقتدار آنے کے بعد شاہ جہاں نے اپنے بدترین مخالفین سے بھی بہتر سلوک کیا اپنے سسر اور نور جہاں کے بھائی آصف خان کو اس نے اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔

آصف ان نے شاہ جہاں کی تخت نشینی کے لئے منصفانہ طور پر مگر پس پردہ رہ کر کوشش کی اس سلسلہ میں مہابت خان نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا آصف خان نے سب سے پہلے نور جہاں کی تقل حرکت پر کڑی نگرانی قائم کر دی بالفاظ دیگر وہ قریباً نظر بند تھی۔ علاوہ ازیں بعض سالاروں کے مشورہ سے جہانگیر کے پوتے داور بخش کی تخت نشینی کا بھی اعلان کر دی گیا اسکے نام کا خطبہ بھی پڑھا گیا اس کے سکے بھی کندہ ہوئے۔ دریں اثناء آصف خان نے شاہ جہاں کے نام اور نور جہاں نے شہریار کے نام پر بھی پیغامات ادا نہ کئے۔ شہریار نے فوراً ہی شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا نیز لاہور کے خزانے پر بھی قبضہ کرلیا۔ شہریار نے اس خزانے کے بل پوتے پر لوگوں کو بھاری رشوتیں دیں تاکہ ان کی حمایت حاصل کر سکے۔ علاوہ ازیں اس نے جنگ کی صورت میں لشکر کی ضرورت کے پیش نظر بھی اضافہ کیا اس نے اپنے لشکر کا سپہ سالار اپنے چچا زاد داور بخش کو بنایا مگر آصف خان کو عجلت میں بھرتی کی ہوئی اس سپاہ کو شکست دینے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

شہریار اور آصف خان کے لشکروں کی مڈبھیڑ لاہور کے راستے پر ہوئی شہریار نے اپنی شکست کی اطلاع پاکر روپوش ہونے کی کوشش کی مگر اسے گرفتار کرنے کے بعد جیل بھیج دیا گیا بعدازاں اسے بینائی سے محروم کر دیا گیا۔ ادھر آصف خان کا خاص پیغامبر بیس دن میں دکن جا پہنچا اور دکن میں اس وقت شاہ جہاں قیام کیے ہوئے تھا اس نے شاہ جہاں کو بنگال کی مہم سے باز رہنے کو کہا دوسری طرف جہانگیر کا سالار اعلیٰ خان جہاں بھی میواڑ سے ہوتا ہوا آگرہ پہنچا جہاں اسے شہنشاہ تسلیم کرلیا گیا اس نے آصف خان کو یہ بھی حکم دیا کہ تخت کے ہر ممکنہ دعویدار کو قتل کر دیا گیا جائے چنانچہ اس حکم کے تحت داور بخش اور شہریار اور خسرو کے ایک ایک بیٹے اور دانیال کے دو بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا صرف نور جہاں کی جان بخشی کی گئی نور جہاں کو سیاست سے دستبردار ہوکر گوشہ نشینی پر مجبور کر کے اس کی پنشن مقرر کر دی گئی اور وہ لاہور جا کر آباد ہوگئی اس طرح نور جہاں نے اپنی باقی زندگی اپنے شوہر جہانگیر کے مقبرے کی تعمیر وغیرہ کی نگرانی میں صرف کر دی اس دوران وہ حسب معمول فیاضی سے خیرات بھی کرتی رہی۔

شاہ جہاں کا ساتھ نہ صرف آصف خان اور مہابت خان دے رہے تھے بلکہ اسے دیگر نمایاں

سالاروں اور امراء کا بھی مکمل تعاون حاصل تھا اس کے علاوہ خود شاہ جہاں بھی بھرپور صلاحیتیں رکھتا تھا اپنی ماں اور دادی کے ناتے اس نے راجپوتوں کا تعاون بھی حاصل کرلیا اس کے مقابلے میں شاہ جہاں کا خیال یہ تھا کہ شہریار یا داور بخش میں سے کوئی ایک تخت نشینی میں کامیابی حاصل کرے گا مگر جب شاہ جہاں نے آگرہ کی طرف پیش قدمی شروع کی تو خان جہاں نے برہان پور میں اپنے صدر مقام پر کچھ توپ خانہ چھوڑا اور مانڈو پر قبضہ کے لیے روانہ ہوگیا۔

جونہی اسے یہ اطلاع ملی کہ شاہ جہاں اجمیر پہنچ گیا ہے اس کے کچھ ہندو ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ان ہندوؤں نے شاہ جہاں کی اطاعت قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ شاہ جہاں نے ان کی معافی قبول کرلی بعدازاں خود خان جہاں نے بھی شاہ جہاں سے معافی مانگ لی اسے دکن کا عامل مقرر کرکے برہان پور لوٹ جانے کا حکم دے دیا گیا۔

اس کے علاوہ شاہ جہاں کے شروع ہی کے دور میں شاہ جہاں کی تاج پوشی کے کچھ عرصہ بعد ہی بندیلہ قبیلہ کی بغاوت کے باعث امن وامان خطرے میں پڑ گیا۔ بندھیل کھنڈ کے راجہ جھیر سنگھ دیو کی وفات کے بعد اس کا لڑکا ججھر سنگھ تخت نشین ہوا اس نے اپنے لڑکے بکرما جیت سنگھ کے سپرد ریاست کا کام کیا اور خود شاہ جہاں کے دربار میں آ گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد ججھر سنگھ کا اپنے لڑکے بکرما جیت کی بدعنوانیوں کی اطلاع ملی چنانچہ اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا مگر غلطی یہ کی کہ شہنشاہ کو اطلاع دیے بغیر آگرہ سے روانہ ہوگیا جس کی وجہ سے اسے شاہ جہاں کی ناراضگی مول لینا پڑی۔

بندھیل کھنڈ کا علاقہ جنگلوں اور دشوار گزار راستوں پر مشتمل تھا موسم برسات میں اس علاقے میں پیش قدمی کرنا ناممکن ہوجاتا تھا ججھر سنگھ نے یہ موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنے مال دولت اور بھاری لشکر کا سہارا لیا اور مغلوں کے خلاف لڑنے کی ٹھان لی۔

آگرہ سے اورنگر کے بعد ججھر سنگھ اڑچھ پہنچ گیا جہاں اس نے اپنے لشکر میں بھرتی شروع کردی اور قلعہ بندیاں مضبوط کرنے کے بعد شاہراہوں کی ناکہ بندی اور جنگ کے لیے اسلحہ جمع کرنا شروع کردیا۔

یہ اطلاع ملتے ہی شاہ جہاں نے اس کی سرکوبی کرنے کا فیصلہ کیا شاہی لشکر تین اطراف سے روانہ ہوا ایک طرف سے مہابت خان دوسری طرف سے خان جہاں اور تیسری طرف سے شاہ جہاں کے نامور سالار عبداللہ خان نے پیش قدمی شروع کی ان لوگوں کے ساتھ گوالیار کا راجہ رام داس آصف خان اور راہ بھرت وغیرہ بھی تھے۔ اس طرح شاہی لشکر کی مجموعی تعداد پینتیس ہزار افراد تک پہنچ گئی شاہ جہاں خود جنوری سولہ سو انتیس میں خود آگرہ سے گوالیار پہنچا عبداللہ نے حملہ کی ابتداء کی اور اڑچھ کا قلعہ وتسخیر کرلیا اس دوران میں جھجھر سنگھ کے تقریباً تین ہزار لشکر کام آئے اتنی بڑی شاہی سپاہ کو دیکھ کر ججھر سنگھ ویسے ہی گھبرا گیا چنانچہ اس نے مہابت خان کی وساطت سے شاہ جہاں کی اطاعت قبول کرلی۔ اس دوران جھجھر سنگھ کو اپنے بعض لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اسے یہ بھی شبہ تھا کہ اس کی بیوی نے اس کے بھائی ہردور سنگھ کے ساتھ مل کر سازش کی تھی چنانچہ اس نے ہردور سنگھ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

بہرحال جھجھر سنگھ کی معافی قبول کرلی گئی شاہ جہاں کے سامنے پیش کیا گیا اس نے ایک ہزار طلائی مہریں بطور نذرانہ پندرہ لاکھ روپے جرمانہ کے طور پر اور چالیس ہاتھی شاہ جہاں کو دینے کا عہد کیا۔ علاوہ ازیں اسے چار ہزار پیدل اور چار ہزار سوار کا منصب قائم رکھنے کے لیے

مناسب جاگیر رکھنے کی اجازت دے دی گئی باقی جاگیر خان جہاں لودھی عبداللہ خان اور راجہ پہاڑ سنگھ بندھیلہ میں تقسیم کر دی گئی ججھجھر سنگھ کو دو ہزار پیادہ اور دو ہزار سوار تیار رکھنے کا حکم دے دیا تا کہ وہ دکن کی مہم میں شاہ جہاں کی مدد کر سکے۔

چند ہفتے بعد شاہ جہاں آگرہ لوٹ گیا اس نے اپنی تمام تر توجہ دکن کے معاملات پر مبذول کر دی خان جہاں کو دکن کے عامل کے طور پر بحال کرنے کے بعد شاہ جہاں نے ہدایت کی تھی کہ وہ بالاگھاٹ پر قبضہ کرے لیکن خان جہاں نے اس حکم کی تعمیل میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ چنانچہ مہابت خان کو خان جہاں کی جگہ عامل بنا کر بھیج دیا گیا۔

گو شاہ جہاں نے خان جہاں کو کوئی سزا نہ دی تاہم وہ آگرہ میں دربار کے ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اسی دوران اس کے ایک لڑکے کو یہ اطلاع ملی کہ خان جہاں اور اسے بہت جلد جیل میں بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ خان جہاں نے دربار میں حاضر ہونا بند کر دیا اور دو ہزار افغانوں کے ساتھ اپنے مکان میں رہنے لگا یہ دو ہزار افغان اس کی حفاظت پر مامور تھے جب شاہ جہاں نے اس کی عدم موجودگی کو محسوس کیا تو ایک پیغامبر کے ذریعے وجہ دریافت کی شاہ جہاں کو اس کے شبہات کا علم ہوا تو آصف خان نے شاہ جہاں کے دستخطوں سے خان جہاں کو ایک خط بھجوایا جس میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ شہنشاہ اسے یا اس کے لڑکے کو کوئی سزا نہیں دینا چاہتا۔

اس کے باوجود خان جہاں کے شبہات دفع نہ ہو سکے اور وہ ایک بار پھر آگرہ سے فرار ہو گیا شاہ جہاں کی اس یقین دہانی کے بعد اس نے چند دن تو دربار میں حاضری دی لیکن اپنے دل میں چور ہونے کے باعث وہ زیادہ دیر تک شاہ جہاں پر اعتماد نہ کر سکا حالانکہ دس اکتوبر سن سولہ سو انتیس میں جب آصف خان کو یہ اطلاع ملی کہ خان جہاں فرار ہونا چاہتا ہے تو اس نے فوری طور پر شاہ جہاں کو اطلاع دے دی تھی لیکن شاہ جہاں نے یہ سوچ کر کہ وہ خان جہاں کو معافی دینے کے وعدے سے بلاوجہ انہیں ہراس کیوں کرے وقت کا انتظار ایک لیکن چند دن میں ہی خان جہاں اپنے دو ہزار ساتھیوں کے ہمراہ رات کے وقت آگرہ سے روانہ ہو گیا شاہی لشکر نے اس کا تعاقب کیا دریائے چنبل کے قریب جا لیا وہاں سے وہ بندھیلہ اور گونڈوانہ کے راستے دکن جا پہنچا اور پرانے اتحادی نظام الملک سے جا ملا شاہی لشکریوں نے خان جہاں کے سپاہیوں کے درمیان جھڑپ ہوئی دھول پور کے قریب دریائے چنبل کے کنارے ہوئی جس میں شاہی لشکر کو نقصان اٹھانا پڑا اس نے سب سے پہلے اپنے لڑکوں سپاہیوں کو تیز رفتار ندی کو عبور کیا مگر اپنا خزانہ پیچھے چھوڑ گیا۔

ججھجھر سنگھ کے لڑکے بکرماجیت سنگھ نے اسے بندھیل کھنڈ کے آسان اور قریب ترین راستوں پر ڈال دیا اس طرح وہ احمد نگر اور دولت آباد جا پہنچا وہاں کے حاکم نظام الدین نے اس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا اس عہدہ بھی دیا بعدازاں اس کے بہت سے ساتھیوں کو مقبوضات فتح کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

شاہی لشکر اس کے تعاقب میں بڑھ رہا تھا۔ دسمبر سولہ سو انتیس میں شاہ جہاں آگرہ سے دکن روانہ ہوا جنوری سولہ سو تیس میں شاہی لشکر نے بالا گھاٹ پر حملہ کر دیا لیکن خان جہاں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی چنانچہ شاہ جہاں نے موسم برسات گزر جانے کے بعد بھرپور حملہ کرنے کی ٹھانی شاہ جہاں کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اسے خان جہاں سے نبٹنے کے ساتھ احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈہ کی تین حکومتوں سے بھی جنگ کرنا پڑتی تھی یہ تینوں حکومتیں مغلوں کے خلاف تھیں اور آپس میں ان کے تنازعات بھی چلتے رہتے تھے۔

انہی دنوں مرہٹوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ شاہ جہاں نے کچھ لشکر خواجہ ابو الحسن کی کمان میں دھولیہ کی طرف روانہ کیا تاکہ نا صرف شمال مغرب کی طرف احمد نگر کو متاثر کیا جاسے بلکہ سپلائی لائن بھی قائم رہے۔

بہت سے لشکر برار کے جنوب میں دھول گاؤں میں رکھے گئے تاکہ بوقت ضرورت شمال مشرق سے حملہ کیا جاسکے کچھ لشکری ریاست حیدر آباد کے شمال کی طرف واقع تلنگانہ بھیج دیے گئے مرہٹے مغلوں کی حکومت میں عہدے قبول کیے تھے مگر دوسری طرف ان کا قائد جادو رائے احمد نگر کی حکومت کے ساتھ بھی تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے لڑکوں اور رشتہ داروں کو احمد نگر کی حکومت کی ملازمت میں دے دیا شاہ جہاں اس دوغلی پالیسی سے مطمئن نہ تھا اس نے جادو رائے کی گرفتاری کے واسطے دربار میں طلب کیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا اس طرح مرہٹے وقتی طور پر مغلوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔

اس کے بعد سن سولہ سو تیس میں گجرات اور دکن میں بارشیں ہونے کے باعث قحط سالی ہوگئی ادھر قحط پڑا ہوا تھا اور ادھر خان جہاں کو مالیہ اکٹھا کرنے میں سخت دشواری پیش آرہی تھی کیونکہ قحط کے دوران زمین داروں سے مالیہ کی وصولی بہت دشوار تھی احمد نگر کے لشکریوں کا سپہ سالار مغرب خان ان دنوں جالنا میں مقیم تھا جہاں سے مغل لشکر چند میل کے فاصلے پر جب شاہ جہاں کا ایک سالار اعظم خان دیول گاؤں سے چلا تو مقرب خان پیچھے ہٹ گیا مگر مغل لشکر خاموشی کے ساتھ اس کا تعاقب کرتا رہا خان جہاں کو اعظم خان کے آنے کی خبر ملی تو اس نے جہاں قیام کیا ہوا تھا وہ جگہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا مگر اس کی روانگی سے پہلے ہی اعظم خان نے راتوں رات پیش قدمی کرکے معمولی سے لشکر کو خان جہاں کے تعاقب میں بھیج دیا اور باقی تمام لشکر کو اپنے ساتھ محفوظ رکھا۔

خان جہاں نے معمولی سی لشکری طاقت دیکھی تو اس پر حملہ کردیا لیکن جونہی خان جہاں کی حملہ آور سپاہ نے باقی ماندہ شاہی لشکر کو دیکھا تو افراتفری کے عالم میں منتشر ہوگئے۔ اب خان جہاں پیچھے ہٹنے کے قابل بھی نہ تھا کیونکہ اس کے تمام راستے شاہی فوج نے محدود کردیے تھے لہٰذا اس نے لڑنے کا فیصلہ کرلیا اس نے حرم کو محفوظ مقام پر بھیجا اور جنگ کی تیاری شروع کردی اس کے بعد مغل لشکریوں سے خون ریز جنگ ہوئی باغیوں نے شاہی افواج کا مقابلہ نہایت دلیری سے کیا لیکن انہیں شکست اٹھانا پڑی مغلوں نے باغیوں کا شدید تعاقب کیا لیکن مغلوں کے گھوڑے بیس گھنٹوں میں ساٹھ میل سفر کرنے کے بعد اس حد تک تھک چکے تھے کہ مزید تعاقب ممکن نہ رہا۔

خان جہاں اپنے چند لیکن زخمی ساتھیوں اور حرم کے ساتھ تازہ دم گھوڑوں پر سوار ہونے میں کامیاب ہوگیا خان جہاں نے وجے پور کا رخ کیا تاکہ دولت آباد میں پناہ لے سکے۔

شاہ جہاں کے سالار احمد خان نے اپنی سپاہ کو قدرے آرام کی مہلت دی پر تعاقب شروع کردیا اس طرح خان جہاں ایک اور افغان سالار دریا خان کے ساتھ جگہ جگہ پناہ ڈھونڈتا رہا احمد نگر کے حکمران نے خود کو قلعہ میں بند کرلیا تھا جادو رائے کے داماد شاہ جی بھونسلے نے جادو رائے کے قتل کے بعد احمد نگر سے تعاون ختم کردیا تھا لہٰذا اس نے شاہ جہاں خوانی خدمات پیش کردیں۔ اس پیش کش کو بخوشی قبول کرلیا گیا۔

باغیوں نے ایک بار پھر دریا خان کو کچھ لشکر دے کر چند واڑ اور چالیس گاؤں بھیجا جہاں افغانوں نے کھانے پینے کی چیزوں کے حصوں کی غرض سے لوٹ مار شروع کروی تھی دوسری طرف شاہ جہاں کے سالار احمد خان نے قلعہ میں بند احمد نگر کے حکمران کا محاصرہ ضروری نہ سمجھا بلکہ اس کی جگہ مقرب خان کے لشکریوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا

مقرب خان اس وقت بالا گھاٹ کے نواح میں اپنے لشکر کے ساتھ قیام کیے ہوئے تھا شاہی لسکر وہاں پہنچا احمد نگر کے لشکری پسپا ہو گئے جب اعظم خان نے ان کا تعاقب شروع کر دیا تو وہ دولت آباد کی طرف بھاگ نکلے وہاں بھی انہیں اشیاء خوردونوش کی کمی کی وجہ سے سکون نصیب نہ ہوا۔ دریں اثناء اعظم خان نے شاہ جی بھونسلے کو احمد نگر کے مغربی شمالی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

امد نگر کے حکمران نے ضروریات زندگی کی نایابی اور خود کو دسمنوں میں گرا ہوا پا کر خان جہاں کی مدد کے لیے ہاتھ روک لیا ادھر خان جہاں اور دریا خان کو ان کے ساتھیوں کے ساتھ گھیر لیا گیا وہ مالوہ کے راستے پنجاب میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے کیونکہ یہاں سے انہیں سرحد کے افغانوں کی حمایت حاصل ہونے کی امید تھی۔

شاہ جہاں اس وقت برہان پور میں تھا اس نے ان کا تعاقب کرنے کے لیے فوری قدم اٹھایا باغیوں کو قدم قدم پر شاہی لشکر سے مقابلہ کرنا پڑا انہوں نے ایک مرتبہ پھر بندھیل کھنڈ میں پناہ لینے کے لیے مدد لینے کی درخواست کی لیکن بکر ماجیت سنگھ کو اپنے باپ بھجھر سنگھ کا انجام بخوبی یاد تھا اس نے باغیوں پر حملہ کر کے دریا خان اور اس کے بیٹے کو ہلاک کر دیا جنوری سولہ سو اکتیس میں خان جہاں ایک بار پھر بچ نکلا اور سیہونہ میں ایک شدید جھڑپ کے دوران مارا گیا۔

اس کے بعد اعظم خان نے احمد نگر کے لشکر کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا اس نے دروڑ کے قلعے پر بغیر کسی مزاحم تکے قبضہ کر لیا اس قلعہ میں بے پناہ دولت اور اسلحہ موجود تھا بعد ازاں اس قلعہ سے ملحق بازار اور شہر کو بھی لوٹ لیا گیا۔

اس کے علاوہ بیجا پور اور احمد نگر کی مملکتوں کے درمیان مخاصمت چل رہی تھی شاہ جہاں نے ان دونوں میں مصالحت کی کوشش کی لیکن ایک علاقے شعلہ پور کے معاملے پر جھگڑا شدت اختیار کر گیا تھا شعلہ پور کو ملک امبر نے بھیجا پور سے چھین لیا تھا ادھر ایک شخص مصطفی خان جس کے خسر کو ملک عنبر نے ہلاک کر دیا تھا مغلوں کا حامی تھا اس کے برعکس اس کا سپہ سالار اوندولا خان مغلوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا غرض کہ مغلوں کو بیجا پور اور احمد نگر کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔

اس کے علاوہ سن سولہ سو تیس میں دکن گجرات اور خاندیش میں زبردست قحط پڑ گیا اس قحط کے دوران ہزاروں افراد موت کے منہ میں چلے گئے بھوک کا عالم یہ تھا کہ والدین نے اپنے بچوں کو لقمہ بنا لیا اولاد کی محبت پر ان کی بھوک غالب آ گئی۔

ہر جگہ مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اشیاء خوردونوش کے تاجران حالات سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے آٹے میں انسانوں کی ہڈیاں پیس کر ملا دیں اور کتوں کا گوشت بیچنا شروع کر دیا قحط کے دوران مختلف وبائیں پھوٹ پڑیں جنہوں نے ہزاروں مزید لوگوں کو موت کے منہ میں لا پھینکا' گاؤں ویران ہو گئے' گلی کوچوں میں انسانی لاشوں کے انبار لگ گئے بڑی شاہراہوں پر اتنا تعفن پیدا ہو گیا کہ وہاں سے گزرنا بھی دوبھر ہو گیا بہت سے لوگ مختلف مقامات کو ہجرت کر گئے تھے۔

بھوک تباہی اور بربادی کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کر کے اپنی خوراک بنا لیا والدین نے اولاد کو کھا لیا مرنے والوں کی وجہ سے سڑکیں بند ہو گئیں جس شخص میں ذرا سی سکت تھی ایک شہر سے دوسرے شہر مارا مارا پھرتا رہا تا کہ پیٹ کی آگ بجھا سکے وہ علاقے جو اپنی زرخیزی اور شادابی کے لیے مشہور تھے بنجر اور ویران ہو گئے تھے۔

شاہ جہاں کو ان حالات کا بڑا دکھ اور غم تھا

اس نے فوری طور پر برہان پور احمد آباد اور سورت کے کچھ صوبوں میں لنگر جاری کر دیے عوا میں روزانہ اشیاء خوردونوش تقسیم کی جاتیں صرف برہان پور میں پیر کے دن قحط زادہ لوگوں میں پانچ ہزار روپے تقسیم کیے جاتے تھے اس طرح شاہ جہاں نے صرف بیس ہفتوں میں ایک لاکھ روپے تقسیم کیا احمد آباد میں حالات زیادہ مخدوش تھے چنانچہ شاہ جہاں نے صرف وہاں کے لیے پچاس ہزار روپے کی رقم کی امداد منظور کی اس خیرات کے علاوہ ستر ہزار روپے کا مالیہ معاف کیا گیا یہ رقم حکومت کے مجموعی مالیہ کا ایک تہائی تھا اس طرح منصب داروں نے بھی اپنی اپنی جاگیروں میں مالیہ معاف کر دیا۔

اس قحط کی وجہ سے شاہراہیں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں وہاں سے گزرنا محال تھا لاشوں کو پاؤں سے پکڑنے کے بعد گھسیٹ کر اندرون شہر سے باہر پہنچا دیا جاتا اس طرح تھوڑا بہت راستہ نکل آتا غذائی اجناس کی قلت کا عالم یہ تھا کہ انگریز بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے قیمتیں سات گناہ ہوگئیں غریب اور متوسط طبقہ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوگیا وبائیں پھوٹ پڑیں تو مزید سینکڑوں افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔

لاتعداد لوگ گلیوں میں دم توڑتے اور سسکتے نظر آتے تھے گیارہ انگریز اور تین ولندیزی بھی اس قحط کی زد میں آئے انگریزوں کے ایک کارخانے کا سربراہ وبا کی لپیٹ میں آ کر مر گیا گلیوں میں سسکتے لوگ باہر آنے والے سے کہتے۔

''ہمیں کھانے کو دو یا مار ڈالو۔'' سیلاب نے عوام کے مصائب میں اضافہ کر دیا اور تمام زمین بے کار ہوگئی تھی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں نے امدادی کاموں میں پھر رقم خرچ کرنے میں بخل سے کام لیا غالباً اس نے بقول مورخین دو کروڑ کے مجموعی مالیہ سے ستر لاکھ کا مالیا معاف کیا جو مجموعی مالیہ کا تقریباً ایک تہائی بنتا ہے اس اعتبار سے فی روپیہ پانچ آنے اور چار پایوں کی معافی دی گئی اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اس علاقے کے جاگیرداروں نے بھی مالیہ میں کمی کی لہٰذا شاہ جہاں سے جہاں بھی ممکن ہوا اس نے عوام کے حقوق کا خیال کیا قحط زدہ لوگوں کی ہر ممکن امداد کی۔

دوسری طرف احمد نگر کی حکومت بھی بیجاپور کی حکومت کی طرح ایک برائے نام حکمراں کے قبضہ میں تھی امراء میں اختلاف تھے مقرب خان جو ایک ایرانی سالار تھا اس کا پلہ بھاری تھا جس نے دوسرے ایرانی سالار ملک عنبر کے لڑکے فتح خان کو زندان میں بھیج دیا تھا مقرب خان خود شاہی لشکر کی مزاحمت کر رہا تھا جبکہ احمد نگر کا حاکم فتح خان کو رہا کرنے کے بعد اس خیال کے تحت مغلوں سے دوستی چاہتا تھا کہ اب ان سے لڑنا بالکل بے کار تھا۔

ایرانی نژاد مقرب خان کا موروثی بادشاہت سے کوئی تعلق نہ تھا جب اس نے احمد نگر کے حکمران کا رویہ دیکھا تو پانسہ بدلا اور اپنی خدمات شاہ جہاں کے سپرد کر دیں شاہ جہاں نے اس کی پیش کش قبول کرتے ہوئے اسے ادھیل کھنڈ تبدیل کر دیا ادھر فتح خان نے جسے احمد نگر کے حکمران نے رہا کیا تھا اس کو گرفتار کر لیا اور آصف خان کو اس غرض سے اطلاع دی کہ اس کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

آصف خان جو شاہ جہاں کا سسر تھا ایسے معاملات میں بے حد سخت انسان تھا اس نے فوری طور پر فتح خان کو پیام بھیجا اگر وہ شاہ جہاں کے ساتھ وفاداری کا ثبوت میا کرنا چاہتا ہے تو احمد نگر کے حاکم کو قتل کر دے چنانچہ فتح خان نے اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا اس کی جگہ وہاں کے لوگوں نے دس سالہ حسین کو اس کی جگہ تخت نشین کر دیا۔

غدار عناصر میں بوصفات بالعموم پائی جاتی ہیں وہ فتح خان میں موجود تھیں اس نے احمد نگر کا خزانہ اور ہاتھی وغیرہ شاہ جہاں کو بھیجنے میں لیت و

لعل سے کام لینا شروع کر دیا چنانچہ شاہ جہاں نے ایرانی نژاد سالار مقرب خان کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا مقرب خان کو احمد نگر کے دارالحکومت دولت پر قبضہ کرنے کا حکم دیا فتح خان اس نئے خطرے سے بہت گھبرایا اس نے فوری طور پر اطاعت قبول کر لی۔

اس کے علاوہ بیجا پور کا سالار اوندولا خان اب تک مغل شکریوں کی مزاحمت کر رہا تھا اس نے شاہ جہاں کی خدمت میں تحائف لے جانے والے ایک سفیر کو بھی روک لیا تھا جب اسے یہ اطلاع ملی کہ احمد نگر کی طرف سے مزاحمت ختم ہو گئی ہے تو اس نے بھی امن قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اوندولا خان نے نا صرف شاہ جہاں کی اطاعت قبول کی بلکہ تحائف لے کر جانے والے سفیر کو بھی گزر جانے کی اجازت دے دی۔ مورخین لکھتے ہیں شاہ جہان کے ایک سالار اعظم خان نے اوندولا خان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اس نے اوندولا خان پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر پسپا ہوا دسمبر سن سولہ سو اکتیس میں شاہ جہاں نے آصف خان کو بھیجا بیجا پور پر حملہ کرنے کا حکم دیا آصف خان نے ایک قریبی راستہ اختیار کرتے ہوئے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا اس کو بیجا پور سے ایک بار پھر اطاعت کی پیش کش وصول ہوئی جسے ٹھکرا دیا گیا مغلوں کا لشکر پیش قدمی کر رہا تھا آخر خورس پور اور شاہ پور میں پڑاؤ ڈالا گیا یہ مقامات بیجا پور سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھے ایک بار پھر مذاکرات کا آغاز ہوا وہاں آصف خان کو لشکر کے لیے اسباب خورد و نوش کے حصول میں سخت دشواری پیش آئی ادھر بیجا پور کے لشکر نے رہی سہی اجناس بھی تباہ کر دیں تا کہ مغل لشکر کے کام نہ آ سکیں۔

مغل لشکر کے پاس کھانے پینے کا سامان بالکل ختم ہو چکا تھا چنانچہ آصف خان کو میرج کی طرف پسپا ہونا پڑا تا کہ خوراک حاصل کر سے بیجا پور کے لشکر اس کے تعاقب میں رہے لشکر اصف خان کو دوبارہ مغل علاقے میں واپس آنا پڑا اس دوران شاہ جہاں کو اس کی بیوی ممتاز محل کی موت اور قحط سالی نے بہت زیادہ غم زدہ کر دیا اس نے بیجا پور کی فتح کا خیال ترک کر دیا لیکن مہابت خان نے اسے یقین دلایا کہ وب بیجا پور کی فتح کوئی مشکل کام نہیں لہٰذا شاہ جہاں نے آصف خان کو واپس بلا لیا اور جنوبی ہندوستان کا عامل مہابت خان کو مقرر کر دیا تھا۔

یہ وہ حالات تھے جو شاہ جہاں کو پرتگالیوں کی بغاوت اور سرکشی سے پہلے پیش آ چکے تھے اور انہی حالات کی وجہ سے شاہ جہاں بغاوتوں اور ہر قسم کی سرکشی سے نبٹنے کے لیے خوب پختہ کار ہو گیا تھا۔

بنگال کے حاکم قاسم خان کو جب شاہ جہاں کی طرف سے اجازت مل گئی وہ اپنی مرضی صوابدید کے مطابق بغاوت اور سرکشی کرنے والے پرتگالیوں کے خلاف حرکت میں آ سکتا ہے تو اس نے اپنے بھتیجے اور اپنے سالار بہادر خان کے ساتھ مل کر اس کام کو آخری شکل دینا شروع کر دی تھی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اسی دوران ایک باغی اور غدار قسم کا پرتگال نام جس کا افانسو تھا اور جو بھی ہگلی شہر کے علاقوں پر اپنا دعوی جتا چکا تھا وہ ایک روز قاسم کان کی خدمت میں حاضر ہوا قاسم خان سے اس نے اپنا تعارف کروایا تو قاسم خان یہ سمجھا کہ شاید وہ پرتگالیوں کے خلاف مغل لشکر کی امداد پر آمادہ ہے لیکن ایسا نہیں ہوا جب اس کے ساتھ قاسم خان کی طویل گفتگو ہوئی تو قاسم خان نے یہ جانا کہ افانسو یہ چاہتا ہے کہ پرتگالیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں اپنا زیر کر دیا جائے اور پھر ان علاقوں پر افانسو کو حاکم مقرر کر دیا جائے اور افانسو مغلوں کا فرمانبردار بن کر رہے گا۔ مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر الفانسو نے قاسم خان کو یہ بھی ترغیب دی کہ اگر پرتگالیوں پر حملہ آور ہوا جائے تو اس حملے کے نتیجے میں قاسم خان کے ہاتھ وہ دولت بھی آ سکتی ہے جو برسوں سے پرتگالی

بحری تجارت کے ذریعے حاصل کر رہے ہیں۔

قاسم خان بھی بچہ نہیں تھا پختہ کار تھا الفانسو نے جو پیش کش اسے کی تھی اس کے جواب میں وہ الفانسو کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''الفانسو تمہاری یہ پیش کش یقیناً پرکشش ہے اور اس پر عمل کیا جا سکتا ہے لیکن تمہیں خبر ہو گی کہ بنگال میں جس قدر مغلوں کا لشکر ہے اس کا سالار ان دنوں مرکز نے بہادر خانکو بنا رکھا ہے وہ ابھی باہر گیا ہوا ہے واپس آئے گا تو میں اس سے مشورہ کروں گا اس کے بعد تمہیں کوئی جواب دوں گا۔''

قاسم خان کے ان الفاظ میں تیز نگاہوں سے قاسم خان کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

''میں نے آپ کی سالار بہادر خان کو دیکھ رکھا ہے اسے پہچانتا بھی ہوں وہ بے چارہ کیا فیصلہ کرے گا مانتا ہوں وہ ایک کڑیل جوان ہے قد کاٹھ کا بھی خوب ہے لیکن عمر کے لحاظ سے تو وہ ابھی نابالغ ہے فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے وہ اگر کوئی فیصلہ کرے گا تو یقیناً جذباتی ہو گا اور جو فیصلے جذبات میں کیے جاتے ہیں عموماً ناکامی اور نامرادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

اس موقع پر قاسم خان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور کہنے لگا۔

''الفانسو تمہارا کہنا درست ہے عمر کے لحاظ سے بہادر خان یقیناً نابالغ ہے لیکن ایک سالار کی حیثیت سے اس کی کارگزاری بڑی پختہ کار ہوئی ہے الفانسو یاد رکھنا ہے جب وہ ضرب لگاتا ہے تو دشمن کو اٹھنے نہیں دیتا الفانسو تم بنگال میں رہتے ہوئے تم نے کبھی شیر کو جنگلی بھینسے کا شکار کرتے دیکھا ہے شیر جنگلی بھینسے کا جب پکڑ لیتا ہے تو اس وقت نہیں چھوڑتا جب تک اس کا دم نہیں نکل جاتا ہے یاد رکھنا بہادر خان بھی ایسا ہے اول تو وہ کسی کو چھیڑتا نہیں اور جب کوئی بغاوت اور سرکشی کرتا ہے تو یاد رکھنا اس کے پیچھے پڑتا ہے کہ جب تک اسے اپنا زیر نہیں کر لیتا اس کا پیچھا اس کا تعاقب نہیں چھوڑتا سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے ہوئے اس پر پے در پے ضربیں لگاتا رہے گا اور آخر کار اسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے گا۔''

قاسم خان جب خاموش ہوا تب الفانسو پھر بولا اور کہنے لگا۔

''قاسم خان میں سمجھتا ہوں آپ کچھ غلط اندازہ بھی لگا رہے ہیں آپ جانتے ہیں کہ پرتگالیوں کی عسکری تربیت بڑی سخت اور کٹھن ہے وہ جنگ کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں جبکہ تم اس بات کا تسلیم کرو گے کہ تمہارا بھیجا بہادر خان کوئی جنگ کا وسیع تجربہ نہیں رکھتا پرو وہ کیسے اور کیونکر پرتگالیوں سے نبٹ لے گا۔''

اس موقع پر قاسم کان کی چھاتی تن گئی پھر کہنے لگا۔

''الفانسو بہادر خان ایک پیدائشی سالار ہے اور مرب وضرب کے مکتب کا سند یافتہ ہے ذرا ان پرتگالیوں کے خلاف کارروائی کی ابتدا ہو جانے دو پھر دیکھنا سمندر خشکی دونوں میں بہادر خان کیسا طوفان کیسا انقلاب برپا کرتا ہے بہرحال فی الوقت تم جاؤ جب میں بہادر خان کے ساتھ کسی آخری نتیجے پر پہنچوں گا تو تمہیں آگاہ کر دیا جائے گا۔''

اس پر الفانسو اپنی جگہ پر اٹھا اور قاسم خان کے پاس سے نکل گیا تھا۔

کوئی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جس کمرے میں قاسم خان بیٹھا ہوا تھا اس کمرے میں ایک خوب دراز قد گورے رنگ کا ایک انتہائی خوبصورت نوجوان داخل ہوا وہ اس وقت گھوڑ سواری کے لباس میں تھا قریب آ کر اس نے قاسم خان کو بڑی انکساری میں سلام کیا پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا قاسم خان کچھ دیر تک گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا قاسم خان کے اس طرح دیکھنے پر وہ نوجوان جس کا نام بہادر خان تھا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ آپ مجھے عجیب سے انداز میں گھورتے چلے جارہے ہیں کیا میرے خلاف کسی نے آپ سے شکایت کردی ہے کیا مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہوگیا ہے جو آپ کی ناپسندگی کا باعث بن گیا ہے اگر ایسی بات ہے تو کہیں میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔''

بڑے پیار سے انداز میں قاسم خان نے ایک چیت اس کے گال پر لگائی کہنے لگا۔

''ایسی کوئی بات نہیں تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے الفانسو آیا تھا۔'' اس کے بعد قاسم خان نے الفانسو کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی تفصیل کے ساتھ بہادر خان سے کہہ دی تھی۔

قاسم خان جب خاموش ہوا تب ہلکی سی مسکراہٹ اس موقع پر بہادر خان کے چہرے پر نمودار ہوئی پھر وہ قاسم خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''یہ الفانسو قابل اعتبار نہیں ایک بات یاد رکھنا جو شخص پرتگالی ہو کر اپنی قوم کے خلاف غداری کرسکا ہے کل کو وہ اس سے زیادہ کہیں شدت کے ساتھ ہمارے خلاف بغاوت اور سرکشی کا اظہار کرے گا اور ایسا وہ اپنی پوری تیاری کرنے کے بعد کرے گا اور ہمارے لیے ایسے مصائب کھڑے کرے گا کہ ان سے نبٹنے کے لیے ہمیں ایک عرصہ درکار ہوگا لہٰذا الفانسو کی کسی بھی بات پر اعتبار کرنا خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔''

بہادر خان جب خاموش ہوا تب قاسم پھر بولا۔

''ٹھیک ہے جو کچھ تم نے کہا ہے درست ہے لیکن یہ بھی تو کہو کہ ہمیں پرتگالیوں سے کیسے نبٹنا ہوگا یاد رکھنا ان کی بغاوتوں ان کی تخریب کاریوں اور ان کے غلط کاموں میں بڑا اضافہ ہو چکا ہے جس کو چاہتے ہیں اٹھا لیتے ہیں۔ غلام بنا کر بیچ دیتے ہیں اور اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو مقامی لوگ ہمارے خلاف ہو جائیں گے اور شاہ جہاں کے پاس ہماری شکایتیں پہنچنا شروع ہو جائیں گی پر شاہ جہاں ہم سے باز پرس کرے گا یہ بھی ممکن ہے کہ اس منصب سے ہمیں ہٹا دے۔''

بہادر خان مسکرایا کہنے لگا۔

''تھوڑی دیر تک شام ہونے والی ہے' میں نیالوں پر مغرب کی نماز ادا کروں گا اس کے بعد کھانے کے بعد دونوں بیٹھیں گے اور اس وقت تک میں سوچ لوں گا کہ ان پرتگالیوں سے ہمیں کیسے نبٹنا ہے۔'' قاسم خان نے اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا بہادر خان اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆

قاسم خان اور بہادر خان دونوں نے عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھایا کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دونوں آمنے سامنے دو نشستوں پر بیٹھ گئے اس موقع پر قاسم خان نے اندازہ لگایا کہ بہادر خان کچھ سوچ رہا تھا اور اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا کچھ دیر خاموشی رہی یہاں تک کہ بہادر خان بولا اور قاسم خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بات یہ ہے میں اس معاملے کی پوری تحقیق کرنے کے بعد آپ کا ساتھ گفتگو کر رہا ہوں۔ میں نہانے کے بعد باہر چلا گیا تھا اور پوری تحقیق کر کے آیا ہوں اس کے بعد آ کر میں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ بات یہ ہے کہ الفانسو نے آپ کے ساتھ ایک طرح سے دھوکہ کیا ہے وہ پرتگالیوں کا ہی آدمی ہے اس نے آپ کے پاس آ کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ پرتگالیوں سے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں پرتگالی ان علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کر رہے ہیں روزمرہ کے کاموں میں دخل اندازی کرنے کے ساتھ ساتھ جسے چاہتے ہیں اغوا کر کے اپنے کاموں میں لگا لیتے ہیں یا غلام بنا کر فروخت کر دیتے ہیں اس بنا پر ان پرتگالوں سے نبٹنا انتہائی ضروری ہو چکا ہے لیکن ان سے نبٹنا آسان

بس نہیں ہے۔"

"الفانسو نے واپس جا کر پرتگالی سالاروں کو بتا دیا ہے کہ قاسم خان ان سے تنگ ہے اور کسی بھی وقت ان کے خلاف حرکت میں آ سکتا ہے لہٰذا پرتگالی اپنے آپ کو سنبھال چکے ہیں اور بد سے بدترین حالات کا بھی وہ مقابلہ کرنے کے لیے وہ تیار ہیں آپ جانتے ہیں ان کے پاس ان گنت مسلح جوان ہیں اور پھر وہ گزشتہ سو سال سے ان علاقوں میں جمے ہوئے ہیں وہ اپنی جڑیں مضبوط کر چکے ہیں ان کے پاس ضروریات زندگی کے وافر ذخائر ہیں کسی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے تربیت یافتہ لشکری بھی بے شمار ہیں اور پھر اب جبکہ الفانسو نے ان کے ذہن میں یہ بھی بات ڈال دی ہے کہ بنگال کا حاکم قاسم خان ان کے خلاف حرکت میں آنا چاہتا ہے' میں آپ پر یہ بھی انکشاف کروں کہ پرتگالیوں کو یہ خبر ہو چکی ہے کہ آپ نے اپنا ایک قاصد آگرہ بھجوایا تھا تاکہ پرتگالیوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے شاہ جہاں سے اجازت لی جائے اور پرتگالی یہ بھی جان چکے ہیں کہ شاہ جہاں نے پرتگالیوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے قاسم خان کو اجازت دے دی ہے اس بنا قاسم خان کسی بھی وقت پرتگالیوں کے خلاف حرکت میں آ سکتا ہے لہٰذا پرتگالی مقابلہ کرنے کے لیے سنبھل اور مستعد ہو چکے ہیں۔"

بہادر خان جب خاموش ہوا تو کسی قدر فکر مندی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے قاسم خان کہنے لگا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر پرتگالیوں پر غالب ... آیا جائے گا شہنشاہ ہمیں پرتگالیوں پر حملہ آور ہونے کی اجازت دے چکے ہیں اور اگر ہم نے پرتگالیوں کی ان ساری منفی کارروائیوں کی وجہ سے سرکوبی نہ کی تو ہمیں یہ بات بھی اپنے ذہن میں رکھنی ہوگی کہ شہنشاہ شاہ جہاں ہم سے برہمی کا اظہار کرے گا۔"

قاسم خان جب خاموش ہوا تب گلہ صاف کرتے ہوئے بہادر خان کہنے لگا۔

"برہمی تو اس وقت ہوگی جب ہم ناکام ہوں گے لیکن ان پرتگالیوں سے کسی طریقے سے نبٹنا ہوگا پہلی بات یہ کہ وہ ہم سے زیادہ مسلح ہیں دوسری بات یہ کہ ان کا جو لشکر ہے وہ بھی تعداد میں ہم سے زیادہ ہے تیسرے جن علاقوں پر ہم نے حملہ کرنا ہے وہاں انہوں نے مضبوط قلعہ بندی کر رکھی ہے لہٰذا ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا اور قدم اٹھانے کے لیے میں نے ایک بہانہ بھی تلاش کر لیا ہے۔"

"کیسا بہانہ۔" قاسم خان نے غور سے بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔ اس پر بہادر خان کہنے لگا۔

"ہم اپنے بحری بیڑے کو اکا دکا کشتیاں اور جہاز کر کے پرتگالیوں کی طرف لے کر جائیں گے لشکری بھی زمینی راستے سے مختلف گزرگاہوں میں آگے بڑھیں گے اور بہانہ یہ کیا جائے گا کہ مقامی جاگیرداروں نے جو مختلف زمینوں پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے ان سے ناجائز اراضی واپس لینے کے لیے یہ کارروائی کی جا رہی ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد بہادر خان رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"جب ہماری بحری طاقت اور زمینی لشکر بھی وہاں پہنچ جائیں گے تو اک دم ہم اپنا ارادہ تبدیل کریں گے پرتگالیوں پر حملہ آور ہو جائیں گے میں جانتا ہوں ان کی یہ تگڑی طاقت ہے لیکن بہر حال ان سے ہم نے نبٹنا ہے میں آج ہی اپنے کچھ چھوٹے سالاروں کو تیار کروں گا ساتھ ہی میں نے گھوڑسواروں کی کچھ کمک بھی طلب کر لی ہے اور امید ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہیں گے۔"

قاسم خان نے بہادر خان کی اس تجویز سے

اتفاق کیا تھا چنانچہ مورخین لکھتے ہیں کہ طے شدہ تجویز کے مطابق بعض جاگیرداروں سے ناجائز اراضی لینے کے بہانے لشکر اور کشتیاں جمع کرنی شروع کردی گئیں اور جب مغل سکر کی ایک خاصی بڑی تعداد جون کے مہینے میں ہگلی پہنچی اور ساتھ ہی مغلوں کا بحری بیڑہ بھی قریب ہوگیا تو اس کے دوطرح کے ردعمل سامنے آئے۔

مغل اپنے سالار اعلیٰ بہادر خان اور چند چھوٹے سالاروں کی کمانداری میں پرتگالیوں پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہوگئے اور مورخین لکھتے ہیں کہ دوسرا ردعمل یہ ہوا کہ پرتگالیوں نے اپنی قلعہ بندیاں مضبوط کرنی شروع کردی تھیں۔

اسی دوران بقول مورخین پرتگالیوں نے ایک سفیر کو مصالحت کی غرض سے بہادر خان کے پاس روانہ کیا اور مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ بہادر خان نے ان پرتگالیوں سے گفتگو کی اور ان پر الزام عائد کیے کیونکہ ان کے پاس ثبوت بھی تھے اور اس موقع پر بہادر خان کیونکہ پرتگالیوں پر ضرب لگانے کا آخری فیصلہ کرچکا ہے تھا لہٰذا پرتگالیوں کا جو وفد گفتگو کرنے کے لیے بہادر خان کے پاس آیا اس پر بہادر خان نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ پرتگالیوں کی آبادیوں کی تلاشی لے گا اور مسلمان غلاموں کو جو پرتگالیوں نے اپنے ہاں روک رکھے ہیں انہیں نجات دلائے گا اس کے علاوہ بہادر خان نے مورخین کے مطابق پرتگالیوں پر یہ بھی واضح کردیا کہ مسلمانوں کو اغواء کرتے یا خریدنے والوں کو سزا بھی دی جائے گی۔

پرتگالیوں کو اپنی طاقت اور قوت پر گھمنڈ تھا لہٰذا انہوں نے تلاشی دینے سے انکار کردیا یہ صورت حال دیکھتے ہوئے کیونہ معاملات گھمبیر ہوتے چلے گئے تھے لہٰذا پرتگالیوں کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لیے بہادر خان نے اپنے کچھ چھوٹے سالاروں کی کمانداری میں پرتگالیوں پر ایک حملہ کرنے کا حکم دیا اور یہ حملہ کیا گیا اور مورخین کے مطابق مغلوں کا یہ حملہ ناکام ہوا۔

دراصل بہادر خان معاملے کو چند دن آگے لے جانا چاہتا تھا اس لیے کہ اس نے جو کمک طلب کررکھی تھی اسے اس کے پہنچنے کا انتظار تھا۔

اسی دوران پرتگالیوں نے امن کے لیے ایک اور سفارت روانہ کی اور ان پرتگالی سفیروں نے مسلمان غلاموں کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا لیکن چالاکی اور عیاری یہ کی کہ انہوں نے تمام غلاموں کو رہا نہ کیا۔

چنانچہ بہادر کان نے ان پرتگالی سفارت کاروں کو اس وقت تک اپنے پاس روکے رکھا جب تک مسلمان غلاموں کو رہا نہیں کردیا جاتا جب اسے اس کے مخبروں نے یہ اطلاع کردی کہ پرتگالیوں نے کچھ غلاموں کو تو رہا کیا ہے لیکن سب کو نہیں کیا یہ صورت حال بہادر خان کے لیے ناقابل برداشت تھی لہٰذا مورخین کے مطابق اس نے پرتگالیوں کے سفیروں کو بطور یرغمال اپنے پاس رکھ لیا اور مطالبہ کیا کہ پرتگالی اپنے باشندوں کو نصف جائیداد اور رقم ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو یرغمالیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

اسی دوران بہادر خان جو چاہتا تھا وہ ہی پورا ہوگیا اس لیے کہ اس نے جو کمک طلب کی تھی وہ اس کے پاس پہنچ گئی لہٰذا اب اس نے بذات خود پرتگالیوں پر ضرب لگانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

چنانچہ پورے لشکر کو لے کر وہ صدیوں کی نیند سے بیدار ہونے والی زمین کی ان بجھی پیاسی تپتے صحراؤں کی وسعتوں میں رقص کرتے وہم و چھلاووں کی طرح آگے بڑھا پھر وہ وقت کی مناسب کھینچ لینے والی پہلی رتوں کے قہر لفظوں میں زیر جرنوں میں تیر خواہشوں میں وحشت کے نشتر بھر دینے والے فطرت کے سنگلاخ لمحوں کی یلغار اور دیکھتے عزائم کی سبک رفتاری کی طرح حملہ آور ہوگیا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے پرتگالی بھی

مینے سے بیزار پورش افلاس زنگ خوردہ کرتی یخ بستہ اداسیوں سرخ شعلوں کے رقص بینائی سے محروم آتی کالی آندھیوں کی تباہ کاریوں قہر گمنامی سے اٹھتے آسیب اور شرار برتی کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

اس طرح بنگال کی سرزمینوں میں پرتگالیوں اور بہادر خان کے لشکر کے درمیان جنگ کے باعث ازم گاہ کے اندر ہوئی روشنی میں سیراب رنگ جسموں کا آشوب اٹھ کھڑا ہوا تھا وقت کا افلاک پر خون بھری تقدیریں ناچ اٹھی تھیں زہریلے لمحوں کا ایسا رقص شروع ہوا تھا کہ میدان جنگ کے اندر نہ سمتوں کا یقین رہا نہ راستوں کا۔

آخر اس جنگ کے نتیجے میں مورخین کے مطابق پرتگالیوں کو بہادر خان کے ہاتھوں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا مورخین لکھتے ہیں کہ پرتگالیوں کو بدترین شکست دینے کے بعد انہوں نے جوادھر ادھر قلعے اور مضبوط گڑھیاں بنا رکھی تھیں پانچ ہفتے تک ان کا محاصرہ جاری رہا لیکن بہادر خان کے حملوں کے سامنے پرتگالی کمزور حیثیت کے پیش نظر دولاکھ دینے پر مجبور ہوگئے بہادر خان نے ان سے یہ رقم لے کر اپنے لشکریوں میں تقسیم کردی لیکن پرتگالیوں کا اس نے پیچھا نہیں چھوڑا آخر اس نے جنگ کے دوران پرتگالی جہازوں کے جلانے کا بھی انتظام کیا پرتگالیوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کے سالار بہادر خان نے چاروں طرف ان کے لیے موت کا رقص شروع کردیا ہے تو انہوں نے مورخین کے مطابق کشتیوں میں سوار ہوکر اپنے شہر خالی کرنے کا ارادہ کرلیا۔

لیکن بہادر خان انہیں اس قدر آسانی سے بھاگ جانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس وقت وہ کشتیوں میں سوار ہورہے تھے بہادر خان نے ان پر حملہ کردیا یہ بھی ہولناک ٹکراؤ تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس ٹکراؤ کے درمیان تین ہزار پرتگال جان بچا کر بھاگ سکے چار سو پرتگالیوں کو قیدی بنا کر رکھ لیا گیا اور مجموعی طور پر اس جنگ میں مورخین کے مطابق تقریباً دس ہزار پرتگالی مارے گئے جبکہ جنگ کے دوران بہادر خان کے ایک ہزار لشکر کام آئے۔

اس جنگ کے دو ہفتے کے بعد آگرہ سے تیز رفتار قاصد قاسم خان کے پاس پہنچے اور قاسم خان کو انہوں نے پیغام دیا کہ شہنشاہ شاہ جہاں کے حکم ہے کہ جو پرتگالی قیدی بنائے گئے ہیں انہیں بہادر خان کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ کیا جائے بہادر خان اپنے ساتھ کچھ دستے بھی لے کر آئے یہ دستے وہ ہوں جن کا تعلق آگرہ یا آس پاس کے علاقوں سے ہو اور قاسم کو یہ بھی پیغام دے دیا گیا کہ بہادر خان اب واپس بنگال نہیں آئے گا اس لیے کہ اس کی خدمات کو مرکز میں منتقل کردیا گیا ہے چنانچہ یہ پیغام ملنے کے بعد بہادر خان چار سو پرتگالیوں کو جن میں مرد اور عورتیں سب شامل تھے بنگال سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا تھا۔

بہادر خان اپنے مختصر سے لشکر اور پرتگالیوں کے ساتھ اس شاہراہ پر سفر کررہا تھا جو کلکتہ سے بنارس وہاں سے الہ اباد پر کانپور آگرہ دہلی لدھیانہ ہوتی ہوئی لاہور کی طرف چلی گئی تھی جس وقت پہلا پڑاؤ کلکتہ اور جمشید پور کے درمیانی علاقے میں کیا گیا اور خیمے نصب کردیے گئے تب سب کے کھانے کا اہتمام کیا گیا بہادر خان کھانا کھانے کے بعد اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے خیمے کے دروازے پر دو خواتین نمودار ہوئیں ان میں سے ایک ڈھلی ہوئی عمر کی تھی دوسری لڑکی تھی جس کا بچپن رخصت ہورہا اور جوانی یلغار کرتی چلی آرہی تھی انتہا درجہ کی خوبصورت دراز قد اور پرکشش تھی دروازے پر آنے کے بعد ڈھلی ہوئی عمر کی عورت بولی اور بہادر خان کو مخاطب کرکے کہنے لگی۔

''امیر کیا ہم دونوں اندر آسکتی ہیں۔'' اس طرح پکارنے پر بہادر خان اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اور

انہیں مخاطب کرتے ہوئے بڑی نرمی میں کہنے لگا۔

''آپ اندر آ سکتی ہیں۔'' چنانچہ وہ دونوں خواتین خیمے میں داخل ہوئیں ہاتھ کے اشارے سے بہادر خان نے ان دونوں کو بیٹھنے کے لیے کہا اس پر وہ دونوں اپنے لباس کو سمیٹتی ہوئی بیٹھ گئی تھیں یہاں تک کہ ڈھلی ہوئی عمر کی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے بہادر خان نے کہنا شروع کیا۔

''خاتون کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔'' عورت سنبھلی ایک گہری نگاہ اس موقع پر اس نے بہادر خان پر ڈالی پر کہنے لگی۔

''امیر میرا نام فیران ہے یہ میرے ساتھ میری بیٹی ہے نام اس کا مارتھل ہے ہم دونوں ماں بیٹی ہیں اور اس کے علاوہ نہ ہمارا کوئی رشتہ دار ہے اور نہ ہی کوئی ایسا شخص جو پردیس میں ہماری کفالت کر سکے ہجلی میں بھی ہم دونوں ماں بیٹی اکیلی تھیں میرا شوہر ایک تاجر تھا وہ ایک بحری جہاز ڈوبنے سے ہلاک ہوگیا لیکن اللہ کا شکر کہ وہ ہمارے لیے اس قدر اثاثہ چھوڑ گیا کہ ہمیں کسی قسم کی دشواری کا احساس نہ ہوا۔

اب جبکہ ہم آگرہ جا رہے ہیں یا یوں کیے کہ ہمیں آگرہ لے جایا جا رہا ہے تو ہم وہاں کہاں رہیں گی کیا ہم دونوں ماں بیٹی وہاں محفوظ ہی ہوں گی کہ نہیں میری بیٹی ابھی چھوٹی عمر کی ہے اونچ نیچ کی اسے ابھی خبر نہیں سیدھی سی ہے پر ہے بہت مخلص میں اور میری بیٹی دونوں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئی ہیں کہ آپ سے یہ پوچھیں کہ کیا آگرہ جا کر ہم دونوں کی جان ہمارا مال اور ہماری عزت اور عصمت محفوظ ہوں گی۔

امیر ہمارے پاس مال بھی کافی ہے جو میرا شہر چھوڑ مرا تھا بس اب مجھے فکر ہے تو صرف اپنی اور اپنی بیٹی کی رہائش اور تحفظ کی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد فیران جب خاموش ہوئی تب بہادر خان نیا پنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہنے لگا۔

''آپ دونوں ماں بیٹی کو کسی بھی قسم کا فکر مند کرنے کی ضرورت نہیں ہے رہی بات آپ کی حفاظت آپ کی عصمت اور آپ کی عزت کی تو میرا نام بہادر خان ہے جو شخص آپ دونوں ماں بیٹی کی طرف نگاہ ڈالے گا آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا اپنی گردن نہیں بچا سکے گا اس کے علاوہ آپ کو کچھ چاہیے تو بولیں۔''

بہادر خان کے ان الفاظ پر نا صرف فیران خوش ہوگئی تھی بلکہ حسین پرکشش اور خوبصورت بیٹی بھی مطمئن دکھائی دے رہی تھی اور اس سے اس کے چہرے پر ایک زبردست تبسم بھی بکھر گیا تھا جس وقت دونوں ماں بیٹی خیمے میں داخل ہوئی تھیں اس وقت ایک بھرپور نگاہ بہادر خان نے ان دونوں ماں بیٹی پر ڈالی تھی اس کے بعد جب تک ان کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی بہادر خان نے ان دونوں کی طرف نہیں دیکھا بلکہ اپنی نگاہوں کو جھکاتے ہوئے اس نے گفتگو کی تھی آخر فیران نے گفتگو کو پھر آگے بڑھایا اور بہادر خان کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''امیر اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے ایک ذاتی سوال کر سکتی ہوں۔''

بہادر خان مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

''ایک چھوڑ آپ کئی سوال کر سکتی ہیں نہ کوئی آپ کو روک سکتا ہے اور نہ ہی منع کر سکتا ہے۔''

فیران مسکرا دی کہنے لگی۔

''کیا بنگال کا حاکم قاسم خان آپ کا چچا ہے۔''

بہادر خان نے نفی میں گردن ہلائی کہنے لگا۔

''نہیں۔''

'میں اسے چچا ہی کہہ کر مخاطب کرتا ہوں لیکن وہ ہمارا رشتہ دار اور عزیز نہیں ہے۔''

فیران پھر بول اٹھی۔

''کیا آپ کی مستقل رہائش آگرہ میں ہے۔'' بہادر خان نے اثبات میں گردن ہلائی

ساتھ ہی کہنے لگا۔ ''بالکل آگرہ میں ہے۔''

فیران مسکرائی اور کہنے لگی۔ ''میں ایک اور تھوڑا سخت ذاتی سوال کرنے لگی ہوں برا نہ مانیے گا کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپکے گھر کے کتنے افراد ہیں۔''

بہادر خان مسکرا دیا کہنے لگا۔

''صرف تین' ایک میں ایک میرا دادا اور تیسری میری دادی۔ میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں' میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں میرے دادا کا نام قطب خان ہے جبکہ میری دادی کا نام قطلغ نگار خانم ہے یہ نام کیونکہ لمبا ہے لہٰذا لوگ اکثر میری دادی کو خانم یا زیادہ سے زیادہ نگار خانم کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔''

یہاں تک کہنے کے بعد بہادر خان رکا کچھ سوچا پھر فیران کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ جس مقصد کے لیے آئی تھیں میں سمجھ چکا ہوں آپ بے فکر رہیں آگرہ میں' میں خود ہوں گا آپ دونوں ماں بیٹی کی رہائش کا عمدہ اہتمام کیا جائے گا ہوسکتا ہے چند دن آپ کو حویلیوں میں رکھا جائے اس کے بعد مناسب رہائش میں منتقل کروا دیا جائے آپ یہ فکر نہ کرنا کہ آگرہ شہر میں آپ دونوں ماں بیٹی اکیلی ہوں گی میں دونوں ماں بیٹی کی حفاظت کا خوب اہتمام کروں گا میں جانتا ہوں آگرہ تم دونوں ماں بیٹی کے لیے ایک انجانا اور نا آشنا شہر ہوگا اور وہاں تم دونوں اجنبیت محسوس کرو گی لیکن میں کچھ لوگوں کو تم دونوں کی حفاظت پر بھی مقرر کروں گا اس بنا پر تم لوگوں کو اپنی عزت اور اپنی جان کی خاطر پریشان اور فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بہادر خان کے یہ الفاظ سن کر دونوں ماں بیٹی مزید خوش ہوگئی تھیں پر دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں یہاں تک کہ فیران بہادر خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''امیر آپ کی بہت مہربانی جو تحفظ جو ضمانت ہم دونوں ماں بیٹی مدد کے لیے آئی تھیں وہ ہمیں مل گیا ہے اب آپ آرام کریں اور ہم بھی جاتی ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی فیران اور مارتھل دونوں ماں بیٹی بہادر خان کے خیمے سے نکل گئی تھیں۔

☆☆

آخر بہادر خان اپنے چھوٹے سے لشکر اور پرتگالیوں کو لے کر آگرہ میں داخل ہوا اس کا شاندار استقبال کیا گیا خیمے نصب کر کے پرتگالیوں کو وہاں رکھا گیا جبکہ ایک قاصد بہادر خان کے پاس آیا اور اسے اطلاع دی کہ اسے شہنشاہ نے طلب کیا ہے۔

چنانچہ بڑی تیزی سے بہادر خان آگرہ کے قصر کی طرف بڑھا جب اسے شاہ جہاں کے سامنے پیش کیا گیا تو شاہ جہاں نے اس کی بڑی عزت افزائی کی اور شاہ جہاں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''گو ابھی تم کم عمر ہو لیکن بنگال میں جو معرکہ تم نے سر کیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں خیال کرتا ہوں کہ مستقبل میں تم اس سے بھی بہتر کارگزاری کا مظاہرہ کرو گے۔

میرے عزیز! سن جس وقت بنگال سے تمہاری شاندار کامیابی اور پرتگالیوں کو شکست دینے کی خبریں آگرہ میں پہنچی تھیں تو سب سے زیادہ تمہاری اس کارگزاری سے متاثر میرا بیٹا اورنگ زیب ہوا تھا لہٰذا اس نے مجھ سے یہ گزارش کی کہ بہادر خان نام کے سالار کو میرے ساتھ کام کرنے کے لیے مقرر کر دیا جائے۔

بہادر خان میں نے اپنے بیٹے اورنگ زیب کی بات کو مان لیا ہے لہٰذا آنے والے دور میں تم میرے بیٹے اورنگ زیب کے ساتھ کام کرو گے لیکن اورنگ زیب کے ساتھ کام کرنے سے پہلے تم دکن کی مہم پر روانہ ہوگے دکن میں اس وقت

میرا برادر نسبتی آصف خان وہاں کے حالات درست کرنے میں مصروف ہے لیکن میں اندازہ کرتا ہوں کہ دکن کے حالات اس کے بس کے نہیں ہیں اسی بنا پر میں تمہیں پہلے دکن بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ تم آصف خان کے ساتھ کام کرو اور جب دکن کے حالات درست ہو جائیں گے تو پر تم میرے بیٹے اورنگ زیب کے ساتھ کام کرو گے۔

میں جانتا ہوں تم لگاتار کئی ماہ تک بنگال میں رہے ہو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور بنگال کا حاکم قاسم خان تمہیں اپنا بیٹا سمجھتا ہے جبکہ تم اسے اپنا چچا ہی خیال کرتے ہو اور آگرہ شہر میں صرف تمہارا دادا اور دادی ہیں لہٰذا میں تمہیں صرف تین دن دیتا ہوں تین دن آگرہ میں اپنے دادا اور دادی کے پاس قیام کرلو اس کے بعد جو لشکر بنگال سے لے کر تم آئے ہو اس لشکر کے ساتھ دن کی طرف روانہ ہو جاؤ اور وہاں آصف خان سے ملو آج ہی ایک تیز رفتار قاصد دکن کی طرف روانہ کر دیا جائے گا اور آصف خان کو اطلاع کر دی جائے گی کہ اس کی مدد کے لیے بہادر خان آرہا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد شاہ جہاں رکا پھر کہنے لگا۔

''تم کیونکہ تھکے جا رہے ہو اس بنا پر میں چاہوں گا کہ تم گھر جاؤ تمہارے دادا اور دادی کو تمہاری آمد کی اطلاع دی جا چکی ہے وہ بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے اور میرے خیال میں جب تمہیں اپنے دادا اور دادی سے ملو گے تو تمہاری تھکاوٹ بھی جاتی رہے گی۔''

شاہ جہاں کے ان الفاظ پر بہادر خان مسکرا دیا پھر شاہ جہاں کے کہنے پر وہ قصر سے نکل کر اپنی حویلی کی طرف ہو لیا تھا۔

اپنے گھوڑے کو درمیانہ روی سے ہانکتا ہوا بہادر خان ایک حویلی کے دروازے پر جا رکا حویلی کا دروازہ اس نے دبایا تو دروازہ کھل گیا لہٰذا جونہی اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے وہ حویلی میں داخل ہوا اندر سے اچانک اس کا دادا قطب خان اور دادی نگار خانم نکلے انہیں دیکھتے ہی بہادر خان نے اپنے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی بھاگتا ہوا آگے بڑھا پہلے دادی سے گلے ملا پر دادا سے ملا دونوں نے اسے خوب چوم کر پیار کیا اس کے بعد بہادر خان کہنے لگا۔

''دادا آپ اور دادی دونوں دیوان خانے میں بیٹھیں میں گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر اس کے دانے چارے کا اہتمام کر کے وہیں آتا ہوں۔''

قطب خان اور نگار خانم نے اس سے اتفاق کیا تھا دونوں میاں بیوی دیوان خانے میں داخل ہوئے جبکہ بہادر خان نے گھوڑے کو اصطبل میں باندھنے کے بعد اس کا دھانہ اور زین اتاری زین کے ساتھ جو خرجین بندھی ہوئی تھی وہ اس نے اپنے کندھے سے لٹکائی گھوڑے کو اصطبل میں پانی پلایا اس کے چارے کا اہتمام کیا اس کے بعد وہ دیوان خانے میں داخل ہوا تھا۔

جب وہ دیوان خانے میں بیٹھا بہت بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے قطب خان کہنے لگا۔

''بیٹے جب آگرہ میں پرتگالیوں کے خلاف تمہاری کامیابی اور فتح مندی کی خبریں پہنچیں تو لوگ ہمیں گروہ در گروہ مبارک باد دینے آنے لگے تھے تمہاری اس کارگزاری پر آگرہ میں بے پناہ خوشی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس لیے کہ لوگوں کا خیال تھا کہ بنگال میں پرتگالیوں کے قدم جم چکے ہیں اب وہ وہاں سے نکلیں گے نہیں بیٹے تم نے اپنی عمدہ کارگزاری سے شاہ جہاں کی نگاہوں میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ آنے والے دور میں میرے بچے میرا رب جو بڑا مہربان ہے تجھے اور نوازے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد قطب خان جب

رفعت نگار خانم اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔

''بیٹے تو دادا کے پاس بیٹھ میں تیرے لیے کھانا لے کر آتی ہوں دیکھ تیری آمد کی اطلاع تو ہمیں پہلے ہی ہو چکی تھی اس بنا پر میں نے کھانا پہلے سے تیار کر رکھا تھا صرف تیری آمد کا انتظار تھا۔''
اس پر بہادر خان اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا دادی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''دادی آپ کھانے کے برتن اکیلی تو نہیں لے کر آئیں گی میں آپ کا پوتا بھی ہوں اور بیٹا بھی آپ کو اکیلے کام کرتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔'' نگار خانم نے ایک خوش کن نگاہ اس موقع پر بہادر خان پر ڈالی پر کہنے لگی۔

''میرے بچے تیرے جیسا ہونہار اور فرمانبردار بیٹا خداوند سب کو عطا کرے۔'' اس کے بعد دونوں دادی پوتا گھر میں گئے کھانے کے برتن لے کر آئے اور پھر دیوان خانے میں تینوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے تھے۔

☆☆

بہادر خان نے تین دن تک اپنے دادا اور دادی کے پاس قیام کیا پر جو لشکر لے کر وہ بنگال سے آیا تھا اسے لے کر وہ دکن کی طرف روانہ ہو گیا تھا دوسری طرف بنگال سے جو چار سو کے لگ بھگ پرتگالی لائے گئے تھے انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا کچھ مغربی مورخ اس رائے کا اظہار کرتے ہوئے حقائق کو مسخ کر دیتے ہیں کہ بنگال سے لائے جانے والے چار سو کے لگ بھگ پرتگالیوں کو زبردستی مسلمان کیا گیا تھا یہ مغربی مورخین بھول جاتے ہیں کہ خود پرتگالیوں نے لاتعداد مسلمانوں کو بنگال میں زبردستی ہم مذہب بنایا اور غلام بنا کر رکھا اور ان پر ظلم توڑے' ماضی میں جو پرتگالیوں کے مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں تاریخ کے صفحات انہیں فراموش نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں شاہ جہاں ایک دردمند اور رحم دل انسان تھا اس نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا تھا ایک راسخ عقیدہ مسلمان کی حیثیت سے وہ گویہ گوارا نہ کر سکتا تھا کہ غیر مسلموں کو زبردستی مسلمان ہونے پر مجبور کر دے اسی بنا پر بیشتر مورخ شاہ جہاں پر یہ الزام تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں بہرحال ان پرتگالیوں نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام قبول کرنے والوں میں حسین اور خوبصورت مارتھل اور اس کی ماں فیران بھی شامل تھی۔

دکن کے حالات بڑے عجیب وغریب تھے اس لیے کہ دکن کی اکثر ریاستیں شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی تھیں اور مورخ لکھتے ہیں کہ دکن کی مسلمان ریاستوں کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا اور کئی سال تک ان ریاستوں کے خلاف نبرد آزما رہا دراصل شاہ جہاں کے دور کے ان شیعہ فرقہ نے کھلم کھلا تبرہ شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے سنی فرقہ میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی تھی' سنی فرقہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ پہلے تین خلفاء پر یوں تبرہ کر کے ان کے جذبات کو مجروح کیا جائے دکن کے سلاطین کی بیشتر تعداد شیعہ فرقے سے تعلق رکھتی تھی لہٰذا نا صرف ان سلاطین نے اپنے مبلغین کو تبرہ سے روکنے سے گریز کیا بلکہ خود بھی اس مشق میں ملوث ہو گئے تھے۔

شاہ جہاں نے پہلے سلاطین کو انتباہ کیا کہ وہ ایسے اقدامات سے باز رہیں جس سے کسی فرقے کے جذبات مجروح ہوتے ہوں لیکن وہ لوگ باز نہیں آئے اس لیے کہ تبرہ کا سلسلہ انہوں نے بہت پہلے سے شروع کر دیا ہوا تھا اور پھر دکن کے یہ حالات شاہ جہاں کے ہی دور میں نہیں اکبر کے دور میں ان کی ابتداء ہو چکی تھی دراصل سن پندرہ سو ننانوے میں اکبر نے خان دیش اور سن سولہ سو میں احمد نگر کو فتح کر لیا تھا اس نے ان دونوں ریاستوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا چنانچہ جب شہزادہ سلیم یعنی جہانگیر نے شمالی علاقوں میں

اکبر کے خلاف بغاوت کی تو دکن میں عسکری کارروائیاں روکنی پڑیں جہاں تک احمد نگر کا تعلق تھا تو مغل سلطنت میں شمولیت کے باوجود اس پر اب تک مکمل گرفت نہ ہوسکی تھی اور وہاں کے امراء من مانی کارروائیوں میں مصروف تھے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دکن کی دوسری ریاستوں مثلاً گولکنڈہ بیجاپور کے سلاطین نے بھی مغلوں کے علاقوں پر دست درازی کرتے ہوئے اپنی سلطنتوں میں توسیع کرنا شروع کردی تھی۔

اس کے بعد جہانگیر کی حکومت کے دوران دکن کے معاملات میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی اس لیے دکن میں ایک ایرانی سالار ملک عنبر نے مغلوں کی بیش قدمی کو روک دیا تھا اور احمد نگر کا علاقہ بھی مغلوں سے واپس لے لیا تھا چنانچہ جہانگیر کے دور میں مغلوں کو برہان پور تک پسپا ہونا پڑا۔

جہانگیر نے ایرانی سالار ملک عبر جو دکن میں ایک طرح کا کرتا دھرتا تھا اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے اپنے بیٹے شاہ جہاں کو دکن روانہ کیا شاہ جہاں کو اپنی مہم میں کامیابی نصیب ہوئی وہ سلاطین دکن سے اپنی شرائط منوانے میں کامیاب ہوگیا یوں اس نے سلطنت مغلیہ کے وقار کو مجروح ہونے سے بچالیا۔

تاہم بعد ازاں شاہ جہاں کی بغاوت اور مغلکوں کی سلطنت کے نامور سالار مہابت خان نے ایک بار پھر دکن میں مغل سالاروں کی کارروائی میں رکاوٹ پیدا کردی لہٰذا دکن کے سلاطین کو پھر موقع ملا اور انہوں نے دوبارہ مغل طاقت اور قوت کے خلاف مزاحمت شروع کردی تھی۔

چنانچہ شاہ جہاں اب دکن کی ان بغاوت کرنے والی ان حکومتوں کے خلاف نئی حکمت عملی کا آغاز کرنا چاہتا تھا شاہ جہاں کیونکہ اپنے باپ جہانگیر کے دور میں دکن میں ایک سالار کی حیثیت سے کام کرچکا تھا لہٰذا وہ دکن کی سلطنتوں کی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھا چنانچہ ماضی کی اپنی انہیں معلومات سے وہ بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جہانگیر کے دور میں دکن میں جو ملک عنبر نام کا ایرانی سپہ سالار دندناتا پھرتا تھا وہ فوت ہوچکا تھا اب اس کا بیٹا نام جس کا فتح خان تھا بقول مورخین وہ اپنے باپ ملک عنبر کے خطوط پر چل رہا تھا اور اس نے نظام شاہی سلطنت کے سلطان کو جیل میں بھیج کر اس کے نوعمر بیٹے جس کی عمر اس وقت دس سال تھی اسے نظام شاہی تخت و تاج کا مالک بنادیا تھا۔

دکن میں مغلوں کے خلاف بغاوت اور سرکشی اور قتل غارت کرنے میں بیجاپور کا سلطان پیش پیش تھا اس کا باغیانہ رویہ بھی بڑی شدت اختیار کرگیا تھا چنانچہ شاہ جہاں نے اسے آگرہ طلب کیا۔ بیجاپور کے سلطان نے جب آنے سے انکار کردیا تب شاہ جہاں نے اس کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دے دیا۔

یہی وہ حالات تھے جن کے تحت شاہ جہاں نے بہادر خان کو دکن کی طرف روانہ کیا تاکہ اس کے برادر نسبتی آصف خان کے ساتھ مل کر دکن کے حالات کو درست کرے۔

جس روز بہادر خان نے بنگال سے آئے ہوئے لشکریوں کو روانہ ہونا تھا اسی روز دکن سے کچھ مخبر شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے شاہ جہاں کو یہ اطلاع دی کہ آصف خان نے بیجاپور کا بیس دن تک محاصرہ جاری رکھتے ہوئے خون ریز جنگ میں مشغول رہا لیکن بیجاپور والوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا کیونکہ رسد کی کمی ہوگئی تھی لہٰذا آصف خان کو ہاتھ روکنے پر مجبور ہونا پڑا اور ساتھ ہی اس علاقے میں کیونکہ لوگ مرنے لگے تھے چنانچہ آصف خان نے بیجاپور کا محاصرہ اٹھالیا ہے اور مغلوں کا لشکر سامان خوردونوش کی تلاش میں نکل کر ادھر ادھر رسد جمع کرنے لگا اور اس کے بعد مغلکوں کے لشکر کو اپنے علاقوں کی

...ے لوٹنا پڑا لہٰذا آصف خان دکن کے
...معاملات پر قابو نہ پا سکا تھا۔

آنے والے مخبروں نے شاہ جہاں کو یہ بھی
...دی کہ دکن میں جو ایرانی سپہ سالار کرتا دھرتا تھا
...نام جس کا ملک عنبر تھا اس کے بیٹے فتح خان
...بھی پر پرزے نکال رکھے ہیں اور آصف خان
...لے پھر اضلاع اس کے تحت کر دیے ہیں یہ وہ
...اضلاع ہیں ماضی میں وہ جن پر قبضہ کر چکا تھا اور
...ہی مخبروں نے یہ اطلاع دی کہ یہ اضلاع
...روز تک فتح خان کی کمانداری میں رہے اس
...کے بعد وہ علاقہ جو فتح خان کو دیا گیا تھا وہ آصف
...ان نے ایک مرہٹہ سردار شاہ جس کے حوالے
[illegible]

اب ان سارے واقعات کی خبر شاہ جہاں کو
...ملی تو سب سے پہلے اس نے بہادر خان اور مغل
...علاقات کے قدیم اور پرانے سپہ سالار مہابت
...خان کو طلب کیا مہابت خان شاہ جہاں کے باپ
...جہانگیر کے دور میں بھی نامور سالاروں میں شمار کیا
...جاتا تھا چنانچہ اس طلبی پر مہابت خان اور بہادر
...خان دونوں شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوئے
...شاہ جہاں نے دونوں کو بڑی عزت بڑا احترام دیا
...دونوں جب شاہ جہاں کے ساتھ بیٹھ گئے تب
...گفتگو کا آغاز شاہ جہاں نے کیا اور کہنے لگا۔

''دکن کے حالات بہت خراب ہو چکے ہیں
...نگر کبھی ہمارے پاس آتا ہے کبھی دشمن کے
...اور پھر دوبارہ ہمارے ہاتھ میں آ جاتا ہے یہ
...ہے بلی کا کھیل مجھے ہرگز پسند نہیں احمد نگر شروع
...ہمارا علاقہ تھا اور ہمارا علاقہ رہے گا اگر اس پر
...نہیں ہو سکتا تو یہ ہماری شکست اور ہماری توہین
...کیا جائے گا اس کے علاوہ بیجا پور کی مملکت
...اس قدر پر پرزے نکال لیے ہیں کہ وہ
...ے علاقوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے ہیں بیجا
...حکمران اپنے لشکر کو ہمارے علاقوں پر حملہ
...ہو کر ضرورت کا سامان اکٹھا کرنے کی

اجازت دے چکا ہے۔

میں نے دکن کے حالات درست کرنے کے لیے اپنے برادر نسبتی آصف خان کو مقرر کیا تھا لیکن آج جو مخبر دکن کی طرف سے آئے ہیں ان کی ساری گفتگو سننے کے بعد میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ آصف خان دکن کے حالات پر قابو نہیں پا سکتا لہٰذا میں نے ایک قاصد دکن کی طرف روانہ کر دیا ہے اور آصف خان کے لیے میں نے حکم جاری کر دیا ہے کہ وہ فی الفور واپس آگرہ آ جائے لہٰذا آصف خان کی جگہ مہابت خان تم اور بہادر خان تم دونوں جاؤ گے مہابت خان تم جنگ کا وسیع تجربہ رکھتے ہو مغل علاقوں سے بھی خوب واقف ہو بہادر خان ابھی نیا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد شاہ جہاں جب دم لینے کے لیے رکا تب مہابت خان بولا اور کہنے لگا۔

''شہنشاہ معظم بہادر خان اس کے دادا دادی اور اس کے مرنے والے باپ کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ نوعمر ضرور ہے لیکن خام کار نہیں ہے بڑے بڑے تجربہ کار سالاروں سے بھی بڑھ کر اپنی کارگزاری کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ شہنشاہ معظم بہادر خان نے بنگال میں جو پرتگالیوں کے خلاف اپنی کارگزاری کا مظاہرہ کیا ہے میں سمجھتا ہوں وہ ایک تجربہ کار سالار بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے بہادر خان کو نا تجربہ کار نہ سمجھیں اور مجھے امید ہے کہ یہ میرے ساتھ خوب کام کرے گا اس کی حیثیت میرے ساتھ میرے بیٹے کی سی ہوگی اور خداوند قدوس نے چاہا تو ہم دونوں مل کر دکن کے حالات درست کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' مہابت خان کے ان الفاظ سے شاہ جہاں نے خوشی کا اظہار کیا پھر مہابت خان کی طرف دیکھتے ہوئے شاہ جہاں کہنے لگا۔

''مہابت خان میں نے جو پہلے سے منصوبہ بندی کی تھی اس کے مطابق آج بہادر خان کو دکن

کی طرف روانہ ہونا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا ہے اب چونکہ تم بھی دکن کا رخ کرو گے لہٰذا میں تمہیں مزید دو دن دیتا ہوں تاکہ مہابت خان تم بھی اپنی تیاریوں کو آخری شکل دے لو اس کے بعد تم دونوں دکن کی طرف روانہ ہو جانا اور مجھے امید ہے کہ دکن میں تم دونوں حالات پر اپنی گرفت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔''

اس کے بعد شاہ جہاں کے کہنے پر مہابت خان اور بہادر خان دونوں قصر سے نکل گئے تھے۔

قصر سے نکلنے کے بعد جب بہادر خان آگرہ کے بازار سے گزر رہا تھا تب کسی نے اسے آواز دے کر پکارا اس پکار پر بہادر خان رک گیا مڑ کر پکارنے والے کی طرف دیکھا ذرا فاصلے پر اس نے دیکھا کہ ماروا ڑ کا راجہ جسونت سنگھ اس کی بیوی سرسوتی دونوں بیٹے دریا ناتھ قوی راج اور حسین خوبصورت بیٹی اور راج کماری رتن مالا کھڑے تھے۔

اور وہ سب بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے چنانچہ بہادر خان پلٹا اور ان کے سامنے جا کھڑا ہوا ماروا ڑ کا راجہ جسونت سنگھ بڑی محبت اور شفقت میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''بیٹے میں نے تو سنا تھا کہ آج تم نے دکن کی طرف روانہ ہونا ہے تم گھر پر نہیں تھے میں تمہارے دادا سے ملنے گیا پوچھا تو تمہارے دادا نے بتایا کہ تم کہیں باہر نکلے ہوئے ہو میرے ساتھ سرسوتی دونوں بیٹے راج کماری رتن مالا بھی گئے تھے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم دکن کی طرف روانہ نہیں ہوئے ابھی تک آگرہ کے بازار ہی میں گھوم رہے ہو۔''

اس پر بہادر خان مسکرایا اور کہنے لگا۔

''آپ کا کہنا درست ہے میں ابھی قصر سے ہی اٹھ کر آ رہا ہوں دراصل میری روانگی میں شہنشاہ نے دو دن کی تاخیر کر دی ہے اس لیے کہ دکن میں پہلے دکن کے حالات درست کرنے کے لیے اصف خان کام کر رہا تھا کیونکہ آصف خان وہاں کے حالات پر قابو نہیں پا سکا اس لیے شاہ جہاں نے آج ہی کچھ قاصد دکن کی طرف روانہ کیے ہیں آصف خان کو واپس بلا لیا ہے جبکہ شہنشاہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دکن کی طرف میں اور مہابت خان دونوں جائیں گے مہابت خان کو بھی میرے ساتھ قصر میں بلایا گیا تھا اور احکامات جاری کر دیے گئے ہیں کہ دو دن مزید ہمیں دیے جاتے ہیں تاکہ مہابت خان بھی اپنے کوچ کی تیاری کرے اس کے بعد ہم دکن کی طرف روانہ ہوں گے اب میں پرسوں یہاں سے دکن کی طرف کوچ کروں گا۔''

جسونت سنگھ نے خوشی کا اظہار کیا دوبارہ وہ بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ بھی اچھا ہوا ہماری ایک خواہش بھی پوری ہو جائے گی میں چاہتا تھا کہ تم کیونکہ کئی ماہ کے بعد بنگال سے لوٹے ہو لہٰذا میری خواہش تھی کہ تمہاری ایک شاندار دعوت کی جانی چاہیے اور کیونکہ تم آج روانہ ہونے والے تھے لہٰذا یہ میری خواہش ادھوری ہی رہ جاتی تھی اب کیونکہ دو دن تمہیں مزید مل گئے ہیں لہٰذا دادا اور دادی کے پاس جا کر کہنا کہ آج رات ہمارے ہاں تم تینوں کی دعوت ہے اگر تم کہو تو ہم پانچوں ابھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں اور خود تمہارے دادا دادی اور تمہیں باقاعدہ دعوت کا پیغام دیتے ہیں۔''

جواب میں بہادر خان مسکرا دیا کہنے لگا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے آپ بے فکر رہیں' میں دادا اور دادی سے کہہ دوں گا ہم تینوں آپ کے ہاں ضرور آئیں گے آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس پر جسونت سنگھ نے اس کا شکریہ ادا کیا اس کے بعد بہادر خان آگے بڑھ گیا اور جسونت سنگھ اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنی حویلی کی طرف ہو لیا تھا۔

اپنی حویلی کی طرف جانے کے بجائے آگرہ کے ایک کھلے اور وسیع میدان میں بہادر خان نے ایک خیمہ گاہ کا رخ کیا مختلف خیموں سے گزرتا ہوا وہ ایک خیمے کے قریب آ کر رک گیا خیمے کے دروازے پر آیا اندر فیران اور مارتھل دونوں ماں بیٹی بیٹھی ہوئی تھیں دھیمے سے لہجے میں بہادر خان نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔''

فیران اور مارتھل دونوں ماں بیٹی بہادر خان کو اپنے خیمے کے دروازے پر دیکھ کر چونک سی گئی تھیں دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں پر فیران بولی اور بہادر خان کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''بیٹے یہ تم کیا اجنبیوں کی طرح دروازے پر کھڑے ہوئے ہو تم ہم دونوں سے ہم تم سے شناسا ہیں بنگال سے یہاں آگرہ تک ہم نے تمہارے ساتھ سفر کا ہے اندر آؤ بیٹے باہر دروازے پر کھڑے ہو کر تم ہم دونوں ماں بیٹی کو شرمسار کر رہے ہو۔''

بہادر خان مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوا اور جس نشست کی طرف فیران نے اشارہ کیا تھا اس پر بیٹھ گیا دونوں ماں بیٹی بھی اس کے سامنے بیٹھ گئیں اس کے بعد گفتگو کا آغاز بھی فیران نے کیا کہنے لگی۔

''بیٹے ہم نے تو سنا تھا کہ تم نے آج دکن کی طرف روانہ ہو جانا تھا کیا دکن کی طرف روانگی سے پہلے تم ہم سے ملنے کے لیے آئے ہو۔''

بہادر خان مسکرایا کہنے لگا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ مجھے آج روانہ ہونا تھا لیکن دو دن کی مزید تاخیر ہو گئی ہے اس لیے کہ دکن میں پہلے شہنشاہ کا برادر نسبتی آصف خان ایک سالار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اسے واپس بلا لیا گیا ہے اور دکن کے حالات درست کرنے کے لیے اب شہنشاہ نے مجھے اور ایک دوسرا سالار نام جس کا مہابت خان ہے اسے مقرر کیا ہے لہٰذا میں آج نہیں پرسوں دکن کی طرف روانہ ہوں گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد بہادر خان رکا وہ دونوں ماں بیٹی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ گفتگو کر رہا تھا اس نے پر فیران کو مخاطب کیا۔

''میرا خیال ہے آپ دونوں ماں بیٹی خیمے میں رہتے ہوئے تنگ آ چکی ہوں گی۔''

یہاں تک کہتے کہتے بہادر خان کو رک جانا پڑا اس لیے کہ حسین اور خوبصورت مارتھل پہلی بار اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''ایسی کوئی بات نہیں یہ آپ کا خیال ہے ہم تنگ نہیں ہیں دراصل بنگال سے روانہ ہونے کے بعد میرے اور ماں کے دل میں جو تحفظات اور خدشات تھے وہ رفع ہو گئے ہیں خاص کر آپ کی وجہ سے پہلے ہم دونوں ماں بیٹی یہ خیال کرتی تھیں کہ آگرہ ہمارے لیے نیا شہر ہو گا ہم وہاں کیسے رہیں گی لیکن یہاں آنے کے بعد ہمارے ساتھ عمدہ سلوک کیا گیا اور پھر جو رویہ آپ نے ہم دونوں ماں بیٹی کے ساتھ رکھا اس سے ہمارے سارے ہی خدشات رفع ہو گئے۔''

''ہاں آپ سے مجھے اور ماں کو ایک گلہ اور شکوہ ضرور ہے۔'' بہادر خان چونک پڑا مارتھل کی طرف دیکھے بغیر بول اٹھا۔

''کیسا گلہ اور شکوہ۔''

مارتھل مسکرائی اور کہنے لگی۔

''آپ سے ایک نہیں اب دو شکوے ہو گئے ہیں تھوڑی دیر پہلے ایک ہی شکوہ تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے دو ہو گئے ہیں۔ پہلا شکوہ یہ ہے کہ آپ نے ابھی تک ہم دونوں ماں بیٹی کو اپنے دادا اور دادی سے نہیں ملایا اور آپ سے دوسرا اور اس سے بڑا شکوہ یہ ہے کہ آپ جب ہم سے گفتگو کرتے ہیں اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں میری طرف دیکھتے نہیں ہیں، زمین کی طرف دیکھتے رہتے ہیں

کیا ہم دونوں ماں بیٹی ایسی کریہہ منظر ہیں کہ آپ ہماری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔''

مارتھل کے ان الفاظ پر بہادر خان کھل کھلا کر ہنس دیا کہنے لگا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے' میں میری عادت ہے کہ جب میں کسی خاتون سے بات کرتا ہوں تو نگاہ جھکا کر رکھتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی بہادر خان اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دھیمے سے لہجے میں کہنے لگا۔

''اب آپ دونوں ماں بیٹی اٹھ کھڑی ہوں میرے ساتھ چلیں میں آپ دونوں کو دادا اور دادی سے ملواتا ہوں تاکہ جب میں دکن کی طرف چلا جاؤں اور میری غیر موجودگی میں تم دونوں ماں بیٹی کو کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو یا تم کوئی تکلیف یا دقت محسوس کرو تو میرے دادا سے کہو خدا وند قدوس نے چاہا تو وہ تمہاری ہر تکلیف رفع کریں گے۔''

بہادر خان کے ان الفاظ پر مارتھل کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی فیران بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھی پھر وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر بہادر خان کے ساتھ ہو لی تھیں۔

بہادر خان اپنی حویلی میں داخل ہوا دیوان خانے کی طرف گیا جہاں اس کا دادا اور دادی دونوں کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ فیران اور مارتھل کو لے کر بہادر خان دیوان خانے میں داخل ہوا پھر کسی نشست پر بیٹھنے سے پہلے اپنے دادا اور دادی دونوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''بنگال سے واپسی کے وقت میں نے آپ لوگوں سے دو خاتونوں کا ذکر کیا تھا۔''

یہاں تک کہتے کہتے بہادر خان کو رک جانا پڑا اس لیے کہ اس کا دادا قطب خان بول پڑا اور کہنے لگا۔

''یقیناً تم نے دو خاتونوں کا ذکر کیا تھا اور وہ دو خواتین یہی ہیں ان میں سے بڑی فیران ہے اور دوسری مارتھل ہے یہ دونوں ماں بیٹی ہیں اب بولو تم مزید کیا چاہتے ہو۔'' بہادر خان مسکرا دیا تھا اتنی دیر تک اس کی دادی نگار خانم اپنی جگہ سے اٹھی فیران اور مارتھل دونوں سے گلے ملی انہیں اپنے قریب بٹھایا پر ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں تم دونوں کو دو طرح کی مبارک باد دیتی ہوں آگرہ شہر میں داخل ہونے کی اور دوسری مبارک باد اسلام قبول کرنے کی میرے پوتے بہادر خان نے تم دونوں کا ذکر کیا اور یہ کہ تم دونوں پریشان اور فکر مند ہو فکر مندی کی کوئی بات نہیں ہے یہاں آنے کے بعد نہ تم اجنبی ہو اور نہ ہی پردیسی اب آگرہ ہی تمہارا وطن ہے تم دونوں یہیں رہو گی تمہیں ہر چیز مہیا کی جائے گی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

نگار خانم جب خاموش ہوئی تب قطب خان اپنے پوتے بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جو لوگ بنگال سے آئے ہیں ان کی رہائش کا بھی بندوبست ہوا ہے۔''

اس پر بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔

''دادا اس سلسلے میں شہنشاہ کے وزیر سعد اللہ سے میری تفصیل کے ساتھ بات ہوئی ہے اس کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کو چند ہی روز خیموں میں بسر کرنا ہوگا اس کے بعد ان دونوں کو بہترین اور مناسب رہائش گاہ مہیا کر دی جائے گی جو ان کی ملکیت ہوگی۔''

بہادر خان کا یہ جواب سن کر قطب خان اور نگار خانم دونوں مطمئن ہو گئے تھے پھر بہادر خان نے دوسرا موضوع چھیڑا اور کہنے لگا۔

''بابا جس وقت میں شہنشاہ کے قصر سے نکل کر بازار پہنچا تو وہاں میری ملاقات راجہ جسونت سنگھ اس کی پتنی سرسوتی بیٹے وریا ناتھ دوسرے بیٹے قوی راج اور بیٹی راج کماری رتن مالا سے

ہو لی۔'' بابا قطب خان بہادر خان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''بیٹے جس وقت تم شہنشاہ کی طرف گئے ہوئے تھے تو وہ پانچوں یہاں بھی آئے ہوئے تھے کسی اہم موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے تھے پھر میں نے انہیں بتایا کہ تھوڑی دیر تک شاید بہادر خان یہاں سے کوچ کر جائے تو جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے انہوں نے کہا نہیں چلے گئے۔''

قطب خان کے خاموش ہونے پر بہادر خان پر بولا اور کہنے لگا۔

''بابا میری روانگی میں دو دن کی مزید تاخیر ہو گئی ہے دکن میں اس وقت شاہ جہاں کا برادر نسبتی آصف خان کام کر رہا ہے اور حالات پر قابو نہیں پا سکا اس بنا پر شہنشاہ نے اسے واپس بلا لیا ہے اب یہاں سے میرے ساتھ مہابت خان جائے گا اور اب ہم دو دن بعد یہاں سے رخصت ہوں گے اور دکن کے حالات درست کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس کے علاوہ جب میری ملاقات جسونت سنگھ سے ہوئی تو اس نے ہمیں آج شام کو کھانے پر بلایا ہے ہماری دعوت کی ہے اور میں نے اس کی دعوت کو قبول بھی کر لیا ہے دادا دعوت قبول کرنے کے بعد مجھے خیال گزرا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا پہلے مجھے دادا سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔

قطب خان مسکرا دیا پھر غور سے بہادر خان کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ بڑی شفقت میں کہنے لگا۔

''او بیٹے تم بھی بچے کے بچے رہے اس میں تمہیں مجھ سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت تھی کوئی مہم تو پیش نہیں آ گئی جس کے لیے تمہیں مجھ سے مشورہ کرو گے جسونت سنگھ نے دعوت دی اور تم نے قبول کر لی ہے تو تم نے بالکل بھلا فیصلہ کیا ہے آج شام ہم ان کے ہاں جائیں گے اور فیران میری بیٹی کی حیثیت سے اور مارتھل میری پوتی کی حیثیت سے ہمارے ساتھ جائیں گی اس طرح اس دعوت میں ہم پانچوں شامل ہوں گے۔''

قطب خان کے یہ الفاظ سن کر فیران اور مارتھل دونوں ماں بیٹی بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں پھر سب مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے لگے تھے۔

قطب خان' بہادر خان' نگار خانم' فیران اور مارتھل پانچوں راجہ جسونت سنگھ کی حویلی میں داخل ہوئے جسونت سنگھ اس کی پتنی دونوں بیٹوں اور راج کماری رتن نے شاندار انداز میں ان کا استقبال کیا پھر جسونت سنگھ کہنے لگا۔

''دیوان خانے میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے کھانے کے کمرے میں چلتے ہیں کھانا بالکل تیار ہے کھانا لگواتے ہیں اور کھاتے ہیں۔'' قطب خان نے اس سے اتفاق کیا تھا پھر سب کھانے کے کمرے کی طرف ہو لیے تھے جب سب بیٹھ گئے تب بہادر خان نے جسونت سنگھ اور اس کے اہل خانہ سے فیران اور مارتھل کا تعارف کروایا تھوڑی دیر بعد کھانا لگ گیا کھانا کھانے کے بعد کافی دیر تک سب بیٹھ کر ملکی حالات سے متعلق گفتگو کرتے رہے اس کے بعد قطب خان نگار خانم دونوں اپنی حویلی کی طرف چلے گئے جبکہ بہادر خان فیران اور مارتھل دونوں کو ان کے خیمے میں چھوڑنے کے لیے آگرہ کی اس خیمہ گاہ کی طرف ہو لیا جہاں پر نگالیوں کے ٹھہرایا گیا تھا دو دن بعد مہابت خان اور بہادر خان دونوں دکن کی طرف کوچ کر گئے تھے۔

◆.....◆.....◆

اس تاریخی داستان کے مزید واقعات کے لیے آئندہ ماہ کا شمارہ ملاحظہ کریں۔

◆.....◆.....◆

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

جس وقت وہ ممی کے اس پار واقع سیاہ مکان کے گیٹ پر پہنچے انہوں نے دیکھا کہ جنگلے کے دوسری طرف لان کے بیچ گھاس کے اندر کوئی راستہ نہیں بنایا گیا ہے۔ چاروں طرف سبزہ تھا اور لان گھاس سے ڈھکا ہوا تھا۔

احمد صغیر صدیقی

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

ہائی وے سے نکلتے ہوئے ذیلی پکی سڑک نسبتاً کشادہ تھی۔ اس کے دونوں جانب کھجور اور پام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ سڑک پر ایسے نشانات موجود نہ تھے جس سے اندازہ ہوتا کہ یہاں سے پہلے بھی کوئی گاڑی گزری ہے لیکن جوں ہی مالکم لارنس نے اپنی گاڑی اس پر موڑی اسے سڑک کے عین وسط میں کچھ نشانات نظر آئے یہ نشانات واضح طور پر کسی کتے کے پیروں کے تھے اور دور تک بنے ہوئے تھے جہاں اس علاقے کا واحد جنرل اسٹور اور پٹرول پمپ تھا۔

''واقعی یہ جگہ خاصی دور افتادہ اور الگ تھلگ سی ہے۔'' ورجینیا نے پر خیال لہجے میں کہا۔ وہ دبلی پتلی سی عورت تھی۔ اور چمکدار سیاہ تھے اور چہرہ کسی قدر لانبا تھا۔ ان دونوں کی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے۔

''ہاں۔'' مالکم نے ہامی بھری۔ چند روز قبل ہی اس نے غصے میں اپنی فرم سے استعفا دے دیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس بار وہ گرمیاں کسی ایسے مقام پر گزارے گا جہاں اخراجات کم سے کم ہوں۔ وہ ایک پیشہ ور مصور تھا۔ وہ کچھ نئی تصاویر بنانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنی کار کو آگے بڑھنے دیا۔ سڑک کے کنارے دور تک بجلی کے کھمبے استادہ تھے' ان میں صرف ایک ہی تار تھا۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس جگہ فون کی سہولت نہیں ہے۔ مالکم کے خیال میں یہ بات اچھی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے بجلی کی موجودگی اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی کار کے پہیے کتے کے قدموں کے نشانات کو دونوں جانب سے گھیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے مالکم ان نشانات کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔

چند سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لوگ ایک سائن بورڈ کے سامنے پہنچے جو قریبی پہاڑی پر نصب تھا۔ اس کی سرخ عبارت چمک رہی تھی۔ لکھا تھا۔

خوش آمدید۔

میرین ویشو۔ نیو جرسی میں واقع تھا۔ یہ ایک تیزی سے ترقی کرتی ہوئی صاف ستھری آبادی تھی یہاں کے مکانات صرف نو ہزار نو سو نوے ڈالر میں تھے۔

ان کے نیچے زمین کا یہ مشکل دس ایکڑ رقبے کا ایک ٹکڑا پھیلا ہوا تھا۔ یہ ٹکڑا زیریں نیویارک کی خلیج تک چلا گیا تھا۔ سڑک بتدریج سمٹتی ہوئی اب ایک گلی جیسی ہو رہی تھی۔ جو خلیج کی سمت جا

رہی تھی۔ اس سے آگے کنکریٹ سے بنی صرف تین چوکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک منہدم تھی۔ ان کے پیچھے نشیبی علاقہ تھا جو شمالی نیویارک تک پھیلا تھا۔ دوسری طرف کھلا ہوا بحیرہ اوقیانوس ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

جس گلی میں وہ جا رہے تھے اس کے دونوں جانب زمین پر بل ڈوزر چلایا گیا تھا تاہم وہاں پھر سے جھاڑیاں وغیرہ اگنے لگی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف چوڑی کھائیاں تھیں بعض میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں جسے گویا نئے بنائے جانے والے مکانوں کی بنیاد کہا جا سکتا تھا۔ دونوں طرف ایسے متعدد مکانات بھی نظر آ رہے تھے جو زیر تعمیر تھے۔

اس پورے منظر میں صرف دو مکان قدرے مختلف تھے۔ گلی کے اختتام پر یہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے یہ دونوں مکمل تھے اور ایک جیسے نقشے سے بنے تھے۔ مغربی سمت والا مکان نسبتاً پرانا تھا۔ تاہم اس کے اردگرد جھاڑیاں وغیرہ نہیں تھیں۔ دوسرا مکان نیا نیا تھا اس کا رنگ و روغن دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک سطح لان تھا یہ سرسبز بھی تھا۔ یہ لان تقریباً چار فٹ اونچے ایک آہنی کٹہرے سے گھرا ہوا تھا۔ مکان کے سامنے موڑ کو ظاہر کرنے کے لیے سفید رنگ کے خاصے بڑے بڑے پتھر قطار میں چنے ہوئے تھے۔

مالکم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خوش مزاجی سے بولا۔ ''لو ورجینا گھر میں تمہیں ایک پرہول جنگل سے نکال کر ایک محفوظ جگہ لے آیا ہوں۔''

''اچھی جگہ ہے۔'' ورجینیا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس جگہ کوئی کڑی محنت کے بغیر اچھی حالت میں رکھنا آسان نہ ہوگا۔''

مالکم نے اپنی کار اپنے مکان کے سامنے روک دی۔ اسی وقت گلی کے دوسری جانب بنے مکان سے شکاری کتوں کا ایک جوڑا نکل کر آہنی پھاٹک کی طرف بڑھا۔ پھر جنگلے کے قریب آ کر یہ دونوں ٹھٹک گئے۔ ان کی نظریں آنے والوں کی طرف تھیں۔

مالکم کار سے نکلا اور چابیوں کا گچھا گھماتا

ہوا مکان کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

مکان اندر سے آراستہ تھا۔ ایک کمرے میں چند کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ کچن سے ذرا ہٹ کر کھانے کی میز تھی۔ شب خوابی کا کمرہ بالکل خالی تھا۔ تاہم دوسرے کمرے میں مسہری موجود تھی۔ مالکم نے سرسری طور پر یکساں کار کا جائزہ لیا اور باہر کی طرف واپس ہوا تاکہ کار سے سامان اور خوراک وغیرہ نکال سکے۔

کتے بدستور جنگلے کے پاس کھڑے انہیں بہ غور دیکھے جا رہے تھے۔ مالکم نے ان کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ورجینیا سے کہا۔ ''خاصے جان دار جانور ہیں۔''

ورجینیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گلی کی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

مالکم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسی کی طرح خود ورجینیا کو اچھی طرح علم ہے کہ یہ کتے ڈوبرمین نسل کے ہیں۔ اور یہ طبعاً نروس ناقابل اعتماد اور خطرناک ہوتے ہیں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے بہرحال اب اپنی گرمیاں اسی جگہ گزارنی ہیں۔ وہ ذرا پریشان سا ہو گیا مگر پھر سر جھٹک کر اس نے کار سے سامان نکالنا شروع کر دیا کیونکہ وہ اب تو رقم ایجنٹ کو دے ہی چکا تھا۔

''ان دونوں میں بڑی مشابہت ہے شاید بچپن ہی میں ان کی دمیں اور کان کتر دیے گئے تھے۔'' ورجینیا نے کتوں کا جائزہ لیا اور بولی۔ پھر سامان کا ایک تھیلا اٹھا کر گھر میں چلی گئی۔

تمام سامان نکالنے کے بعد مالکم نے کار کا ٹرنک بند کر دیا حالانکہ وہ ابھی کار کے پاس ہی تھے مگر کتوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اب جانے ہی والے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں بھی مڑے اور والے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں بھی مڑے اور شانے سے شانہ ملائے سامنے کے سیاہ مکان کے عقبی حصے میں بڑھتے ہوئے غائب ہو گئے۔

☆☆

اندر پہنچ کر دونوں میاں بیوی نے سامان کو خواب گاہ میں واحد الماری میں رکھ دیا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس نے نشست گاہ کی کھڑکی سے باہر جھانکا اور جیسے ٹھٹک گیا۔

سڑک کے اس پار سیاہ مکان کے چاروں کونوں پر خوب روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی بہت تیز تھی جس کی وجہ سے صحن کا کونا کونا روشن ہوتا رہا تھا۔ جنگلے کے اندر اسے ایک اپاہج آدمی چلتا نظر آیا۔ اس کے پیر اکڑے ہوئے تھے اس کا اوپری حصہ کمر کے پاس سے خاصا جھکا ہوا تھا۔ اس نے دونوں بغلوں میں بیساکھی دبا رکھی تھی۔ مالکم اسے دیکھنے لگا۔ معذور شخص جنگلے کے داہنے گوشے کے پاس آ کر مڑا اب وہ لان میں گلی کے متوازی چل رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں وہ دونوں کتے اس کے آگے آگے تھے۔ معذور نے دوسرا موڑ مڑا اور اب اس کی پشت مالکم کی جانب ہو گئی تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور بالآخر مکان کے عقبی حصے میں غائب ہو گیا۔

اس دوران ورجینیا نے کھانا گرم کر کے میز پر لگا دیا تھا۔ وہ اب بشاش نظر آ رہی تھی۔ ''کیا خیال ہے اچھی جگہ ہے نا۔'' مالکم نے بیوی سے پوچھا۔

''تم جہاں رہو گے مجھے وہ جگہ اچھی لگے گی۔''

مالکم کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ نیویارک میں اس نے سوچا تھا کہ تین ماہ کی گرمیوں میں وہ بہرحال کسی فیصلے پر پہنچ جائے گا اس کے ذہن میں ایک ایسے مکان کا تصور تھا۔ جو سمندر کے کنارے ہو اور ایسے علاقے میں ہو جہاں غیروں کا شور نہ ہو۔ جہاں سکون ہو۔ ایک لائبریری ہو ایک سینما گھر ہو اور کچھ اور مشاغل ہوں اور بس۔

پھر جب وہ ایسے مکان کی تلاش میں نکلا تھا تو اسے حیرت ہوئی تھی کہ ساحل پر گرمیاں

گزارنے کے لیے خطیر رقم ہی نہیں بلکہ اس کے لیے کافی پہلے سے تگ و دو کرنا ضروری ہے۔ پھر جب وہ تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ اسے ایک ایجنٹ ملا۔ جب ایجنٹ نے اس جگہ کا نقشہ کھینچ کر اسے بتایا کہ اس کا کرایہ بھی بہت کم ہے تو مالکم نے تامل کے بغیر معاملہ طے کرلیا تھا۔ ورجینیا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے صرف محل وقوع کی دوبارہ وضاحت چاہی تھی۔ اس ایجنٹ نے اس سے کہا تھا۔ ''مسٹر مالکم اگر آپ کو کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں رک کر آپ کے شوہر کسی قسم کی مداخلت کے بغیر کچھ کرسکیں گے یہ جگہ مثالی ہے پھر ورجینیا نے بھی ادے کہہ دیا تھا۔''

اس نے نوکری چھوڑ دی تھی جس کی وجہ سے ورجینیا کو کچھ پریشانی تھی۔ یہ بات مالکم کو معلوم تھی وہ اسے خوش رکھنا چاہتا تھا اسے امید تھی کہ گرمیوں کے اختتام پر وہ کوئی دوسری جاب حاصل کرلے گا۔ کھانے کھاتے ہوئے مالکم کو وہ منظر یاد آیا جو اس نے کچھ دیر قبل کھڑکی سے دیکھا تھا۔ اس نے ورجینیا سے اسی اپاہج آدمی اور کتوں کی بات چھیڑ دی۔

''کیا ایجنٹ نے ہمیں اس کے کمرے میں کچھ بتایا تھا۔'' ورجینیا نے پوچھا۔

''مجھے یاد نہیں پڑتا۔'' مالکم نے سوچتے ہوئے کہا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس سے ایجنٹ نے یہاں کسی نگران کا ذکر کیا تھا جسے بروقت بتلایا جا سکتا تھا۔ اس نے نگراں کے ذکر میں دلچسپی نہیں لی تھی مگر اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس دور افتادہ جگہ پر نگراں کی کتنی اہمیت تھی۔

''میرا خیال ہے یہی نگراں ہے۔'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''ہنسو۔'' ورجینیا نے ہنکاری بھری۔

''دیکھو نا یہ پراپرٹی ایسی نہیں کہ اسے بلا کسی نگراں کے چھوڑا جاسکے۔''

ورجینیا نے چند لمحوں بعد کہا۔ ''ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ اصل مالک نے اسے ادھر نگرانی کے لیے رکھا ہو۔ میرا خیال ہے کتوں کے ساتھ وہ یہ کام بہ خوبی کروالیتا ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں ابھی یہ مکان اسی طرح خالی پڑے رہیں گے۔ کم از کم دس سال تک تو کوئی ادھر آئے گا نہیں۔''

''ہاں اس کے مالک کو انتظار کرنا ہوگا۔'' ورجینیا نے کار اس کی نظریں کمرے کی کھلی کھڑکی کی طرف اٹھیں اور اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''نہیں۔ وہ یہاں کی چیزیں نہیں دیکھ سکتا۔ بس نشست گاہ دیکھ سکتا ہے مگر اس کے لیے بھی اسے اپنے صحن کے سب سے عقبی کونے میں جانا ہوگا۔'' مالکم نے کہا اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں صرف ایک ہی کتا تھا۔ اور وہ ان کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں پھر اس کا رخ ذرا سا بدلا۔ اب وہ سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے حرکت کی اور جنگلے سے کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے دوڑ لگائی اور زقند بھری اور جنگلے کو پار کرتا ہوا سڑک پر گرا۔ اٹھ کر وہ لپکا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے اسے اپنے ساتھ کتے کے ساتھ واپس آتے دیکھا۔ دوسرے کتے نے اپنے منہ میں کاغذ کا ایک بڑا سا بیگ دبا رکھا تھا۔

وہ دونوں کتے ساتھ ساتھ چلتے رہے جنگلے سے ذرا پیچھے ٹھٹک کر انہوں نے زقند بھری اور جنگلا پار کر کے مکان کے صحن میں جا کودے پھر وہ دونوں ان کی نظروں سے روپوش ہوگئے۔

''کمال ہے یہ شخص کتوں کے ساتھ تنہا رہتا ہے۔'' ورجینیا نے کہا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' مالکم نے پوچھا۔

''صاف ظاہر ہے۔'' ورجینیا نے کہا۔ ''تم نے دیکھا نہیں۔ یہ کتے اس کے ملازم ہیں وہ خود

چل نہیں سکتا لہذا سارے باہر کے کام یہ کتے کرتے ہیں۔ بیوی بچے ہوتے تو سودا سلف کتے کیوں لاتے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔''

''اور یہ کتے کس قدر خوش لگتے ہیں۔'' ورجینیا نے کہا۔ ''پہلا کتا کس بے تابی سے اپنے ساتھی کا خیر مقدم کر رہا تھا۔'' اس نے رک کر مالکم کو دیکھا مالکم نے محسوس کیا کہ کسی سوچ سے اس کی بیوی کی آنکھیں خواب گوں ہوگئی ہیں۔''

''یہ صرف کتے ہیں اور بس۔ خوشی نا خوشی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔

''نہیں۔'' ورجینیا نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''یہ خوش ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔''

☆☆

مالکم اس رات دیر تک بستر پر کروٹ بدلتا رہا۔ پہلے وہ اس تصور سے خوش تھا کہ بہرحال گرمیاں اچھی گزریں گی۔ پھر اس نے خود کو ملامت کی کہ آخر وہ ایڈورٹائزنگ بزنس میں کیوں نہیں چلا جاتا۔ کوئی چار بجے کے قریب اسے احساس ہوا کہ شاید وہ کسی وجہ سے کسی نا معلوم خوف میں مبتلا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی مزاجی کیفیت اکثر بدلتی رہتی ہے۔

ورجینیا نے صبح ہی صبح اسے بستر سے اٹھانا چاہا تو اس نے معذرت کر لی۔ دن کے ایک بجے ورجینیا نے اسے پھر جھنجھوڑا۔ وہ کافی لا چکی تھی۔ مالکم اٹھ کر کچن میں جا گھسا وہاں اس نے کچھ انڈے بال رکھے تھے۔

کھانے کے خاتمے پر ورجینیا نے پوچھا۔ ''آج اس کا پروگرام کیا ہے۔''

''کیوں۔'' اس نے پوچھا۔

''تم تو سوئے پڑے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اس دوران تمہاری مصوری کا سامان سامنے والے کمرے میں لگا دیا ہے اب وہ چھوٹا سا نگار خانہ بن گیا ہے۔ تم کام شروع کر سکتے ہو۔''

''دیکھو میں اس طرح کام نہیں کرتا تمہیں معلوم ہے کہ میں موڈ کا پابند ہوں۔ مجھے اس ذرا اس نئے پن سے لطف اٹھانے دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' ورجینیا نے کہا۔ ''میں نے تمہاری چیزیں منتقل ضرور کر دی ہیں مگر میں مصور نہیں ہوں۔ تم انہیں اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کر لو۔''

پھر جتنی دیر مالکم بیٹھا رہا ورجینیا میرے کمرے سے بات کرتی رہی جب وہ باہر آئی تو اس کے جسم پر نیا لباس تھا۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا اور بال سنورے ہوئے تھے۔

آتے ہی اس نے کہا۔ ''اب تمہارا جو جی چاہے کرو میں تو ذرا سامنے والے مکان میں جا رہی ہوں اس کے مکینوں سے ملنے۔''

لمحے بھر کے لیے مالکم کا موڈ بگڑا مگر اس نے سنبھالا لیا اور بولا۔ ''تم ذرا سا رک جاؤ تو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

پھر وہ خواب گاہ میں گھس گیا۔ پھر وہ ایک سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ کے ساتھ نکلا۔ اور احساس ہو رہا تھا کہ ورجینیا نے آج اس کا موڈ خراب کر دیا ہے۔

جس وقت وہ ممی کے اس پار واقع سیاہ مکان کے گیٹ پر پہنچے انہوں نے دیکھا کہ جنگلے کے دوسری طرف لان کے بیچ گھاس کے اندر کوئی راستہ نہیں بنایا گیا ہے۔ چاروں طرف سبزہ تھا اور لان گھاس سے ڈھکا ہوا تھا۔

مالکم نے جنگلے کے اندر کی زمین کو جھانکا اسے وہاں پر معذور آدمی کی بیساکھیوں کے نشانات دکھائی دیے اور اس نے اطمینان کے سانس لی۔

''ادھر تو کوئی گھنٹہ بھی نہیں شاید۔'' اس نے کہا۔

''اور کوئی کتاب بھی نہیں ہے۔'' ورجینیا نے کہا۔ پھر اس نے جنگلے کو چھوا۔ ''میرا خیال ہے اس کی کنڈی کافی عرصے سے نہیں کھلی ہے اس کا پینٹ جوں کا توں ہے۔'' اس کے بعد اس نے گیٹ کو کھٹکھٹایا۔ فوراً ہی مکان کے عقب سے دونوں کتے آتے دکھائی دیے ان میں سے ایک ٹھٹکا پھر واپس ہوگیا۔ دوسرا آگے بڑھتا ہوا جنگلے کے پاس آکر رک گیا۔ کتا چوکنے انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا۔

پھر عمارت کا صدر دروازہ کھلا انہیں پھر بیساکھیوں پر لگے پتر کی ہلکی چمک نظر آئی۔ پھر وہ آدمی مکان کی سیڑھیوں پر آکر رک گیا۔ انہیں پہچاننے کے بعد اس نے سر ہلا کر خیر مقدمی سے رہ گیا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسرا کتا اس کے ساتھ تھا۔ جنگلے والا کتا اپنی جگہ رکا رہا معذور آدمی بیساکھیوں پر جھکولہ کھاتا ہوا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیر بیماری سے متاثر تھے۔ وہ ان پر کم دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس کے چلنے کے انداز سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ بالکل ہی اپاہج نہیں ہے۔ اس شخص کی عمر پچیس سال کے نزدیک ہوگی۔ جسم دبلا تھا۔ جلد کھردری اور چہرہ گرم و سرد چشیدہ لگتا تھا۔ اس کے بھورے سیاہ سفید بالوں میں ایک پلٹنگ نکلی ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شخص شاید فوج میں رہا ہوگا اس کے جسم پر جیکٹ تھی جس کی کہنیوں پر چمڑے کے جوڑ تھے۔ گرمی میں یہ لباس ناموزوں سا تھا۔ اس نے جو ٹائی بھی باندھ رکھی تھی۔ پھاٹک کے پاس آکر وہ رک گیا۔ اور اپنی بیساکھیوں کے سہارے قدرے سنبھل کر کھڑا [illegible]'' کہا۔

اس نے شائستہ انداز میں مزاج پرسی کی پھر بولا۔ ''میں خود بھی آپ لوگوں سے ملنے کا متمنی تھا۔ میرا نام کرنل رچی ہے۔''

کتے اس کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ ان کے لانبے سیاہ چہرے آگے نکلے ہوئے تھے۔

''میرا نام مالکم لارنس ہے اور یہ میری بیوی ہے ورجینیا۔'' مالکم نے کہا۔

''آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔'' کرنل نے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ شاید اس سال میں ایجنٹ کوریو کو یہاں کے لیے مناسب کرائے دار مشکل سے ملیں گے۔''

ورجینیا مسکرائی۔ ''یہ کتے بہت خوب صورت ہیں۔''

''ہاں۔'' کرنل رچی نے کہا۔ ''ان کے نام میکس اور مورس ہیں۔''

باتوں کے درمیان مالکم نے سوچا۔ ''آخر اس شخص نے اسٹیٹ ایجنٹ کا تذکرہ کیوں کیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کرنل کی شخصیت میں کوئی مانوس سی بات محسوس کر رہا تھا۔''

''اوہ۔'' اسی وقت ورجینیا نے گویا نعرہ سا لگایا۔

''تو گویا آپ ہی ہیں مشہور زماں کرنل رچی۔''

تب مالکم کو بھی یاد آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ ایک فلم کی ریلیز کے بعد متعدد رسائل میں اس نے کرنل کے بارے میں کئی مضامین پڑھے تھے۔

کرنل خوش مزاجی سے مسکرایا۔ ''ہاں میں وہی فلم والا رچی ہوں مگر اب میں ویسا نہیں رہا ہوں جیسا فلم میں تھا۔''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو کرنل۔'' مالکم نے پوچھا۔

کرنل نے کہا۔ ''کہیں نہ کہیں تو رہنا ہی پڑتا ہے۔'' تبھی ورجینیا بول پڑی۔ ''میرا خیال ہے یہ کتے آپ کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔''

''ہاں یہ میرے لیے بہت قیمتی ہیں۔'' کرنل نے کہا۔ ''کم از کم اس جگہ۔ کوریو کی طرح میں بھی ناامید ہو رہا تھا۔''

مالکم نے سوچا ایجنٹ نے تو کرنل کا تذکرہ کسی نگراں کی طرح کیا تھا۔ مگر بات کچھ اور تھی جس سے وہ پوری طرح واقف نہ تھا۔

''آجاؤ۔'' کرنل نے انہیں دعوت دی۔ پھر اس نے پھاٹک کی کنڈی پر ہاتھ ڈالا مگر اس میں جنبش نہ ہوئی تو اس نے اس پر ایک ضرب لگائی اور کھول دیا۔

اس نے کہا۔ ''میکس اور مورس کی فکر نہ کرو یہ میرے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔''

''نہیں میں ان سے خوف زدہ نہیں ہوں۔'' ورجینیا نے کہا۔

''اچھا۔ مگر پھر بھی تمہیں چوکنا رہنا چاہیے۔'' کرنل نے کہا۔ ''اس نسل کے کتے زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتے ان پر بہت محنت کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر یہ قابو میں آتے ہیں۔''

''لیکن یہ تو آپ کے تربیت یافتہ ہیں۔'' ورجینیا نے پوچھا۔

''ہاں۔ انہیں میں نے خود تربیت دی ہے۔'' کرنل نے مسکرا کر کہا پھر وہ کتوں کی طرف مڑا اور قدرے تحکم آمیز لہجے میں بولا۔ ''گو ہوم (گھر جاؤ)'' دوسرے ہی لمحے دونوں کتے منہ گھمایا اور واپس ہو گئے۔

کرنل کا اقامتی کمرہ صاف ستھرا تھا۔ فرنیچر قدرے پرانا تھا۔ دیوار پر تصاویر تھیں جن میں مناظر فطرت نقش تھے ملاقاتیوں کے لیے کرسیاں موجود نہ تھیں۔

''تم لوگ بیٹھو میں مشروب لاتا ہوں۔'' کرنل نے کہا۔

جب وہ چلا گیا تو ورجینیا نے کہا۔ ''وہ اچھا آدمی لگتا ہے۔''

''اور پرکشش بھی ہے۔'' مالکم نے تائید کی۔

کرنل جب واپس ہوا انہوں نے دیکھا اس نے اپنے انگوٹھے اور ایک انگلی کی مدد سے ایک سلور ٹرے تھام رکھی تھی اس کی بقیہ انگلیاں بیساکھی کو پکڑے ہوئے تھیں۔ ٹرے پر چائے اور بسکٹ تھے۔ کرنل نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے اس کے سوا میں اور کچھ اور پیش نہیں کر سکتا۔''

ٹرے کو دیکھتے ہوئے مالکم نے نوٹ کیا کہ سارے برتن ٹین کے بنے ہوئے ہیں۔ جب مالکم نے اپنا پیالہ اٹھایا تو اسے احساس ہوا انہیں ٹین کو موڑ کر بنایا گیا ہے' ٹی پاٹ بھی ایسی ہی تھی۔ ''میرے خدا۔'' مالکم نے حیرت سے کہا۔ ''کرنل کیا یہ برتن تم نے خود کسی بندی کیمپ میں رہ کر بنائے تھے۔''

''خوب تم نے درست اندازہ لگایا۔'' کرنل نے فخریہ کہا۔ ''ان دنوں میں اپنے اس ہنر پر فخر کیا کرتا تھا۔ ان سے کام چل جاتا ہے۔ اور پھر اس جگہ یہی برتن کافی ہیں۔ ان کا ہینڈل زیادہ گرم تو نہیں ہو رہا ہے۔''

''نہیں یہ ٹھیک ہے۔'' ورجینیا مسکرائی۔

مالکم نے نوٹ کیا وہ اچھے موڈ میں ہے۔ اچھے موڈ میں وہ زیادہ بھلی لگتی تھی۔ حالانکہ اب وہ ایک بھرپور عورت تھی تاہم ایسے لمحات میں وہ جوان جوان سی لگنے لگتی تھی۔

کرنل کی آنکھیں جواب میں چمکیں۔ وہ مالکم سے مخاطب ہوا۔ ''میرا خیال ہے اپنی بیوی کے ساتھ تمہاری گرمیاں اچھی گزریں گی۔''

''ہوں۔'' مالکم نے یونہی ہنکاری بھر دی۔ چائے کا کپ گرم ہو رہا تھا۔

''میں پیالے پر کھدے کچھ حروف دیکھ رہی ہوں۔'' ورجینیا نے کہا۔ پھر اس نے بلند آواز سے پڑھا۔

''کرنل ڈیوڈ رچی آر ایم ای کی خدمت میں ساتھی آفیسروں کی جانب سے آزادی کے دن مورخہ چودہ مئی 1945ء کے موقع پر پھر

ورجینیا نے کرنل سے کہا۔ ''آپ یقیناً بہت مقبول ہوں گے۔''

''سب میں تو نہیں۔'' کرنل نے کہا۔ ''البتہ نوجوان آفیسروں کے اس گروپ میں میں مقبول تھا۔ یہ سب کے سب لیڈر تھے۔ کچھ نفرت زدہ تھے کچھ مایوس۔ کچھ اچھے تھے کچھ برے۔ یہ خدمت میرے سپرد تھی کہ میں ان سب کو منظم رکھوں۔ یہ میرا کام تھا کہ کسے تحفظ دوں کسے آگے رکھوں۔ ہم سب کے سب قیدی تھے۔ ڈنکرک کی جنگ کے بعد سے ہم قید میں تھے بندی کیمپوں میں ہر وقت حکمت عملی کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔'' کرنل چند لمحے رک کر بولا۔ ''یہ ٹرے مجھے جن لوگوں نے دی تھی صرف وہی زندہ بچے تھے۔ وہاں بندی کیمپ میں کسی کو علم نہیں ہوتا تھا کہ کون کب مر جائے گا۔ یہ تو بالکل فلموں جیسی بات ہوئی۔'' ورجینیا نے کہا۔

''ہاں ہے تو.....'' کرنل نے کہا۔ ''مگر فلموں میں بہت سی باتیں درست ہوتی ہیں۔ بس ان کا پس منظر حقیقی نہیں ہوتا۔ کرسمس سرنگ والی بات بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے واقعی اپنے آدمیوں سے سرنگ کھودنے کے لیے کہا تھا جنگ میں کافی وقت گزر چکا تھا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ خطرے سے بچے' بہت سے ساتھی بالکل فوجی نہیں رہے تھے۔ وہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی سویلین لوگوں کی طرح کر رہے تھے۔ میں اسی لیے سرنگ کی تجویز دی تھی۔ میرا مقصد انہیں یاد دلانا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ یہ میرا طریقہ کار تھا میں ان کی صلاحیتوں کو زنگ آلود نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔''

کرنل کا لہجہ خوابناک ہو چلا تھا۔ وہ بولتا رہا۔ ''بعض لوگ میرے پیچھے میری برائی کرنے لگے تھے۔ لیکن زیادہ تر میری عزت کرتے تھے۔''

''گویا آپ کا کام تھا انہیں یکجا رکھنا۔ خواہ کسی طرح۔''

کرنل کے چہرے کے نقش بدل سے گئے ان میں سختی اور خشونت ابھر آئی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

''ہاں یہی میرا کام تھا۔ اور میں نے انہیں یکجا رکھا تھا۔ جھوٹ بول کر ڈرا دھمکا کر' دلاسے دے کر ہر طرح اس میں میری بڑی توانائیاں ضائع ہوئی تھیں۔ ہم سب بہرحال کسی بڑی اتھارٹی کے تابع نہ تھے۔ وہ لوگ بھی اگر قیدی نہ ہوتے تو میری بات کبھی نہ مانتے۔ سب جانتے ہیں کوئی گروہ اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک ان کا کوئی مشترکہ مقصد نہ ہو اور ان میں نظم و ضبط نہ ہو۔'' رک کر کرنل نے مالکم اور ورجینیا کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ کہنا بیکار ہے کہ کیا کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان سے احکامات پر عمل کرانے والا ایسی حیثیت کا حامل ہو کہ ان پر کیا حکم چلا سکے اور انہیں حکم ماننے پر مجبور کر سکے۔''

''پھر کیا تمہیں کچھ مسلح محافظ مدد کے لیے مل گئے تھے۔ یا تم نے جرمنوں سے مشین گن حاصل کر لی تھی۔'' مالکم نے کہا وہ کچھ اسی طرح بے دھڑک بولنے کا عادی تھا۔

کرنل نے اسے غور سے دیکھا جیسے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر بولا۔ ''جرمنی میں میری ساکھ ایسی نہ تھی کہ ہم میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سنانا چاہوں گا اس میں ایک اہم نکتہ چھپا ہے۔'' اس نے کرسی سے ٹیک لگالی اور بولا۔ ''تم لوگوں نے میرے کتوں کو حیرت سے دیکھا ہوگا جرمن کتوں کو تربیت دینے کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں سنتریوں کو ڈوبرمین نسل کے کتے ملے ہوئے تھے کہ پہرہ داری میں مدد کر سکیں۔ مسٹر مالکم عملی طور پر ایک کتا کسی مسلح سنتری سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جانوروں کے لیے مشکل نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو بھی بے جھجک روک سکیں۔ آدمی خواہ فریاد کرے یا گالی بکے انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی۔ جنگی کیمپ

میں قیدیوں کا جوانچارج تھا اسے کتوں کا آقا کہا جاتا تھا۔ یہ شخص کتوں کے درمیان خود کو شناخت کرنے کے بعد چند معمولی ہدایات پر عمل کرتا تھا اور بس..... پھر کتے اس کے اشارے پر چلتے تھے۔ کتوں کو پہرہ دینے کے رموز ابتدا ہی میں سکھا دیے جاتے تھے۔ انہیں جو حکم ملتا ہے۔ وہ صرف اپنے آقا سے' آقا کے احکامات مختصر ہوتے تھے اور یہ حکم صرف وہی آقا دیتا تھا۔ مثلاً Search (تلاش کرو) یا Arrest (گرفتار کرو) کتے یہ لفظ سن کر سمجھ جاتے تھے کیا کرنا ہے۔ جب قیدی دیکھ لیتے تھے کہ کتے آقا کا حکم کس طرح مانتے ہیں تو یہ کتے ان کے لیے خوف کی عدالت بن جاتے تھے۔ ایک ڈوبرمین کتا ضمیر وغیرہ سے آزاد چیز ہوتا ہے۔ وہ صرف کتا ہوتا ہے ایک تربیت یافتہ کتا اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا۔ جب وہ بچہ ہوتا ہے اسے سدھایا جاتا ہے۔ پھر آگے جا کر وہ کسی خاص مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسے بڑی عرق ریزی سے اسباق دیے جاتے ہیں۔ اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ یہ حکم بجالائے۔ ہر قیمت پر یہ بات ان کے ذہن میں بٹھانے ضروری ہوتی ہے اس کے علاوہ اس کے ذہن میں یہ بھی بٹھانا ہوتا ہے کہ ہر حکم یعنی ہر کسی کا (سوائے آقا کے) دیا ہوا حکم حکم نہیں ہوتا۔ ایک بار سدھائے جانے کے بعد ڈوبرمین کتا دوسری طرح نہیں بدلا جا سکتا۔ جب امریکی فوجوں نے قبضہ کیا تھا جرمن فوجیوں نے ہتھیار پھینک دیے تھے۔ بہت سے جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے تھے لیکن یہ کتے انہیں امریکی فوجیوں کو چن چن کر مارنا پڑا تھا کیونکہ انہیں مقابلے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ آقا یہ حکم دے کر خود بھاگ گیا تھا۔ میں اس منظر کو فراموش نہیں کر سکتا' کتے تھے کہ اچھل اچھل کر امریکی فوجیوں پر حملہ کر رہے تھے گولیاں انہیں بھون رہی تھیں لیکن وہ اس سے بے نیاز آقا کا حکم بجا لا رہے تھے حتی کہ وہ سب ایک ایک کر کے مر گئے تھے۔ کوئی کتا فرار نہیں ہوا تھا۔''

مالکم نے نوٹ کیا کہ ورجینیا کرنل کی گفتگو اشتیاق اور توجہ سے سن رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ ہسپتال کس طرح پہنچے۔ کیا یہ وہی سرنگ والا معاملا تھا۔''

''ہاں۔'' کرنل نے کہا۔ وہ شاید خواتین کے ساتھ بہت نرمی سے بولنے کا عادی تھا۔ ''جیسا کہ میں نے کہا۔ اس سرنگ کا واحد مقصد یہ تھا کہ میں لوگوں کی توجہ کسی ایک طرف رکھوں۔ جنگ قریب الختم تھی ایسے میں فرار ہونے کی کوئی کوشش حماقت ہوتی۔

ہمارے پاس پہلے سے ایک بیلچہ اور ایک ٹرالی موجود تھی جسے ہم نے چھپا رکھا تھا۔ ہم نے کچھ لیمپ بھی بنائے تھے۔ یہ پالش کی ڈبیوں سے بنائے تھے اس میں ہم چربی استعمال کرتے تھے۔ گویا راستہ بنانے کے لوازمات تو تھے۔

جرمنوں کو اس دوران ایسے معاملات سے نمٹنے کے طریقے آ گئے تھے۔ قید کے دوران سرنگ کھودنا آسان کام نہیں ہوتا۔ نومبر کے آخر میں ہمارے کچھ ساتھیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ کچھ کام مجھے خود بھی کرنا چاہیے۔ پھر میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ حالات عموماً قید کے دنوں میں خراب ہی ہوئے ہیں۔ اس کام کے دوران ہم سانس لے سکتے تھے اس وقت ہمارے جسموں پر لباس نہیں ہوتا تھا۔ باہر آ کر ہم گرد جھاڑ کر لباس نہیں لیتے تھے۔ بہت جلد کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ مگر ان حالات میں ہم کپڑے پہن کر کام نہیں کر سکتی تھے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ ہماری جلد سے ڈاکٹر معائنے پر بھید کھل سکتا ہے۔ اس روز کام کرتے ہوئے مجھے دو گھنٹے ہوئے تھے میں آہستہ آہستہ سرنگ کے پچھلے حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک سرنگ کی چھت گری تھی۔ میرا سارا جسم سینے تک دب گیا۔ چہرہ بچ گیا تھا۔ ریت کی

صفائی کا کام خطرناک تھا۔ ابھی میں ریت سے نکلا ہی تھا کہ ایک بار پھر سرنگ کی چھت کا کچھ حصہ اور گرا اس بار وہ لیمپ جو لٹکا ہوا تھا وہ بھی گر گیا۔ اس کی چربی گرم تھی۔ یہ چربی میری ران پر گری تھی بدقسمتی سے لیمپ بجھا نہیں تھا بتی جل رہی تھی میرا نچلا جسم ٹخنوں تک جلنے لگا۔'' کرنل تھوڑا سا چپ ہوا۔ پھر بولا۔

''خدا جانے میں نے کس طرح جسم کی آگ بجھائی تھی پھر میں سرنگ میں اندر کی طرف گھسٹنے لگا میرے دوسرے ساتھیوں کو اس حادثے کا کوئی علم نہ تھا تاہم جب میں سرنگ کے دہانے پر پہنچا تو انہوں نے مجھے گھسیٹ لیا۔''

ورجینیا کی طرح اب مالکم بھی کرنل کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔

کرنل کہہ رہا تھا..... ''سنتریوں کو تو اب ساری بات بتانی ہی تھی۔ کیوں کہ میری حالت چھپائی جا نہیں سکتی تھی۔ پھر انہوں نے مجھے ہسپتال بھیج دیا۔ میں وہاں جنگ کے خاتمے تک رہا لیٹنے اور سوچنے کے لیے..... مجھے حیرت تھی کہ کمانڈر کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اس کام کا سرغنہ میں ہی تھا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ میری وجہ سے قیدی تہذیب کے دائرے میں رہ رہے ہیں۔ یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ امریکی فوج نے آ کر ہمیں رہائی دلائی تھی۔ اسپتال سے رخصت ہو کر میں پہلے ہوٹلوں میں ٹھہرا اور معذوروں کی سی زندگی گزارتا رہا۔ پھر ایک صحافی نے میرے اوپر کتاب لکھی۔ اس کتاب کو قلم والوں نے پسند کر لیا۔ انہوں نے مجھ پر فلم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تب مجھے ہالی وڈ لایا گیا بہ طور ٹیکنیکل ایڈوائزر۔ میری پنشن معمولی سی تھی۔ یہ نوکری میرے لیے نعمت تھی۔ پھر اب ہر طرف میرے چرچے ہو رہے تھے میں نے وہاں سے اچھی رقم کمائی۔ میں انگلینڈ واپس نہیں آ سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں کے قانون کے مطابق میری بہت سی رقم اڑ جاتی۔ میں نے پھر پراپرٹی ایجنٹ مسٹر کیورو سے دوستی پیدا کی۔ پھر میکس اور مورس کو تربیت دی۔ تب سے میں خاصی مطمئن زندگی گزار رہا ہوں۔ زندہ رہنا میرا ایمان ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کے لیے آدمی بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنے کا حقدار ہوتا ہے۔'' رک کر کرنل نے پوچھا۔ ''کیوں۔ کیوں میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''آپ کا خیال صحیح ہے۔'' ورجینیا نے کہا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ میں ہمدردی شامل تھی۔

''میں چاہتا ہوں موجودہ صورت حال کو تم لوگوں پر واضح کر دوں۔'' کرنل اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں پھنسائے ہوئے کہا۔ پھر وہ جھٹکے سے اٹھا اور بیساکھیوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''تم نے میری کہانی سن لی۔ میں سمجھتا ہوں اسے سنانے کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم دونوں کو مزید روکا جائے۔ چلو میں تمہیں دروازے تک چھوڑ دوں۔''

''ہم چلے جائیں گے۔'' مالکم نے کہا۔ ''زحمت کی ضرورت نہیں۔''

''نہیں میں چلوں گا۔'' کرنل نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

ورجینیا اسے مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ آخر اس نے کہا۔

''معاف کیجیے گا کرنل..... شاید ہمیں زیادہ نہیں رکنا چاہیے تھا۔ چائے اور بسکٹوں کا شکریہ۔''

''اوہ..... مائی ڈیئر ایسی کوئی بات نہیں۔'' کرنل نے کہا۔ ''تمہاری یہاں موجودگی میرے لیے باعث مسرت ہے۔ تمہارے مکان کے پچھلے کرائے دار کے جانے کے بعد میں نے سارے مکان کو اچھی طرح صاف کیا تھا ہو سکتا ہے تم مکان کے سامنے پودے لگانا چاہو میرے لیے ایسی

مشغولیات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً تم جیسی پرکشش خاتون کی جھلکیاں۔ کبھی دھوپ میں لیٹے کبھی پودوں کو پانی دیتے۔ سچ مچ آپ کی گرمیاں اچھی گزریں گی۔ مجھے یقین ہے تم ساری گرمی رکو گی کوریو کسی ایسے آدمی کو مکان دیتا ہی نہیں جو جلد بھاگنے والا ہو۔ اس کے ذرائع زیادہ نہیں ہیں۔ وہ یہ باتیں اچھی طرح دیکھ کر مکان دیتا ہے۔ پھر یہاں آتے ہی وہی لوگ ہیں جو کہیں اور جا نہیں سکتے۔ کیوں میں غلط کہہ رہا ہوں۔'' کرنل نے ٹھہر کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر مکارسی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''آؤ مالکم..... اب چلیں۔'' ورجینیا نے کہا۔

''آپ سے اچھی گفتگو رہی۔'' مالکم نے کرنل سے رسماً کہا۔

''ہاں..... اچھی بھی اور ضروری بھی۔'' کرنل نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ لوگ اب لان میں آ گئے تھے۔ گیٹ کی سمت بڑھتے ہوئے ورجینیا نے کرنل کو قریب سے دیکھا اور مالکم کو محسوس ہوا جیسے ورجینیا نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا ہو۔

''کیا تم تھکن محسوس کر رہی ہو مسٹر مالکم۔'' کرنل نے پوچھا۔ پھر بولا۔ ''یقین کرو میں تم دونوں کے احساسات کا پورا خیال رکھوں گا جب تک میرے آرام میں خلل نہیں پڑتا۔ میں خواتین کے ساتھ سختی پسند نہیں کرتا اور پھر.....'' کرنل ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔

''سرنگ کے معاملے کے بعد اب صورت حال یوں ہے کہ روح تو بہت بے چین ہوتی ہے مگر جسم۔'' وہ بولتے بولتے ٹھٹکا اور بولا۔ ''مگر نہیں مسٹر مالکم..... وہ پھول ہی کیا جسے سونگھا نہ جا سکے۔ تم اپنی موجودہ حالت کو بدتر نہ سمجھو۔ بعض لوگوں کو ایسی ہی حالت اچھی لگتی ہے۔ مگر بعض چیزیں خیال سے بھی زیادہ جلد بدل جاتی ہیں۔ مجھے امید ہے آئندہ چند روز میں تمہارے خیالات میں بھی تبدیلی آ جائے گی۔''

''یہ تم میری بیوی سے کیا کہہ رہے ہو۔'' معاً مالکم نے مداخلت کی۔

ورجینیا نے جلدی سے بات بدلی اور جواباً بولی۔

''چلو..... باقی باتیں بعد میں کریں گے۔''

کرنل مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ کسی بھیڑیے جیسی تھی۔

''اس سے قبل کہ تم جاؤ۔'' اس نے ورجینیا سے کہا۔ ''میں مسٹر مالکم کو کچھ دکھانا چاہوں گا۔'' رک کر اس نے کتوں کو پکارا۔ ''میکس مورس ادھر آؤ۔'' کتے فوراً آ گئے۔

''مسٹر مالکم میں تمہیں یہ دکھاؤں گا کہ یہ جانور کس طرح احکامات پر عمل کرتے ہیں۔'' وہ ایک کتے کی سمت مڑا۔ ''مورس۔'' اس نے تیز لہجے میں کتے کو پکارا اور گردن کے اشارے سے اس سے کہا۔ Kill (مار ڈالو۔)''

مالکم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے۔ دوسرے لمحے اسے اپنے سینے پر زور کا دھکا محسوس ہوا۔ کتا اس پر جھپٹ پڑا تھا اس نے اپنی دونوں اگلی ٹانگیں اس کے سینے پر رکھ دی تھیں اور اپنا جسم اٹھالیا تھا۔

مالکم زیادہ سے زیادہ اسے بازوؤں میں دبا کر بھینچ سکتا تھا اور بس۔ کتا خاصہ طاقت ور تھا۔ مالکم کے قدم اکھڑنے لگے معاً کتے نے اپنا منہ مالکم کے رخسار سے مس کیا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے اگلے پیروں پر گرنے کے بعد وہ کرنل کے پاس جا رکا۔ یہ سارا عمل چشم زدن میں ہوا تھا۔

''تم نے دیکھا مسٹر مالکم۔'' کرنل نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''کتا الفاظ کے اصل مطلب سے سروکار نہیں رکھتا اسے قیود و شرائط معلوم ہیں' تربیت دینے والا اسے کسی بھی لفظ کے ذریعے کوئی خاص عمل پر آمادہ کر سکتا ہے۔ مثلاً گھنٹی کی آواز

اسے کھانا کھانے کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ اگر زبان سے اسے کھانے کے لیے کہا جائے تو یہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ میں اگر نارمل آواز میں یعنی عام لہجے کے ساتھ نہیں اس کتے سے کہوں Kill تو اس کے نزدیک مار ڈالنے کا مطلب مار ڈالنا نہیں ہوگا وہ جانتا ہے جب میں چاہوں گا کہ وہ کسی کو ہلاک کر دے تو میں اس سے کہوں گا Kiss ''بوسہ دو۔'' کو Kill اور Kiss کے اصل معانی اس کے ذہن میں نہیں ہوتے۔ میرے پاس ایسے بہت سے الفاظ ہیں میں جن کے ذریعے ان سے مختلف کام لیتا ہوں۔ میرے سوا یہ کام اس سے کوئی اور نہیں لے سکتا۔ تم سمجھ گئے نا...... اچھا مسٹر مالکم...... خدا حافظ اب تم جاؤ تمہیں بہت کام ہوں گے۔''

اس کے بعد کرنل نے دروازہ بند کرلیا۔ پھر وہ ایک کتے سے بولا۔ ''میکس۔ نگرانی کرو۔'' وہ کتا وہیں ٹھہر گیا۔

کرنل مڑا اور دوسرے کتے کے ساتھ لان پار کر کے مکان کے اندر چلا گیا۔

☆☆

مالکم اور ورجینیا نارمل رفتار سے چلتے ہوئے اپنے مکان کی سمت چلے جو انہوں نے کرائے پر لیا تھا۔ مالکم نے سوچا ورجینیا کہیں اس لیے تو نارمل رفتار سے نہیں چل رہی ہے کہ اسے کتوں سے ڈر ہے گھر پہنچ کر ورجینیا نے دروازہ مقفل کر دیا پھر وہ کمرے میں اس کرسی پر جا بیٹھی جہاں سے کھڑکی سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔

''مالکم۔'' اس نے کہا۔ ''آج چائے تم بنالو میں تھک رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' مالکم نے کہا۔

چائے کی چسکیوں کے درمیان ورجینیا نے کہا۔

''لگتا ہے کرنل اور ایجنٹ کوریو کے درمیان تعلقات خاصے پرانے ہیں۔ مجھے یقین ہے یہاں کے اسٹور والے بھی کرنل کو ناپسند کرتے ہوں گے اس کے لیے انہیں بالکل اچھے نہیں لگتے ہوں گے۔ ہم لوگ بھی پھنس گئے ہیں مالکم۔''

''مگر۔'' مالکم نے جلدی سے کہا۔ ''یہاں تو نیو جرسی کا سارا علاقہ پڑا ہے اور وہ۔''

''وہ سب کچھ کرسکتا ہے اگر اسے علم ہو کہ وہ پکڑا نہیں جاسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سمجھتا ہے وہ بچ سکتا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔'' مالکم نے کہا۔ ''وہ ہمارا کیا کرے گا۔''

''جو کچھ اس کا جی چاہے گا۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔'' مالکم نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ آج اس نے ہمیں تھوڑا سا سہا کر مسترد کر دیا ہے۔ ہمیں اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔''

''کتا بدستور اپنی جگہ ہے نا۔''

''ہاں۔'' مالکم نے کہا۔

''وہ تم پر جھپٹا تھا تو تمہیں کیسا لگا تھا۔''

''کتا خاصا جاندار ہے۔'' مالکم نے کہا۔ ''مگر اس کا حملہ اچانک تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھے مار ڈالنے کا حکم دے گا۔ خصوصاً اس تواضع کے بعد۔''

''یہ شخص بے حد فطین اور چالاک لگتا ہے مجھے۔''

ورجینیا نے کہا۔ ''اس سے گھر کے گارڈ بھی گھبراتے ہوں گے۔ اس پر کتاب بلا سبب ہی نہیں لکھی گئی ہے۔''

''اسے تو جیل میں بند کر دینا چاہیے۔'' مالکم نے سڑتے ہوئے کہا۔

''ایسی ایک کوشش کی گئی تھی۔'' ورجینیا نے بتایا۔

''اچھا۔'' مالکم نے کہا۔ ''آج کی ملاقات میں اس نے ہمیں سمجھایا ہے کہ یہ علاقہ اس کی مملکت ہے وہ یہاں کا ماسٹر ہے۔ مختار کل...... لیکن

شاید وہ یہ بھلا بیٹھا ہے کہ وہ ایک نیم پاگل..... بوڑھا اور اپاہج بھی ہے۔ ممکن ہے اس نے ادھر کے کچھ دکانداروں اور باسیوں اور ایک ایجنٹ پر قبضہ جما رکھا ہو لیکن یہ اور بات ہے۔ رہا ہمارا معاملہ تو ہم اس کے غلام نہیں ہیں نہ اس کے ماتحت۔''

''ہم دراصل اس دیوانے کے جنگی قیدی ہیں۔'' ورجینیا نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' مالکم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہمیں کوریو سے جا کر بات کرنی چاہیے۔ ہم اس سے کہہ دیں گے کہ ہم اس خبطی کرنل کی وجہ سے یہاں نہیں رہنا چاہتے ممکن ہے ہمیں ہماری رقم واپس مل جائے۔ اس طرح بیٹھ کر کڑھنے سے تو کام نہیں چل سکتا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' ورجینیا نے کہا۔ ''مجھے تو تم جنگی قیدیوں کی طرح لگ رہے ہو۔ فرار کے راستے سوچتے ہوئے اسکیمیں بناتے ہوئے۔''

''تو بس طے ہوگیا۔ مالکم نے کہا۔'' ہم کار تک چلتے ہیں۔'' مالکم کے ہونٹوں پر پسینہ ابھر رہا تھا۔

''کیا۔'' ورجینیا نے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ وہ منحوس کتا ہمیں کار میں بیٹھنے دے گا۔''

''تو پھر..... تم یہیں رکو اور دروازہ بند رکھنا۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ اگر نکل سکا تو میں اس کرنل کو اچھی طرح سمجھ لوں گا۔ یا تو پھر یہ دونوں کتے یہاں رہیں گے یا ہم۔''

اس نے کار کی چابیاں اٹھائیں اور تیزی سے گھر سے نکلا۔ وہ سیدھا کار کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر ادھر موجود کتے نے منہ سے صرف ایک بار آواز نکالی..... فوراً ہی سامنے والی عمارت کا دروازہ کھلا اور کرنل نے پکار کر کتے کو حکم دیا۔

''میکس اسے روکو۔''

کتے نے زقند بھری جنگلا عبور کیا اور مالکم کی سمت دیکھا۔ کار چند قدم دوری پر تھی۔ مالکم نے لپک کر کار میں گھسنا چاہا مگر کتا بہت تیز تھا۔ وہ مالکم تک آ گیا اور اس نے اس کی کلائی پر منہ مارا اور اسے دانتوں میں دبا لیا۔ مگر زور نہیں لگایا۔ مالکم ساکت ہوگیا۔ کتا اب ساکت تھا۔ صرف اس کی ہانپ سنائی دے رہی تھی۔

اس وقت دوسرا کتا اور کرنل ساتھ ساتھ جنگلے کے قریب پہنچے۔

''مسٹر مالکم۔'' کرنل نے کہا۔ ''میں میکس سے کہنے والا ہوں کہ تمہیں پکڑ کر یہاں لے آئے چھڑانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ یہ کلائی ٹوٹ جائے گی۔ میکس اسے ادھر لاؤ۔''

مالکم کرنل کی طرف چل پڑا۔ کتے نے بدستور اس کی کلائی منہ میں دبا رکھی تھی۔

''گڈ میکس۔'' کرنل نے کتے سے کہا۔

''چھوڑ دو۔''

کتے نے کلائی چھوڑ دی۔ جنگلے کے مخالف سمت میں کھڑے کرنل اور مالکم نے ایک دوسرے کو گھورا۔

''مسٹر مالکم.....'' کرنل نے کہا۔ ''برائے کرم کار کی چابیاں مجھے دے دو۔''

مالکم نے چابیاں اسے دے دیں جسے کرنل نے جیب میں ڈال لیا۔

''مسٹر مالکم۔'' کرنل نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں تم موقع محل کو سمجھ لو۔ دراصل مجھے تین پونڈ کا کرسکو کا ایک ڈبا درکار ہے۔ تمہاری جیب میں جتنی رقم ہے وہ بھی مجھے دے دو اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''میرے پاس کوئی رقم نہیں۔ میں گھر سے لا کر دے سکتا ہوں۔''

''نہیں..... میں کوئی لٹیرا نہیں ہوں۔ میں صرف تمہاری نقل و حرکت پر پابندی لگانا چاہتا ہوں۔ میرے پاس اور بھی طریقے ہیں۔ اپنی

جیبیں خالی کر کے دکھاؤ۔''

مالکم نے جیبیں پلٹ کر دکھائیں۔

''ٹھیک ہے۔'' کرنل نے کہا۔ ''اپنا پرس ڈائری اور چند سکے جو تمہارے پاس ہیں وہ مجھے دے دو۔ تمہارے کاغذات ضرورت پر تمہیں واپس مل جائیں گے۔'' پھر کرنل یہ سب چیزیں لے کر اپنی جیب میں ڈال لیں۔ وہ ڈبا اٹھانوے سنٹ میں مل جائے گا۔ یہ ڈبا ایک ڈالر کا نوٹ میکس تمہارے ساتھ گارنر کے اسٹور تک جائے گا۔ تم میرے لیے کرسکو خریدنا اور واپس آ جانا۔ کتا یہ تھیلا نہیں لا سکتا۔ ابھی میرے ہاں ماہانہ سپلائی کے آنے میں تین دن باقی ہیں۔ اسٹور والے سے کہنا کہ اس ماہ وہ سامان نہ لائیں۔ کیونکہ آئندہ سے یہ کام تم میرے لیے کرو گے۔ مسٹر مالکم مجھے امید ہے تم وقت خراب کیے بغیر جلد واپس آ جاؤ گے۔'' کرنل نے کہا۔ ''میکس اور بتایا..... اسٹور۔''

کتا چوکنا ہو گیا۔

مسٹر مالکم نے کرنل سے کہا۔ ''رکنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ کتا ہیجان زدہ ہو جائے گا۔ بس جاؤ۔ میں اور مورس مل کر تمہاری بیوی کا تب تک دل بہلائیں گے۔''

☆☆

اسٹور صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ جو ایک تاریک سے مکان کا حصہ تھا۔ یہاں ایک جانب ایسی اشیا رکھی تھیں جن کے نام تک مالکم نے کبھی نہیں سنے تھے۔

''اچھا تو یہ کتا تمہارے ساتھ آیا ہے۔'' اسٹور میں موجود موٹی سی عورت نے مالکم سے کہا۔

''کرنل جی کو کرسکو کا ایک ڈبا چاہیے۔''

اس نے کہا۔ اس نے جان کر کرنل کا نام لیا تھا تاکہ ردعمل دیکھ سکے۔

''اچھا تو تم اس کے لیے مددگار ہو۔''

''یوں ہی سمجھو۔''

''بہادر آدمی ہے۔'' عورت نے آہستہ سے کہا۔ شاید وہ کسی سے ڈر رہی تھی۔ ''بعض لوگ اسے قابل رحم سمجھتے ہیں۔ مگر توبہ کرو میں تو سمجھتی نہیں وہ..... مگر چھوڑو..... اور ایک حیرت انگیز آدمی ہے۔ یہ کتا سارا سودا لے جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ہم لوگوں کے سوا ادھر کا کوئی فرد اس سے نہیں ملتا۔ پورا سال وہ تنہا رہتا ہے بس گرمیوں میں نقشہ بدلتا ہے۔'' اس نے مالکم کو غور سے دیکھا اور بولی۔ ''غالباً تم اس کے نئے کرائے دار ہو۔ اچھا ہے کہ تم اس کی مدد کر رہے ہو ورنہ پچھلے سال والے کرائے دار نے تو حد ہی کر دی تھی۔ وہ چپکے سے کھسک لیا تھا اس کے بعد ہم نے نہ اس کی کھال دیکھی نہ بال۔ کرنل کو اس نے مہینے کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ یہ بات خود کرنل نے ہمیں بتائی تھی۔''

''کیا ان مکانات کا مالک کرنل ہی ہے۔''

''ہاں' اس کے پاس ادھر اور بھی پراپرٹی ہے۔''

''اور یہ اسٹور۔ کیا یہ بھی اسی کا ہے۔''

''پہلے تھا۔ ہم نے اس کی لیز اس سے لے لی ہے۔''

عورت نے بتایا۔ ''دراصل میرے شوہر کا خیال تھا کہ ادھر وہ ایک گیس اسٹیشن کھولے گا۔ ویسے ابھی تک تو یہ علاقہ غیر آباد ہے۔ البتہ کرنل رہا تو یہ ضرور ترقی کرے گا۔''

کتا اب بے چین ہو رہا تھا۔ اور خود مالکم کو ورجینیا کی فکر لاحق تھی اس نے کرسکو کا ڈبا لیا اور پھر کتے کے ساتھ واپس ہو گیا۔

وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ واقعی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اپنے گھر کے صدر دروازے پر اس نے دستک دی۔ ورجینیا نے دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا کہ ورجینیا کے جسم پر دوسرا لباس ہے۔

ورجینیا نے ہٹ کر اسے اور کتے کے لیے راستہ دیا۔

کرنل گھر میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مالکم کو دیکھا اور بولا۔ ''تم کچھ الجھے ہوئے نظر آتے ہو۔ مگر مجھے ادھر بہت سکون ملا ہے۔ تمہاری خوب صورت بیوی کی صحبت میں وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔''

مالکم نے ورجینیا کی سمت دیکھا۔ جس نے خاصا اونچا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

''شام ہو چکی ہے۔'' کرنل رچی نے کہا۔ اس نے مالکم کی نظریں سمجھ لی تھیں۔ ''لباس تبدیل کرنے کے لیے میں نے ہی مشورہ دیا تھا۔''

مالکم سمجھ گیا کہ ورجینیا بھی اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہوئی ہوگی۔

''یہ ہے تمہارا سامان۔'' مالکم نے اس سے کہا۔ ''بقیہ رقم تھیلے میں ہے۔''

''شکریہ۔'' کرنل نے کہا۔ ''تم نے اسٹور والے سے کہہ دیا ہے تاکہ اس ماہ انہیں سامان لانے کی ضرورت نہیں۔''

''نہیں۔'' مالکم نے کہا۔ ''میں بھول گیا۔ دراصل میرا ذہن یہ جاننے میں لگا ہوا تھا کہ تم نے یہاں کہاں کہاں قبضہ جما رکھا ہے۔''

کرنل نے اس کے طنز کو نظر انداز کر دیا۔

''کوئی حرج نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کل بتا دینا۔''

مالکم نے پوچھا۔ ''اب ذرا یہ بتا دو۔ یہ تمام کام مجھے کن کن اوقات میں کرنے ہوں گے ایسا تو نہیں کہ تم نے مجھے بھی کتا سمجھ لیا ہو کہ ادھر سیٹی بجائی ادھر میں چلا فوراً۔''

''اوہ مسٹر مالکم۔'' کرنل نے سکون سے کہا۔ ''مجھے تمہاری بیوی سے معلوم ہوا ہے کہ تم کوئی آرٹسٹ ہو اور خاصے موڈی ہو۔ تم اسی لیے چڑچڑے ہو رہے ہو۔ بہرحال ہم جلد کوئی طریقہ ڈھونڈ لیں گے جو ہم دونوں کے لیے مناسب ہوگا ویسے نئے لوگوں کو میرے احکامات قبول کرنے میں کچھ وقت ضرور لگتا ہے۔ اس کے بعد یہ مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ سب کچھ معمولات کا حصہ بن جاتا ہے۔ کب کھائیں' کب صفائی کریں' کب کام کریں' کب سوئیں۔ وغیرہ بہرحال تم گھبراؤ نہیں مسٹر مالکم بعد میں تمہارے کام سارے قطعاً ناگوار نہیں لگیں گے دراصل ابھی تمہاری عادت نہیں پڑے ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قدرے احمق ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ میرا رویہ کیسا ہوتا ہے اس کا علم تمہیں جلد ہو جائے گا۔ کیمپ کی قید کے دوران مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ کامیابی کا راز کیا ہوتا ہے۔ میں دوسروں کی ہر چال پر نگاہ رکھتا ہوں۔ بہرحال یہ تو وقت بتائے گا کہ تم کس طرح کی روش اختیار کرتے ہو۔'' کرنل کی آنکھیں کسی اندرونی خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''میں نے ماضی میں جن مخلوق لوگوں سے بھی معلومات کی ہے ان میں سے زیادہ تر اپنے سارے کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ ایسے کام جیسے ادھر ہوتے ہیں۔'' اس نے نامکمل مکانوں کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں آری یا سدلا چلانا آتا ہے۔ ادھر اس کا کام کافی ہے۔ نہ آتا ہو تو میں سکھا دوں گا۔ پھر تمہیں بے زاری نہیں ہوگی۔ تم ان مکانوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کرنا۔''

''میرا خیال ہے یہ تجربہ تمہارے لیے نیا ہوگا کیوں۔''

مالکم نے سر ہلایا اور کاٹ دار لہجے میں بولا۔

''اچھی بات ہے۔ ورجینیا کو اس سلسلے میں خاصی پریشانی تھی اب وہ خوش ہوگی کہ میری مصروفیت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''بھئی تم لوگ آپس میں الجھو نہیں۔''

لرل نے کہا۔ ''اس سے توانائی ضائع ہوتی ہے۔'' وہ اٹھا اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کتوں کو آواز دی۔ ''میکس، مورس، چلو۔'' پھر وہ باہر نکل گیا۔

☆☆

مالکم نے دروازہ مقفل کرتے ہوئے کہا۔

''اب۔''

''تم نے مجھ پر طنز کیوں کیا۔'' ورجینیا نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''لڑومت۔'' مالکم جلدی سے بولا۔ ''ہمارے پاس سوچنے کے لیے بہت سی ضروری باتیں ہیں۔''

''شاید تمہیں میرے لباس پر اعتراض ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' وہ عجلت سے بولا۔ ''لعنت بھیجو اس پر میں موجود مسئلے پر سوچ رہا ہوں۔''

''تم اسے کس طرح حل کر سکتے ہو۔ یہ آدمی بہت ہی بدمعاش ہے۔''

ویا ورجینیا کو اس پر بھروسہ نہیں تھا۔ وہ فرش پر ٹہلنے لگا۔

آخر ورجینیا نے کہا وہ سونے جا رہی ہے۔ اسے اطمینان ہوا۔ اس کے دماغ میں ایک منصوبہ پرورش پا رہا تھا وہ نہیں چاہتا کہ ورجینیا اس میں رخنہ ڈالے۔

خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے وہ اسٹوڈیو میں چلا گیا ایک کارٹن میں مصوری کا سامان تھا۔ وہ ادھر بڑھا اس نے سوچا۔ کرنل کے مکان کے گرد تیز روشنی ہو رہی تھی۔ کرنل نے چاروں طرف گھوم کر معمول کے مطابق اطمینان کر لیا تھا اب ادھر ایک کتا پہرے پر تھا۔ جو سامنے دیکھ رہا تھا۔ مالکم نے ایک جار اٹھایا پھر وہ صدر دروازے کی طرف چلا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر وہ چند قدم ننگے پاؤں چلا تاکہ رفتار میں تیزی لا سکے۔ پھر اس نے جھک کر جار کو فضا میں

اندازِ فکر

☆ ماں کی آنکھ سے گرا ہوا ایک آنسو سات آسمانوں کو ہلا دیتا ہے۔

☆ علم کے راستے پر جو مرتا ہے اسے شہید کا مرتبہ ملتا ہے۔

☆ زبان ایسی چیز ہے جو پل میں دوست اور پل میں دشمن بنا دیتی ہے۔

☆ یہ ضروری نہیں کہ انسان خوب صورت ہو، ضروری ہے کہ انسان خوب سیرت ہو۔

☆ دوسروں کی عزت کرو اگر تم عزت دار بننا چاہتے ہو۔

☆ کوشش نہ کرنے سے کوشش کر کے ناکام ہو جانا بہتر ہے۔

☆ استاد کا احترام انسان کو دنیا کی سیر کرا دیتا ہے۔

☆ میٹھے بول غصے کو دور کر دیتے ہیں۔

☆☆

جھکولا دیا۔ اور اسے سامنے کی طرف اچھال دیا اس طرح کہ وہ سامنے کے گھر کے جنگلے سے ٹکرا جائے۔ مگر جنگلا ذرا دور تھا۔ جار اس تک پہنچنے سے قبل ہی گر گیا مگر اس میں بھرا رنگ اچھل کر دور تک بکھر گیا۔ کتا تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اس نے حملہ نہیں کیا کیونکہ اسے حکم نہ تھا۔ تاہم وہ بھونکنے لگا تھا۔ مالکم اپنے گھر کی اوپری سیڑھی پر رک گیا۔ جس وقت اسے سامنے کے مکان کے دروازے پہ کرنل رچی نظر آیا، اس نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کان سے لگا کر اس کا مذاق اڑایا۔ دو تین گالیاں جرمن زبان میں فضا میں اچھالیں اور اپنے گھر میں واپس ہو گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ مڑا۔ کتا اس کے تعاقب میں دروازے پر آ گیا تھا۔ اور پٹ کو کھرچ رہا تھا۔ مالکم کھڑکی کی طرف جا کھڑا ہوا۔

اس عرصے میں کتا بھی کھڑکی کی طرف آ گیا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس نے کھڑکی پر چھلانگ

لگائی۔ وہ زیادہ اچھل نہ سکا تو مزید پیچھے ہٹا اس نے دوبارہ چھلانگ لگائی مالکم اسے مرحلے کا منتظر تھا۔

اسے معلوم تھا کہ کھڑکی پہ شیشہ لگا ہے کتا جس کی طرف سے بے نیاز ہے۔ وہ بہرحال اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کتے نے چھلانگ لگائی۔ اس کا منہ شیشے سے ٹکرایا اور چپک گیا۔ ویسے اگر وہ شیشہ توڑ بھی لیتا تو بھی اندر نہیں آسکتا تھا۔ فریم کے ٹوٹے شیشوں پر بھی گرتا اور ضرور زخمی ہوتا۔ ہوسکتا ہے ناکارہ ہی ہوجاتا۔ تب کرنل کے لیے صرف ایک کتے کے ساتھ کچھ کرنا آسان نہ رہتا۔ مالکم کا منصوبہ خاصا ذہانت آمیز تھا۔

کتا ناکام ہوکر پھر زمین پر جا گرا۔ خود کرنل کے لیے بھی کھڑکی کے شیشے کو توڑنا آسان نہ تھا۔ اس میں بھاری پتھر اٹھا کر پھینکنے کی قوت نہیں تھی۔ گھر کا دروازہ مقفل تھا۔ کرنل کسی بھی طرح اندر نہیں آسکتا تھا۔ اس نے کرنل کے لیے سب راستہ مسدود کردیے تھے۔ یقیناً اب اسے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی دن کی ضرورت تھی۔

کتا ناکام ہوکر جب واپس ہوا تو کرنل نے بیساکھی سے ہاتھ ہٹا کر اس کا سر سہلایا' کتا اس کے حکم پر ہی واپس ہوا تھا۔ اس نے پھر دوسرے کتے کو آواز دی۔ اس کتے نے آکر صحن میں جگہ بنالی۔ پھر کرنل اور وہ کتا دونوں گھر میں چلے گئے۔

مالکم مطمئن انداز میں مسکرایا۔ اس نے دروازے کو چیک کیا۔ پھر وہ ہال سے گزر کر شب خوابی کے کمرے میں گیا۔ ورجینیا اٹھی ہوئی تھی وہ ادھر دیکھ رہی تھی جدھر شور ہوا تھا۔

''یہ تم کیا کررہے تھے۔'' اس نے پوچھا۔

''میں نے صورت حال میں کچھ تبدیلی پیدا کی ہے۔'' مالکم نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں اس خبطی کو بتایا ہے کہ میں ایک آزاد فرد ہوں اور کودن بھی نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے آج رات وہ سو نہیں سکے گا۔ میں وہی ترکیبیں کررہا ہوں جو جنگی قیدی کرتے ہیں میں نے اس بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔''

ورجینیا نے کہا۔ ''تمہیں علم ہے تم نے اگر گھر سے باہر قدم نکالا تو وہ ان کتوں کی مدد سے تمہارے ساتھ کیا کچھ کرسکتا ہے۔''

''میں باہر نہیں جاؤں گا۔'' مالکم نے کہا۔

''تم بھی نہیں جاؤ گی۔ ہم یہیں انتظار کریں گے کچھ دنوں۔''

''کیا۔'' ورجینیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں۔'' مالکم نے کہا۔ ''کل یا اس کے بعد والے دن کرنل کے ہاں ماہانہ سودے اور ضروری سامان کی سپلائی ہوگی۔ میں نے انہیں منع نہیں کیا تھا۔ کوئی نہ کوئی کار لے کر آئے گا۔ مجھے ان کی فکر نہیں کہ اسٹور کیپر اس کرنل کے کتنا زیر اثر ہے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی موجودی میں ہم اگر گھر سے نکلے تو دن کی روشنی میں کرنل ہم پر کسی گواہ کی موجودی میں کتے نہیں چھوڑ سکے گا ہم اسی کار میں یہاں سے جائیں گے جس سے سامان آئے گا۔''

ورجینیا اسے ملامتی نظروں سے دیکھا اور بولی۔

''تمہیں یہ خیال کیوں نہیں کہ وہ کتے کی گردن میں کوئی پرچا باندھ کر اسٹور بھیج سکتا ہے۔ ڈیلوری رکواسکتا ہے۔''

مالکم نے اس نکتے کو سنا اور سر ہلایا۔ ''تم نے درست کہا۔''

یہ بات سوچنے والی تھی۔ وہ پھر کیا کرے گا۔

دو تین دنوں میں کوئی معجزہ ممکن نہ تھا۔ ویسے مالکم کے پاس کھانے کا سامان موجود تھا۔ جبکہ کرنل کا سامان ختم ہوچکا تھا۔

مالکم بستر پر چلا گیا۔ ''کل دیکھا جائے گا۔''

اس ... آج رات ہم سکون سے سوئیں
گے ... فی الحال میں نے اس اپاہج حرامزادے کو
... دے دیا ہے۔ کل میرا ذہن صاف
ہو گا تو میں اپنے دفاع کے لیے کچھ اور سوچوں گا۔
دیکھوں گا اس شخص کے ہاں کہاں کہاں سوراخ
ہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ لیمپ گل کر دیا۔
ورجینا بھی بستر پر تھی۔ "میرا خدا یہ ہم کس
مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" وہ کراہی۔
مالکم کو افسوس ہوا کہ اس کی بیوی ہمت والی
نہیں ہے۔ اسے خوشی تھی کہ اس مصیبت میں بھی
وہ حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس
ذلیل کرنل سے الجھنے کی تمام تر صلاحیت رکھتا
ہے۔

اس کی آنکھ کھلی تو اسے محسوس ہوا جیسے کچھ
آوازیں آ رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی کھٹ پٹ سی تھی۔
وہ ابھی نیم خوانده تھا۔ اسی حالت میں وہ
بڑبڑایا۔ "کہیں یہ پاگل کرنل سرنگ تو نہیں لگا رہا
ہے۔" اور پھر اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا
اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ نیم تعمیر شدہ
مکان سے لکڑیاں لائی جا رہی ہیں جنہیں سہارا بنایا
جا سکتا تھا۔ پھر نکالی ہوئی مٹی کو کھدی ہوئی
بنیادوں میں بھرا جا رہا ہے ممکن ہے وہاں ایسی
سرنگیں پہلے سے ہوں جو نئی بنیادوں کی سمت جاتی
ہوں محض اس لیے کہ کرنل سب تک اپنی رسائی
رکھ سکے۔ آخر ابھی یہاں مزید لوگ بھی تو آنے
تھے۔

معاً مالکم کو کمرے کے ایک گوشے میں پیلی
سی لکیر نظر آئی۔ مالکم نے پھرتی سے بیڈ لیمپ جلا
دیا۔ خود ورجینا سوتے سوتے اٹھ بیٹھی۔ اس
کونے میں ایک چور دروازہ موجود تھا جسے دفتی
کے ٹکڑوں سے چھپا دیا گیا تھا۔

چور دروازہ چرچرایا۔ اور اس میں سے ایسی
بو نکلی جو جسموں اور گرد و غبار کی ہو سکتی تھی اس
سوراخ سے ایک کتے کا منہ برآمد ہوا پھر وہ
کمرے میں آ گیا۔ کتے کے جسم اور چہرے پر
دھول بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بدن کو ہلا کر
یہ خاک دھول اڑائی اور خود کو صاف کیا ٹھیک اس
کے عقب میں خود کرنل بھی گھسٹ رہا تھا۔ اس کا
جسم ننگا تھا۔ اور وہ کہنیوں کے بل فرش پر رینگ
رہا تھا۔

اندازِ فکر

☆ جو زیادہ پوچھتا ہے وہ زیادہ سیکھتا ہے۔
☆ دولت عزت تو دے سکتی ہے مگر سچی خوشی نہیں۔
☆ دولت شہرت تو دے سکتی ہے مگر سکون نہیں۔
☆ دولت مسجد تو بنا سکتی ہے مگر ایمان نہیں۔
☆ دولت عینک تو دے سکتی ہے مگر بینائی نہیں۔
☆ یتیم کی بد دعا آسمانی بجلی کی طرح گرتی ہے۔
☆ جنت چاہتے ہو تو اپنی ماں کے قدم چومو۔
☆ خدمت کرنا چاہتے ہو تو اپنے ماں باپ کی کرو۔
☆ عزت چاہتے ہو تو ایمانداری سے کام کرو۔
☆ جل کر کباب ہونے بہتر ہے کہ کھل کر گلاب بن جاؤ۔
☆ جو دوسروں کے لئے برا سوچتا ہے اس کا خود برا ہوتا ہے۔
☆ کامیابی کے لئے دعا اور دوا دونوں چاہئیں۔
☆ سچے دل سے مانگی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔
☆ سب سے اعلیٰ اور بہترین پکار اذان ہے۔
☆ موت ایک ایسا دروازہ ہے جس سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔
☆ سب سے بڑی فتح اپنے آپ پر فتح ہے۔
☆ جسے ہارنے کا خوف ہے وہ ضرور ہارے گا۔

تنہائی کی ماری ایک عورت کی کہانی

تو بھی تھے بلبیر بھلا جن کو دیکھنے کی خواھش میرے دل کے ایک گوشے میں کب سے دبکی بیٹھی تھی اور آج اس وقت وہ میرے بہت ھی نزدیک بیٹھے تھے اتنے نزدیک کہ اگر میں ذرا سا بھی بائیں جانب جھک جاتی تو ان سے چھو جاتی سوچتے سوچتے اچانک ایک سرسراھٹ سی میری دل میں دوڑ گئی۔

ایم الیاس

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

دروازہ توڑ کر جب پولیس اندر داخل ہوئی تو کمرے کا بھیانک منظر دیکھ کر سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کمرے میں تین کرسیوں پر تین لاشیں لڑھکی پڑی تھیں جن میں ایک لاش مرد کی تھی اور دو عورتوں کی۔

پولیس انسپکٹر کی نظر دروازے کے پاس پڑی ہوئی چیز پر گئی' اس پر ایک بڑا سا سفید لفافہ پڑا تھا جس کا ایک کونا کانچ کے پیپر ویٹ سے دبا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے ذرا جھک کر دیکھا تو لفافے پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ ''پولیس کے لیے۔'' انسپکٹر رمیش نے وہ لفافہ کھولے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیا اور تھوڑی دیر کی تفتیش کے بعد اس نے تینوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیا اس کے بعد نوکروں سے چند سوالات کرنے کے بعد اس نے اس کمرے کے دروازے پر تالا لگوایا اور خود تھانے لوٹ آیا۔

تھانے میں بیٹھے ایس پی ورما صاحب بڑی بے چینی سے اس کی راہ دیکھ رہے تھے انہیں ٹیلی فون پر یہ اطلاع مل چکی تھی کہ نارائن گرلز اسکول کی پرنسپل مسز چاند اور کانگریس کے منتخب ایم ایل اے جناب بلبیر بھلا اور سوشل ویلفیئر کی ڈپٹی ڈائریکٹر مس سلوچنا کا قتل ہو گیا ہے۔

ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی کہ آخر ان تینوں کو ایک ہی وقت میں اور ایک ہی کمرے میں کس نے اور کیوں قتل کیا تھا۔ یہ تینوں ہی سماجی کارکن کی حیثیت سے دہلی کی مشہور ہستیاں تھیں۔

مسٹر بھلا کافی ہنس مکھ' خوش اخلاق اور انتہائی ملنسار آدمی تھے ایل ایل بی کرنے کے بعد انہوں نے دہلی میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ وہ ایک قابل اور سلجھے ہوئے وکیل مانے جاتے تھے اس لیے ان کی پریکٹس بھی خوب چل نکلی تھی۔ اپنے کالج کے زمانے میں ہی وہ کانگریس کے کارکنوں میں شامل ہو گئی تھے اور کانگریس کے ہر جلسے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے جس کی وجہ سے چار پانچ بار وہ تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے جیل بھی گئے۔ یہی وجہ تھی کہ حالیہ چناؤ میں انہیں کانگریس کا ٹکٹ دیا گیا تھا وہ اپنے علاقے میں اپنی شرافت اور خوش اخلاق طبیعت کی وجہ سے کافی مقبول تھے جس کی وجہ سے اپنے مخالف امیدوار کو کافی ووٹوں سے شکست دے کر وہ کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

مسٹر بھلا خواتین کو مردوں کے برابر کا درجہ دینے کے حق میں تھے اور ان کے مسئلے مسائل کو حل کرنے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے یہی وجہ تھی

امن کے جلسے جلوسوں میں بھی انہیں خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا اور وہ تن من دھن سے ان میں شانہ بشانہ شریک ہوتے تھے۔ وہ خود نئی دہلی میں رہتے تھے۔ دہلی چھاؤنی کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے نارائن۔ تین سال قبل وہاں لڑکیوں کا ایک اسکول کھولنے کی تجویز لے کر گاؤں کے کچھ لوگ ان کے پاس مدد کے لیے آئے تھے انہوں نے اس وقت نہ صرف اس کام کے لیے ان کی مدد کی بلکہ آئندہ سے اسکول کا سارا خسارہ اپنے ذمے لینے کا وعدہ بھی کیا جب اسکول کھل گیا اور اس کی انتظامیہ کمیٹی بنائی گئی تو اس کے صدر بھی بھلا ہی چنے گئے اور تب ہی سے اسکول کے سیاہ و سفید کے وہی مالک تھے۔

دوسری مقتول عورت مس سلوچنا تھی جو سوشل ویلفیئر سوسائٹی کی ڈپٹی ڈائریکٹر تھی، بہت خوب صورت اور بہت ہی پرکشش صورت وشکل کی مالک تھی وہ چھریرے بدن اور نرم گفتار کی عورت تھی۔ اس کی آواز سننے والوں کے دل میں اتر جاتی تھی دہلی کی تمام خواتین تنظیموں میں اس کا نام بڑی عزت اور احترام سے لیا جاتا تھا۔ مس سلوچنا نے زندگی بھر کنواری رہ کر عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور دیگر سماجی کاموں کے لیے خود کو وقف کر دینے کا عہد کر رکھا تھا۔ جب کہ مسز چاند جو کہ نارائن گرلز اسکول کی پرنسپل تھی کچھ زیادہ خوب صورت نہیں تھی مگر اسے بدصورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کا رنگ سانولا ضرور تھا لیکن اس میں غضب کی کشش تھی۔ جب وہ سفید ساری پہنتی تھی تو بہت بھلی لگتی تھی، اس کی بڑی بڑی بادامی سی آنکھوں میں دوسروں کو متوجہ کرنے کی بے پناہ طاقت تھی۔ لمبا سڈول جسم اور اس پر

چہرے کے تیکھے خدوخال کی وجہ سے وہ کسی صورت بھی نظرانداز کردینے والی شخصیت نہیں تھی اس کے بارے میں لوگوں کو زیادہ تو معلوم نہیں تھا لیکن وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ مسز چاند نے اپنے شوہر کو طلاق دے دی تھی کیونکہ اس کا شوہر جواری' شرابی اور عیاش آدمی تھا اور کبھی کبھی وہ اسے مارتا پیٹتا بھی تھا۔ اس کے انہی ظلم و تشدد سے تنگ آکر ہی اسے ایسا قدم اٹھانا پڑا تھا۔

پچھلے سال نارائن گرلز کالج کی پرنسپل مس شکنتلا کو جب بغیر کسی وجہ کے نوکری سے الگ کر دیا گیا تھا تو اس کی خالی جگہ مسز چاند اسکول کی پرنسپل مقرر کی گئی تھی۔ عام سے اسکولوں کی انچارج ہیڈ مسٹریس ہی ہوتی ہے۔ پرنسپل کی وہاں کوئی جگہ نہیں ہوتی لیکن اس اسکول میں ہیڈ مسٹریس بھی تھی اور پرنسپل بھی۔ ہیڈ مسٹریس کے ذمے زیادہ تر لڑکیوں کی پڑھائی کا ہی کام تھا اور پرنسپل کا کام انتظامی امور کی دیکھ بھال وغیرہ تھا اس لیے اس اسکول کی پڑھائی بھی اچھی تھی اور اس کے انتظامات بھی بہت بہتر تھے۔

مسز چاند باصلاحیت تھی' اسکول میں اپنے آنے پر اس نے بلبیر بھلا سے صلاح مشورہ کرکے اسکول میں کچھ بہتر تبدیلیاں بھی کی تھیں وہ اسکول کے کمپاؤنڈ کے اندر ہی ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتی تھی۔ یہ بنگلہ اسے اسکول کی طرف سے مفت ملا تھا کیونکہ لڑکیوں کا ہاسٹل بھی اس چہار دیواری کے اندر تھا اور اس کی دیکھ بھال بھی مسز چاند کے ذمے تھی۔ اور یہی وہ تین لوگ تھے جن کا قتل ہوا تھا۔ ایس پی مسٹر ورما تھانے کے گیٹ پر ہی کھڑے انسپکٹر رمیش کا انتظار کر رہے تھے جونہی رمیش جیپ سے اترا تو مسٹر ورما نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد فوراً ہی قتل کی تفصیل پوچھ لی رمیش انہیں اپنے ساتھ تھانے کے اندر لے گیا۔ پھر وہ دونوں ہی ایک میز کے قریب رکھی ہوئی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے اس کے بعد انسپکٹر رمیش نے اپنی جیب سے وہی بڑا سا سفید لفافہ نکال کر مسٹر ورما کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ ''سر یہ لفافہ مجھے مسز چاند کی میز پر رکھا ہوا ملا ہے۔ اس پر لکھا ہے پولیس کے لیے اور میرا خیال ہے اس سے ہمیں کچھ معلوم ہو سکے گا کہ قاتل کون ہے اور اس نے یہ قتل کیوں کیے ہیں۔

''کیا لکھا ہے اس میں۔'' مسٹر ورما نے لفافہ دیکھ کر پوچھا۔

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔'' انسپکٹر رمیش نے کہا۔ ''ابھی میں نے پڑھا نہیں ہے۔''

مسٹر ورما نے لفافے کے اندر سے خط نکالا یہ فل اسکیپ کے دو کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر تھی مگر یہ تحریر ہندی میں تھی اس لیے مسٹر ورما نے اسے انسپکٹر رمیش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ہی پڑھ کر سناؤ مجھ سے یہ رائٹنگ پڑھی نہیں جائے گی۔''

انسپکٹر رمیش نے خط ان کے ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کیا' اس میں لکھا تھا۔ ''میں نے ہی مس سلوچنا اور مسٹر بلبیر بھلا کو قتل کیا ہے اور خود بھی خودکشی کر رہی ہوں۔ یہ قتل میں نے کیوں کیے۔ اس کی ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کہانی کو میں آپ کو سنانے کے بعد ہی چائے کا وہ پیالہ جس میں زہر ملا ہوا ہے اپنے منہ سے لگالوں گی لیکن ہاں اپنی اس کہانی میں' میں اپنے شوہر وغیرہ کے نام اصلی نہیں لکھوں گی' اس کے لیے آپ لوگ مجھے معاف کردیں۔''

''ہاں تو میرا اصلی نام شاشی کانتا ہے۔ میں ایک پڑھے لکھے شریف اور امیر خاندان کی لڑکی ہوں' میرے والد مل مالک ہیں میری شادی بڑی دھوم دھام سے رام اوتار سہگل بمبئی والے کے اکلوتے بیٹے رام سروپ سے ہوئی تھی۔ میرے شوہر مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اور میں بھی ان پر جان دیتی تھی۔

شادی کے ایک ماہ بعد ہم دونوں نے

...رے یورپ کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ میں ... سے ملک ملک گھومنے اور سیر و تفریح کی ... تھی۔ شادی سے پہلے میں ہر سال اپنے ... بھائی کو ساتھ لے کر دو دو مہینے کے لیے ... نہ کہیں چلی جاتی تھی اس طرح میں نے ... را بھارت دیکھ لیا تھا۔ سیر و تفریح میں ... ہی دیکھ کر ہی میرے شوہر نے یورپ ... کا پروگرام بنایا تھا۔ میرے سسر نے بھی ... سے ہمیں جانے کی اجازت دے دی

... اپنے دل میں بڑے بڑے ارمان لیے اور ... یورپ کی رنگینیاں سجائے ہم سفر کی ... رہے تھے اور دو دن بعد ہم یورپ کے ... بھی ہونے والے تھے کہ اچانک ایک ... ی مصیبت آن پڑی، میرے سسر صاحب ... ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے چل بسے ... سے یورپ کی سیر کا سپنا تو ادھورا رہ گیا ... اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے کاروبار ... اور اندر باہر کی تمام ذمے داریاں ... ہر کے ناتجربہ کار کندھوں پر آ پڑیں۔ ... سے وہ بہت مصروف رہنے لگے۔ صبح ... کے بعد نکل جاتے اور کبھی کبھی ... کھانا گھر پر کھالیتے ورنہ زیادہ تر تو وہ کافی ... واپس آتے تھے، بار بار انہیں احمد ... ل کی دیکھ بھال کے لیے بھی جانا ... کئی کئی روز تک ان کی کوئی خبر نہیں ... ہیں تو کاروبار کی جھنجھٹ اور اگر ... گھر آ جائیں اور باتیں کرنے کا ... پاس ہو تو وہی بزنس کی روکھی پھیکی ...

... یہ سب ناقابل برداشت تھا ... ہوئے خوابوں کو حقیقت کے ... دیکھنا چاہتی تھی میں اپنے ... ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن مجھے اپنے شوہر کی مجبوریوں کا احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتی تھی۔ احتجاج کرنے کی بات کئی بار میرے ذہن میں آئی تھی مگر وہ اندر ہی اندر دب کر رہ گئی ایسی بات بھی نہیں تھی کہ انہوں نے مجھ پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد کر رکھی تھی، نہیں مجھے ان کی طرف سے پوری آزادی تھی میں جہاں چاہے جس وقت چاہے آ جا سکتی تھی لیکن اس کے باوجود اتنے بڑے مکان میں، میں خود کو ایک قیدی کی طرح سمجھتی تھی۔

ایک روز جب میں اپنے ان حالات پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ میری کالج کی ایک سہیلی سرینا اپنے شوہر کے ساتھ مجھ سے ملنے آ گئی۔ میں ان کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر حیران رہ گئی، وہ دونوں انگلینڈ اور پورے یورپ کی سیر کر کے لوٹے تھے۔ ان کی شادی کو ابھی چھ مہینے ہی ہوئے تھے شادی کے دوسرے ہی مہینے وہ یورپ چلے گئے تھے اور اب پورے چار ماہ بعد واپس بھارت آئے تھے۔

یورپ اور انگلینڈ کی رنگین باتوں اور جگہ جگہ بکھری ہوئی حسن کی رعنائیوں کی باتیں سن سن کر میرا اداس دل اور بھی اداس ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ تو چلے گئے مگر میں اپنی جگہ پر جوں کی توں بیٹھی رہی کھوئی ہوئی سی۔ رات کو نوکر نے کھانے کے لیے پوچھا مگر میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد نوکر پھر آیا، میں جانتی تھی کہ جب تک میں کھانا کھا نہیں لوں گی وہ بار بار آتا رہے گا مجھے بھوک بالکل نہیں تھی پھر بھی اسے میز پر کھانا رکھ دینے کے لیے کہہ دیا اور پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی۔

رات کو کوئی گیارہ بجے کار کے رکنے کی آواز سنائی دی، یہ میرے شوہر کی کار کی آواز تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور بڑی محبت بھری نظروں سے

میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''ارے ڈارلنگ کیا بات ہے آج تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔''

میں چپ رہی اور ایک بار ان کی طرف کڑی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں نیچی کرلیں۔ اس وقت وہ میری طرف دیکھ نہیں رہے تھے بلکہ اپنا کوٹ اتار کر ہینگر میں رکھ رہے تھے یکا یک ان کی نظر میز پر رکھے کھانے پر پڑی۔ انہوں نے اسے چھو کر دیکھا پھر بولے۔ ''تو تم نے ابھی تک کھانا کھاؤ گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔ ٹھہرو میں نوکر سے کہتا ہوں کہ وہ اسے گرم کر دے۔''

کہہ کر وہ باہر جانے لگے تو میں نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

''رہنے دیجیے اصل میں اس وقت مجھے بھوک نہیں ہے۔''

ان کے قدم رک گئے اور وہ پلٹ کر حیرت سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔ شاید اس سے پہلے انہوں نے میرا ایسا سخت لہجہ کبھی نہیں سنا تھا لیکن اس کے باوجود سنی ان سنی کر کے وہ میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے اور ایک ہاتھ میرے کندھے پر اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بڑے پیار سے بولے۔ ''کیا بات ہے ڈارلنگ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

میں اندر سے اپ سیٹ تو تھی ہی اس لیے ذرا سی ہمدردی پا کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی وہ حیران سے ہو کر میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس پیار بھرے لہجے میں بولے۔ ''کیوں شاشی آخر بات کیا ہے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے کیا دکھ ہے۔ پہلے تو تم کبھی ایسا نہیں کرتی تھیں۔''

بھری تو تھی ہی میں بس ایک دم ان پر برس پڑی۔ ''میں اس گھر میں ایک قیدی کی طرح رہ رہی ہوں۔ آپ دن رات اپنے کاروبار میں مست رہتے ہیں کبھی میرے لیے بھی دو منٹ کا وقت نکالتے ہیں آپ۔ میرے پاس بیٹھ کر کبھی پوچھا کہ جی رہی ہوں یا مر رہی ہوں میں۔ عورت کو صرف روپیہ ہی نہیں چاہیے وہ کچھ اور بھی چاہتی ہے اپنے شوہر کا پیار اور اس کی توجہ آپ خود ہی بتایئے آپ نے کبھی میرے جذبات کا خیال کیا ہے۔ میں یہاں رہ کر پریشان ہو گئی ہوں بمبئی سے کہیں باہر جانا چاہتی ہوں میں۔''

''بس اتنی سی بات ہے۔'' وہ ہنس کر سکون سے بولے۔ ''تم کل ہی سیر کے لیے کشمیر چلی جاؤ میں جہاز سے تمہارے اور رامو کے جانے کا بندوبست کر دوں گا اور فون کر کے پرنس ہوٹل میں تمہارے دو کمرے بک کرا دوں گا۔''

''نہیں میں اکیلی کسی نوکر کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔ ''اکیلے ہی جانے کی بات ہوتی تو میں کب کی چلی گئی ہوتی۔'' اتنا کہہ کر میں نے اپنی باہیں ان کی گردن میں ڈال کر اپنا سارا پیار ان کی آنکھوں میں انڈیل کر کہا۔ ''آپ ساتھ نہیں ہوں گے تو کشمیر کا کیا مزہ آئے گا۔ آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''لیکن یہاں...... یہ سارا کام۔''

''منیجر وغیرہ جو ہیں۔'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہزاروں روپے تنخواہ آخر کیوں لیتے ہیں وہ لوگ۔ وہ آپ کی غیر موجودگی میں کام دیکھ لیں گے اور پھر پندرہ بیس روز میں کاروبار میں کوئی خاص فرق نہیں پڑ جائے گا اور پھر ٹیلی فون کس لیے ہے آپ سری نگر سے بھی انہیں ضروری ہدایات دے سکتے ہیں۔''

اور وہ مان گئے چوتھے روز صبح کے وقت ہمارے جانے کا پروگرام طے ہو گیا میں سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئی مجھ میں بہت زیادہ جوش تھا۔ مگر تیسرے روز اچانک ایک اور مصیبت آ گئی۔ میرے شوہر اس روز جلدی گھر لوٹ آئے تھے کیونکہ ہم دونوں کو شاپنگ کے لیے بازار جانا تھا۔ میں ایک خوب صورت اور قیمتی سی ساڑھی

[illegible] ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور [illegible] جا رہی تھی اس لیے ریسیور میں نے ہی اٹھایا دوسری طرف سے آواز آئی۔
"ذرا [illegible] صاحب سے بات کرادیں۔"
"کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا۔
"انہی سے کچھ کہنا ہے میں احمد آباد مل کا منیجر بول رہا ہوں۔" میں نے انہیں بلا کر ریسیور ان کو دے دیا وہ دیر تک دھیرے دھیرے فون پر ہوں ہاں کرتے رہے پھر انہوں نے منہ لٹکائے ہوئے ریسیور رکھ دیا ان کے چہرے کی رنگت دیکھ کر میں بھی گھبرا گئی۔ "کیا ہوا۔" میں نے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا۔
"ہماری احمد آباد والی مل کے مزدور کل صبح سے ہڑتال کر رہے ہیں۔ ان کی مانگ کچھ ایسی ہے کہ میں اسے پورا نہیں کرسکتا اس لیے میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔" میرا خوشی سے کھلا ہوا چہرہ ایک دم اتر گیا۔ میں کچھ نہیں بولی اور چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گئی۔
پھر کوئی دس منٹ بعد وہ میرے پاس آئے اور میرے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئے پھر مجھے اٹھا کر اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے بولے۔ "تم اس طرح ناامید ہو کر کیوں دل چھوٹا کرتی ہو۔ چلو شاپنگ کے لیے بازار چلتے ہیں۔"
میں نے پرامید نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔
"سچ کہہ رہے ہو کیا۔"
"پروگرام کے مطابق تم کل صبح ہی کشمیر چلی جاؤ میرے لیے تم اپنا پروگرام کیوں برباد کرو گی" انہوں نے کہا تو میں نے چونک کر پوچھا۔
"اور آپ۔"
"دیکھو شاشی ضد نہ کرو جانتی تو ہو کہ کاروبار کا معاملہ ہے ایسے میں ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو مصیبت آجائے گی کاروبار میں آدمی اس طرح گرتا ہے کہ پھر زندگی بھر اٹھ نہیں سکتا۔"
"تو میں کب کہتی ہوں کہ میرے لیے آپ اپنے کاروبار کا نقصان کریں۔" میں نے منہ پھیر کر کہا۔ "میں آپ کی کون ہوتی ہوں۔ میرا آپ پر حق ہی کیا ہے۔" اس کے بعد میں ان کی بانہوں سے الگ ہو کر کرسی پر جا بیٹھی اور رونے لگی۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولے۔
"شاشی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ احمد آباد کا معاملہ نپٹا کر میں دو چار روز میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"
"تو پھر دو چار دن بعد ایک ساتھ چلیں گے۔" میں نے کہا۔
"نہیں‘ نہیں تم چلی جاؤ۔" وہ پیار سے بولے۔ "تم وہاں رہو گی تو مجھے کام کاج چھوڑ کر بھی اپنی شاشی کے پاس آنا پڑے گا۔ آؤ اب چلیں۔"
میں اٹھی‘ چند منٹوں میں ہی اپنے بال اور کپڑے درست کیے اور ان کے ساتھ شاپنگ کرنے چلی گئی۔ اس کے بعد وہ رات کی گاڑی سے احمد آباد چلے گئے ہوائی جہاز میں میرے برابر والی سیٹ خالی تھی۔ ہم نے دو سیٹوں کا ریزرویشن کرا رکھا تھا لیکن ایئرپورٹ پر آ کر میں نے ایک سیٹ کینسل کرادی تھی پھر جہاز کی روانگی میں پانچ سات منٹ باقی تھے تو ایک خوب صورت نوجوان میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پہلی ہی نظر میں‘ میں اس کی سحر انگیز شخصیت سے کافی متاثر ہو گئی۔ جہاز ٹیک آف کر رہا تھا اور ادھر میرے دماغ میں بھی اس نوجوان کے تصور کی ایک اڑان شروع ہو گئی تھی۔ کون ہوسکتا ہے یہ۔ کھدر کا صاف ستھرا لباس پیروں میں اعلیٰ قسم کے چپل اور ہاتھ میں چمڑے کا ایک ہینڈ بیگ۔ اچانک میری نظر اس کے ہینڈ بیگ پر چپکے ہوئے ایک کارڈ پر جم گئی جس پر لکھا تھا۔ مبلبیر بھلا‘ ایم اے‘ ایل ایل بی ایڈووکیٹ دہلی۔ بلبیر کا نام میں نے کئی بار اخباروں میں پڑھا تھا۔ عورتوں کی

فلاح و بہبود کا نام میں نے کئی بار اخباروں میں پڑھا تھا۔ عورتوں کی فلاح و بہبود اور ترقی پر ان کے آرٹیکل سب ہی ہندی اور انگریزی اخباروں میں شائع ہوتے تھے۔ پچھلے دنوں الیکشن کے موقع پر بھی ان کا نام کئی بار اخباروں میں دیکھا تھا۔ الیکشن میں کامیابی کے بعد اخباروں نے پہلے صفحے پر ان کی تصویریں چھاپ کر ان کے کردار کی خوب خوب تعریفیں کی تھیں۔

تو یہی تھے بلبیر بھلا جن کو دیکھنے کی خواہش میرے دل کے ایک گوشے میں کب سے دبکی بیٹھی تھی اور آج اس وقت وہ میرے بہت ہی نزدیک بیٹھے تھے اتنے نزدیک کہ اگر میں ذرا سا بھی بائیں جانب جھک جاتی تو ان سے چھو جاتی سوچتے سوچتے اچانک ایک سرسراہٹ سی میری دل میں دوڑ گئی۔ اور پھر میں اپنے آپ کو ڈانٹتے ہوئے دل ہی دل میں بولی اور پھر میں اپنے آپ کو ڈانٹتے ہوئے دل ہی دل میں بولی۔ ''چھی کہیں ایسا بھی سوچنا چاہیے کسی غیر مرد کے بارے میں۔'' میں نے سارے خیالوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے بیگ سے سچی کہانیوں کا ایک رسالہ نکالا کہ اس میں اپنے دل کی الجھن کو بھلا دینے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے کئی بار کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھا اور اپنے سامنے رکھی ہوئی کتاب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے ایک سرسری سی نظر جہاز کے دوسرے مسافروں پر ڈالی۔ سب ہی ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں معروف تھے۔ جہاز کا ماحول ان لوگوں کی باتوں اور ہنسی کی چہکار میں بڑا دلکش لگ رہا تھا مگر میں ایک عجیب سی گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور اپنی ہچکچاہٹ کو پرے رکھ کر میں پوچھ بیٹھی۔ ''کیا آپ دہلی تک ہی جا رہے ہیں۔''

ان کی آنکھوں اور ہونٹوں پر ایک جادو بھری مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ سر ہلا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ہاں'' بس یہ ایک لفظ کہہ کر ہی انہوں نے اپنی آنکھیں پھر کتاب پر جما دیں لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے یکا یک ہی مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کہاں تک جا رہی ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا۔ آپ بمبئی سے ہی آ رہی ہیں یا کہیں اور سے۔''

ایک ساتھ اتنے سوالات سن کر میں گھبرا گئی اور ہڑبڑا کر بولی۔ ''میں..... میں سری نگر جا رہی ہوں۔ میرا نام شاشی کانتا ہے اور میں بمبئی سے ہی آ رہی ہوں۔'' یہ جواب دینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بھاری بوجھ اپنے اوپر سے اتار پھینکا ہو۔

''شاشی۔ یعنی چاند..... دھرتی کا چاند۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''بڑا پیارا نام ہے آپ کا کیا آپ دہلی میں بھی اتریں گی۔''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ اکیلی ہیں۔''

''ہاں میرے شوہر ایک ضروری کام سے رک گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دو چار دن بعد وہ پہنچ جائیں گے۔''

''آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''بڑا کاروبار ہے ان کا ملیں ہیں ان کی کپڑے کی اور بنا سپتی گھی کی۔'' یہ کہہ کر میں چپ ہو گئی مگر تھوڑی دیر بعد پھر بولی۔ ''میں آپ کے نام سے بہت پہلے سے ہی واقف ہوں اخباروں میں آپ کے آرٹیکل آتے رہتے ہیں نا۔''

وہ پھر اس طرح مسکرائے لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے۔ اس وقت ہمارا جہاز آگرے کے ہوائی اڈے پر منڈلا رہا تھا' نیچے آگرے کے مکانات کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے لیکن آگرے میں تو جہاز کو رکنا نہیں تھا لیکن اس کے باوجود جہاز ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔ پتا چلا کہ

انجن میں کچھ خرابی ہوگئی ہے اور تمام مسافروں کو اب چار گھنٹے تک آگرے میں ٹھہرنا پڑے گا۔

میری خواہش پر وہ ممتاز اور شاہ جہاں کے پیار کی امر یادگار تاج محل دیکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک اچھے سے ہوٹل میں ایک ساتھ کھایا۔ ہوٹل کا بل انہوں نے مجھے ادا کرنے نہیں دیا۔ وہ چار گھنٹے چار لمحوں کی طرح گزر گئے ہم ایئرپورٹ واپس آئے تو جہاز ٹھیک ہو چکا تھا تھوڑی دیر بعد ہم پھر ہوا کے دوش پر اڑ رہے تھے۔

ایک گھنٹے بعد جہاز دہلی پہنچ گیا بھلا صاحب کو وہیں اترنا تھا۔ تھوڑی دیر کی اس ملاقات سے ہی مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں برسوں سے انہیں جانتی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے دو ایک بار دہلی میں اترنے کی درخواست کی لیکن کچھ ہچکچاہٹ اور کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کی وجہ سے میں دہلی میں اترنے پر رضامند نہیں ہوئی میں نے انہیں اپنے سری نگر والے ہوٹل کا پتا دے دیا اور پھر وہ میرے دل میں ایک طوفان سا چھوڑ کر چلے گئے جہاز پھر آسمان پر اڑنے لگا تھا اب میری برابر والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت آ بیٹھی تھی مجھے بڑا سونا سونا لگ رہا تھا میں پھر تصور کے پر لگا کر خیالوں میں اڑنے لگی تھی ایسا ہی ہاں بالکل ایسا ہی...... بلبیر بھلا جیسا ہی جیون ساتھی میں چاہتی تھی جو میرے دلی جذبات کی قدر کرتا اور دل کے اندر پرورش پانے والی امنگوں اور آرزوؤں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں تھا دنیا سمجھتی ہے کہ جس کے پاس روپیہ پیسہ ہے وہی اصل میں سب سے سکھی انسان ہے۔ لیکن میرے پاس دھن دولت کے ہوتے ہوئے بھی میں کتنی دکھی ہوں۔ یہ سب سوچتے سوچتے میری آنکھوں کے سامنے شوہر کا چہرہ ابھر آیا۔ وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں لیکن تب ہی میرے دل کے اندر سے ایک اور آواز آئی کہ تیرے شوہر کا پیار ایک فریب ہے صرف دکھاوا ہے۔ انہیں تم سے پیار نہیں بلکہ انہیں پیار ہے اپنے کاروبار سے' اپنی ملوں سے' اپنی دولت سے جب ہی تو اپنے کاروبار کے لیے وہ تیرے جذبات کو نظرانداز کرتے رہتے ہیں۔

دل کی یہ ساری باتیں میرے اندر ایک ہلچل سی مچانے لگیں اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ میں مسٹر بھلا کے بارے میں بھی سوچنے لگی جو ایک دل میں اتر جانے والی شخصیت کے مالک ہیں ان کے پاس پیسہ ہے شہرت ہے۔ صلاحیت ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک نرم دل ہمدرد اور حساس طبیعت کے مالک بھی ہیں وہ دوسروں کے دکھ درد سمجھتے ہیں دوسروں کے جذبات کی قدر کرنا جانتے ہیں میں نے دل کے دو پلڑوں میں جب اپنے شوہر اور بلبیر بھلا کو تول کر دیکھا تو بلبیر بھلا کا پلڑا بھاری نکلا۔

اس طرح سوچتی سوچتی میں سری نگر پہنچ گئی۔ پرنس ہوٹل میں پہلے سے دو کمرے میرے لیے بک ہو چکے تھے اس نے ٹھہرنے کی جگہ کے لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑی۔ سری نگر آنے کے بعد شروع کے دو تین دن تو بڑے روکھے پھیکے گزرے۔ آپ ہی بتایئے بھلا سری نگر میں اکیلا آدمی کیا اپنے کو پاگل سے کچھ کم سمجھے گا۔ جب میں صبح شام ہوٹل کی بالکونی میں کھڑی ہو کر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو رنگین کپڑے پہنے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور ماحول میں ہنسی کا فوارہ بکھیرتے ہوئے سڑک پر آتے جاتے دیکھتی تو میرا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ اس وقت ایک ساتھی کی کمی بری طرح کھٹکتی تھی۔ ہر روز صبح و شام میں اپنے شوہر کا انتظار کرتی۔ جس جہاز کے آنے کا وقت ہوتا تھا تو دل کو یقین سا ہو جاتا تھا کہ اسی جہاز میں وہ آئے ہوں گے اور اس امید میں میں بھی سنور کر بالکونی میں کھڑی ہو کر ایئرپورٹ سے سیدھی آنے والی سڑک کو تاکتی رہتی لیکن کافی دیر بعد تا

امید ہو کر تھکی ہاری سی اپنے بستر پر آ گرتی اور ایک بے بس پرندے کی طرح چھٹ پٹانے لگتی۔

اس طرح چار دن گزر گئے اور پانچویں دن بمبئی سے ان کا ایک ٹیلی گرام آیا جس میں لکھا تھا کہ ان کا آنا ممکن نہیں ہے۔ مزدوروں کی ہڑتال جاری ہے ٹیلی گرام میں لکھی ہوئی اس ایک سطر کو پڑھتے ہی میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ یوں لگا جیسے یہ تار کا غذ کا نہیں بجلی کا تار ہو جس نے میرے دل کی تمام امیدوں اور تمام آرزوؤں کو جلا کر راکھ کر دیا ہو۔ میں نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو پھاڑ کر پھینک دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے پلنگ پر گر کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رہ رہ کر دل میں بس یہی خیال آتا کہ کیا میرے جذبات کی ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ ان کی نظر میں مجھ سے زیادہ اہمیت دولت کی ہے۔ کاش میں کوئی غریب لڑکی ہوتی اور میرا شوہر ہر وقت میرے ساتھ ہوتا' سوچتے سوچتے اچانک میرے دل میں یہ شک بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں میرے شوہر مجھ سے دھوکہ نہ کر رہے ہوں۔ کاروبار کا بہانہ بنا کر مجھ سے دور رہ کر وہ کسی اور عورت سے پیار نہ کرتے ہوں اس خیال کے ساتھ ہی ان کے دفتر کی اسٹینولڑکی روما کا خوب صورت چہرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔

کہیں وہ روما کو ہی تو نہیں چاہتے۔ دفتر کے بعد وہ اکثر رات کو بھی اور ٹائم پر اسے بنگلے پر بلا لیتے تھے اور کافی رات تک اس کے ساتھ ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر دفتر کا کام کرتے تھے۔ کون جانے دفتر کے کام کے بہانے وہاں پیار و محبت کا کام ہوتا ہو۔ مجھے اس وقت اپنی سادگی پر غصہ آنے لگا آخر میں نے پہلے ہی کیوں روما کو نہیں ٹوک دیا۔ میں نے اس سے پہلے ہی کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ رات کو یہاں نہ آیا کرے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوتا کہ روما ناراض ہو جاتی اور وہ بھی کچھ لال پیلے ہوتے لیکن بات اس حد تک تو نہ پہنچتی۔ کام کے بعد روما کو اس کے گھر تک چھوڑنے کے لیے انہی کی کار جاتی تھی اور یہ بھی شک پیدا کرنے والی بات تھی۔

میرا بھاری دل ان شکوک و شبہات سے اور بھی بوجھل ہو گیا۔ اس لیے شاید مجھے بے وقوف بنا کر یہاں اکیلے بھیج دیا گیا ہے۔ یہاں میں اکیلی پڑے پڑے تڑپ رہی ہوں اور وہاں وہ روما کے ساتھ موج اڑا رہے ہوں گے میں دیر تک روتی رہی اور طرح طرح کی باتیں سوچتی ہوئی اپنے دل کو اور بھی دکھی کرتی رہی۔

ٹھیک اسی وقت اچانک کسی نے کمرے کے دروازے پر دھیرے سے دستک دی میں نے جھٹ سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور اپنے بے ترتیب بالوں اور کپڑوں کو درست کر کے دروازہ کھول دیا۔ میں حیرت سے اچھل پڑی میرے سامنے بلبیر بھلا مسکراتے ہوئے کھڑے تھے۔

وہ سلام کر کے اندر آ گئے شاید انہوں نے میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کو جنہیں میں نے پونچھ ڈالنے کی ناکام کوشش کی تھی دیکھ لی تھی۔ وہ پلنگ پر ہی بیٹھ کر بولے۔ ''آپ رو رہی تھیں کیوں۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان پر جمی ہوئی اپنی نگاہوں کو جھکا لیا۔

''بات کیا ہے۔'' انہوں نے پیار سے پوچھا۔

میں نے پلکیں اٹھائیں تو وہ میری طرف ہی دیکھ رہے تھے میں کوئی جواب نہ دے کر ان کی آنکھوں میں جھانکتی رہ گئی۔ میرے اس خاموش اشارے کو وہ سمجھ گئے اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے مجھے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا' میں گڑیا کی طرح ان کی گود میں گر گئی پھر انہوں نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اس لیے وہ مجھے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولے۔ ''میں ذرا دروازہ بند کر دوں۔'' اور دروازہ بند کرنے کے بعد انہوں نے پھر مجھے اپنی

باہوں میں لے لیا۔ میری اجڑی ہوئی بے کیف زندگی ایک بار پھر پیار اور ہمدردی پا کر لہلہانے لگی اب ہم دن بھر ٹیکسی میں بیٹھ کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ جہاں ٹیکسی نہیں جا سکتی تھی وہاں ہم پیدل ہی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نکل جاتے۔ سارا سارا دن ہم سری نگر کے دلکش مناظر میں لطف اندوز ہوتے رہتے۔ اس طرح سیر و تفریح اور موج مستی میں دن گزرتے گئے کوئی بیس روز بعد بمبئی سے میرے شوہر کا ایک خط آیا جس میں مجھے واپس آجانے کے لیے لکھا تھا۔

میں نے وہ خط بلبیر بھلا کو دے دیا' میں نے دیکھا کہ اس خط کو دیکھنے کے بعد ان کا چہرہ بھی اتر گیا تھا۔ ''اب کیا خیال ہے تمہارا۔'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''میں تو کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم مجھ سے جدا ہو جاؤ۔'' انہوں نے کہا اور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کے بعد ہم کافی رات گئے تک اس خط کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر صبح ہوتے ہی میں نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک طویل خط اپنے شوہر کے نام لکھ دیا جس کی تفصیل کچھ اس طرح تھی کہ۔ آپ نے ہر وقت اور ہر لمحہ میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے' آپ کو پیسے سے پیار ہے مجھ سے نہیں اس لیے میں اپنی زندگی آپ کے گھر میں برباد کرنے نہیں آسکتی آپ طلاق کے لیے تیار ہو جائیں تاکہ ہم دونوں کے لیے ہی راستہ صاف ہو جائے آخر میں' میں نے یہ بھی لکھ دیا کہ میرا یہ فیصلہ اٹل ہے اس لیے اب وہ مجھے کوئی خط نہ لکھیں۔

اور پھر دو ہفتہ مزید وہاں رہنے کے بعد ہم دہلی آگئے۔ بلبیر بھلا نے مجھے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ پھر دو چار دن بعد ہی وہ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر لے کر پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آئے اور اپنے ساتھ لے گئے اس طرح مجھے گرلز اسکول کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ پہلے والی پرنسپل مس شکنتلا کو کیا بہانہ بنا کر یا کون سا الزام لگا کر نوکری سے الگ کیا گیا تھا اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے اس اسکول میں میرے ذمے صرف انتظامات کا کام ہی دیکھنا تھا اس لیے یہ کام سنبھالنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی بلبیر بھلا صبح و شام آکر مجھے کام سمجھا جاتے تھے۔

اسکول کی ہیڈ مسٹریس الگ ہیں اور وہی سب کچھ دیکھتی بھالتی ہیں۔ ہیڈ مسٹریس کے ہوتے ہوئے بھلا پرنسپل کی کیا ضرورت ہے' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تین کمروں کے ایک چھوٹے سے بنگلے کے علاوہ ایک نوکر اور نوکرانی اسکول کے ہی خرچ پر مجھے ملے ہوئے تھے مسٹر بھلا مجھ سے ہر رات کسی نہ کسی بہانے سے ملنے آتے اور گھنٹوں میرے ساتھ رہتے اسکول میں اور شہر بھر میں ان کی اتنی عزت تھی کہ کسی کو خواب میں بھی ان پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی درمیان اسکول کے ایک فنکشن میں ان کی بیوی سے میرا تعارف ہوا۔ پدمارانی کا چہرہ بڑا بھولا بھالا اور پرکشش تھا اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں یہ بتاتی تھیں کہ وہ بڑے نرم مزاج کی ایک ملنسار خاتون ہے۔ مجھ سے وہ بڑے پیار اور احترام سے ملی کافی دیر تک وہ میرے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ ان کی باتوں سے میں بہت متاثر ہوئی میں اس کے پاس بیٹھ کر اپنے دل میں ایک شرم اور اپنے آپ سے نفرت سی محسوس کر رہی تھی اس لیے کہ میں آگ میں کھیل کر اپنے آپ کو تو بھلا ہی رہی ہوں ساتھ ہی اس دیوی جیسی عورت کا گھر بھی برباد کر رہی ہوں لیکن تب ہی کسی غیبی طاقت نے میرے اس خیال کو میرے اندر ہی دبا دیا۔

اس طرح وقت گزرتا گیا اور پھر جب مجھے پتا چلا کہ میں بلبیر بھلا کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو میں بہت گھبرائی مجھے اس اسکول میں آئے ایک برس سے کچھ اوپر ہو چکا تھا اور مہینے بھر پہلے

میری طلاق کی درخواست بھی منظور ہو چکی تھی۔

میں بری طرح پریشان تھی اس رات میں نے نوکر کو بھیج کر بلبیر بھلا کو بلوا بھیجا' وہ آئے تو میں نے انہیں ساری بات بتائی جسے سن کر وہ بھی گھبرا گئے لیکن اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے انہوں نے صرف اتنا ہی کہا۔ ''اچھا۔''

ان کا یہ مختصر اور سپاٹ سا جواب مجھے بہت ہی برا لگا۔ تب میں نے ان سے صاف صاف لفظوں میں کہا کہ اگر وہ میرے ساتھ جلد ہی شادی نہیں کریں گے تو میں تو رسوا ہوں گی ہی لیکن انہیں بھی رسوا کر دوں گی۔ یہ دھمکی سن کر وہ ہنس پڑے اور پیار سے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔ ''ایسا موقع نہیں آئے گا ڈارلنگ مجھے صرف ایک ہفتے کا وقت دو میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ پدمارانی میری بات مان لے گی اور کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔'' یہ بات انہوں نے کچھ اسی سنجیدگی سے کہی تھی کہ مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔

چار دن بعد جب میں رات کو کھانے کے لیے نوکر کو ہدایت دے رہی تھی کہ ٹھیک اس وقت اسکول کی ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آئی' وہ بہت گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی وہ بڑی تیزی سے ہانپتے ہانپتے بولی۔ ''میڈم ابھی ابھی بھلا صاحب کی کوٹھی کا ایک نوکر ملا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بھلا صاحب کی بیوی پدمارانی کو گولی لگ گئی ہے اور وہ مر چکی ہیں۔'' میری سانس نیچے کی نیچے اور اوپر کی اوپر رہ گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میں اسے دیکھتی رہ گئی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پدمارانی کا معصوم اور پیارا سا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اچانک کسی طرح میرے منہ سے نکلا۔ ''کیسے۔ کیسے ہو گیا یہ۔'' لڑکی نے بتایا کہ صاحب اپنی بندوق صاف کر رہے تھے اور اس کمرے میں کچھ فاصلے پر پدمارانی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ بندوق کی نال اسی کی طرف تھی لیکن بھلا صاحب کو اس کا خیال نہیں تھا کہ اچانک گھوڑا دب گیا۔ بندوق بھری ہوئی تھی اس لیے ٹھائیں' کی آواز کے ساتھ گولی سیدھی پدمارانی کے جا لگی اور وہ اچھل کر صوفے پر سے فرش پر آ گریں۔

ہے بھگوان یہ کیا ہو گیا۔ میرا دل تڑپ رہا تھا اور دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اگر بلبیر بھلا کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا اور اس سے غلطی سے ایسا قتل ہو جاتا تو پولیس اسے کبھی نہیں چھوڑتی۔ چاہے وہ بعد میں عدالت میں جا کر چھوٹ جاتا لیکن چند مہینوں تک تو اسے ذہنی اذیت میں رہنا ہی پڑتا لیکن بلبیر بھلا تو عوامی شخصیت تھے۔ بہت نیک بہت شریف اور بہت عزت دار مانے جاتے تھے اس لیے پولیس نے معمولی سی پوچھ گچھ کے بعد ان کے بیان پر یقین کر کے انہیں چھوڑ دیا۔

مگر اس واقعے کے بعد سے میرے دل میں بلبیر بھلا کے لیے جو مقام اور جو عزت تھی وہ اڑ گئی۔ سارے شہر میں ایک میں ہی تھی جسے یقین تھا کہ پدمارانی کو جان بوجھ کر قتل کیا گیا ہے اور جب میرے اندر کی عورت نے مجھے پھٹکارتے ہوئے کہا کہ اس قتل کی وجہ تم ہی ہو تو میرا دل تڑپ اٹھا لیکن میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں بھی تو بے بس تھی۔ اس واقعے کو پانچ دن ہو چکے تھے لیکن نہ تو وہ مجھ سے ملنے آئے اور نہ میں ان کی کوٹھی پر تعزیت کے لیے گئی۔ چھٹے دن شام کے وقت وہ میرے پاس آئے اور سیدھے لفظوں میں بولے۔ ''شاشی پانچ چھ دن بعد اسکولوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ میں نے کشمیر جانے کا پروگرام بنایا ہے تم تیار رہنا ہم وہیں کسی کورٹ میں سول میرج کر لیں گے۔'' بس اتنا کہہ کر وہ چلے گئے میں کچھ نہیں بولی نہ جانے کیوں میرا ان

لی طرف دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ کنکھیوں سے میں نے دیکھا ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں جیسے باپ شاید آنکھوں کی پلکوں پر بوجھ بن کر بیٹھ گیا اور اسی لیے وہ اٹھ نہیں پا رہی تھیں۔

ہمارا اسکول بھی بند ہو گیا میں اسکول کی ایک ٹیچر کو جو مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھی اسٹیشن چھوڑنے گئی۔ وہ چھٹیوں میں اپنے گھر جا رہی تھی وہ پنجاب کی رہنے والی تھی اور اسے لدھیانہ جانا تھا امرتسر میل ٹرین دہلی سے دن کے ڈیڑھ بجے روانہ ہوتی ہے اس ٹرین پر جب میں اسے سوار کرا کے گھر لوٹ رہی تھی تو خیال آیا کہ پرسوں مجھے بھلا کے ساتھ کشمیر جانا ہے۔ اس لیے کیوں نہ جاتے جاتے اس سے ملتی چلوں اس کی کوٹھی راستے میں ہی تھی اصل میں اس سے مل کر پوچھ لینا چاہتی تھی کہ کون سا اور کتنا سامان لے چلنا ہے۔ اس کے بارے میں اس سے مشورہ بھی کرنا تھا۔ کیونکہ اس دن کے بعد نہ تو وہ مجھ سے ملا تھا اور نہ ہی جہاز کے وقت اور روانگی کے بارے میں ہی کچھ کہلا بھیجا تھا ایسا مصروف شخص کہیں عین وقت پر اپنا پروگرام ہی منسوخ کر دے تو کوئی بعید نہیں تھا۔

بلبیر کا ایک کمرہ اس عمارت کی تیسری منزل پر بھی تھا۔ وہ اکثر تنہائی میں اس کمرے میں بیٹھ کر اپنے لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا تھا۔ میں نے نیچے نوکر سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ گھر پر ہی ہے۔ کمرا تو میں جانتی تھی اس لیے چپ چاپ اوپر چڑھ گئی۔ تیسری منزل کے دو تین زینے ابھی چڑھنے کو باقی تھے کہ مجھ کسی عورت کے غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی جسے سن کر میں وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ اس آواز کو پہچاننے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی وہ آواز مس سلوچنا کی تھی۔ سلوچنا ویلفیئر سوسائٹی کی اپنی ڈائریکٹر تو تھی ہی ایک مانی ہوئی سوشل ورکر بھی تھی۔ وہ بڑی ہی ملنسار اور دوسروں کا دکھ درد بانٹنے والی پر خلوص عورت تھی۔ وہ خاص دہلی کی رہنے والی تھی لیکن دہلی سے باہر بھی کہیں خواتین کے حقوق اور ان کی فلاح وغیرہ کے سلسلے میں کوئی جلسہ وغیرہ ہوتا تو وہ اس وقت تک ادھورا سمجھا جاتا تھا جب تک مس سلوچنا کو اس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ نہ بھیجا جاتا۔

مگر وہ اس وقت مسٹر بھلا کے کمرے میں کیسے آ گئی۔ میں نے سوچا اور دبے پاؤں چوروں کی طرح دروازے کے پاس دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر دم سادھے کھڑی ہو گئی۔ کمرا اندر سے بند تھا اور سلوچنا کہہ رہی تھی۔ ''میری بربادی کے ذمے دار تم ہی ہو تم نے بہلا پھسلا کر مجھے تباہ کر ڈالا ہے۔''

''لیکن تم کوئی دودھ پیتی بچی نہیں تھیں۔'' یہ بلبیر بھلا کی آواز تھی۔ ''کہ تم میرے بہلانے پھسلانے میں آ گئیں۔''

''تو بتاؤ۔ بتاؤ......'' سلوچنا کی آواز روہانسی ہو گئی شاید وہ بولتے بولتے رونے لگی تھی۔ ''تو بتاؤ میں اس پاپ کے بوجھ کو لے کر کہاں جاؤں۔ آخر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے۔''

''ڈارلنگ۔'' بلبیر بھلا کی آواز یکایک نرم پڑ گئی اور وہ ذرا پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں شادی سے انکار کب کرتا ہوں۔ تم مجھے صرف دو تین ہفتے کا وقت دیدو میں پرسوں سری نگر ایک خاص کام سے جا رہا ہوں وہاں سے لوٹتے ہی جو پہلا کام کروں گا وہ تم سے شادی کرنا ہی ہو گا۔ بس اب ان خوب صورت آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ ڈالو......اور۔''

آگے کی بات میرے کان کچھ سن ہی نہیں سکے وہ ایک دم بہرے ہو گئے تھے پھر اچانک مجھے اتنے زور کا چکر آیا کہ میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا اور زینے پر سے گرتے گرتے بچی خود کو سنبھالنے کے بعد میں جس طرح چوروں کی طرح اوپر چڑھی تھی اسی طرح لڑکھڑاتی ہوئی نیچے

آ گئی۔

بلبیر بھلا کی کوٹھی سے نکل کر میں کس طرح اپنے گھر لوٹی تھی یہ مجھے یاد نہیں ہے۔ میرا دل بری طرح پسپا جا رہا تھا اور دماغ کی رگیں اتنی تیزی سے پھڑک رہی تھیں جیسے ابھی ابھی میرا سر پھٹ جائے گا۔ میرے جبڑے بھینچے ہوئے تھے اور دانت سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ ''اف یہ بھیڑیا انسان کا روپ اختیار کیے ہوئے خونخوار بھیڑیا جس کا کام ہی ہے نت نئی بھیڑوں کا شکار کرنا۔''

اب مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں بلبیر کے ساتھ کشمیر گئی تو زندہ واپس نہیں آؤں گی میں سن چکی تھی۔ کہ بلبیر بھلا کی پہلی بیوی اوشا کہیں پہاڑ سے پھسل کر گہری کھائی میں گر گئی تھی اس کی موت کے بعد ہی بلبیر نے پدمارانی سے شادی کی تھی جواب بندوق کی گولی کا نشانہ بنی' میں سمجھ گئی کہ اوشا پہاڑ پر پھسلی نہیں ہو گی بلکہ پھسلائی گئی ہو گی' اس درندے نے اس کو بھی قتل کر کے اپنے راستے سے ہٹایا ہو گا اور اب یقیناً میری باری تھی لیکن بھگوان نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا لیکن اس آگاہی کے باوجود میرے جینے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ یہاں اسکول اور ہاسٹل کے ماحول میں مجھے جو پیار اور عزت ملی تھی اسے پانے کے بعد لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں مجھے آوارہ اور بدچلن کہیں' میرے کلنک کا بھانڈا پھوٹنے سے پہلے میں ایک نہیں ہزار موت کو گلے لگانے کے لیے تیار تھی۔

آخر میں' میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں تو مروں گی ہی مگر اس بھیڑیے کو اور بھیڑوں کا شکار کرنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑوں گی اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے دل ہی دل میں پروگرام ترتیب دیا اور پھر آرام سے اپنے بستر پر سو گئی۔ میرے دل میں اٹھا ہوا طوفان اور دماغ میں مچی ہوئی ہلچل اب تھم چکی تھی لیکن یہ طوفان واقعی تھم چکا تھا یا آنے والے کسی بڑے طوفان کی اطلاع دے رہا تھا۔ پتا نہیں۔

صبح اٹھ کر میں نے دو خط لکھے ایک سلوچنا کے نام اور دوسرا بلبیر بھلا کے نام ان سے میں نے درخواست کی تھی کہ آج میری سالگرہ کے موقع پر وہ رات کا کھانا میرے یہاں کھائیں۔ اس دعوت کا وقت میں نے رات کے آٹھ بجے کا رکھا تھا' اسکول کی طرف سے ملے ہوئے چھوٹے سے بنگلے کے اوپری منزل والے کمرے کو میں اپنے نجی کاموں کے لیے استعمال کرتی تھی۔ رات کے آٹھ بجنے میں جب پانچ منٹ باقی تھے تو کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی یہ مس سلوچنا تھی اسے بیٹھے ابھی پانچ سات منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بلبیر بھلا بھی آ گیا۔ بھیڑوں کا شکار کرنے والا خونخوار بھیڑیا..... لیکن آج وہ خود ایک بھیڑ کا شکار ہونے والا تھا۔ ہنستے مسکراتے میں نے اس کا استقبال کیا اور ہیٹر جلا کر اس پر چائے کی کیتلی رکھ دی۔ اس درمیان بلبیر اور سلوچنا آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر تھوڑی دیر بعد اچانک بلبیر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''آج تمہارے نوکر کو کیا ہوا کہ تم خود چائے بنا رہی ہو۔''

میں نے بہت ہی خوشگوار موڈ میں مسکرا کر جواب دیا۔ ''آج میری سالگرہ ہے نا اس لیے ہر چیز میں اپنے ہاتھ سے بنا کر کھلاؤں گی اس لیے اس کو چھٹی دے دی ہے۔''

''اور لوگ بھی تو آئیں گے نا۔'' سلوچنا نے پوچھا۔

''اب کون آئے گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اسکول کی چھٹیاں پڑ چکی ہیں جو ٹیچر وغیرہ تھیں وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکی ہیں بس اسی لیے تو آپ دونوں کو بلا لیا ہے۔'' اتنا کہہ کر میں کرسی پر بیٹھ گئی پھر ذرا دیر بعد کہا۔ ''کھانا ایک گھنٹے بعد ملے گا تب تک آپ لوگ ایک ایک کپ

چائے پی کر باتیں کیجیے اور میں کھانا تیار کرتی ہوں۔

میں نے ان دونوں کے چہروں سے ان کے دلوں کو پڑھنے کی کوشش کی وہ بھی تنہائی چاہتے تھے لیکن بے چارے یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں ساتھ لے کر میں آخری سفر پر جانے کا منصوبہ بنا چکی ہوں۔

اٹھ کر میں نے الماری سے کچھ بسکٹ نکالے اور انہیں کانچ کی پلیٹ میں سجا کر ان کے سامنے رکھ دیے اس وقت تک چائے کا پانی کھولنے لگا تھا‘ میں نے چائے کے تین کپ بھرے اور ایک ایک کپ ان دونوں کے سامنے رکھ کر تیسرا کپ اپنے سامنے رکھ لیا۔ ایک دو بسکٹ کھانے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ کپ اٹھائے تو میں نے بھی اپنا کپ اٹھایا انہوں نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کپ منہ سے لگا لیے دونوں نے ابھی چائے کا ایک ایک گھونٹ ہی بھرا تھا کہ دوسرے ہی لمحے کپ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور وہ اپنی اپنی کرسیوں پر ہی لڑھک گئے اصل میں‘ میں نے دودھ میں پہلے ہی سے پوٹاشیم سائنائیڈ ملا دیا تھا۔

ان کے لڑھکتے ہی میں نے جلدی سے اپنا کپ میز پر رکھ دیا اور اندر کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس طرح بھیڑوں کا شکار کرنے والا بھیڑیا آج ایک بھیڑ کا شکار ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی نفرت سے اس جانور کی طرف دیکھا اور اپنی کرسی کو دوسری میز کی جانب کھسکا کر یہ خط لکھنے بیٹھ گئی اصل میں‘ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس راز کو اپنے سینے میں چھپا کر چپ چاپ مر جاؤں اور اخبار والے بلبیر بھلا جیسے وحشی درندے کی تعریفوں کے پل باندھتے رہیں اور اس کی عزت و شرافت پر لمبے لمبے مضامین چھاپتے رہیں۔ میں یہ خط لکھ کر لوگوں کے سامنے اس کا اصلی چہرہ بے نقاب کر رہی ہوں۔ میں نے اسے چاہا تھا مگر اسے اپنے ہاتھوں سے مار دینے پر مجھے کوئی افسوس نہیں ہے البتہ مجھے مس سلوچنا کی موت پر افسوس ضرور ہے لیکن یہ افسوس بھی میری نظر میں بے کار ہے کیونکہ میری ہی طرح وہ بھی بچے کی ماں بننے والی تھی ایک بن بیاہی ماں یعنی ناجائز بچے کی ماں اگر میں اسے نہ مارتی تو بھی وہ اپنے آپ کو ضرور مار ڈالتی میری ہی طرح۔

اب اس وقت یہ پوری داستان لکھتے کافی رات گزر چکی ہے۔ میرے سامنے دو کرسیوں پر دو لاشیں پڑی ہیں اور میری میز پر رکھا ہوا چائے کا ٹھنڈا کپ مجھے موت کی وادی میں پہنچانے کے لیے میرے ہونٹوں کو تاک رہا ہے۔

آج جب میں مرنے جا رہی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ کاش میں نے طلاق نہ لی ہوتی تو آج میری زندگی کا یہ بھیانک انجام بھی نہ ہوتا اگر میرے شوہر میرے مزاج کے مطابق نہیں تھے تو میں ہی خود کو ان کی مرضی کے مطابق ڈھال لیتی تو زندگی آج بھی خوشگوار ہوتی۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا‘ قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔

اب آخر میں پولیس سے میری اتنی ہی درخواست ہے کہ میرا یہ خط جوں کا توں ہر اخبار میں شائع کرا دیا جائے تاکہ مجھ جیسی بھولی بھٹکی بھیڑ سماج کے ان بھیڑیوں سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ بس فقط چاند۔“

خط پڑھ لینے کے بعد انسپکٹر رمیش نے مسٹر ورما کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک پوری توجہ سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے انہوں نے رمیش کے ہاتھ سے وہ خط لیا اور میز پر رکھ کر بولے۔ ”یہ خط اخباروں میں ضرور شائع ہونا چاہیے تاکہ لوگ ان شیطانوں کو بھی دیکھ لیں جو دیوتا بن کر انہیں لوٹ رہے ہیں۔“

چوتھی قسط

جادوگر

ایم اے راحت

دِل والوں کی دِلّی..... مُغلوں کی یَادگاروں اور وَلیوں دَرویشوں کی آغوش میں سانس لینے والی دِلّی میں پیش آنے والے ایک پریشان حال نوجوان کی داستانِ حیات جسے جِنوں سے واسطہ پڑگیا تھا۔ سطر سطر تجسس اور پراسرار واقعات سے سجی ہوئی دلچسپ سلسلے وار داستان۔

اس جہان میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ جن پر عقل حیران رہ جاتی ہے اور یقین ہی نہیں آتا کہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے.....؟ ایسے ہی واقعات سے بھرپور یہ داستان بھی آپ کو اپنے حصار میں جکڑ لے گی۔ عمران ڈائجسٹ کا نیا اور حیرت انگیز سلسلہ

عمران ڈائجسٹ کا سنسنی خیز، پُرتجسس اور نیا سلسلہ

ابرانوس بہت ہی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا' اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ساتھ پیش آنے والے عجیب وغریب واقعات مجھے بری طرح الجھائے ہوئے تھے' پے در پے کوئی نہ کوئی نیا حادثہ ہو جاتا تھا' اگر یہ نہ ہوتا تو اس جن زاد سے میں بڑا لطف لے سکتا تھا' اسی وقت ابرانوس کی آواز ابھری۔

''اس سے اس کے بارے میں پوچھو' میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ جو کچھ یہ بولے گی' اب سوچ بولے گی۔''

میں گینس کی شکل دیکھنے لگا' پھر میں نے ناشتہ اٹھا کر سامنے رکھ لیا اور کہا۔ ''گینس ہم لوگوں کو اتنی قربت کا مظاہرہ بھی نہیں کرنا چاہیے' جبکہ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تم نے بے شک یہ کہا تھا کہ تم حالات کا شکار ہو اور کچھ دشمن تمہاری تاک میں ہیں لیکن یہ نہیں بتایا تم نے کہ وہ کون ہیں اور تمہاری کہانی کیا ہے۔'' اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

''کیا کرو گے میری کہانی سن کر؟''

''میری خواہش ہے کہ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور دفعتہً گینس کی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں وہ مدھم لہجے میں بولی۔

''میں نے تمہیں اپنا نام غلط نہیں بتایا' میرا نام گینس ہی ہے' میں نے ایک ایسی عمارت میں ہوش سنبھالا تھا جو میرے لئے قید خانے کی طرح سے تھی' اسے قید خانہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ وہاں بے پناہ پابندیاں تھیں' وقت پر باہر نکلو اور نکلو بھی تو محافظوں کے ساتھ' دو آدمی ہمیشہ مجھ پر مسلط رہتے تھے۔ کہیں بھی جاتی تھی تو وہ دونوں موجود ہوتے تھے۔ کسی دوست کے پاس بھی اکیلی نہیں جا سکتی تھی' مجھے تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ میرے اتالیق نے مجھے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ میرے باپ نہیں ہیں بلکہ چچا ہیں۔ میرے والدین کے بارے میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ وہ ایک حادثے میں ہلاک ہو چکے ہیں اور چچا میری پرورش کر رہے ہیں۔ وہ شخص جو میرے سامنے چچا کی حیثیت سے آیا تھا اور جس کا نام حاذق ریازی تھا ہمیشہ میرے لئے شبہے کا باعث رہا' وہ میری جائیداد کا متولی تھا' لیکن اس کا انداز جس طرح میرے لئے خادمانہ تھا وہ بات ذرا تعجب خیز تھی' وہ ہمیشہ میرے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اپنے اختیارات کو اس نے ہمیشہ ہی میرے خلاف استعمال کیا' یعنی جو کام میں نے کرنا چاہا اور اسے پسند نہ ہوا تو اس نے نہایت نرمی اور سادگی سے کہہ دیا کہ یہ کسی قیمت پر نہیں ہوگا اور مجھے اس کام سے روک دیا جاتا تھا' لیکن اس نے کبھی اپنا لہجہ تلخ نہیں کیا' سوچو ذرا سوچو اس طرح کوئی زندگی گزرتی ہے۔

میں بڑے عجیب وغریب حالات کا شکار تھی' میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا مستقبل کیا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا' گھر میں صرف حاذق ریازی تھا' کچھ ملازم تھے یا پھر میری گورنس تھی' میں نہیں جانتی تھی کہ اس بوڑھی عورت نے کب سے میری نگرانی سنبھالی تھی' لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے اسے ہی اپنے قریب دیکھا تھا اور وہ میری ہر ضرورت میں خیال رکھتی تھی' میں بھی اس کا احترام کرتی تھی لیکن جب بھی میں اس سے کوئی اپنائیت کی بات کرتی وہ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو جاتی اور کہتی تھی کہ وہ صرف خادمہ ہے اسے خادمہ ہی رہنے دیا جائے' تم خود بتاؤ شامی یہ حالات عجیب وغریب تھے کہ نہیں' میرے ذہن میں بغاوت کیوں نہ بیدار ہوتی' بہرحال حاذق ریازی سے اس بارے میں سوال کیا لیکن وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ وہ صرف میرا متولی ہے اور اپنا فرض پورا کر رہا ہے۔ پھر ایک رات میں نے حاذق

ریازی کو کچھ پراسرار لوگوں سے ملاقات کرتے دیکھا' یہ تین افراد میرے لئے بالکل اجنبی شکل و صورت کے حامل تھے اور میں نے اس سے قبل انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

حاذق ریازی کی شخصیت بہت پراسرار تھی' لیکن ان تینوں کے سامنے میں نے اسے بہت مؤدب محسوس کیا۔ وہ جس طرح کی گفتگو کر رہے تھے اس نے میرے تجسس کو بری طرح بھڑکا دیا' موضوع میں ہی تھی' وہ تینوں میرے بارے میں حاذق ریازی سے معلومات حاصل کر رہے تھے اور حاذق ریازی عاجزی سے ان سے کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اس کے پاس پرسکون ہوں' ان میں سے ایک نے حاذق ریازی سے کہا کہ اگر مجھے کسی قسم کی الجھن یا دقت پیش آئی تو اسے اس کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا جس پر حاذق ریازی گڑگڑانے لگا تھا' یہ ساری گفتگو میرے لئے اس قدر تعجب خیز تھی کہ میں ساکت ہوگئی اور اس وقت تک میرے قدم وہاں جمے رہے جب تک وہ لوگ گفتگو کرتے رہے' میں کچھ بھی نہیں سمجھ پائی تھی' لیکن وہ رات میری زندگی کی بدترین رات تھی' اس رات میرے ذہن میں ایک انوکھا تصور جاگا اور میں نے سوچا کہ درحقیقت میں ان میں سے نہیں ہوں بلکہ یہ لوگ میرے پرورش کنندگان ہیں اور کسی خاص مقصد کے لئے میری پرورش کر رہے ہیں' یہ سب کچھ کیا ہے میں نہیں سمجھ پائی' دوسرے دن میں نے پھر حاذق ریازی سے سوال کیا تو اس نے پریشان لہجے میں کہا کہ میں کوئی تردد نہ کروں وہ خود پریشان ہے' اب میری قوت برداشت جواب دے گئی تھی' میں خود سے اجنبی ہوگئی تھی' اب تو میں نے مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی کہ میں کیا ہوں' کون ہوں' میرے والدین کون ہیں' عجیب و غریب انکشافات ہوتے تھے مجھ پر' کوئی میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا میں نے گورنس سے بھی سوال کیا اور وہ بوڑھی خاتون لرز کر خاموش ہوگئی' پھر جب میرا ذہنی ہیجان انتہاء کو پہنچ گیا تو ایک دن میں نے گورنس کی گردن پر خنجر رکھ دیا' حاذق ریازی اس وقت موجود نہیں تھا' میں نے خوفناک لہجے میں کہا کہ میں اسے قتل کردوں گی ورنہ مجھے میرے بارے میں بتائے اور میں اسے خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے لرزتے لہجے میں قسمیں کھا کر بتایا کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی سوائے اس کے کہ میرا تعلق ایران کی ایک بڑی شخصیت سے ہے اور میں خالص ہندوستانی نہیں ہوں' حاذق ریازی صرف میرا ملازم ہے اور اسی نے گورنس کو میری نگرانی کے لئے مامور کیا تھا' یہ الفاظ میرے لئے انتہائی حیرت ناک تھے۔ پھر میں نے گورنس سے سوال کیا کہ ایران کی وہ کونسی شخصیت ہوسکتی ہے جس سے میرا تعلق ہے اور میرے ہندوستان میں پرورش کی وجہ کیا ہے۔ بیچاری نے یہی جواب دیا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی' صرف ایک نام اتفاقیہ طور پر اس کے علم میں آیا ہے جس سے کسی بھی شکل میں میرا تعلق ہوسکتا ہے اور وہ نام تھا باطش چنگیزی' اس نے بتایا کہ اس شخصیت کے نام پر اکثر حاذق ریازی سے ملاقاتیں کی جاتی ہیں اور ان کا تعلق میری ذات سے ہے' بوڑھی گورنس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ واقعی اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی' چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا' لیکن مجھے سکون نہیں تھا' میں اپنی ذات سے واقف ہونا چاہتی تھی اور مجھے اس بات پر یقین تھا کہ حاذق ریازی مجھے کچھ نہیں کرنے دے گا' جو کچھ کرنا ہے مجھے خود ہی کرنا ہوگا' اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ میری گورنس میری اس بات کی اطلاع فوراً حاذق ریازی کو دے گی کیونکہ بہرطور وہ اس کی ملازمہ تھی اس لئے میں نے اپنی رہائش گاہ چھوڑ دی اور اس کے بعد

نجانے کہاں کہاں بھٹکتی رہی' میرے ذہن میں صرف ایک ہی خبط ہے کہ کسی بھی طرح میں اپنی ذات کی شناخت کرلوں' باقی سب کچھ میں تمہیں بتا چکی ہوں' یہ بھی کہ بالکل اتفاقیہ طور پر میں ڈاکٹر جین اور اس کے خزانے سے واقف ہوگئی۔ اس کا منصوبہ میرے علم میں آگیا اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح میں اس جہاز تک پہنچ جاؤں جو ایران جارہا ہے۔ چنانچہ میں شدید کاوشوں کے بعد جہاز میں داخل ہوگئی اور بعد میں تمہیں معلوم ہے کہ کیا ہوا ہے۔''

لڑکی جس انداز میں بول رہی تھی اس پر اب مجھے حیرت نہیں تھی' میں جانتا تھا کہ ابرانوس کی قوتوں کے زیر اثر وہ بالکل سچ بول رہی ہے لیکن بہت سی باتیں اب بھی میرے ذہن میں الجھی ہوئی تھیں۔ گینس ایرانی نام تو نہیں تھا جبکہ وہ اپنے آپ کو ایران سے متعلق کہتی تھی اور باطش چنگیزی بھی جو کوئی بھی تھا اس کے بارے میں صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ بہرحال مجھے ان گتھیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میں تو اپنے لئے ہی پریشان تھا۔ اسی وقت ابرانوس کی آواز میرے ذہن میں ابھری۔

''یار یہی تو زندگی ہے' کتنی دلچسپ کہانی ہے' اب یہ لڑکی ایران جائے گی اور اس شخص کو تلاش کرے گی جس کا نام باطش چنگیزی ہے' ہم بھی دیکھیں گے کہ اس کی شخصیت کیا ہے۔''

''میری جان' کیوں تم جنوں کا مذاق اڑوا رہے ہو' جنوں کے بارے میں تو یہ مشہور ہے کہ شہزادی گلنار کو اس کی قبر سے نکال لاتے ہیں اور بڑے بڑے محل اڑا کر لے آتے ہیں' تم کیسے جن ہو کہ اس لڑکی کے بارے میں بھی معلومات نہیں حاصل کرسکتے۔''

''تم نے ان بیوقوفوں کی کہانیاں پڑھ کر اپنے ذہن کو خراب کرلیا ہے' بھائی جن بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہیں' بے شک آتش زادے ہونے کی وجہ سے ہمارے اندر کچھ صفات مختلف ہیں' لیکن یہ تو نہیں کہ سب کچھ ہی ہمارے سامنے عیاں ہو۔''

''اونہہ..... جہنم میں جائے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' گینس کی طرف نگاہ اٹھی تو وہ شدید حیرانی کا شکار نظر آرہی تھی۔ اس کی چمکدار آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی' پھر اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھی میرے نزدیک پہنچی اور اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ اس کی تھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''تم کون ہو جواب دو' ورنہ حقیقتاً میں تمہارا خون کردوں گی۔''

''ارے ارے اب کیا مصیبت نازل ہوئی تم پر؟''

''تم ان باتوں سے بھی واقف ہوگئے جو میں نے اپنے وجود سے بھی چھپا کر رکھی ہیں۔ میری زبان تمہارے سامنے کیوں کھل گئی' میں نے تمہیں یہ سب کچھ کیوں بتا دیا۔''

''اوہو..... اس میں میرا قصور ہے' میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید تمہارے دل میں میرے لئے کچھ سچے جذبے جاگ اٹھے ہیں۔''

''بکواس..... میں اس حد تک کسی پر اعتماد نہیں کرسکتی تھی' لیکن مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم نے مجھے ہپناٹائز کردیا اور مجھ سے میرے بارے میں سب کچھ پوچھ لیا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیئر گینس' کسی دیوانگی کا شکار نہ ہو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں خود بھی مسائل کا شکار ایک پریشان آدمی ہوں' اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھی اس بے بسی کا سفر کیوں کرتا' تم اطمینان رکھو' میرے لئے تمہاری کہانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی' میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

وہ بے یقینی کے انداز میں مجھے دیکھتی رہی

اس نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے کیا ہو گیا تھا' میں نے تو تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی زندگی کی کہانی دنیا میں کسی کو نہیں سناؤں گی' پھر میری زبان کیوں کھل گئی' آہ یہ سب تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوا۔''

''دوسری بار تم سے کہہ رہا ہوں گینس کہ میری ذات سے تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا اور اس ...'' اس بار میرا لہجہ سخت اور کھردرا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دم نڈھال ہو گئی ہے اور بہت گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے' بہرحال ابرانوس کی خواہش کچھ بھی ہو میں بلاوجہ کسی اجنبی اس لڑکی کے معاملات میں خود کو نہیں الجھانا چاہتا تھا۔ میں تو خود ڈانواں ڈول شخصیت کا مالک تھا۔ بہرحال وہ میری طرف سے خوف کا شکار ہو گئی تھی۔ وقت تھوڑا سا اور آگے بڑھا اور کھانے پینے کی اشیاء کے لئے ہمیں راتوں کو باہر جانا پڑتا' البتہ ابرانوس اب میرے ساتھ ہوتا تھا۔ کئی بار اس نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ میں تہہ خانے کی زندگی چھوڑ کر جہاز پر چلوں' کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکے گا لیکن یہاں میں نے اس سے کوئی تعاون نہیں کیا تھا' اس گفتگو کے بعد گینس نے بھی تہہ خانے سے باہر جانے کے لئے بات نہیں کی تھی لیکن اب وہ بہت اداس اور الجھی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے ذہن پر شاید یہ خیال سوار ہوتا تھا کہ میں اس کی ذات کے لئے کوئی عذاب بن جاؤں' پھر ایک چمکتی دوپہر جہاز کی رفتار تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور آہستہ آہستہ وہ اچھلتا چلا گیا۔ اب اس تہہ خانے کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے تھے میں نے گینس سے کہا۔

''گینس شاید ہم ایران پہنچ گئے ہیں؟''

''اب کیا کریں؟''

''اس صندوق میں ہم دونوں نہیں آ سکتے' تم ہی کسی سامان میں داخل ہونے کی کوشش کرو' میں اس صندوق میں ہی چھپ جاؤں گا۔''

''تم چھپ جاؤ' میں اپنے لئے کوئی جگہ تلاش کرتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور میں نے مجبوری کی حالت میں اپنے لئے صندوق میں وہی جگہ بنا لی۔

سامان اٹھانے کی آوازیں آ رہی تھیں' کچھ دیر کے بعد یہ صندوق بھی اٹھا لیا گیا۔ صندوق کو شاید اوپر لایا گیا اور پھر یوں لگا جیسے اسے بلندی سے نیچے پھینک دیا گیا ہو' اس کے نیچے گرنے کی رفتار اتنی ہی تیز تھی' لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ رک گیا' مجھے کوئی جھٹکا نہیں لگا تھا' صندوق کسی جگہ رکھ دیا گیا۔ میں صورت حال سے بالکل ناواقف تھا۔ ایک چھوٹے سے سوراخ سے چمکتا ہوا آسمان نظر آ رہا تھا' کبھی کبھی کوئی انسان بھی قریب سے گزرتا نظر آتا تھا' جس جگہ مجھے رکھا گیا تھا اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن کچھ ہی لمحے کے بعد میں نے کسی اسٹیمر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے اسٹیمر میں رکھا گیا ہے۔

اسٹیمر کسی نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا تھا۔ مجھے گینس کا خیال ضرور آ رہا تھا لیکن کسی بہت بڑی ہمدردی کے ساتھ نہیں' میں تو اپنی ہی مشکل کا شکار تھا کسی اور کے بارے میں کیا سوچتا۔ یہ سمندری سفر میری توقع سے کہیں زیادہ طویل تھا' خدا خدا کر کے یہ جان لیوا سفر ختم ہوا اور اسٹیمر کا انجن بند ہو گیا۔ آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر پانی کی شڑاپ شڑاپ' غالباً اسٹیمر کو اب ساحل کی جانب چپوؤں کی مدد سے لے جایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جھٹکا لگا اور میرا سر صندوق سے ٹکرا گیا۔ آنکھوں میں تارے ناچ گئے' ان بیچاروں کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس عظیم الشان خزانے کے ساتھ ساتھ ایک انسانی خزانہ بھی اس صندوق میں موجود ہے' پتہ نہیں بیچاری گینس کا کیا حشر ہوا' غرضیکہ صندوق کو اسٹیمر سے اٹھا لیا گیا اور پھر شاید کہیں کسی بلندی پر لے جانا

پڑا۔ کیونکہ اب صورت حال یہ تھی کہ میری ٹانگیں اوپر اور سر نیچے اور صندوق ہوا کے دوش پر اڑا چلا جا رہا تھا' لیکن یہ ہوا کا دوش نہیں تھا بلکہ چار آدمی زندگی میں ہی مجھے کاندھا دے کر اوپر لے جا رہے تھے' یہ سفر بھی ختم ہوا اور اس کے بعد مجھے کسی گاڑی میں رکھ دیا گیا۔

نئے سفر کا آغاز ہوگیا' لیکن وہ کمبخت ڈرائیور خدا اسے غارت کرے' بالکل اناڑی معلوم ہوتا تھا اتنے جھٹکے لگ رہے تھے کہ میرا اپنا ہی جھٹکا ہوا جا رہا تھا' یہ سفر بھی کوئی دو ڈھائی گھنٹے سے کم کا نہیں تھا' اس کے بعد گاڑی کے پیچھے سے صندوق باہر نکال لیا گیا۔ بہرحال یہ سفر جاری رہا اور پھر اسے کسی عمارت میں لے آیا گیا۔ پھر اسے ایک ایسی جگہ سے گزارا گیا جہاں خاصی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔

پھر کسی تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کی جانے لگیں اور اس کے بعد پھر ویسا ہی ماحول ملا جیسا کہ جہاز کے سفر میں تھا' خاموشی سناٹا لیکن یہ جگہ شاید ایئر کنڈیشنڈ تھی کیونکہ ہلکی ہلکی خنکی محسوس ہو رہی تھی اور یہ خنکی اسی سوراخ سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی حالات ایسے نہیں تھے کہ اپنے اس ٹھکانے کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جاتی لیکن میرے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور میں اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے لانے والے یہاں سے چلے جائیں' کافی دیر گزر گئی اب کوئی آہٹ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے صندوق کے ڈھکن کو تھوڑا سا اٹھایا۔

مجھے پہلے ہی ہلکی ہلکی روشنی کا احساس ہو رہا تھا' جب میں نے صندوق کا ڈھکن اٹھایا تو ایک عجیب و غریب منظر نظر آیا۔ انسان زندگی پر ایک بہترین عجائب خانہ' پتھروں سے بنی ہوئی تصویریں' مجسمے' بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ ایک جانب الماریاں نظر آ رہی تھیں جن کے اندر لاتعداد موٹی موٹی کتابیں سجی ہوئی تھیں' ان کتابوں کے قریب ایک میز موجود تھی جس کے پیچھے ایک ریوالونگ چیئر سامنے کرسیاں' دبیز قالین ایک انتہائی خوبصورت جگہ تھی' ابھی میں اس جگہ کا جائزہ نہیں لے پایا تھا کہ اچانک ہی ایک طرف روشنی نمودار ہوئی اور میں نے صندوق کا ڈھکن بند کرلیا' قدموں کی آوازیں سنائی دی تھیں' شاید دو افراد تھے' یہ آوازیں میرے قریب آ کر رک گئیں۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہر لمحے مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابھی صندوق کا ڈھکن کھل جائے گا اور ساتھ ہی میرا راز بھی کہ میں کس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا' وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئی تھی' پھر مجھے ایک آواز سنائی دی۔

''بے شک یہ بہت قیمتی خزانہ ہے' لیکن تم جانتے ہو میری منزل خزانے نہیں ہیں' میں تو علم کے وہ خزانے حاصل کرنا چاہتا ہوں جو بے مثال ہیں اور میری یہی تحقیق میری منزل ہے' بے شک خزانے بڑی اہمیتوں کے حامل ہوتے ہیں' لیکن صرف اس حد تک کہ تحقیقی ضرورت میں کام آسکے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر جین' آپ کی شخصیت ایسی ہی ہے۔''

''بس میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ میرے ساتھ رہو اور میرے مشن میں میرے معاون۔''

''نہ صرف میں ڈاکٹر جین' بلکہ ہم سب دل و جان سے اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔''

تھوڑی دیر تک وہ لوگ باتیں کرتے رہے' غالباً صندوق کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ میں نے سکون کی سانس لی' مجھے تو یہ خوف تھا کہ کہیں صندوق کھول نہ لیا جائے' ایک بار پھر سناٹا چھا گیا اور میں باہر کی آہٹوں کا انتظار کرنے لگا' جب کوئی آہٹ نہ سنائی دی تو میں نے صندوق کا ڈھکن کھولا اور باہر کی سن گن لینے لگا' اب آس پاس

را ا ا ا آئیں ... لالی ... ے رہی تھی' یقیناً یہ ... کی ... کی گاہ تھی' لیکن اب مجھے کیا کرنا تھا ... وہ ... ن جانب داخلی دروازہ تھا' میں ... تھی۔ ایک لمحے تک میں سوچتا رہا اور اس کے بعد صندوق سے باہر نکل آیا اور پھر باہر ... دل پر ایک اداسی چھا گئی' یہاں اس ... کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں تھا۔ پتہ نہیں ... ں کہاں ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اتنی چالاک ہے کہ یہاں سے نکل بھاگے گی' اگر وہ یہاں تک پہنچی ہے تو۔

اچانک میرے ذہن میں ابرانوس کا خیال آیا اور میرے جبڑے بھنچ گئے' یہ ناقابلِ بھروسہ ... میرے لئے عذاب بنا ہوا تھا۔ بلاوجہ اس پر ... کرتا تھا۔ میں نے دانت پیس کر اسے آواز دی' لیکن ابرانوس کا کوئی جواب نہیں ملا' دل ہی دل میں' میں نے اسے بہت برا بھلا کہا اور کہا ابرانوس اب تم پر اعتماد کرنا میری سب سے بڑی حماقت ہوگی' جب کسی مشکل میں گرفتار ہوتا ہوں تو میرا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ بہرحال ابرانوس کے بارے میں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اس ... دور تک اس کا کوئی پتہ نہیں ہے' میں دروازے کے قریب پہنچ گیا' اندر سے ایک چوکور ... نظر آرہی تھی جو دروازے کی شکل کی تھی' ... بھی پتھر ہی کی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ دروازہ ... ملازم سے ہی کھولا جاتا ہوگا کیونکہ اندر ... ہینڈل وغیرہ بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ ابھی میں کھڑا ہی ہوا تھا کہ باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں نے برق رفتاری سے صندوق کی جانب دوڑ لگا دی' ڈھکنا کھلا ہوا تھا' میں نے جلدی سے اس میں لیٹ کر ڈھکنا بند کرلیا۔ اصل میں اب بھی مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی تھی کہ میں صندوق کی مکانیت چھوڑ کر وہاں اپنا ٹھکانہ بنا لوں۔ میں نے جلدی سے صندوق کا ڈھکنا بند کیا۔ قدموں کی چاپ اندر آگئی تھی اور کوئی اندر داخل ہوگیا تھا لیکن اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوسکا دل ہی دل میں میں نے سوچا کہ اب کرنا کیا ہوگا۔ آنے والی شخصیت اگر ایک ہے تو میں اس کی مرمت کردوں گا اور یہاں سے نکل بھاگوں گا' لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ دروازے کو دیکھ چکا تھا' اسے کھولنے کا طریقہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

آخرکار قدموں کی چاپ صندوق کے پاس آکر رک گئی اور دو ہاتھ صندوق کو ٹٹولنے لگے۔ میں نے خوفزدہ انداز میں آنکھیں بند کرلی تھیں۔ صندوق کھل گیا تھا' میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والا کون ہے' دوسری طرف مکمل خاموشی طاری تھی' لیکن پھر کچھ انگلیاں میرے چہرے سے ٹکرائیں۔ وہ مخروطی انگلیاں تھیں اور اس کا اندازہ ایک نازک سے لمس سے ہوگیا تھا جو میرے چہرے پر تھا' پھر مجھے ایک آواز سنائی دی۔

"آہ...... تم آگئے میرے محبوب' تم آگئے' ڈیڈی کہتے ہیں کہ اس صندوق میں خزانہ ہے' ہاں اس صندوق میں خزانہ ہے' لیکن میرے دل کا خزانہ' ڈیڈی کا دماغ خراب ہوگیا ہے' سنو آنکھیں کھولو' میری جان میری زندگی ذرا آنکھیں تو کھولو۔ اگر تم زندہ ہو تو آنکھیں کھولو' مجھ سے بات کرو' دیکھو میں ایلن ہوں' ایلن جین' اپنی ایلن جین کو پہچانو' میرے دوست' اپنی ایلن جین کو پہچانو۔ میں نے صرف تمہیں خوابوں میں دیکھا ہے اور دیکھو' کس طرح میں نے تمہیں پہچان لیا' لیکن میرے خواب بھی تو سچے ہوتے ہیں' سچے ہوتے ہیں میرے خواب' اٹھ جاؤ نا' مجھے اپنے بارے میں بتاؤ' مگر تم مجھے کیا پہچانتے ہوگے' خوابوں میں یکطرفہ شناسائی ہوتی ہے' بتاؤ تم زندہ ہو یا پھر ڈیڈی ہی ٹھیک کہتے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں یہ نام دہرایا' ایلن جین' یعنی ڈاکٹر جین کی بیٹی' کیا یہ لڑکی اتنی معصوم ہے یا پاگل ہے' یا پھر مجھے احمق بنا رہی ہے' آہ

کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر جین کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہو' میں دم سادھے پڑا رہا' لڑکی چند لمحے مجھے دیکھتی رہی' پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''نہیں..... میں کبھی نہیں مانوں گی' کبھی نہیں مانوں گی کہ تم اس دنیا میں نہیں ہو' تم زندہ ہو' تم زندہ ہو' اور سنو تم اگر زندہ بھی نہیں ہو تو میں تمہیں زندہ کر سکتی ہوں' میں ایسے علوم جانتی ہوں کہ میں تمہیں زندہ کر لوں گی' اب مجھے سوچنا پڑے گا کہ تمہیں زندہ کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

دفعتہً لڑکی کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے ایک دم تیز روشنی محسوس کی تھی' غالباً وہ دروازہ پھر کھلا تھا اور کوئی اندر آ رہا تھا' بہت سے قدموں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ ڈاکٹر جین کی آواز سنائی دی۔

''ارے ایلن جین! میں تمہیں کہاں کہاں تلاش کر رہا تھا' یہاں کیوں آئی ہو؟''

''کیوں کیا مجھ پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں' کیا یہ عمارت صرف آپ کی ملکیت ہے ڈیڈی اور کیا میں غیر تعلیم یافتہ لڑکی ہوں۔''

''ارے نہیں نہیں ایلن بیٹا کس نے کہا تم سے یہ' تمہیں شاید یہ اندازہ نہیں کہ یہ وقت ہماری چائے کا ہے اور تمہیں یہ بھی اندازہ نہیں کہ میں تمہارے بغیر چائے نہیں پیتا۔''

''جھوٹ نہ بولیئے ڈیڈی' اتنے عرصے سے کون میرے ساتھ چائے پی رہا تھا' ناشتہ کر رہا تھا' کھانا کھا رہا تھا' کیا میں تنہا نہیں تھی۔؟''

''بے بی کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ میں کس قدر اہم مشن پر گیا تھا؟''

''ڈیڈی' اس مشن کی واپسی پر آپ نجانے کس بیچارے کو پکڑ کر اس صندوق میں بند کر لائے ہیں' کیا یہ واقعی مردہ ہے۔''

''اں۔'' ڈاکٹر جین کی آواز چونکی ہوئی تھی پھر اس نے کہا۔

''اوہ بے بی' اس میں کوئی زندہ یا مردہ انسان نہیں ہے' آؤ تم میرے ساتھ چلو' چلو آؤ میرے ساتھ۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تمہارے لئے کس قدر پریشان تھا' آؤ۔''

''لیکن یہ..... مردہ انسان میں اسے زندہ کئے بغیر نہیں رہوں گی ڈیڈی۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' چلو آ جاؤ' آ جاؤ.....'' ڈاکٹر جین نے کہا اور شاید لڑکی کا بازو پکڑ کر اسے گھسیٹا۔ لڑکی کی آواز ابھری۔

''سنو تم زندہ ہو' زندہ رہو گے' اگر نہیں ہو تو میں تمہیں زندہ کر لوں گی یہ میرا وعدہ ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے بے بی آؤ' ہم اس سلسلے میں کسی مناسب وقت بات کریں گے' باہر چلو میں چائے پیؤں گا۔'' ڈاکٹر جین کے انداز میں بے حد پیار تھا' لیکن لڑکی سے وہ جس انداز میں بات کر رہا تھا اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ لڑکی تھوڑی سی کھسکی ہوئی ہے' کیا یہ میرے لئے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا' وہ لوگ چلے گئے' لیکن میرے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے تھے۔ لڑکی مجھے زندہ کرنا چاہتی ہے' اپنے کسی محبوب کی بات کر رہی ہے' تو پھر جلدی کرے میری مدد کرے تاکہ مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے۔ اس نے مجھے اپنا محبوب کہا تھا' کوئی بہت بڑی غلط فہمی تھی یا پھر' یا پھر لڑکی ذہنی طور پر بہت ہی غیر متوازن تھی۔ ایک بار پھر دل میں گینس کا خیال آیا' پتہ نہیں اس پر کیا گزری' ذہن میں بہت سے خیالات تھے۔ میں سوچتا اور ایک بار پھر میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ابرانوس..... جواب تو دے دے بدبخت۔ کہاں مر گیا' لعنت ہے تجھ پر۔''

نجانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا' وہ لوگ اب چائے پی رہے ہوں گے اور چائے کے ساتھ ممکن ہے دوسرے لوازمات بھی ہوں۔ میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے' یہاں کھانے کو کچھ

نہیں تھا' کم از کم جہاز میں کھانے کی آسائشیں تو میسر تھیں اور ہم خوراک حاصل کرتے رہے تھے' لیکن اب کیا ہوسکتا ہے' یہاں تو کتابوں کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں' آہ کچھ نہ کچھ کھانے کو ملنا چاہیے ورنہ خطرہ ہی خطرہ ہے۔

سوچتا رہا پھر اس وقت رات کا غالباً کوئی پہر تھا جب دروازہ ایک بار پھر کھلا اور دوسری طرف سے آنے والی روشنی سے احساس ہوا کہ کوئی اندر آیا ہے لیکن روشنی اتنی تیز نہیں تھی قدموں کی چاپ پھر میرے قریب آکر رک گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس ہال نما کمرے میں روشنی پھیل گئی' یقیناً یہاں تیز روشنیاں جلادی گئی تھیں' کچھ جھریوں سے روشنیاں اندر آرہی تھیں۔ قدموں کے چاپ آہستہ آہستہ بالکل میرے قریب آکر رک گئی' میں نے ایک لمحے کے اندر کچھ فیصلے کئے۔ ایک بار پھر صندوق کا ڈھکن کھلا اور ایک بہت ہی حسین خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ خوشبو میں نے اس وقت بھی محسوس کی تھی جب پہلی بار لڑکی جس کا نام ایلن تھا میرے پاس آئی تھی۔ اوہو تو وہ اس وقت یہاں آئی ہے۔ گویا میری مراد پوری ہوئی ہے اور اب مجھے بڑی فراست سے کام لینا تھا۔

صندوق کا ڈھکن کھلا اور لڑکی ایک بار پھر میرے چہرے کو ٹٹولنے لگی' پھر درد بھرے لہجے میں بولی۔

''دیکھو تم جاگ جاؤ' میرے دل کے تار تمہارے دل کے تاروں سے بندھے ہوئے ہیں۔ کیا میں یہ کہوں کہ اگر میری محبت سچی ہے اور میرے خواب سچے ہیں تو تم مجھے زندہ ملو گے' لیکن تم...... تم سو رہے ہو' سنو جاگ جاؤ' میری بات مان لو' میری اتنی سی بات مان لو' تم ایک زندہ انسان ہو' لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں جبکہ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں حقیقتوں کی متلاشی ہوں' اٹھ جاؤ' آنکھیں کھول دو مجھ سے باتیں کرو۔ مجھے اپنی کہانی سناؤ' دیکھو میں ایلن ہوں ایلن' اگر میرا پیار میری محبت سچی ہے تو جاگ جاؤ' خدا کے لئے جاگ جاؤ'' اور اس وقت مجھے اپنے لئے جاگنا تھا چنانچہ میں نے آنکھیں آہستہ آہستہ پٹپٹائیں۔ لڑکی کی نگاہیں غالباً میرے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں' میں نے آنکھیں کھول کر اس کا چہرہ دیکھا' آہ کیا بات تھی' انتہائی حسین نقوش کی مالک ایک ایسی لڑکی تھی جسے دیکھ کر بار بار دیکھنے کو دل چاہے' اس کے سیاہ بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور بیضوی چہرہ انتہائی دلکش نقوش کا حامل تھا' میں نے اس کے چہرے پر بے اختیار بے پناہ خوشیاں رقصاں تھیں' اس کی آنکھیں چراغوں کی طرح روشن ہوگئی تھیں۔ پھر اس کے خوبصورت دانت آبدار موتیوں کی طرح نمایاں ہوگئے۔

''دیکھا ناں میں ہی سچ کہتی تھی ناں' میری محبت سچی تھی۔ تم...... تم نے میری بات مان لی' بہت بہت شکریہ' بہت شکریہ میرے محبوب اور اب میں ثابت کرسکتی ہوں کہ میں بے حد ذہین ہوں اور ڈیڈی...... ڈیڈی اپنے فن میں بالکل ناکارہ' تم خود سوچو...... وہ جو زندہ ہوتے ہیں وہ مردہ کیسے ہوسکتے ہیں' ڈیڈی آرکیالوجسٹ ہیں' مگر میں نے ان کی باتیں کبھی نہیں مانیں' میں جانتی ہوں کہ وہ دنیا کے ساتھ فراڈ کررہے ہیں۔ زندہ لوگوں کو ممی بنا کر پکڑ لاتے ہیں اور اپنی تحقیقات پر کتابیں لکھتے ہیں' اٹھو...... صندوق میں نجانے کب سے لیٹے ہو' تمہاری کمر دکھ گئی ہوگی۔ اٹھو میرے محبوب اٹھ جاؤ۔''

میں نے خاموشی سے اسے دیکھا اور پھر میری نگاہیں اس دروازے کی جانب اٹھ گئیں جہاں سے داخل ہوا جاسکتا تھا' مجھے خوف تھا کہ کہیں ڈاکٹر جین یا کوئی اور یہاں نہ آجائے' وہ غالباً میرا مقصد سمجھ گئی تھی' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں ڈیڈی گہری نیند سو رہے ہیں' میں

ان کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر آئی ہوں' اگر وہ اٹھنے کی کوشش بھی کریں گے تو کم از کم وہ دروازہ کھول کر باہر نہیں آسکیں گے کیونکہ سارے ملازم اپنے کوارٹروں میں سو رہے ہیں' کوئی ان کی آواز نہیں سن سکے گا۔''

''تم کون ہو؟'' میں نے پہلی بار سوال کیا' اپنا لہجہ ذرا مشینی سا بنالیا تھا تاکہ اسے کسی عجیب سی کیفیت کا احساس ہو' وہ پرمسرت لہجے میں بولی۔

''ایلن..... ایلن' ڈاکٹر جین کی بیٹی ایلن' اچھا ایک بات بتاؤ' کیا میں تمہیں شکل سے پاگل لگتی ہوں؟''

''نہیں۔'' میں نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''ویری گڈ' چلو اٹھ کر بیٹھ جاؤ' کیا لیٹے لیٹے تمہاری کمر نہیں دکھ گئی' میں تو اگر صبح دیر سے اٹھوں تو میری کمر میں درد ہو جاتا ہے' تم نجانے کب سے اسے صندوق میں لیٹے ہوئے ہو۔''

میں نے کہنیوں کا سہارا لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''باہر نکل آؤ' میں تمہیں سہارا دوں' افوہ' تمہارا لباس کتنا گندہ ہو رہا ہے' خیر کوئی بات نہیں ہے' میں تمہیں لباس مہیا کردوں گی' اب تم دیکھنا ذرا میں دنیا کے سامنے اپنی ہی تحقیق پیش کروں گی' ڈیڈی حیران رہ جائیں گے یہ دیکھ کر کہ میں نے تمہیں زندہ کر دیا ہے' ہے ناں' میں نے تمہیں زندہ کر دیا ہے۔ اور جانتے ہو کہ یہ زندگی تمہیں کیسے ملی ہے اس لئے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

مجھے اب اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ لڑکی کسی قدر خبطی اور پاگل لگتی ہے' اس نے خود بھی اظہار کیا تھا کہ لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں' لیکن اتنی خوبصورت اور اتنی پیاری تھی وہ کہ مجھے اس کے پاگل پن پر دکھ ہونے لگا اور اس کے بعد اپنے پاگل پن پر کہ میں ابھی تک یہاں موجود ہوں جبکہ مجھے فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے' چنانچہ میں نے کراہتی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔

''ایلن اب جبکہ تم نے مجھے زندہ کر دیا ہے تو کیا تم یہ جانتی ہو کہ زندہ انسانوں کو زندگی کی دوسری ضروریات بھی درکار ہوتی ہیں۔''

''دوسری ضروریات' ارے ہاں میں سمجھ گئی' سمجھ گئی' بھوکے ہو نا۔''

''تم واقعی بے حد ذہین ہو تمہیں کون پاگل سمجھتا ہے۔؟''

''بس یہ ڈیڈی صاحب ہی ہیں نا ذرا ہمارے' زیادہ ہی ناز برداریاں برداشت کرتے ہیں میری' وہ یہ کہتے ہیں کہ میں ذہنی طور پر کچھ کمزور ہو گئی ہوں۔ کیا میں تمہیں کمزور نظر آتی ہوں' یہ دیکھو میں نے کیسے پہچان لیا کہ تم بھوکے ہو۔''

''واقعی کمال ہے' حالانکہ یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''سنو تم میرا شاہکار ہو' میں ڈیڈی کے پراسرار علوم سے تنگ آ گئی ہوں' وہ آرکیالوجسٹ ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ نجانے کیا کیا کچھ ہیں تم نہیں جانتے' ان کے بارے میں تم کچھ تفصیلات نہیں جانتے۔''

''ہاں یہ سچ ہے' لیکن پہلے مجھے کچھ کھلاؤ' ورنہ شاید میں دوبارہ مر جاؤں۔''

''ارے نہیں..... نہیں..... آؤ..... آؤ میرے ساتھ آؤ' کچن میں بہت کچھ موجود ہے' آؤ باہر چلو۔''

''لیکن اگر تمہارے ڈیڈی کے دوسرے ملازموں نے مجھے دیکھ لیا تو۔؟''

''بتا تو چکی ہوں ناں کہ اس وقت اندرونی حصہ خالی ہے۔ ملازم بیرونی حصے میں ہیں' رات کے وقت کوئی ملازم اندر نہیں ہوتا اور ڈیڈی اپنے کمرے میں سو رہے ہوتے ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ بند ہیں' اگر وہ زور زور سے دروازہ بھی پیٹیں گے

تو میں دروازہ ہی نہیں کھولوں گی' کمرے سے باہر نکلنے کا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے' آجاؤ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی اور میں اس کے ساتھ دروازے سے باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا' دروازہ کھولنے کا میکنزم اب مجھے معلوم ہو چکا تھا' یہ ایک نامعلوم سا چوکور خانہ تھا جو دور سے نظر نہیں آتا تھا' لیکن اسے دبانے سے دروازہ سلائیڈنگ ڈور کی طرح ایک طرف ہٹ جاتا تھا' وہ غالباً پتھر ہی کا بنا ہوا دروازہ تھا' دوسری طرف پہنچ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ دروازہ بند ہونے کے بعد دیوار میں دروازے کا پتہ نہیں چلتا تھا' اسے انتہائی نفاست سے بنایا گیا تھا' جس جگہ میں پہنچا وہ اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ تھی۔ اس کمرے کو بھی نشست گاہ کہا جاسکتا تھا' چاروں طرف خوبصورت آبنوسی فرنیچر سجا ہوا تھا' لیکن لڑکی اس کمرے میں نہیں رکی اور آگے بڑھتی رہی پھر وہ ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔

''بیٹھو یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ' ڈیڈی کا کمرہ یہاں سے بہت دور ہے' میں تمہارے لئے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

''اور لباس کا بھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں' ڈیڈی کا لباس تمہارے بدن پر یقیناً ٹھیک ہوگا' بس وہ تم سے قد میں ذرا بڑے ہیں' لیکن کوئی بات نہیں چل جائے گا۔'' وہ بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی میں نشست سے کھڑا ہوکر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اگر کسی طرح ڈاکٹر جین اپنے کمرے سے نکل آئے تو بھاگنے کے لئے مجھے کونسا راستہ مل سکتا ہے۔ بدن میں واقعی شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک اور پیاس سے جان نکلی جارہی تھی' بہرحال تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک خوبصورت ٹرالی میں کھانے پینے کی اشیاء اور کافی کا سامان سجائے اندر داخل ہوئی' اس وقت یہ لڑکی میرے لئے فرشتہ ہی تھی' میں ٹرالی پر ٹوٹ پڑا۔ ایلین مجھے مسکراتی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔ میں نے اخلاقاً اس سے کھانے کے بارے میں پوچھا بھی نہیں تھا' لیکن وہ اپنے اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہی تھی' اس نے اپنے اور میرے لئے کافی بنائی اور خود میرے سامنے بیٹھ گئی' پھر وہ خاموشی سے کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی رہی اور کچھ دیر کے بعد بولی۔

''اور کوئی چیز لاؤں' یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم واقعی بہت بھوکے تھے۔''

''نہیں میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہارے احسان کا بدلہ میں کس طرح ادا کروں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے' میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا' تم بھی تو میری خوشی کے لئے جاگ اٹھے ہو' کب سے سو رہے تھے اس صندوق میں؟''

''شاید صدیوں سے۔'' میں نے ایک کراہ کے ساتھ جواب دیا۔

''اوہ..... مگر تمہارا لباس تو اتنا پرانا نہیں ہے کہ تم صدیوں پرانے آدمی معلوم ہو اور پھر تم تو میرے خوابوں میں آیا کرتے تھے' اگر تم اتنے پرانے تھے تو میرے خواب میں پھر کیسے آگئے' میرے خواب تو نئے نئے ہیں ناں۔؟''

''ہاں واقعی' مگر تم نے مجھے زندہ کردیا۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں تمہارے لئے لباس لے آؤں' دیکھو وہ سامنے غسل خانہ ہے تم اس میں چلے جاؤ میں ابھی تمہارے لئے لباس لے آتی ہوں۔''

''ہاں لے آؤ۔'' اس نے کہا اور دروازے کی جانب مڑ گئی' پھر دروازے پر رک کر بولی۔

''میں کپڑے تمہیں دروازے پر دے دوں گی جاؤ نہالو پلیز' پتہ نہیں کب سے نہیں نہائے ہوگے شاید صدیاں ہوگئی ہوں گی۔''

وہ ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گئی' میں اللہ کا نام لے کر غسل خانے میں داخل ہوگیا' گرم پانی نے جسم کے تمام مسامات کھول دیئے تھے' اب تک میں جس عذاب میں مبتلا تھا اچانک ہی سر سے اتر گیا تھا' لڑکی مجھے لباس لا دے تو کسی نہ کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر یہاں سے نکل جاؤں' اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی تھی۔

کچھ لمحوں کے بعد غسل خانے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھول کر اس کے ہاتھ سے لباس لے لیا' یہ قیمتی سوٹ تھا۔ قمیص کے ساتھ ٹائی بھی تھی' میں نے پتلون پہنی تو پائنچے ایڑھیوں سے نیچے جاتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ڈاکٹر جین کے قد و قامت کا میں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا' لیکن بہر حال اس کے پائنچوں کی لمبائی دو تین انچ نیچے تھی' تاہم میں نے پائنچے نیچے سے موڑ لئے اور قمیص پہن کر باہر نکل آیا' اس کے ٹائی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''ٹائی بھی ہے اور یہ خوش قسمتی ہے کہ ڈیڈی نے یہ سوٹ دوسرے کمرے میں لٹکا دیا تھا' اگر وہ اسے اپنے ہی کمرے میں لٹکا دیتے تو اس کا حصول میرے لئے ممکن نہیں تھا کیونکہ ڈیڈی کی الماری ان کے کمرے میں ہی ہے اور کمرے کا دروازہ میں نے باہر سے بند کر رکھا ہے اور اسے کھولنے کا خطرہ نہیں مول لیا جا سکتا۔'' وہ ہنس پڑی' پھر ایک طرف اشارہ کر کے بولی۔

''جوتے بھی ہیں' جوتے بھی پہنو' سوٹ پہنو' ٹائی باندھو' میں دیکھوں گی کہ ایک مردہ آدمی جدید دور میں زندہ ہو کر کیسا لگتا ہے۔''

میں نے ٹائی باندھ کر کوٹ پہن لیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ڈیڈی کی تمام تھیوری بیکار ہو کر رہ گئی' اب دیکھو نا وہ تو قدیم دور پر ریسرچ کر رہے ہیں' لیکن میری ریسرچ میرے سامنے ہے' انسان ہر دور میں ایک جیسا ہوتا ہے صرف لباس اور خیالات کا فرق ہوتا ہے' کیا سمجھے۔''

''بالکل..... بالکل ٹھیک۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔

''اب مزہ آئے گا ڈیڈی نجانے اپنے اس ریسرچ سینٹر کو کہاں کہاں تلاش کرتے پھریں گے' ان کی ریسرچ میرے پاس موجود ہے۔''

''ہاں..... بالکل ٹھیک کہتی ہو' ممی کہاں ہیں تمہاری؟''

''ممی..... وہ تو کبھی تھیں ہی نہیں' بس ڈیڈی ہی تھے۔'' اس نے کسی قدر افسردہ ہو کر کہا اور پھر اس کے چہرے پر غم کے گہرے سائے نظر آنے لگے' وہ بولی۔

''میں سوچتی ہوں کہ اگر میری ماں ہوتی تو پھر کیسا لگتا مجھے' ایک بات بتاؤ؟''

''ہاں پوچھو۔''

''تمہاری مما تھیں؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا اور میں بوکھلائے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا' پھر جلدی سے بولا۔

''ہاں تھیں' بھی تھیں لیکن اب نہیں ہیں۔''

''اب تو خیر کوئی بھی نہیں ہوگا تمہارا' صدیوں پرانی بات ہے' ڈیڈی نے واقعی تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے' تم اس چھوٹے صندوق میں مطمئن اور خوش تھے؟''

''نہیں بالکل نہیں۔''

''کیا اس میں کوئی خزانہ بھی موجود ہے؟''

''مم..... مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیر کوئی بات نہیں ہے' ہاں یہ بتاؤ کہ اب تم کرو گے کیا؟''

''میں صبح کو ڈیڈی کے ساتھ ناشتہ کرتی ہوں' لیکن میں تمہیں ناشتہ پہنچا دوں گی تم اس کی فکر مت

لرنا' آؤ میں تمہیں تمہارے آرام کے لئے بھی جگہ بتادوں تم آرام سے سوجاؤ۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے اس سے کہا اس کے بعد وہ مجھے اس کمرے سے نکال لائی' پھر اس نے ایک دوسرے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''یہاں کوئی نہیں رہتا' اس لئے یہ تمہارے لئے بہت اچھی جگہ ہے' تم چاہو تو میں یہ دروازہ باہر سے بند کردوں تاکہ کسی کو شک ہی نہ ہوسکے۔''

''نن..... نہیں بالکل نہیں دروازہ کھلا ہی رہنے دینا میں خود ہی احتیاط کروں گا۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''او کے پھر آرام سے سوجاؤ' ناشتہ ذرا دیر سے ملے گا' لیکن ڈیڈی دس ساڑھے دس بجے چلے جائیں گے' انہوں نے مجھے اپنا پروگرام بتایا تھا۔''

''او کے ڈیئر ایلین خدا حافظ۔'' میں نے اس سے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی' معصوم لڑکی اپنی معصومیت میں میرے کام آگئی تھی' لیکن ڈاکٹر جین کو جب یہ معلوم ہوگا کہ اس نے ایک ایسی شخصیت کو آزاد کر کے بھگا دیا ہے تو پتہ نہیں اس کی کیا کیفیت ہوگی' لیکن مجھے اس وقت کسی کی کیفیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ بس تھوڑا سا وقت گزر جائے تو میں یہاں سے نکل بھاگوں۔ میرے لئے یہ جگہ بالکل اجنبی تھی اور میں یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ میں کونسے شہر میں ہوں اور اس کی نوعیت کیا ہے' ویسے ڈاکٹر جین نے ایران کا نام لیا تھا تو ظاہر ہے ایران میں ہی ہوں گا۔

ایران کے بارے میں میری معلومات کچھ بھی نہیں تھیں' چنانچہ اب جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا' تقریباً ایک گھنٹے تک میں انتظار کرتا رہا' پھر میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ رات کی تاریکی میں سناٹے کی حکومت پھیلی ہوئی تھی' یہ بات مجھے پتہ چل چکی تھی کہ ملازم اپنے اپنے کوارٹروں میں سو رہے ہیں' چنانچہ میں راہداری میں نکل آیا اور راہداری عبور کر کے اندازے کی بناء پر عمارت کے بیرونی سمت کی جانب بڑھنے لگا' تھوڑی دیر کے بعد میں صدر دروازے سے باہر تھا' باہر ایک خوبصورت سا لان تھا۔ ایک سائیڈ میں تین چار کوارٹر بنے ہوئے تھے' یقیناً یہی ملازموں کے کوارٹر تھے' اس کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر جین یہاں کے دولت مند لوگوں میں سے ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کمپاؤنڈ میں کار کھڑی ہوئی تھی' لیکن اب اس کار سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی' میں تو یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا چنانچہ سامنے کی طرف سے نکلنے کے بجائے میں نے کمپاؤنڈ کی دیوار پھلانگی اور یہاں سے باہر نکلنے کا کام کر ڈالا۔

باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور اس تاریکی میں میں کسی سمت کا تعین کئے بغیر چل پڑا۔ میں جس سمت سفر کر رہا تھا یہاں گھاس کا ایک چھوٹا سا میدان پھیلا ہوا تھا' اکا دکا مکانات میں روشنیاں نظر آرہی تھیں' میں تن بہ تقدیر تھوڑی دیر چلتا رہا اور پھر ایک پکی سڑک پر پہنچ گیا جو سیدھی چلی جاتی تھی' سڑک پر پہنچ کر میں نے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ سڑک پر لاتعداد روشنیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ پوری طرح روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ لیکن میرے پاس خود کو چھپانے کے لئے کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بس یہ سوچ رہا تھا کہ کسی مناسب جگہ پہنچ جاؤں تاکہ ڈاکٹر جین مجھے تلاش نہ کر سکے' البتہ اب اس بات کے امکانات نہیں تھے کہ وہ فوری طور پر میرے پاس پہنچ جائے' تھوڑی دور چلنے کے بعد بائیں سمت ایک چوراہا نظر آیا اور میں اس طرف چل پڑا' چوراہے سے ایک سمت اختیار کر کے آخر کار ایک شبینہ ریستوران نظر آیا جس پر فارسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

میرے دل میں ایک دم سے خیال پیدا ہوا کہ میں وہاں جاؤں لیکن مجھے اس بات کا بھی خیال آیا کہ میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے، میں نے بے بسی کے عالم میں جیبوں میں ہاتھ ڈالے مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جیب میں پرس موجود ہے، بے اختیار ہو کر پرس کھولا اور یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ پرس میں مقامی کرنسی کے کافی نوٹ موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ کاغذات اور دوسری چیزیں بھی تھیں، باہر لگے کھمبے کی روشنی میں کھڑے ہو کر میں نے دوسری جیبوں کی تلاشی لی، مجھے کئی ایسی چیزیں ملیں جن کا تعلق ڈاکٹر جین سے تھا تب ایک دم مجھے خیال آیا کہ یہ وہی لباس ہے جو ڈاکٹر جین کی بیٹی نے مجھے دیا تھا اور اس لباس میں ہی ڈاکٹر جین کا پرس وغیرہ بھی پڑا ہوا تھا، اوہ میرے خدا یہ تو میری بڑی مدد ہوئی ہے اس وقت میرے قدم ریستوران کی جانب اٹھ گئے۔

اب مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی لوگ مختلف قسم کی تفریحات میں مشغول تھے۔

شبینہ ریستوران میں رات کے اس پہر گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا، میں ایک خالی میز کی طرف بڑھ گیا۔ اس میز کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر میں نے اس کی پشت سے گردن ٹکالی۔ ایک ویٹر میرے قریب آیا تو میں نے انگریزی میں اس سے چائے طلب کی اور وہ گردن خم کر کے چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد چائے کے خوبصورت برتن میرے سامنے لگا دیئے گئے۔

چائے پینے کا قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ کافی کی کئی پیالیاں پی چکا تھا، لیکن یہاں بیٹھنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضروری تھا۔ چائے آ گئی اور میں نے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، چائے کی پیالی سے بھاپ کی لکیر سی اٹھ رہی تھی۔ لیکن دفعتہً ہی لکیر مجھ سے دور ہونا شروع ہو گئی اور چائے کی پیالی کھسک کر میز کے دوسرے کنارے تک پہنچ گئی۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکی تھی، لیکن دوسرے لمحے مجھے اپنے کانوں میں ابرانوس کی آواز سنائی دی۔

''تمہاری چائے میں پی رہا ہوں ورنہ میرے لئے دوسری چائے منگواؤ۔''

ایک دم غصے سے میری تیوریاں چڑھ گئیں اور میرے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

''تم پھر آ گئے؟''

''کیوں بگڑ رہے ہو؟''

''دیکھو ابرانوس، تم میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا، یقین کرو کہ بس...... بس بس......'' میں بے بسی سے خاموش ہو گیا ظاہر ہے میں اسے کیا دھمکی دے سکتا تھا۔ ابرانوس کی ہلکی سی آواز میرے کانوں میں ابھری۔

''تم پریشان کیوں ہو؟''

''تم مجھے اس تہہ خانے میں کیوں چھوڑ بھاگے تھے۔ تم ہو کیا چیز آخر؟''

''یار دیکھو مجھ پر پابندی عائد نہ کرو، میں تمہارے ذریعے اس دنیا میں جینا چاہتا ہوں لیکن......''

''لعنت ہے تم پر اور لعنت ہے مجھ پر، تم ہر جگہ اپنی مرضی سے آ جا رہے ہو، میرا ذریعہ کیوں پکڑ رکھا ہے تم نے۔''

''تو پھر کیا کروں، کوئی نہ کوئی تو ساتھی ہو جس سے میں بات کر سکوں، ہم جن بے شک تمہارے ساتھ رہتے ہیں لیکن ہر جگہ سے تو واقف نہیں ہوتے۔''

''لعنت ہے مجھ پر اور لعنت ہے تم پر۔''

''آخر اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو وجہ تو بتاؤ۔؟''

''تم یہاں کیسے پہنچے، تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں موجود ہوں۔؟''

''فضاؤں میں تمہاری بو سونگھی اور یہاں آ گیا' مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم تہہ خانے سے نکل بھاگے ہو۔''

''مگر میں تو کسی تہہ خانے میں داخل ہی نہیں ہوا تھا۔''

''میرے سامنے جھوٹ بول رہے ہو۔''

''یقین کرو میرے دوست میں کسی تہہ خانے میں نہیں داخل ہوا تھا تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے کسی تہہ خانے میں قید کیا گیا ہے؟''

''بس جو کچھ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں مجھے بہت زیادہ دقت نہیں ہوتی۔''

''مگر تم مر کہاں گئے تھے؟''

''جو ایک بات میں تمہیں بتا چکا ہوں میں زبونا کے پیچھے گیا تھا۔''

''زبونا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے یار وہی لڑکی جس کا نام گیس ہے' کیا سمجھے؟''

''اوہ...... تم بتا چکے ہو مجھے' لیکن یار جن اس طرح فرار تو نہیں ہوتے۔''

''فراڈی تو میں بھی نہیں ہوں' بس یوں سمجھو کہ اس دنیا کو میں نے بڑی عجیب شکل میں دیکھا ہے' بس میرا ہی تھوڑا سا مسئلہ ہے زبونا کے ساتھ۔''

''اب میں تم سے کیا کہوں؟''

''کچھ نہ کہو' میں تو تمہارے وجود کا ایک حصہ ہی ہوں۔''

''میں اب ایسی باتیں نہیں سننا چاہتا' جب تمہارا دل چاہتا ہے مجھے مصیبت میں چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہو۔''

''یار میں تمہیں کیا بتاؤں' اب مجھے شرم بھی تو آتی ہے' زبونا سے میری بڑی دوستی تھی' بے شک وہ میری خادمہ تھی' لیکن مجھے اتنا چاہتی تھی کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

''مگر وہ چلی کہاں گئی؟''

''پتہ نہیں کہاں گئی' میرا خیال ہے کسی نے وظیفہ پڑھ کر اسے بھی قبضے میں کر لیا ہے۔''

''کیا مطلب کیا ایسا ہو سکتا ہے؟''

''سب کچھ ہو سکتا ہے ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں' وہ جو ڈاکٹر جین ہے نا بہت خطرناک آدمی ہے' وہ تنہا وہاں نہیں گیا تھا بلکہ اس کے ساتھ پورا گروہ تھا اور یہ خزانہ اس نے بڑی چالاکی سے حاصل کیا ہے اور آپس میں تقسیم کر لیا ہے' تم یوں سمجھ لو کہ صندوق میں جو کچھ ہے وہ ڈاکٹر جین کا حصہ ہے' اربوں روپے کی مالیت کا ہے وہ خزانہ...... اور میرا تو یہ اندازہ ہے کہ ڈاکٹر جین جنوں کو قبضے میں کرنے کا کوئی منتر جانتا ہے اور اس منتر کے ذریعے اس نے زبونا کو بھی اپنی قید میں کیا ہوا ہے بہرحال' زبونا کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

''کیا؟''

''وہ لڑکی جو گیس کے نام سے تھی جسے ایک شخص اپنے ساتھ لے گیا تھا' بس یوں سمجھ لو کہ اس نے ان لوگوں پر دہشت بٹھا دی' پانچ آدمیوں کا گروہ تھا جو اس سے معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کے گرد جمع ہوا تھا۔ اس نے پستول نکال کر فائرنگ شروع کر دی اور اس کے بعد جو تماشہ ہوا وہ قابل دید تھا۔ ان لوگوں کے ہوش اڑ گئے تھے' وہ ایسے بھاگے کہ پلٹ کر نہ دیکھا اور وہ وہاں سے نکل گئی۔''

''اوہو...... وہ وہاں سے کہاں گئی؟''

''اس وقت وہ ہوٹل میں مقیم ہے۔''

''کونسے ہوٹل میں؟''

''تم اگر چاہو تو میں تمہیں اس عمدہ ہوٹل میں قیام کے لئے جگہ دلوا سکتا ہوں۔''

''ہرگز نہیں اور خاص طور سے وہاں نہیں جہاں تم چاہو گے۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور ابرانوس ہنسنے لگا۔

''یار بڑے مزے کے دوست ہو' غصہ کرتے ہو تو دل خوش ہوجاتا ہے' لیکن ہم اسی ہوٹل میں قیام کریں گے جس میں زبونا مقیم ہے' وہاں پر ایک کمرہ حاصل کرلو زبونا کے بالکل قریب تاکہ تمہاری اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں' میں تو خیر جن ہوں لیکن تم تو ہو' میری محبت تمہارے اندر شامل ہوکر زبونا کی قربت اختیار کرسکتی ہے' کیا سمجھے' اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے دل میں اس کے لئے کیا ہے' میرے دوست میری یہ بات مان لو۔'' ابرانوس کی آواز دردناک ہوگئی۔

''بس میں کیا کہوں تم سے' میں تو خود بے بس آدمی ہوں' میرے ساتھ کتنی پریشانیاں چل رہی ہیں تم کیا جانو' تم جانتے ہو نا یہاں کن حالات میں داخل ہوا ہوں' ملکوں کے قوانین ہوتے ہیں ہر آدمی ہر جگہ نہیں پہنچ سکتا' اس کے لئے پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے' بغیر کاغذات کا آدمی ایک مجرم ہوتا ہے اور میں اسی طرح کا ایک مجرم ہوں۔ اگر پولیس کا ہاتھ مجھ تک پہنچ گیا تو بچنا مشکل ہوجائے گا اور پھر سنا ہے کہ ایرانی پولیس بہت سخت ہے۔''

''تو میں جو موجود ہوں فکر کیوں کرتے ہو' میں فضاؤں میں تمہاری بو سونگھ کر پہنچ سکتا ہوں' اگر میں بھی موجود نہ ہوں اور تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی نہ کسی تلاش کرتا ہوا تم تک پہنچ ہی جاؤں گا' بس یہ الگ بات ہے کہ میں خود کسی چکر میں نہ پھنس جاؤں' اب دیکھو نا مجھے ان عاملوں سے بہت ڈر لگتا ہے جو جنوں کو قبضے میں کرنے کے لئے نجانے کیا کیا حرکتیں کرتے پھرتے ہیں' تم فکر نہ کرو' ہم چلتے ہیں یہاں سے' میں تمہیں بتاؤں گا کہ کونسا کمرہ لینا ہے۔''

آخر کار مجھے وہی کرنا تھا جو ابرانوس کہے اور ویسے بھی ابرانوس بعض جگہ میرے لئے بڑا مددگار ثابت ہوا تھا۔ اسے اس طرح نظرانداز کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ بہرحال ہم ایک انتہائی شاندار ہوٹل میں پہنچ گئے جس کا نام فانوس تھا۔ فانوس واقعی بہت ہی اعلیٰ درجے کا ہوٹل تھا' اس کے ریسیپشن پر سناٹا طاری تھا اور چند لمحوں کے بعد میں اس ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ابرانوس میرے ساتھ ساتھ ہی تھا' مجھے محسوس ہورہا تھا کہ وہ میرے بالکل قریب ہی ہے' کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے کہا۔

''تمہارے پاس ضرورت کا سارا سامان پہنچ جائے گا' آرام کرو' میں تمہارے پاس ہی ہوں' کسی قسم کی فکر مت کرنا۔''

میں نے جوتے وغیرہ اتارے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس وقت میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی لباس نہیں تھا۔ کئی بار ابرانوس کے بارے میں سوچا لیکن مجھے اس کی دوستی ناپائیدار ہی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے اپنے بھی کچھ مسائل تھے' بہرحال مجھے اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کوئی ایسا عمل کروں جس سے میری اپنی بھی کوئی حیثیت بن جائے' کافی دیر تک سوچتا رہا تھا اس کے بعد نیند آگئی۔

دوسری صبح جاگا تو سورج چڑھ چکا تھا' دھوپ کی کرنیں جگہ جگہ سے اندر آرہی تھیں کیونکہ میں نے پردے ٹھیک نہیں کئے تھے اس لئے دھوپ اندر آرہی تھی' میں نے ایک طویل انگڑائی لی اور ابرانوس کو پکارا تو اس کی آواز میرے ذہن میں سنائی دی۔

''ہاں میری جان میں تمہارے پاس ہی ہوں۔''

اس کی آواز سنتے ہی میں نے اس کی شان میں قصیدہ گوئی کی اور بستر سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ غسل خانے میں داخل ہوکر لباس اتارا اور شاور کے نیچے کھڑا ہوگیا' نہاتے ہوئے میری نگاہ ایک سمت پڑی تو وہاں میں نے

ایک انتہائی نفیس اور خوبصورت لباس رکھا ہوا تھا' میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' لیکن دوسرے لمحے پتہ چلا کہ ابرانوس میرے ساتھ ہے' ظاہر ہے یہ لباس اسی نے مہیا کیا ہے' لباس میرے جسم پر بالکل درست تھا' لباس پہن کر باہر نکل آیا اور ایک بار پھر میں نے اسے آواز دی۔

''ہاں موجود ہوں۔''

''یار...... کیا غسل خانے میں بھی تم میرے ساتھ ہوتے ہو؟'' میں نے کہا اور ہنس پڑا

''ہاں' میں تو تمہارے وجود میں ہی ہوں۔ میں دنیا سے لطف اندوز ہو رہا ہوں ورنہ ایک جن کو بھی کسی سے لطف نہیں حاصل ہو سکتا۔''

''پیٹ خالی ہے اس وقت کچھ نہیں بوجھ سکوں گا۔''

''تو پھر ادھر آجاؤ۔ میں نے ناشتہ منگوالیا ہے۔'' ابرانوس نے کہا اور میں نے سینٹر ٹیبل کی طرف دیکھا' اس پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔

''تمہارے نام پر میں نے ویٹر سے منگوالیا۔''

''بڑی عنایت ہے تمہاری۔''

''میں تمہاری تمام محرومیاں دور کردوں گا' تم فکرمند کیوں ہوتے ہو؟'' ابرانوس نے کہا اور میں ناشتے میں مصروف ہو گیا' ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں صوفے پر بیٹھا تھا' ابرانوس میرے پاس موجود تھا' تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔

''تم مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کررہے ہو۔؟''

''ہاں اپنے بارے میں تمہیں بتا رہا تھا۔'' اس نے کہا۔

''مثلاً۔'' میں نے سوال کیا۔

''مثلاً یار یہ کہ تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اِن کی دنیا میں برا جن قرار پایا ہوں' بہت سی پابندیاں میرے اوپر لگا دی گئی ہیں' عامل وظیفہ پڑھ کر مجھے قابو میں کرنے کے چکر میں ہوتے ہیں' جیسا کہ میں تمہیں اس ٹوٹی حویلی میں دستیاب ہوا' میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس دنیا کی تفریحات میں تم مجھے شریک رکھو اور سنو تم کسی جگہ قیام مت کرو' زیادہ سے زیادہ متحرک رہو تاکہ میری خوشیاں پوری ہوتی رہیں۔''

''زبونا کے بارے میں کیا آئیڈیا ہے؟''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں وہ میری پسندیدہ کنیز تھی' اب جبکہ وہ نئی شکل میں میرے قریب آئی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس کا تھوڑا سا قرب ضرور رہے اور ہمیں اس نئی شکل میں اس کی بھی مدد کرنی چاہیئے جو کہانی اس نے سنائی ہے تم یہ بتاؤ کیا وہ دلچسپ نہیں ہے' آخر اپنے نئے روپ میں کون ہے کیا ہے' میں یہ مان لیتا ہوں کہ جس طرح تم پریشان حال ہو اسی طرح وہ بھی پریشان ہے' خیر ہم اس کے لئے کچھ کردیں تو کیا یہ اچھی بات نہیں ہے؟''

''کیا تم اپنی قوتوں سے کام لے کر اس کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔؟''

''نہیں...... اس لئے کہ یہ میرے بس سے باہر ہے' تم اس کی مدد کرو' تھوڑی سی تفریح سہی' آخر ہرج ہی کیا ہے۔''

''اور اگر مجھے کوئی نقصان پہنچ گیا تو؟''

''اس کی ذمے داری میں لیتا ہوں' اگر تم کسی چکر میں پھنس گئے تو بےفکر ہو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے لباس وغیرہ اور بھی ہیں یا بس یہ ہی۔''

''الماری بھری پڑی ہے' کھول کر دیکھ لو۔ میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا ہے۔ تمہیں ہر چیز ملتی رہے گی' جس جگہ دولت کا حصول چاہو گے وہاں دولت تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائے گی۔''

''بڑی بڑی باتیں کرتے ہو اور موقع پر بھاگ نکلتے ہو۔''

''تم بے فکر رہو۔ ہو سکے گا تو تم سے زیادہ دور نہیں رہوں گا۔''

''چلو چھوڑو' اب یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

''زبونا سے ملاقات۔''

''وہ اپنے کمرے میں موجود ہے۔''

''ہاں۔''

''تو پھر مجھے اس کے سامنے ذرا مختلف انداز میں آنا پڑے گا۔ دیکھتا ہوں وہ مجھے پہچانتی ہے یا نہیں۔''

''باقی سب کام تمہارا ہے' کیا سمجھے' تم اپنا کام شروع کرو' میں تو صرف ایک دیکھنے والی نگاہ رکھتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

بڑا دلچسپ مشغلہ تھا' اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کا جس طرح بھی تیا پانچہ ہوا تھا وہ بہت خراب تھا لیکن ساری صورت حال تھی دلچسپ' میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ جس کمرے کے بارے میں ابرانوس نے مجھے بتایا تھا اس کا دروازہ بند تھا' اس بند دروازے کے پیچھے گینس موجود تھی' میں ابھی اس دروازے سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئی' بیش قیمت اور حسین لباس میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی' میں انتظار کرنے لگا کہ وہ آگے بڑھ کر لفٹ میں داخل ہو جائے تو میں بھی اس کے ساتھ ہی لفٹ میں پہنچوں' دیکھوں کہ وہ کس قسم کے تاثرات کا مظاہرہ کرتی ہے۔

پھر یہی ہوا جونہی وہ لفٹ میں داخل ہوئی' میں بھی دروازہ کھول کر اندر پہنچ گیا' اس نے سرسری نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر بری طرح چونک پڑی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ دوسرے لمحے اس نے اپنا رخ تبدیل کر لیا' میں نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ نیچے اتری اور اس کے بعد ہوٹل کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر اس کا تعاقب کر رہا تھا' میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پہچاننے کے باوجود مجھ سے اجتناب برت رہی ہے' مجھے اندازہ ہو گیا تھا' کچھ لمحوں کے بعد اس نے ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر چل پڑی۔ میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ میں بھی اس کا تعاقب کروں چنانچہ دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور کو اس کی ٹیکسی کا پیچھا کرنے کے لئے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں ٹیکسیاں اس خوبصورت علاقے میں داخل ہو گئیں جہاں پر رونق بازار تھے۔

گینس نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں نے بھی وہی عمل دہرایا اور اب ہم ایک فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ اس نے دو تین بار پلٹ کر مجھے دیکھا تھا اور اس کے چہرے پر الجھن سی پھیل گئی تھی وہ دیر تک بازار میں چہل قدمی کرتی رہی کسی دکان میں داخل نہیں ہوئی۔ خاصے فاصلے پر پہنچنے کے بعد اچانک وہ رک گئی اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور آخر کار اس کے قریب پہنچ گیا۔

''آپ میرا پیچھا کر رہے ہیں جناب؟'' اس نے انگریزی میں کہا۔

''جی؟''

''کیا یہ بدتمیزی نہیں ہے؟''

''ہو سکتا ہے' لیکن آپ نے جس طرح مجھ سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے' میرے خیال میں یہ خود ایک بڑی بدتمیزی ہے۔''

''کیا فضول آدمی ہیں آپ' میں بھلا آپ کو کب جانتی ہوں؟''

''یہ بھی ایک بدتمیزی ہے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھئے آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں آپ کو بالکل نہیں جانتی اور اس کے بعد میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرا پیچھا نہ کریں ورنہ میں پولیس سے رابطہ قائم کر لوں گی۔''

"کیوں بھائی اب کیا کہتے ہو؟" میں نے ابرانوس سے دل ہی دل میں کہا اور اس کی آواز ذہن میں گونجی۔ "بولنے دو بولنے دو سچ بولے گی کیا حرج ہے، تھوڑی دیر جھوٹ لئے دو اسے۔"

ابھی میرا رابطہ ابرانوس سے ہی تھا کہ اس ایک اور ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ گئی، دیکھتے دیکھتے ٹیکسی ہوا ہوگئی تھی، آس پاس کوئی دوسری ٹیکسی بھی نہیں تھی اس لئے وہ میری نگاہوں اوجھل ہوگئی۔

"اب بولو کیا کہتے ہو؟"

"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے، جائے گی کہاں، تمہیں اس کی رہائش گاہ معلوم ہے۔"

"ہوں مگر ایک بات بتاؤ ابرانوس، اب میں اس سے کیا لینا دینا ہوگا؟"

"یار تفریح، اس کے علاوہ ہمیں اور کیا پتہ نہیں تمہارے ذہن میں جھلاہٹ کیوں نہیں لوگ کس کس طرح کوشش کر کے حاصل کرتے ہیں اور تم ہو کہ کسی کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سیر و سیاحت کرو اپنے کو صرف ایک سیاح سمجھو۔"

میں سوچنے لگا، ابرانوس اس وقت جو کچھ کہہ سچ ہی کہہ رہا تھا، پتہ نہیں میں نے اپنی کے بارے میں کیا کیا سوچا تھا، دلفریب کی سنہری چابیاں حاصل کر کے زندگی کا اٹھانا چاہتا تھا لیکن وہ سب کچھ نہیں کر پایا تھا، خیالات دل میں آئے تو کچھ سکون سا ہوا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو، میں بھی علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا، کیا سمجھے، زندگی کا نام ہے میری جان، پوری پوری دلچسپی کاموں میں اور کسی پریشانی سے متاثر نہ"

"ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے، تمہاری نصیحتیں تو اب میری زندگی بن چکی ہیں۔"

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں، اور تم مجھے ایک ہی نہ تصور کرو، بلکہ بیس سمجھو چنانچہ بیس اور ایک اکیس۔"

"تم تو اکتیس اور اکتالیس بھی ہو سکتے ہو تمہارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، بات تو میری اپنی ہے۔"

ابرانوس کی ہنسی میرے کانوں میں ابھری، پھر وہ بولا۔ "ایران کی گلیاں، سڑکیاں اور بازار تمہارے لئے کھلے ہوئے ہیں عیش کرو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بس یونہی منہ اٹھا کر چل پڑا، میدان سپاہ کو پار کر کے میں خیابانِ فردوسی پر پہنچ گیا جس کے آخری سرے پر شاعر فردوسی کا مجسمہ شاہنامے کی جلد تھامے ایک ایسے شہر پر نگاہ ڈال رہا تھا جس کا تصور ہی کتنا مختلف تھا، قدیم اور جدید کے درمیان صدیوں کے فاصلے تھے۔ منی اسکرٹ اور سلیپ فراک میں دل گدگدانے والی حسین لڑکیاں، پیئر کارڈن کے جدید سوٹوں میں اترانے والے نوجوان ہر کونے میں آب جو، سنیما، نائٹ کلب، کیبرے، جدھر دیکھو روشنیوں اور زندگی کا ایک طوفان، خیابان خیابان سڑک گردی اور اس کے بعد جب بھوک لگی تو ایک چھوٹے سے ریستوران میں جا بیٹھا، بہرحال کافی وقت سڑکوں پر گزارا تھا، جب یہاں سے گھومنے پھرنے سے دل بھر گیا تو ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر فانوس چل پڑا۔

فانوس میں داخل ہوتے وقت سڑکوں پر ہلکی ہلکی دھند چھا گئی تھی، اس دھند میں لاتعداد روشنیاں جھلملا رہی تھیں، کمرے کی کھڑکی کھول کر میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، ابرانوس کے مہیا کئے ہوئے لباسوں کے انبار لگے ہوئے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن وہ قلبی سکون کہاں سے لاتا، آخر بیٹھے بیٹھے دل اکتا گیا، سوچا کہ فانوس کے ریفریشنگ ہال کی دلچسپیاں دیکھوں چنانچہ ایک اچھا لباس

زیب تن کر کے نوک پلک سنوار کر نیچے اتر آیا۔ ریفریشنگ ہال کے بارے میں جس قدر تصور کیا تھا اس سے بھی زیادہ حسین مناظر یہاں بکھرے ہوئے تھے۔ میزیں تقریباً بھری ہوئی تھیں' خوشبو کے سمندر سے نکل کر کیف و سرور میں ڈوبی حسن کی جولانیاں۔ مترنم ہنسی کی دلربائیاں' نوجوانوں کے دہکتے سلگتے وجود سے پُر خوابناک ماحول میں آرکسٹرا' مدھم موسیقی بکھیر رہا تھا اور ایک ایرانی حسینہ فارسی زبان میں عمر خیام کے اشعار حسین انداز میں پیش کر رہی تھی۔ ایرانی حسینہ کے نقوش اور اس کے ہونٹوں کی جنبش قابل دید تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی لباس کے استعمال میں شاید عمر خیام کی حسن پرستی کو بھی مدنگاہ رکھا گیا تھا۔ خیام کی رباعی' اعضاء کی شاعری' حسن کی بے باکی' نوجوانوں کی سرگوشیاں' شراب کی بدمستیاں' بوڑھوں کی سسکیاں اور دولت کی فراوانی کے اس حسین سنگم کو دیکھ کر میرا ہاتھ بے اختیار اس خیال سے سر پر پہنچ گیا کہ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں' لیکن ویٹر کی آمد سے میں دوسرے ہی لمحے خیال سے ہوش میں آ گیا۔

ویٹر نے ایک میز تک میری رہنمائی کی اور میں میز کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر ہال میں بکھرے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگا۔ تبھی میری نگاہ کچھ فاصلے پر بیٹھی گینس پر پڑی اور میرا چہرہ بگڑ گیا' میں نے سوچا کہ مجھ پر ایک کیا مصیبت طاری ہوئی ہے کہ میں اس میں داخل ہونے کی کوشش کروں' جو حماقت ہو چکی تھی وہ ہو چکی تھی اس نے نفرت سے مجھے ٹھکرا دیا تھا' میں نے اس پر سے نگاہیں ہٹا لیں اور ویٹر کو ایک مشروب کا آرڈر دے دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مشروب میرے سامنے سرو کر دیا گیا' گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا تو بے خیالی کے انداز میں نگاہیں سامنے اٹھ گئیں' گینس مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔

میں نے نگاہیں پھیر لیں اور گلاس سے سپ لینے لگا' کچھ دیر تک میں نے اس کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی' لیکن چند ہی لمحات کے بعد میرے سامنے والی کرسی کھسکی اور کوئی اس پر بیٹھ گیا' میں نے چونک کر دیکھا تو وہ گینس ہی تھی جو سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی' میں نے سپاٹ آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''ناراض ہو؟''

''میں آپ کو نہیں جانتا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''لیکن میں آپ کو جانتی ہوں۔''

''میں اجنبی لوگوں سے بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔''

''وہ تو میں بھی نہیں کرتی' لیکن ہم اجنبی کہاں ہیں؟''

''میڈم آپ نے ایک غیر اخلاقی حرکت کی ہے' مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے۔''

''اور میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ ناراضگی ختم کر دیجئے۔'' اس نے جوابی انداز میں کہا اور میں اسے گھورنے لگا۔

''مگر مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' تمہارے مسائل تمہارے اپنے ہیں' اتفاق تھا کہ ہمارے درمیان چند روز کی رفاقت ہو گئی اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ میں نے خود تم تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی تھی' وہ ایک دلچسپ حادثہ تھا' اس سے زیادہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے مس گینس۔''

''یار ناراضگی ختم کر دو' میں جن حالات کا شکار ہوں اب وہ تم جان ہی چکے ہو کیا میں قابل معافی نہیں ہوں' بس ذہنی الجھنوں میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہوں کہ ہر چیز سے جھنجھلاہٹ ہوتی ہے' پلیز معاف کر دو۔'' گینس نے کہا اور میں کسی قدر نرم ہو گیا' پھر میں نے کہا۔

''کیا پیو گی؟''

''جو بھی پلا دو۔'' اس نے منہ بنا کر کہا اور
پھر آہستہ سے ہنس پڑی' میں نے اس کے لئے بھی
الکحل شراب منگوالیا تھا جس سے میں شغل کر رہا
تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔
''کچھ بات چیت نہیں کرو گے مجھ سے؟''
''کرو۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
''تو پھر تم بتاؤ تم پر کیا بیتی؟''
''کوئی خاص نہیں' ڈاکٹر جین مجھے اپنی
رہائش گاہ میں موجود تہہ خانے میں لے گیا اور اس
کے بعد میں کوشش کر کے وہاں سے نکل بھاگا۔''
''اپنے مالی وسائل تم نے کیسے پورے
کیے؟'' وہ بولی۔
''کسی نہ کسی طرح کر ہی لئے' لیکن تم پر کیا
گزری؟'' میں نے سوال کیا اور گینس نے مجھے
وہی کہانی سنائی جو ابرانوس مجھے بتا چکا تھا۔
''یہ سوال پوچھنا رہ گیا کہ تمہارے مالی
وسائل کیسے پورے ہوئے؟''
''لڑکیوں کو مالی وسائل پورے کرنے میں
زیادہ الجھن نہیں ہوتی۔'' وہ بولی اور میرے
ہونٹ سکڑ گئے۔
''گڈ۔'' میں نے کہا۔
''نہیں بیوقوفی کی بات مت سوچنا' ورنہ یہ
گلاس اٹھا کر تمہارے منہ پر دے ماروں گی' میں
بدکردار لڑکی نہیں ہوں' کیا سمجھے؟'' اس نے کہا
اور اس طرح مجھے دیکھنے لگی جیسے اس نے سوچا ہو
کہ ان الفاظ کا برا مان جاؤں گا' لیکن خیر یہ برا
ماننے والی بات نہیں تھی پھر وہ خود ہی بولی۔
''بس ایک شخص کو مرغا بنانا پڑا تھا' لیکن اس
انداز میں کہ مرغا بعد میں اپنی جیبیں ہی ٹٹولتا رہ گیا
تھا' تفصیل نہیں بتاؤں گی۔''
''ٹھیک ہے مجھے تفصیل سے دلچسپی بھی نہیں
ہے۔''
''وہی ناراضگی' وہی ناراضگی۔''
''نہیں اب ناراض نہیں ہوں۔''

''اچھا پکی بات ہے۔''
''ہاں کہا ناں' لیکن مجھے بتاؤ تمہاری
الجھنیں اسی حد میں ہیں یا پھر کچھ آگے بڑھیں۔''
''ابھی تک کچھ بھی نہیں' اب میں کیا بتاؤں
تمہیں' باطش چنگیزی کے بارے میں بھی کچھ نہیں
معلوم ہو سکا کیونکہ میرے وسائل بہت محدود ہیں'
ایران سے میری واقفیت تقریباً نہ ہونے کے برابر
ہے' ان حالات میں بڑی الجھنوں کا شکار ہوں'
سمجھ میں نہیں آتا کہ باطش چنگیزی کی تلاش کے
لئے کیا کروں۔''
''مجھے تم سے ہمدردی ہے گینس۔'' میں نے
کہا۔
''دیکھو صرف ہمدردی ہی کہو گے یا میرا
ساتھ دو گے شامی' یہی نام بتایا تھا نا تم نے' میں
بہت پریشان ہوں' میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے
لیکن اتفاقات ہم دونوں کو بار بار سامنے لا رہے
ہیں' اگر کچھ دن میرا ساتھ دے دو تو کیا ہرج ہے'
بشرطیکہ تمہارا اپنا کوئی نقصان نہ ہو۔''
''کیا چاہتی ہو مجھ سے؟''
''میں چاہتی ہوں کہ ایران کے مشہور
شہروں میں گھوم کر کسی نہ کسی طرح باطش چنگیزی
کو تلاش کروں' اس طرح ہم ایران کی سیاحت
بھی کر لیں گے' تم یقین کرو میں نے جس انداز
میں زندگی گزاری ہے وہ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔
میں نے اپنے طور پر اپنے لئے زندگی کا ایک تعین
کیا ہوا تھا لیکن اپنی شناخت میں ناکام رہ کر دل
اس قدر اکتا گیا تھا کہ اس کے بعد میں ہندوستان
سے نکل بھاگی' بہت سے خیالات دل میں ہیں۔
میں کیا کروں' سب سے پہلا خیال کہ میں کون
ہوں' کیا ہوں' اس بارے میں اگر مجھے معلوم
ہو جائے تو یقین کرو مجھ سے زیادہ ہنس مکھ لڑکی
تمہیں اور کوئی نہیں ملے گی' میرے کہنے کا مقصد یہ
ہے کہ ہم لوگ یہاں پر سیاحت کریں اور جہاں
تک ممکن ہو سکے مختلف مقامات پر باطش چنگیزی کو

تلاش کریں۔''

میں نے کچھ دیر سوچا' گینس کی یہ پیشکش میرے لئے غیر دلچسپ نہیں تھی' ظاہر ہے میری زندگی کا بھی کوئی خاص مقصد نہیں تھا' بلکہ آج میں نے اپنے بارے میں یہی سوچا تھا کہ جب تک یہاں کا آب و دانہ ہے سیاحت کروں گا اور اس کے بعد یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔ پھر ابرانوس بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں سے دنیا دیکھے۔ پتہ نہیں کہاں ہے کمبخت ہوسکتا ہے میرے وجود کے کسی گوشے میں بیٹھا ہوا خاموشی سے یہ تماشہ دیکھ رہا ہو۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا' وہ کہاں ہے' کیا کر رہا ہے اس کے بارے میں مجھے نہ کبھی معلوم ہوسکا تھا اور نہ کبھی معلوم ہوگا' لیکن تھا بہت جالاک کمال کی بات ہے' کمال کی بات ہے' خیر مجھے احساس ہوا کہ گینس کا پروگرام خراب نہیں ہے۔ میں نے اس کے پروگرام سے آمادگی کا اظہار کر دیا اور وہ خوش ہوگئی

''یقین کرو اس طرح مجھے ایک نئی زندگی مل جائے گی کیونکہ میرے اور تمہارے درمیان کافی انڈر اسٹینڈنگ ہوچکی ہے۔''

اس کے بعد گینس میرے ساتھ رہی' رات کا کھانا بھی اس نے میرے ساتھ ہی کھایا۔ ہمارے کمرے بھی نزدیک نزدیک تھے' اس لئے ہال سے اٹھنے کے بعد تقریباً ایک ڈیڑھ بجے تک ہم لوگ ساتھ رہے' اس کے بعد وہ مجھ سے اجازت لے کر چلی گئی اور میں اپنے کمرے کے بستر پر لیٹ گیا' ابرانوس کو آواز دی تو اس بدبخت کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

پتہ نہیں کیوں اب ابرانوس سے میری جان جلنے لگی تھی' مطلب کا ساتھی تھا۔ جب دل چاہا میرے پاس آگیا' کہتا تھا میں تمہارے وجود کا ایک حصہ ہوں' تمہاری ذات میں پوشیدہ ہوگیا ہوں اور نجانے کیا کیا' لیکن میں نے جب بھی اپنی ذات کو ٹٹولا' جب بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی اسے غائب ہی پایا۔ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اس کا ہاں اگر موقع پر ساتھ دے جائے تو غنیمت ہے۔ بہرحال میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو لیکن مجھے اپنے حالات سے خود ہی نمٹنا ہوگا اور تھوڑی سی ہمت سے کام لینا ہوگا۔ خوفزدہ رہ کر اور دنیا سے ڈر کر بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

دوسری صبح گینس نے ناشتہ میرے ساتھ ہی کیا اور اس کے بعد فیصلہ کیا کہ ہم عام سیاحوں کی طرح یہاں کی سیر کریں گے۔ چنانچہ ہم باہر نکل آئے ایک بک اسٹال سے کتابچے خریدے گئے جن میں ایران کی سیاحت کے بارے میں تفصیلات درج تھیں' پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے سمران چلتے ہیں۔ سمران کوہ دامن کے پہلو میں واقع ہے اور باقی شہر سے دو ہزار فٹ بلند ہے' سخت گرمیوں میں جب خیابان فردوسی تپنے لگتا ہے تو سمران میں بہار کا موسم ہوتا ہے' پررونق بازار اور بلند و بالا عمارتیں آہستہ آہستہ پیچھے رہ گئیں۔ ہماری ٹیکسی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی' فضا میں موٹروں کے ہارن اور شہر کے شور و غل کے بجائے اب سڑک کے پہلو میں گنگناتی ہوئی ندی کا شور اور پرندوں کی چہچہاہٹ شامل تھی۔ پہاڑی چشموں کی مدھر آوازیں ابھر رہی تھیں۔ خنکی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھولوں کے تختے اور گھنے سرسبز چناروں کی قطاریں تھیں' ہم اس پر پیچ سڑک پر کوئی موڑ مڑتے تو یوں لگتا جیسے گھنے چنار ہمارا راستہ روک لیں گے جن کی شاخیں ٹیکسی کی چھت پر آکر یوں گتھی ہوتی تھیں کہ سبزے اور خنکی کی ایک سرنگ سی بن گئی تھی۔ خشک ہوا کے تھپیڑے چل رہے تھے اور چنار کے سرخی مائل پتے ہماری ٹیکسی پر بارش کے قطروں کی طرح برس رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی دربند کی بلیوارڈ میں جا کر رک گئی اور ہمیں ایک پتھریلی چٹان میں تراشی ہوئی سیڑھیاں طئے کر کے ایک اوپن ایئر

ریسٹورینٹ میں آگئے۔ یہاں ایک میز پر بیٹھ کر ہم نے اطراف کا ماحول دیکھا' تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پہاڑی چشمہ ابل رہا تھا' بہت حسین جگہ تھی' یہاں میزوں پر رنگ برنگے گلدانوں کے بجائے ننھے ننھے پرندوں کے پنجرے رکھے ہوئے تھے' انتہائی حسین اور رومانی ماحول تھا۔ میں نے کینس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت دیکھی' اس پر نگاہ پڑی تو وہ مجھے دیکھ رہی تھی' مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا کھایا جائے؟'' میں نے ایک دم کہا۔

''کوئی بھی ایسی چیز جو ہم نے پہلے نہ کھائی ہو۔''

میں نے ایک ویٹر کو بلا کر اس سے انگریزی میں یہاں کے کھانوں کی تفصیلات پوچھیں اور پھر اسی کا مشورہ لیا تو اس نے ہنس کر کہا۔

''آب جو خنک اور جگر مرغ۔''

''لے آؤ۔'' میں نے کہا اور اس کے بعد ویٹر نے ہمارے سامنے خوبصورت برتن لگانے شروع کر دیئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہماری مطلوبہ اشیاء لے آیا۔ کینس نے جگر مرغ بڑی دلچسپی سے کھایا تھا' آب جو کے گھونٹ لے کر اس کی آنکھوں میں ایک سرور کی سی کیفیت نمودار ہوگئی تھی۔ میں نے آرڈر تو دے دیا تھا لیکن چند لمحات کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ذہن میں سرور کی ایک ترنگ سی اٹھ رہی ہے' مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں کافی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ کینس نے کہا۔

''تم یقین کرو شامی' ایک نوجوان کی حیثیت سے تم بہت دلکش انسان ہو تمہارے ساتھ رہ کر ذہن بھٹکنے لگتا ہے۔''

''ہوں شاید......'' میں نے کہا۔

''لیکن تم مجھ سے متاثر نہیں معلوم ہوتے۔''

''اگر نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ یہاں کیوں بیٹھا ہوتا۔''

آب جو کا سرور جب تک ہمارے ذہن پر طاری رہا' ہماری گفتگو میں رومانیت رہی اور اس کے بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے' خراج کے قصبے سے گزرنے کے بعد ہماری ٹیکسی دریائے خراج کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگی' دریا سڑک اور پتھریلی چٹانوں کے درمیان سر پٹختا ہوا زور و شور سے بہہ رہا تھا' اس کے کنارے درختوں کی گھنی چھاؤں میں پتھروں پر بچھے ہوئے دیدہ زیب قالینوں پر بیٹھے ہوئے لوگ پکنک منا رہے تھے' ساری فضا اس رنگین وادی میں رومان پرور کیفیت پیدا کر رہی تھی' ایک موڑ پر دریا ایک گھنے درختوں کے درمیان گم ہوگیا' یہاں ہم نے ٹیکسی رکوائی اور وادی میں اترتی ہوئی پکی سیڑھیاں طے کر کے دریا کے کنارے واقع ایک ریستوران میں آگئے' بلند درختوں پر خوشگوار پھول' بہتے ہوئے دریا کا شور اور ہوا کی سرسراہٹ جس میں زندگی کی لہر تھی جس میں ڈوب جانے کو دل چاہتا تھا۔

اوپن ایئر ریستوران کے ایک کچے تالاب میں خراج سے پکڑی ہوئی مچھلیاں اچھل رہی تھیں' یہاں کا طریقہ یہ تھا کہ آپ اپنی پسند کی مچھلی پکڑیں اور ویٹر کو دے دیں' ویٹر آپ کی میز کے پاس چھوٹا سا کچن بنا کر آپ کو وہیں مچھلی بھون دے گا۔ کینس بچوں کے سے انداز میں یہ سب دیکھ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کا یہ انداز اسے ایک معصوم انسان ظاہر کرتا ہے' پتہ نہیں کن حالات کا شکار رہی ہے' بہرحال میں اس کا ساتھ دینے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

❖......❖......❖

یہ ہنستی مسکراتی داستان جاری ہے
مزید واقعات کے لیے آئندہ ماہ کا شمارہ ملاحظہ کریں۔

❖......❖......❖

اس شمارے کی ایک حیرت انگیز تحریر

دیوار کے شکستہ حصے پر گزشتہ ادوار کے اثرات موجود تھے۔ تاہم سنگ تراش کا فن ابھری ہوئی اشکال کی صورت میں زندہ تھا۔ یہ ایک شہنشاہ کے دربار کی مکمل تصویر تھی۔ عبداللہ نے اس پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے دیوار کے قریب رک کر آگے بڑھ گیا تھا لیکن غزالہ اس جگہ پر یوں رک گئی جیسے فرش سے اس کے قدم چپک کر رہ گئے ہوں۔

ایس اے ہاشمی

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

قاہرہ میوزیم کی رونق اپنے شباب پر تھی۔ قدیم مصری شاہکار اور نوادرات سیاحوں کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ سیاح اپنی آنکھوں میں حیرت اور تجسس سمیٹے گائیڈز کی رہنمائی میں میوزیم کے مختلف حصوں میں گھوم رہے تھے۔ گائیڈز روانی سے ہر چیز کی تفصیل بیان کر رہے تھے۔ ایک گائیڈ ایک شوکیس کے پاس جا کر رک گیا۔ اس میں ایک ایسی تصویر تھی جس کا آدھا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ چہرہ اس حد تک جل گیا تھا کہ رخساروں کی چربی تک بہ گئی تھی لیکن تصویر کا آدھا چہرہ بہت حسین اور دلنواز تھا۔ گائیڈ نے تصویر کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

''خواتین وحضرات۔ یہ اس دوشیزہ کی تصویر ہے جسے فرعون بہت پسند کرتا تھا۔ یہ اس کی خاص کنیز تھی۔ اس کنیز نے فرعون کے ساتھ بے وفائی کی۔ فرعون نے خود ایک مشعل سے اس کا آدھا چہرہ جلا دیا۔ کنیز مر گئی۔ فرعون نے اس کی تصویر بنا کر محل میں رکھ دی تا کہ دوسرے عبرت حاصل کریں۔ اس کنیز کا نام ہرمینہ تھا۔ وہ فرعون کے دور کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔''

سیاحوں کے ہجوم میں شامل ایک نوعمر لڑکی اچانک لڑکھڑا گئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ ایک پراسرار چمک! ایک ادھیڑ عمر شخص نے اسے سہارا دیا پھر مشفقانہ لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے بیٹی غزالہ۔''

''آں۔'' غزالہ نے ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھا جو اس کا باپ تھا لیکن اس وقت لڑکی کی آنکھوں میں اس کے لیے قطعی شناسائی نہیں تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی یہ کیفیت ختم ہو گئی۔

''کچھ نہیں پاپا! ذرا سر چکرا گیا تھا۔''

''چلو تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دیتا ہوں۔ اس طرح سرِ راہ چکر آنا اچھی علامت نہیں ہے۔''

''نہیں پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' غزالہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اب گھر چلیں میں تھکان سی محسوس کر رہی ہوں۔''

وہ شخص غزالہ کو سہارا دیتا ہوا باہر کی طرف چل دیا۔

☆☆

اس کا نام عبداللہ تھا قاہرہ میں اس کی خود کار کھلونے بنانے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ قومیت کے اعتبار سے وہ بمبئی کا رہنے والا تھا۔

مصر میں وہ کاروباری سلسلے میں آیا تھا لیکن ایک مصری لڑکی فائزہ سے شادی کرنے کے بعد وہ ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ غزالہ کی عمر کے آٹھویں سال فائزہ کا انتقال ہوگیا۔ تاہم عبداللہ نے دوسری شادی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے غزالہ کی پرورش پر بھرپور توجہ دینی شروع کردی تھی۔ اسے فائزہ کی اس پہلی اور آخری نشانی سے بہت پیار تھا۔ غزالہ ایک ذہین لڑکی تھی اسے مطالعے کا شوق بھی تھا چنانچہ اس نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی تھی۔ وہ ایک بار اپنے والدین کے ساتھ ہندوستان بھی گئی تھی لیکن اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی اور اب وہ کئی ماہ سے عبداللہ سے ہندوستان گیا تو جلد واپس نہ آسکے گا۔ اس کا پروگرام تھا کہ اگر مناسب ہوا تو غزالہ کا رشتہ بھی طے کرآئے گا۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹی کے بے حد اصرار پر وہ ہندوستان چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ پہلے دہلی جانا چاہتا تھا کیوں کہ وہاں اس کے کئی پرانے ساتھی موجود تھے۔

☆☆

کار ابھی گیٹ سے نکلی ہی تھی کہ اچانک فضا میں خطرے کے سائرن کی آواز گونجی۔ یہ آواز میوزیم کے اندر سے آرہی تھی۔ عبداللہ نے اپنی کار روک لی۔ اس نے دیکھا کہ سیکورٹی کا عملہ میوزیم کا گیٹ بند کررہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ پر لگے ہوئے اسپیکر سے انتظامیہ کے افسر کی آواز گونجی۔

''خواتین و حضرات! میوزیم کے ایک شوکیس سے ایک نایاب و نادر تصویر چوری ہوگئی ہے۔ برائے مہربانی باہر جانے کے لیے گیٹ نمبر ون استعمال کیا کریں۔ باقی گیٹ بند کردیے گئے ہیں۔'' یہ اعلان بار بار ہونے لگا۔

عبداللہ نے اندازہ لگالیا کہ سیکورٹی کے عملے نے گیٹ نمبر ون پر کوئی ایسا انتظام کرلیا ہے جس کی مدد سے چور بہ آسانی گرفت میں آجائے گا۔ اس نے غزالہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''بیٹی اتنے آدمیوں کی موجودگی میں کوئی

چیز چرانا کیسے ممکن ہے۔ حیرت انگیز بات ہے۔''
غزالہ میوزیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر عبداللہ کی طرف دیکھا پھر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''بعض چور پراسرار ہوتے ہیں۔ ہر کام کر لیتے ہیں۔''

''پراسراریت سے تمہاری کیا مراد ہے۔'' عبداللہ غزالہ کو گھورتا ہوا بولا۔

''میری مراد ہندوستان کے کالے علم سے ہے' اس علم کے ماہر ہر کام بہ آسانی کر گزرتے ہیں۔''

''ہر وقت ہندوستان تمہارے ذہن پر سوار رہتا ہے۔'' عبداللہ نے منہ بناتے ہوئے کہا اور کار آگے بڑھا دی لیکن اس نے غزالہ کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی اگر وہ یہ مسکراہٹ دیکھ لیتا تو اسے غزالہ کی شخصیت میں ایک نیا روپ نظر آ جاتا۔ بنگلے پر پہنچ کر اس نے ڈاکٹر جوزف کو فون کر دیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ غزالہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر جوزف آیا۔ اس نے غزالہ کا چیک اپ کیا۔ اس کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی پھر وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''مسٹر عبداللہ! آپ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتے ہیں۔ بے بی غزالہ پوری طرح صحت مند ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ایک صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان ہے۔ میں نے اسے دوا دے دی ہے۔''

ڈاکٹر جوزف چلا گیا۔ عبداللہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ فون پر فیکٹری کا منیجر تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ فون کا ریسیور رکھ کر پلٹا تو اس نے غزالہ کو اپنے روبرو کھڑے پایا۔

''غزالہ...... تم!'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کمرے کی محدود فضا میں سانپ کی پھنکار گونجی۔ یہ آواز غزالہ کے لبوں سے نکلی تھی۔

عبداللہ حیران تھا کہ اچانک غزالہ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ ہمیشہ اجازت لینے کے بعد اس کے کمرے میں آتی تھی مگر آج...... وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ کمرے کی فضا میں آواز پھر گونجی۔

غزالہ کے لبوں سے نکلنے والی آواز اتنی ہی بھیانک تھی کہ عبداللہ کا وجود لرز کر رہ گیا۔ اس نے ایک بار ہمت کر کے غزالہ کی طرف دیکھا۔ نظریں ملتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود بے وزن ہو گیا ہو۔ اس نے خود کو کسی گہری کھائی میں گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے غزالہ کی آنکھوں میں اتنی چمک دیکھی تھی جیسے سورج پتلیوں پر اتر آیا ہے۔ اسے اپنا ذہن اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا محسوس ہوا۔

''مسٹر عبداللہ'' غزالہ کے لبوں سے نکلنے والی آواز غیر انسانی سی تھی اس میں ایسی کھنک تھی جیسے ویران مندر میں اچانک گھنٹیاں بجا دی جائیں۔ آواز کمرے میں گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''ہاں۔'' عبداللہ خوابیدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ تم مجھے کس طرح مخاطب کر رہی ہو' تم ٹھیک تو ہو۔''

''تم نے ڈاکٹر کو کیوں بلایا تھا۔'' غزالہ سخت لہجے میں اس کے سوال کو نظر انداز کر کے بولی۔

''تمہاری طبیعت خراب تھی بیٹی۔''

''میں نے کہا تھا میں ٹھیک ہوں پھر ڈاکٹر کو کیوں بلایا۔'' غزالہ کے لبوں سے نکلنے والی نامانوس آواز عبداللہ کی سماعت پر برف کی طرح جمتی جا رہی تھی۔ [illegible] ہوتا جا رہا تھا۔

''آج کے بعد تم میرے ذاتی معاملات میں قطعی مداخلت نہیں کرو گے سمجھے۔'' غزالہ سپاٹ لہجے میں بولی

''اچھا۔'' عبداللہ [illegible] سے بولا۔ اس کی

کیفیت ایسی تھی گویا سحر زدہ اور اس کے حکم کے تابع ہو۔

''ٹھیک ہے۔ میں جا رہی ہوں لیکن میری باتیں اپنے شعور میں محفوظ کر لو۔ تم یہ بھول جاؤ گے کہ غزالہ تمہارے کمرے میں آئی تھی۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

اچانک عبداللہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہے۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا' کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ کوشش کے باوجود اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ ریسیور رکھ کر پلٹا تھا پھر کیا ہوا تھا' کیا غزالہ آئی تھی۔ لاشعور کے کسی تاریک گوشے سے ہلکی سی کرن پھوٹی پھر تاریکی چھا گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے چند لمحے اس کی زندگی سے گم ہو گئے ہیں لیکن وہ کہاں گئے' اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دور کچن میں میوزک کی آواز ابھری۔ چند لمحوں کے بعد ایک خادمہ اس کے کمرے میں آ گئی۔

''غزالہ کو بلاؤ۔'' عبداللہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور سگریٹ جلانے میں مصروف ہو گیا۔

چند لمحوں بعد غزالہ آ گئی۔ ''جی پاپا!'' وہ ایک کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

عبداللہ نے غزالہ پر گہری نگاہ ڈالی لیکن اسے غزالہ میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نظر نہیں آئی۔

''ابھی کچھ دیر قبل تم میرے کمرے میں آئی تھیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی نہیں! میں تو اپنے کمرے میں رسالہ پڑھ رہی تھی۔''

عبداللہ اچھی طرح جانتا تھا کہ غزالہ جھوٹ نہیں بولتی۔

''ٹھیک ہے بیٹی تم جاؤ۔'' وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے پاپا! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔''

''کچھ نہیں بیٹی۔ تم جاؤ کچھ دیر آرام کر لو۔ ہمیں شاپنگ بھی کرنی ہے' کل ہم ہندوستان کے لیے فلائی کر رہے ہیں۔''

غزالہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ مسہری پر لیٹ گئی پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس طرح اٹھی تھی جیسے اس کے ادارے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا پھر واپس مسہری پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا پرس کھولا اور پرس کے اندر سے فولڈ کیا ہوا ریشمی کپڑا نکالا۔

کپڑا بہت پرانا اور کسی حد تک دبیز تھا۔ غزالہ کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اس نے کپڑے کی تہ کھول دی۔ ریشمی کپڑے پر فرعون کی کنیز ہرمینہ کی تصویر تھی۔ تصویر کا آدھا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جو میوزیم کے شوکیس سے غائب ہو چکی تھی۔

تصویر غزالہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کسی بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے لب بند تھے۔ چہرہ تمام تر جذبات سے عاری تھا۔ اچانک کمرے میں سسکیوں کی آواز ابھری۔ یہ آواز چاروں طرف گردش کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کمرے کا سارا ماحول سسک رہا ہو۔ صرف غزالہ مسہری پر خاموش بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد غزالہ کے ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے تصویر کو فولڈ کر کے پرس میں رکھ دیا پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ پرس الماری میں رکھ دیا اور آہستہ سے لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ کمرے میں سسکیوں کی آواز لحہ لحہ کم

ہوتی جارہی تھی۔

☆☆

جہاز کے پہیے زمین کو چھو کر اب رن وے پر دوڑ رہے تھے۔ اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا عملہ تیزی سے حرکت میں آچکا تھا۔ مسافر جہاز سے اترنا شروع ہوگئے تھے۔ غزالہ جہاز سے اترنے کے بعد ایک جگہ ٹھہر گئی۔ اس نے اپنا منہ اوپر اٹھایا اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے آبائی وطن کی خوشبو اپنی سانسوں میں بسالینا چاہتی ہے۔ طمانیت سے اس کے رخسار دمکنے لگے تھے۔ چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بچکانہ چمک در آئی تھی۔

عبداللہ نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''پاپا..... کتنا حسین ایئرپورٹ ہے۔ ہندوستان نے واقعی بہت ترقی کرلی ہے۔'' غزالہ نے چہکتے ہوئے کہا۔

پندرہ منٹ بعد وہ کسٹم وغیرہ سے فارغ ہوچکے تھے۔ عبداللہ نے ایئرپورٹ کے پارکنگ لاٹ کی طرف دیکھا۔ اسے وہاں اشوکا ہوٹل کی کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔

دہلی میں عبداللہ کے کئی دوست موجود تھے لیکن اس نے اپنی آمد کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی۔ وہ اچانک سامنے جاکر انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اشوکا ہوٹل کی پرشکوہ عمارت میں داخل ہورہے تھے۔ اشوکا ہوٹل کا شمار ان چند ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ جہاں عام آدمی ایک دن ٹھہرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ غزالہ اور عبداللہ اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے تھے۔ رات کا کھانا انہوں نے جہاز میں کھالیا تھا۔

دوسری صبح عبداللہ حسب دستور جلد بیدار ہوگیا۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر ٹیرس میں جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ تاہم دور افق پر سنہری کرنیں ابھر رہی تھیں۔ اچانک کال بیل کی آواز ابھری۔ عبداللہ بری طرح چونک پڑا۔ ''اس وقت کون ہوسکتا ہے۔'' وہ بڑبڑایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا پھر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دوسری طرف غزالہ کھڑی تھی۔

''غزالہ تم..... تم اتنی جلدی کیسے بیدار ہوگئیں۔'' عبداللہ نے حیرت کا اظہار کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

''جلدی۔'' غزالہ نے عبداللہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''اندر آجاؤ۔'' عبداللہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''لیکن بیٹی یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔''

غزالہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔ سامنے نہرو پارک کا سبزہ زار تھا۔ ایک بڑے قطعہ اراضی پر یہ پارک بہت سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ''کتنا خوب صورت پارک ہے۔'' غزالہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں..... لیکن اس کی خوب صورتی میں اس علاقے کی انفرادیت کا بڑا حصہ ہے۔ یہ صرف متمول طبقے کا علاقہ ہے۔ یہاں غیر ملکی زیادہ رہتے ہیں۔ پارک کے اختتام پر پاکستانی سفارت خانہ ہے۔ اس کے برابر میں آسٹریلیا کا سفارت خانہ ہے۔ یہ سارا علاقہ مختلف سفارت خانوں سے بھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ناشتا کرلینا چاہیے۔'' عبداللہ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

ناشتا انہوں نے اپنے کمرے میں کیا تھا۔ ناشتے کے بعد غزالہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

عبداللہ بھی لباس تبدیل کرنے لگا۔ اس کا پروگرام دہلی کی سیر کا تھا۔ اس کی فرمائش پر ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک گائیڈ فراہم کر دیا تھا۔ جو ارائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

دہلی کا لال قلعہ دیکھ کر غزالہ حیران رہ گئی۔ اسے مغلیہ دور کی فن تعمیر کے اس شاہکار نے بہت متاثر کیا تھا۔ قلعے کے ایک حصے میں قدیم نوادرات بھی رکھے تھے۔ غزالہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے ایک ریستوران میں کھایا پھر دوسرے مقامات کی سیر میں مصروف ہو گئے۔

عجائب گھر سے واپسی پر نکاسی کے دروازے کے قریب انہوں نے ایک قدیم دیوار کا شکستہ حصہ دیکھا جس پر ایک دربار کا منظر دکھایا گیا تھا۔ دربار میں ایک تخت تھا۔ تخت پر فرعون بیٹھا تھا۔ باقی درباری کچھ کھڑے تھے کچھ بیٹھے تھے۔

دیوار کے شکستہ حصے پر گزشتہ ادوار کے اثرات موجود تھے۔ تاہم سنگ تراش کا فن ابھری ہوئی اشکال کی صورت میں زندہ تھا۔ یہ ایک شہنشاہ کے دربار کی مکمل تصویر تھی۔ عبداللہ نے اس پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے دیوار کے قریب رک کر آگے بڑھ گیا تھا لیکن غزالہ اس جگہ پر یوں رک گئی جیسے فرش سے اس کے قدم چپک کر رہ گئے ہوں۔

غزالہ کی نگاہیں شکستہ دیوار کے اس حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں فرعون کا تخت تھا۔ عبداللہ نے پلٹ کر دیکھا غزالہ کسی بت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

''غزالہ!'' عبداللہ نے اسے آواز دی۔

''کیا ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولی پھر ایک جھٹکے سے اس کی طرف پلٹی۔ اس کی دونوں آنکھیں قدرے سرخ تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے عبداللہ کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے اعتدال پر آ گئی۔ اس کی پہلی والی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔

''پلیز پاپا! مجھے معاف کر دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قدیم مجسمے اور تصاویر میری کمزوری ہیں۔ میں فن کار کی فنکاری میں ڈوب گئی تھی۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔

عبداللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کار کی طرف بڑھنے لگا۔ غزالہ بوجھل قدموں سے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

شام تک انہوں نے مختلف مقامات کی سیر کی پھر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں غزالہ نے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ عبداللہ خود بھی زیادہ تر خاموش رہا تھا۔ ہوٹل میں پہنچ کر غزالہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عبداللہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

شام کے سائے تیزی سے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ کمرے میں خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تاہم عبداللہ نے بلب روشن نہیں کیا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اس کی سوچ کا مرکز غزالہ ہی تھی۔ بیٹی سے اسے بہت پیار تھا۔ اس کی پرورش پر اس نے خاص توجہ دی تھی۔ اسے مشرقی آداب سکھائے تھے۔ وہ بے حد مطمئن تھا کہ اس نے اپنی مرضی کے مطابق غزالہ کی تربیت مکمل کر لی تھی لیکن کبھی کبھی اس کی رنگ بدلتی کیفیت نے اسے متفکر کر دیا تھا۔ اس نے سوچا ممکن ہے غزالہ کو کچھ ہو گیا ہے مگر کیا' اسے کیا ہو گیا ہے۔ یہ ایک معمہ تھا جسے دماغ حل نہیں کر سکا تھا۔

عبداللہ کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس سلسلے میں کسی سے مشورہ بھی نہیں لے سکتا تھا اگر مشورہ لیتا تو کیا بتاتا۔ لوگ اس پر ہنستے۔

اچانک کال بیل کی آواز ابھری۔ عبداللہ نے ایک طویل سانس لی اور اپنی نشست سے اٹھ

گیا۔ ''دروازہ لاک نہیں ہے۔ اندر آجاؤ۔'' وہ یہ کہتا ہوا باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ غزالہ رات کے کھانے کے لیے آئی ہوگی۔

چند لمحوں کے بعد وہ اشوکا ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے۔

عبداللہ نے غزالہ کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ وہ سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔ اس نے مشفقانہ نگاہ سے غزالہ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور سر جھکائے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔

دوسری صبح ویٹر نے ناشتے کے ساتھ ہی ایک کارڈ بھی پیش کیا تھا۔ کارڈ میں ہوٹل کے پروگراموں کی تفصیل درج تھی۔ عبداللہ نے کارڈ پڑھ کر غزالہ کی طرف بڑھا دیا۔ کارڈ میں اس کی دلچسپی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

''پاپا یہاں تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔ کیا آپ شرکت کرنا پسند کریں گے۔ میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔'' غزالہ نے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہیں آرٹ سے کتنا لگاؤ ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

☆☆

اشوکا ہوٹل کی آرٹ گیلری میں ہوٹل کے مکینوں کے علاوہ شہر کے شرفا کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں اکثریت خواتین کی تھی۔ عبداللہ کچھ دیر تک غزالہ کے ساتھ رہا پھر اسے آرٹ گیلری میں چھوڑ کر خود نہرو پارک چلا گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ غزالہ یہاں سے جلدی نہیں جائے گی۔ وہ اس کے بے پناہ ذوق سے پوری طرح واقف تھا۔

غزالہ نے کئی تصویریں دیکھیں۔ اسے ایک تصویر بہت پسند آئی۔ اس نے ہوٹل کی انتظامیہ سے مصور کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ اتنا تو وہ پہلے ہی معلوم کر چکی تھی کہ مصور مقامی ہے۔ وہ رات گئے تک تصویروں میں گم رہی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد عبداللہ نے اپنے دوستوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ غزالہ نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر آہستہ سے بولی۔

''پاپا آپ تنہا اپنے دوستوں سے مل آئیں۔ میں دہلی کی سیر کروں گی۔ کچھ تھوڑی سی شاپنگ بھی کروں گی۔''

''لیکن بیٹی تمہارے لیے یہ شہر اجنبی ہے یہاں کے حالات پل پل تبدیل ہوتے رہتے ہیں تم تنہا کیسے گھوم سکتی ہو۔''

''پاپا میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی۔ دوپہر تک ہوٹل واپس آجاؤں گی پھر لنچ کرنے کے بعد سو جاؤں گی۔''

''اوکے بیٹی۔ ذرا خیال رکھنا۔'' عبداللہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

دس بجے غزالہ ہوٹل سے نکلی۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتا کر عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیکسی شاہ تارا اسٹریٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ غزالہ کو مصور کا مکان تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اسے ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک معروف شاعر کا حوالہ بھی دیا تھا۔ مصور کا مکان اس کے برابر میں تھا۔

غزالہ نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دور کہیں گھنٹی کی آواز ابھری پھر چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ مصور اجیت پال حسین شاہکاروں کا خالق ہونے کے علاوہ شائستہ مزاج بھی تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے غزالہ کو خوش آمدید کہا اور اپنے اسٹوڈیو میں لے گیا اس نے غزالہ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اس بات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گھر پر اس کے مداح آتے رہتے ہیں۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔

غزالہ کی بات سن کر اجیت پال سنجیدہ ہوگیا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''مس غزالہ میں

معذرت چاہتا ہوں۔ فرمائشی تصاویر نہیں بناتا اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ دراصل مصوری میرا ذریعہ معاش ہی نہیں میرا شوق بھی ہے' میں فن مصوری کے پس پردہ ایک خاص مشن پر کام کر رہا ہوں۔ آپ نے یقیناً میری اس تصویر کو پسند کیا ہوگا جس میں ایک دوشیزہ ندی سے پانی بھر رہی ہے۔ تصویر کے پس منظر میں چند کچے مکانات بھی ہیں۔ تصویر کے رنگوں میں ڈوب کر دیکھا جائے تو ناقد کو بہ آسانی اندازہ ہو جائے گا کہ اس جدید دور میں بھی ایک طبقہ کتنی کٹھن زندگی بسر کر رہا ہے۔ دولت کے پجاری اور سیاست کے ٹھیکیدار صرف قوم کی خوشحالی پر تقریریں کرتے ہیں۔ ان پر عمل نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو میرے وطن میں محرومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی آواز ایوانوں تک کبھی نہیں پہنچتی لیکن میری تصاویر دکھی انسانیت کی فریاد کی صورت میں ان بڑے لوگوں کے ڈرائنگ روم تک پہنچ جاتی ہے۔''

غزالہ خاموشی سے اجیت پال کی باتیں سنتی رہی۔ اچانک اس کے چہرے پر تلخی ابھر آئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''مسٹر اجیت پال! میرا بھی ایک مشن ہے۔ میں ہندوستان میں آپ کی مہمان ہوں۔ میں جو تصویر آپ سے بنوانا چاہتی ہوں وہ فن مصوری کے لیے ایک چیلنج ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ یہ چیلنج قبول کرلیں گے۔''

چیلنج کا نام سن کر اجیت پال کے چہرے پر غبار سا چھا گیا۔ وہ چند لمحوں کے بعد بولا۔ ''کیا آپ اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہیں۔''

''نہیں۔'' غزالہ نے پرس کھولتے ہوئے کہا پھر پرس میں سے فولڈ کیا ہوا ریشمی کپڑا نکال کر اجیت پال کو دے دیا۔ اجیت پال نے کپڑے کا رومال کھولا اور دلچسپی سے تصویر دیکھنے لگا۔

''مسٹر اجیت پال۔'' غزالہ نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ اس تصویر کے جلے ہوئے حصے کو نظر انداز کر کے دوسرے حصے کی مدد سے تصویر کا چہرہ مکمل کر دیں۔ اس کام کے سلسلے میں آپ جو رقم طلب کریں گے۔ میں پیش کر دوں گی لیکن تصویر کے محفوظ حصے پر جو حسن اور رعنائی ہے وہی سب کچھ دوسرے حصے پر ہونی چاہیے۔''

''رقم کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اجیت پال نے غزالہ کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تصویر بہت پرانی اور نایاب نظر آتی ہے۔ جس مصور نے اسے بنایا ہے وہ رنگوں کی جادوگری سے بخوبی واقف ہے۔ فن کی یہ بلندیاں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ میں اتنا اچھا مصور نہیں ہوں۔ تاہم تصویر کا چہرہ مکمل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''پھر میں کب آجاؤں۔'' غزالہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔

''آپ چار دن کے بعد مجھے فون کرلیں۔'' اجیت پال ایک چھوٹا سا کارڈ اسے دیتا ہوا بولا۔

غزالہ اپنی نشست سے اٹھ گئی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی پھر ٹھہر گئی۔ ''مسٹر اجیت پال! میں ایک بات آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''برائے مہربانی آپ یہ تصویر کسی اور کو نہ دکھائیں اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔ میرے کام میں رازداری شرط اول ہے۔''

''اس سلسلے میں آپ فکر نہ کریں۔ اس اسٹوڈیو میں میری اجازت کے بغیر کوئی نہیں آتا۔''

غزالہ نے مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے پلٹی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

☆☆

پانچویں دن رات کو آٹھ بجے غزالہ اجیت پال کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے دن میں اجیت پال

کوفون کیا تھا۔ اجیت پال نے اسے شام چھ بجے تک آنے کو کہا تھا لیکن اس نے خود ہی رات آٹھ بجے کا وقت مقرر کر لیا تھا۔ اجیت پال غزالہ کا منتظر تھا۔

''تشریف رکھیں مس غزالہ!'' اجیت پال ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اور یہ رہی آپ کی امانت۔'' اجیت پال نے ادھ جلے چہرے والی تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔

غزالہ چند لمحوں تک تصویر کو دیکھتی رہی پھر خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''نہیں..... یہ وہ چہرہ نہیں ہے۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے چہرے کی تمام تر رعنائی رخصت ہوگئی۔ رخساروں پر تناؤ سا پیدا ہوگیا' آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں اس کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ اجیت پال لرز گیا۔

''مصور تم ناکام ہوگئے ہو۔ مجھے افسوس ہے۔'' غزالہ کے لبوں سے غراہٹ سی ابھری۔

''مم..... میں۔'' اجیت پال نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''خاموش۔ تم بالکل خاموش کھڑے رہو۔ اپنے لب سختی سے بند کر لو۔'' غزالہ پھر غرائی۔

اچانک ایزل پر موجود تصویر میں آگ لگ گئی۔ آگ اجیت پال کے لباس میں بھی لگ گئی تھی۔ وہ خود کسی مشعل کی طرح جل رہا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ دوسری جانب غزالہ کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل اجیت پال کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ایزل راکھ کا ڈھیر ہوگیا اور اجیت پال کا توانا جسم کوئلے کے مجسمے میں تبدیل ہوگیا۔ غزالہ نے ایک طائرانہ نگاہ پورے اسٹوڈیو پر ڈالی پھر ایک جھٹکے سے پلٹی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

☆☆

عبداللہ اور غزالہ شام چھ بجے تک آگرہ پہنچ گئے۔ عبداللہ نے ٹیکسی ڈرائیور کے مشورے سے ایک مناسب ہوٹل میں دو کمرے حاصل کر لیے تھے۔ یہ ہوٹل دریائے جمنا سے قدرے نزدیک تھا۔

غزالہ' عبداللہ کے کمرے میں تھی۔ وہ اس وقت چائے پی رہے تھے۔ غزالہ کسی حد تک نارمل نظر آرہی تھی۔ عبداللہ نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھ دیا پھر سگریٹ سلگانے کے بعد بولا۔ ''بیٹی یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ آج چاند کی چودہ تاریخ ہے۔ ہم مکمل چاندنی میں تاج محل کا نظارہ کریں گے۔ رات کے وقت تاج محل کے اندرونی حصے بند ہوتے ہیں۔ ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد دریائے جمنا کے کنارے چلیں گے۔ کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد تاج محل کا نظارہ کریں گے۔''

چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ فضا میں چمکیلی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ زمین کی ہر شے چاندنی میں نہائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ایسے عالم میں تاج محل کا حسن قابل دید تھا۔ عبداللہ اور غزالہ حیرت سے چاندنی میں ڈوبے ہوئے تاج محل کو دیکھ رہے تھے۔

پاپا! یہ..... یہ تاج محل ہے۔'' غزالہ سحر زدہ کیفیت میں بولی۔ اس کی نگاہیں مسلسل تاج محل کا طواف کر رہی تھیں۔ ''کیا یہ کسی انسان کی تخلیق ہوسکتی ہے۔ کیا انسان اتنا حسین شاہکار بنا سکتا ہے۔''

''ہاں! ایسا ممکن ہے اگر انسان کا ذہن مثبت سوچ اختیار کر لے اور وہ تعمیری مقاصد پر بھرپور توجہ دے تو وہ ایسے ہی شاہکار تخلیق کرتا ہے لیکن اگر اس کی سوچ منفی ہے وہ انسانوں کی تباہی کے مشن پر کام کرتا ہے تو جنت ارضی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے۔''

اس وقت کافی رات گزر گئی تھی۔ غزالہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ عبداللہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ چنانچہ وہ ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

☆☆

عبداللہ صبح کو بیدار ہو کر غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد چائے پی رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ غزالہ ابھی سو رہی ہوگی۔ آگرہ میں اسے صرف دو دن قیام کرنا تھا۔ یہ بات اس نے رات ہی غزالہ کو بتا دی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ اخبار پڑھنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ غزالہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ غزالہ دروازے کا پٹ تھامے کھڑی تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اسے شدید سردی لگ رہی ہو۔ اس کا چہرہ بہت زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے بیٹی۔'' عبداللہ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ ''ارے!..... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ ٹھہرو میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ تم لیٹ جاؤ میں کمبل اوڑھا دیتا ہوں۔''

''ہاں پاپا! ڈاکٹر کو لے آئیں۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد عبداللہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ غزالہ کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غزالہ کو انجکشن لگایا۔ چند کیپسول اور گولیاں دیں پھر ایک پرچے پر اسٹور کی دوا لکھ دی۔ عبداللہ ڈاکٹر کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوا لے آیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس نے دوا میز پر رکھ دی پھر مسہری کی طرف بڑھا۔ غزالہ گہری نیند سو رہی تھی' وہ دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ دیوار گیر گھڑی میں دن کے دو بج رہے تھے۔ دفعتاً غزالہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کمرے میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر کھڑی ہوگئی۔ الماری کھول کر اس نے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے ایک کارڈ نکال کر پڑھنے لگی۔

یہ کارڈ آگرہ کے ایک مصور رام لال کا تھا جو اس نے اشوکا ہوٹل کی انتظامیہ سے حاصل کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے الماری بند کر دی۔ کارڈ پرس میں رکھ لیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

چند گھنٹے قبل غزالہ کی جو حالت تھی وہ یکسر مفقود ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ پوری طرح تر و تازہ اور صحت مند نظر آ رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر دروازہ لاک کر دیا پھر عبداللہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں برق سی چمکی تھی پھر اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے پلٹی اور زینے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆

دوسرے دن غزالہ کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ عبداللہ نے فوراً روانگی کا پروگرام بنا لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ عبداللہ نے دہلی کے لیے دو ٹکٹ خریدے پھر وہ ایک بنچ پر بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین آ گئی۔ وہ ایک ڈبے میں سوار ہوگئے۔ دونوں کی نشستیں کھڑکی کے پاس تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔ غزالہ نے ایک رسالہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

عبداللہ نے اسٹیشن پر نگاہ دوڑائی۔ اس کی نگاہیں ایک بک اسٹال کا طواف کرنے لگیں۔ بک اسٹال کھڑکی کے سامنے تھا۔ اخبار و رسائل قرینے سے سجے تھے۔ اخبار کی ایک سرخی پر اس کی نگاہ چپک کر رہ گئی۔ لکھا تھا۔ ''پندرہ منٹ کے اندر مصور رام لال کا جسم کوئلے کے مجسمے میں تبدیل

ہوگیا۔ پندرہ منٹ قبل اسے زندہ دیکھا گیا تھا۔ اس نوعیت کا یہ دوسرا حادثہ ہے۔''

عبداللہ اس سے زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے چل پڑی تھی۔

شام تک وہ دہلی پہنچ گئے۔ عبداللہ کو تمام رات ٹرین میں سفر کرنے کے بعد کل دن میں بس سے بھی سفر کرنا تھا۔ اس کا پروگرام ریشم نگر جانے کا تھا۔ ریشم نگر تک کوئی ٹرین نہیں جاتی تھی۔ اسے پرتاب گڑھ کے اسٹیشن پر اتر کر بس کے ذریعے سفر کرنا تھا۔ جو زیادہ طویل نہیں تھا۔

☆☆

اس وقت غزالہ اور عبداللہ بس میں سفر کر رہے تھے۔ عبداللہ نے دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجے تھے۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔

''پاپا ہم ریشم نگر کب تک پہنچ جائیں گے۔'' غزالہ نے گزرتے ہوئے مناظر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''بارہ بجے تک ہم تقریباً نصف سے زیادہ سفر کر چکے ہیں۔''

''ہم وہاں کتنے دن قیام کریں گے۔''

''کتنے دن قیام سے تمہاری کیا مراد ہے! بیٹی تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ریشم نگر تو تمہارا گھر ہے۔ ایک نہ ایک دن تمہیں وہیں منتقل ہونا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ آفتاب تمہارا منگیتر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ یہ فیصلہ وہیں چل کر کرنا پڑے گا اگر اسرار احمد یا عبیدہ زندہ ہوتی تو یہ سب کچھ بہت آسان ہوتا۔ خیر اللہ مالک ہے۔''

غزالہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر بولی۔ ''پاپا جب ہم پہلی بار ریشم نگر آئے تھے۔ تو وہاں کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ انکل کا ہوٹل بھی خالی خالی سا رہتا تھا۔ ہوٹل میں گاہک کم اور عملہ زیادہ نظر آتا تھا۔''

''ہاں۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ علاقہ کیسا ہوگا۔ اسرار احمد مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ چند سالوں میں یہ علاقہ بہت ترقی کر لے گا لیکن ہوٹل کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد عبیدہ کا انتقال ہوگیا۔ ایک سال بعد اسرار احمد بھی دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسرار احمد کی تدفین میں' میں ریشم نگر آیا تھا۔ چند دن قیام کے بعد آفتاب کو ہوٹل کے منیجر جگدیش کی نگرانی میں چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔'' عبداللہ خاموش ہوگیا۔ اس کے ذہن میں ماضی کے دریچے کھلنے لگے تھے۔

☆☆

دوپہر تک وہ ریشم نگر پہنچ گئے۔ آفتاب 'انکل' کہہ کر عبداللہ سے لپٹ گیا۔ عبداللہ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''انکل یہ غزالہ ہے نا۔ یہ تو بہت بڑی ہوگئی ہے۔'' آفتاب نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ غزالہ نے حجابانہ انداز میں اپنا نازک سا ہاتھ اوپر اٹھا دیا اور ساتھ ہی سر کو ہلکا سا خم دے کر سلام کیا۔

''ہاں یہ غزالہ ہے لیکن بیٹے چند سالوں میں تم نے بھی خوب قد نکالا ہے۔'' عبداللہ کو آفتاب کا بے تکلف انداز پسند آیا۔

''بڑی سندر جوڑی ہے۔ بھگوان سلامت رکھے۔ آداب عرض کرتا ہوں بڑے صاحب۔''

عبداللہ چونک پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''ارے جگدیش تم بھی یہاں موجود ہو۔'' عبداللہ نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

جگدیش' آفتاب کے ہوٹل کا منیجر تھا۔ وہ اسرار احمد کے زمانے سے کام کر رہا تھا۔ جگدیش کو اسرار احمد مرحوم اور عبداللہ کے تعلقات کا علم تھا۔ وہ عبداللہ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سب آفتاب کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ جگدیش ان سے اجازت لے کر ہوٹل

چلا گیا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ سب کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا جگدیش نے ہوٹل سے بھجوایا تھا۔

''بیٹے تم اس بنگلے میں تنہا رہتے ہو۔'' عبداللہ نے کھانے کے دوران پوچھا۔

''نہیں میرے ساتھ بابا معین بھی رہتے ہیں۔ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ بابا کو ڈیڈی نے ملازم رکھا تھا لیکن میں انہیں ملازم نہیں سمجھتا۔'' آفتاب چند لمحوں تک خاموش رہا پھر بولا۔ ''جہاں تک ذاتی تنہائی کا تعلق ہے تو چند سال قبل سے یہ احساس شدید ہوگیا ہے۔ تاہم میں نے خود کو مصروف رکھنے کے بہانے ڈھونڈ لیے ہیں' میں ہوٹل سے فارغ ہونے کے بعد تفریح کرنے نکل جاتا ہوں اور فطری مناظر کا مشاہدہ کرتا ہوں پھر ان کی تصویریں بناتا ہوں۔''

''آپ مصور بھی ہیں۔'' غزالہ نے چہکتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ اس نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

''جی نہیں! بس الٹی سیدھی تصویریں بنا لیتا ہوں۔ ایک کمرے میں میرا اسٹوڈیو بھی ہے۔ میں تمہیں ضرور دکھاؤں گا۔''

''تو پھر ابھی چلتے ہیں۔'' غزالہ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''آیئے! مجھے کیا اعتراض ہے۔'' آفتاب اٹھ کھڑا ہوا۔

آفتاب غزالہ کو لے کر بنگلے کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اسٹوڈیو میں پہنچ گئے۔ غزالہ اسٹوڈیو میں موجود تصاویر دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''آپ بہت اچھی تصویریں بناتے ہیں۔'' غزالہ بولی۔

''نہیں غزالہ! میں رنگوں کے علم سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ اس کے لیے مدت درکار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فن کار کو اپنے فن سے بے پناہ لگاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک کامیاب فنکار وہی ہے جو اپنے فن میں ڈوب جائے۔ میں یہ سب کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے اس فن کو مشغلے کے طور پر اپنایا ہے۔'' آفتاب نے وضاحت کی۔

''آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ ایک بڑی تصویر کے نزدیک جا کر ٹھہر گئی۔

یہ ایک مصری خاتون کی تصویر تھی۔ تصویر بہت حسین تھی' رنگوں کا استعمال اتنی مہارت سے کیا گیا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے تصویر کسی بھی لمحے متحرک ہو کر اپنے فریم سے باہر نکل آئے گی۔ تصویر کی آنکھیں' لب و رخسار کسی لمحے متحرک ہو جائیں گے۔ تصویر کے لب اس زاویے سے بنائے گئے تھے کہ ہلکی سی مسکراہٹ کا گمان ہوتا تھا۔ آنکھوں میں ممتا کا نور جھلک رہا تھا۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مجموعی طور پر تصویر کے چہرے پر اتنا وقار تھا کہ اساطیری ملکاؤں کے حسن کا گمان ہوتا تھا۔

غزالہ محویت سے تصویر دیکھتی رہی۔ ''یہ تصویر آپ نے بنائی ہے۔'' وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔

''ہاں' پسند آئی۔ یہ تصویر میری مرحوم ماں کی ہے۔'' آفتاب بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ایک مصور کی حیثیت سے میں نے جو کچھ سیکھا ہے' اس مہارت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر اس میں بھر دیا ہے۔ اس تصویر میں میری فنی صلاحیتوں کے علاوہ میرے جذبات و احساسات کا بھی عمل دخل ہے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے اس کی تکمیل کی ہے۔''

''بہت خوب! اگر میں بھی آپ سے کوئی فرمائش کروں تو آپ کا کیا جواب ہوگا۔'' غزالہ نے کہا۔

''بھئی فرمائش کیسی۔ کیا تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔'' آفتاب

نے ہنستے ہوئے کہا۔

غزالہ اسے چند لمحے تک ٹھہرنے کا کہہ کر اسٹوڈیو سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پرس سے اس نے ریشمی کپڑے کا رومال نکال کر آفتاب کو دے دیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

آفتاب نے رول کھول لیا۔ ریشمی کپڑے پر ادھ جلے چہرے کی تصویر تھی۔ وہ چند لمحوں تک تصویر کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔ ''یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گئی۔ یہ تو بہت نایاب تصویر معلوم ہوتی ہے۔ تصویر میں استعمال ہونے والا رنگ اور کپڑا موجودہ دور کا نہیں ہے۔ شاید کئی سو سال پرانا ہے۔''

''یہ میری ایک سہیلی کی ہے۔ وہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ کیا آپ اس کی فرمائش پوری کریں گے۔''

''اب بتا بھی چکو کیا فرمائش ہے۔'' آفتاب نے بے تکلفی سے کہا۔

''وہ چاہتی ہے' میرا مطلب ہے کہ آپ جلے ہوئے حصے کو ختم کر کے سالم حصے کی مدد سے تصویر کا چہرہ مکمل کر دیں۔''

آفتاب نے ایک بار پھر تصویر کا جائزہ لینا شروع کر دیا پھر چند ثانیے کے بعد وہ بولا۔ ''میں تصویر کا چہرہ مکمل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ تاہم یہ کہنا دشوار ہے کہ مجھے کس حد تک کامیابی ہوگی۔ مجھے اس امر کا بہ خوبی اندازہ ہے کہ میں اس تصویر کے مصور کی مہارت تک نہیں پہنچ سکتا۔''

آفتاب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ اسے کب تک بنا دیں گے۔'' غزالہ نے بے تابی سے دریافت کیا۔

''اب اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ کیا تم یہاں صرف تصویر بنوانے آئی ہو۔'' آفتاب نے غزالہ کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

غزالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرا تمام تر جذبات سے عاری تھا۔ وہ سر اٹھائے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ان دیکھی شے کو تلاش کر رہی ہے۔

''کیا اب یہیں قیام کا ارادہ ہے۔'' اس نے غزالہ کو مخاطب کیا۔

''ایں..... نہیں۔'' غزالہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ''آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا' پکا وعدہ۔''

''میں وعدہ ہمیشہ پکا ہی کرتا ہوں اور وہ وعدہ جو تم سے کروں گا یقیناً پائیدار ہوگا۔'' آفتاب شوخ لہجے میں بولا۔

''نہیں' میں سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔ آپ اس تصویر کا ذکر کسی سے بھی نہیں کریں گے۔ پاپا سے بھی نہیں' پلیز اس بات کا وعدہ کریں۔'' غزالہ سرتاپا التجا بن گئی۔

آفتاب کو اس پر ترس آنے لگا۔ ''ٹھیک ہے غزالہ میں وعدہ کرتا ہوں لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ جب تک میں تصویر مکمل نہ کر لوں۔ تم میرے اسٹوڈیو میں نہیں آؤ گی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' غزالہ نے جلدی سے کہا اور اسٹوڈیو سے باہر آ گئی۔ آفتاب نے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆

کئی دن کے بعد عبداللہ نے ریشم پوائنٹ جانے کا پروگرام بنایا۔ اس کے ساتھ صرف جگدیش تھا۔ سفر کے لیے اس نے جیپ کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے ساتھ وافر مقدار میں کھانے پینے کی اشیا تھیں اسے دوسرے دن شام تک واپس آنا تھا۔

عبداللہ کے جانے کے بعد غزالہ آفتاب کے ساتھ ہوٹل آ گئی۔ اس نے دوپہر کا کھانا آفتاب کے ساتھ اس کے آفس میں کھایا تھا۔

چند لمحوں کے بعد چائے آ گئی۔ غزالہ چائے

کی طرف متوجہ ہوگئی۔ آفتاب سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔

''چائے پی لو پھر تمہیں ایک خوش خبری سناؤں گا۔''

''کیا..... کیا تصویر مکمل ہوگئی۔'' غزالہ نے بے تابی سے سوال کیا۔

''ابھی نہیں۔ پہلے چائے پی لو مگر جلدی میں منہ نہ جلا لینا۔ آرام سے پینا۔''

''ہاں..... اب بتاؤ۔'' غزالہ نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' آفتاب اپنی نشست سے اٹھتا ہوا بولا۔ اس کا رخ بنگلے کے عقبی حصے کی طرف تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اسٹوڈیو میں داخل ہو رہے تھے۔ غزالہ نے بے تابی سے ایزل کی طرف دیکھا۔ ایزل باریک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا لیکن تصویر کے دلکش نقوش باریک کپڑے سے جھلک رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی دوشیزہ نے چہرے پر نقاب لگا رکھا ہے۔

''یہ رہی تمہاری ادھ جلی تصویر۔'' آفتاب نے ریشمی کپڑے کا رول غزالہ کی طرف بڑھایا۔

غزالہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی وہ ایزل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آفتاب نے بڑھ کر ایزل سے باریک کپڑا ہٹا دیا۔

ایزل پر فرعون کے دور کی حسین و جمیل دوشیزہ ہرمینہ کی مکمل تصویر موجود تھی۔ تصویر کے رخساروں پر آفتاب نے بہت عمدہ ورک کیا تھا۔ وہ اس طرح دمک رہے تھے جیسے گلاب شبنم سے دھل کر تر و تازہ ہوتا ہے۔ اس نے چہرے کے جلے ہوئے حصے کو اتنی مہارت سے مکمل کیا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ تصویر آدھی تصویر کی مدد سے مکمل کی گئی ہے۔ تصویر کی آنکھوں میں زندگی کی رمق تھی۔ یوں لگتا تھا پلکیں کسی بھی لمحے حرکت میں آجائیں گی۔ لبوں پر ہلکی سی آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

''آہ.....'' اچانک غزالہ کے لبوں سے عجیب سی آواز نکلی۔ ''مصور..... تم نے میری تصویر مکمل کر دی۔ آہ..... تم نے میرے صدیوں کے کرب کو ختم کر دیا۔ میری تصویر مکمل کر کے مجھے رسوا ہونے سے بچا لیا۔'' غزالہ غیر انسانی اور پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔

آفتاب حیرت سے غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نامکمل تصویر ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

''مصور میں جا رہی ہوں۔ جانے سے قبل غزالہ کی صورت میں تمہیں ایک تحفہ پیش کر رہی ہوں۔ میں غزالہ کا جسم چھوڑ رہی ہوں۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی غزالہ کی آنکھوں سے برق سی چمکی۔ آفتاب کے ہاتھ میں موجود تصویر میں آگ لگ گئی۔ آفتاب نے تصویر کا رول چھوڑ دیا ریشمی کپڑے کا رول فرش پر گرنے سے قبل جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

اچانک غزالہ لہرا کر فرش پر گر پڑی۔ ''کیا ہوا غزالہ۔'' آفتاب گھبرا کر بولا پھر اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا' غزالہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ آفتاب نے ایزل کی طرف دیکھا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا' تصویر ایزل سے غائب تھی۔

دریں اثناء غزالہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے متوحش نظروں سے آفتاب کی طرف دیکھا پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں کہاں ہوں۔ تم کون ہو۔ پاپا کہاں ہیں۔'' اس نے ایک ساتھ کئی سوال کیے تھے۔ وہ آفتاب سے قدرے خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

''بیٹے آفتاب..... آفتاب۔'' دور سے عبداللہ کی آواز آئی۔ آفتاب جلدی سے اسٹوڈیو سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ عبداللہ کے ساتھ

اسٹوڈیو میں داخل ہو رہا تھا۔ غزالہ ابھی تک فرش پر بیٹھی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹے' یہ غزالہ کو کیا ہو گیا۔'' عبداللہ گھبرا کر بولا۔

''پاپا! میں کہاں ہوں! میں تو قاہرہ میوزیم میں تھی۔'' غزالہ نے قدرے سہمے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''کیا۔'' عبداللہ تقریباً چیخ پڑا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم اس وقت ہندوستان کے قصبے ریشم نگر میں ہو۔''

''نہیں۔'' غزالہ غیر یقینی انداز میں چیخی۔ ''میں قاہرہ میوزیم میں ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ جس کا آدھا چہرہ جلا ہوا تھا۔''

''تم یہاں سے اٹھو۔ باہر نکلو۔ تمہیں خود یقین آ جائے گا تم کہاں ہو۔'' عبداللہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ غزالہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اسے خبر کیوں نہیں ہوئی۔

آفتاب نے عبداللہ کو ساری تفصیل بتا دی تھی۔ اس بات کو غزالہ نے حیرت سے سنا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں میں نے کوئی تصویر نہیں بنوائی ہے۔ میرا کسی تصویر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

عبداللہ کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اس کے ذہن میں دہلی اور آگرہ کے مصوروں کی جلی ہوئی لاشیں ابھر آئیں لیکن وہ اس کے لیے غزالہ کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ اسے تو خود اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پر تو کوئی اور قابض تھا۔

اس امر کا یقین ہونے کے بعد کہ وہ واقعی ریشم نگر میں ہے غزالہ کے چہرے پر مسرت جھلکنے لگی۔

☆☆

دوسرے دن آفتاب اور غزالہ کی شادی ہو گئی اور غزالہ ریشم نگر کی دلچسپیوں میں کھو گئی۔

ایک ماہ بعد آفتاب' غزالہ اور عبداللہ قاہرہ روانہ ہو گئے۔ عبداللہ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ فیکٹری اور مکان فروخت کر کے مستقل طور پر ریشم نگر میں آ جائے گا۔ غزالہ کے بعد قاہرہ میں اس کا کوئی نہیں تھا۔

قاہرہ کے اخبارات میں ایک خبر بڑی گرم تھی۔ تقریباً ایک ماہ سے اس خبر کا چرچا ہو رہا تھا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ چند ماہ قبل قاہرہ میوزیم سے جو ادھ جلی تصویر پراسرار انداز میں غائب ہوئی تھی' وہ خود ہی اپنے شوکیس میں واپس آ گئی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر تصویر کا چہرہ مکمل ہے۔ یہ بات ظاہر نہیں ہوئی کہ تصویر کس نے بنائی اور کس طرح شوکیس میں رکھ دی۔

آفتاب' غزالہ اور عبداللہ قاہرہ میوزیم میں تصویر دیکھنے گئے تھے۔ تصویر کے شوکیس کے پاس بہت زیادہ ہجوم تھا۔ تماشائی قطار کی صورت میں تصویر دیکھ رہے تھے۔ تصویر دیکھتے ہی آفتاب نے پہچان لیا۔ یہ اسی کی بنائی ہوئی تصویر تھی۔ غزالہ نے تصویر کی طرف دیکھا پھر آفتاب کا ہاتھ تھام لیا اس کی گرفت بہت زیادہ سخت تھی۔ ''چلیں یہاں سے' چلیں۔'' غزالہ نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''ہاں چلو۔'' آفتاب آگے بڑھتا ہوا بولا۔

اچانک ایک گائیڈ کی آواز ابھری۔ ''خواتین و حضرات یہ فرعون کے دور کی حسین ترین دوشیزہ ہرمینہ کی تصویر ہے۔''

آفتاب نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے یوں لگا تصویر کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ہے۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

عورت کی یہی فطرت ہے۔ اس دن کے بعد سے کنسولینا نے نہ صرف کہ خود کو میری منگیتر سمجھنا چھوڑ دیا بلکہ اس کی خواہش یہ رہی کہ مَیں اس گھر کی ملازمت بھی چھوڑ دوں جہاں اس نے مجھے زبردستی رکھوایا تھا۔ وہ ہر طریقہ سے مجھے بے عزت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

سنہری جال

معین کمالی

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

روم میں اگر کسی کو جاہل اور گنوار کہنا ہو تو اس سے پوچھتے ہیں ''کیا تم سرگولا سے آئے ہو؟''

میرا تعلق سرگولا ہی سے ہے اور اسی وجہ سے مَیں ایک گھریلو ملازم ہوں۔ سرگولا میں مجھے کنسولینا سے محبت ہوگئی تھی اور پھر ہماری منگنی بھی ہوگئی۔ اسے روم میں ایک ملازمت مل گئی اور اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے بھی اسی گھر میں نوکری دلا دی جہاں وہ خود کام کر رہی تھی۔ اس نے اپنے مالکوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہم دونوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے منگیتر ہونے کے باوجود ایک ہی گھر میں اجنبی بن کر رہنے لگے۔ کنسولینا ہمارے گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی جسے زیادہ سے زیادہ قبول صورت کہا جا سکتا

ہے مگر میری نظر میں وہ بڑی حسین جمیل لڑکی تھی۔ اس کے گال گہرے سرخ بلکہ سیاہی مائل اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔ اس کا جسم متناسب تھا۔ اس کے برعکس مَیں ایک پستہ قد اور لحیم شحیم انسان ہوں میرا رنگ بھی قدرے سیاہ ہے' میری آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ ہیں' ناک تیکھی اور چہرہ چوڑا ہے۔ خیال رہے کہ ہم دونوں گورے رنگ کے نہیں تھے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچنے لگیں کہ ہم دونوں ایک ہی گھر میں برابر برابر کے کمروں میں رہتے ہوئے اور باورچی خانے میں ایک ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔

اس کے خاندان میں ایک ماہ ساتھ گزارنے کے بعد مجھ سے اس کی محبت سرد پڑنے لگی۔ ایک شام ہم دونوں ساتھ تھے۔ اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی اور مَیں سیاہ السیشین کتے کو چہل قدمی کرانے کے لیے نکلا تھا۔ ہاں اسی شام اس نے منگنی کی انگوٹھی لوٹاتے ہوئے کہا۔

''ہمارا تمہارا ساتھ اب نہیں نبھ سکتا۔ اب تم میرے متعلق سوچنا بھی چھوڑ دو۔''

میں اسے حیرت سے تکتا رہ گیا۔ مَیں نے اس کو شریکِ حیات بنا کر آئندہ زندگی کے جو خواب دیکھے تھے وہ سب بکھر گئے' اس نے پھر کہا۔

''مجھے اب تمہاری کوئی پروا نہیں' بس یہی وجہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ غصّے کے عالم میں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

عورت کی یہی فطرت ہے۔ اس دن کے بعد سے کنسولینا نے نہ صرف کہ خود کو میری منگیتر سمجھنا چھوڑ دیا بلکہ اس کی خواہش یہ رہی کہ مَیں اس گھر کی ملازمت بھی چھوڑ دوں جہاں اس نے مجھے زبردستی رکھوایا تھا۔ وہ ہر طریقے سے مجھے بے عزت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میری کسی بات کا جواب نہ دیتی اور کبھی جذبات سے مغلوب ہو کر مَیں اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تو وہ انتہائی بے رخی سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتی۔ اکثر وہ مجھ سے پوچھا کرتی ''تم یہ گھر کب چھوڑ رہے ہو؟''

آخر تنگ آ کر ایک روز مَیں نے اس سے کہا۔ ''مَیں یہاں سے اسی وقت جاؤں گا جب مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تمھیں مجھ سے نفرت کیوں ہو گئی۔''

اس نے جواب نہیں دیا اور کندھے اچکاتی ہوئی چلی گئی لیکن مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس نے مجھ سے گھر چھوڑنے کے بارے میں پوچھنا چھوڑ دیا۔

ایک دن اتوار کو کنسولین گھر سے باہر تھی۔ مَیں اس کے کمرے میں گیا تھا کہ اس کی ذہنی تبدیلی کا سبب معلوم کر سکوں۔ کنسولینا میری طرح غریب ہی تھی۔ اس کا تعلق میرے ہی گاؤں سے تھا اور وہ میری ہی طرح ملازمت کرتی تھی۔

کمرے میں ہر طرف کنسولینا کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور یہ خوشبو اتنی واضح تھی کہ مَیں بے اختیار اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور ان دنوں کو یاد کرنے لگا جب ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے' کچھ دیر بعد مَیں پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مختلف چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ مَیں نے الماری اور تمام درازیں چھان ماریں۔ پھر مَیں نے اس کا سوٹ کیس کھولا جس پر اتفاق سے تالا نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس میں اپنی پسند کی چیزیں رکھتی ہے۔ میری توقع کے عین مطابق اس میں بہت سی فالتو چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ کون سی ایسی چیز تھی جو اس سوٹ کیس میں موجود نہ ہو۔ چائے اور بسکٹ کے ڈبے' چھوٹی بڑی پنیں' ایسٹر کی کچھ اشیا' رنگین شیشوں والے ہار' سینٹ کی خالی شیشیاں' رنگ برنگے ربن وغیرہ۔ مجھے جس چیز کی تلاش تھی' وہ اس میں نہیں تھی' یعنی کوئی خط یا تصویر۔ مَیں سوٹ کیس کی

لطف چیزیں الٹتا پلٹتا رہا۔ اچانک میرا ہاتھ سوٹ کیس کی ایک اندرونی جیب میں چلا گیا جہاں ایک پھولا ہوا لفافہ رکھا تھا۔ مَیں نے اس امید پر لفافہ کھولا کہ اب راز فاش ہو جائے گا۔ اس میں سنہری بالوں کا ایک بڑا سا گچھا رکھا ہوا تھا لیکن یہ بال باقاعدہ کٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ کنگھے یا برش میں سے نکالے ہوئے بال تھے۔

بالوں کے اس گچھے کو دیکھ کر مَیں مبہوت رہ گیا' مجھے معلوم تھا کہ یہ بال کس کے ہو سکتے تھے اور کنسولینا کس کی زلفوں کی اسیر ہو چکی تھی۔ یہ سنہری بال پالبنیسی خاندان کے نوجوان فرد الفریڈو کے تھے۔ ایک روز پہلے ہی مَیں الفریڈو کے برش کو صرف کرتے ہوئے ان بالوں کو دیکھ چکا تھا' یہ نوجوان ایک طالبعلم تھا جو اپنے باپ کے برعکس نہایت سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا۔ زیادہ محنتی نہیں تھا مگر اسے گراموفون ریکارڈوں' برطانوی سگریٹوں اور امریکی مشروبات سے بڑا لگاؤ تھا۔ یہ ان نوجوانوں میں سے تھا جن کے بال کم عمری میں ہی گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور جو تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے بالکل گنجے ہو جاتے ہیں۔ الفریڈو کے بال گھنگھریالے' ماتھا چوڑا' سامنے کے بال غائب' نیلی آنکھیں ناک خمیدہ اور منہ ٹھوڑی کی طرف جھکا ہوا۔ وہ کسی بھیڑ کی طرح نظر آتا تھا۔

الفریڈو کے بالوں کو دیکھ کر مجھے اور بہت سی باتیں یاد آ گئیں جب بھی الفریڈو گھنٹی بجاتا وہ فوراً یہ کہتی ہوئی لپکتی۔ ''چھوٹے آقا یاد کر رہے ہیں' مجھے جانا چاہیے۔'' اس گھر میں ایک میں ہی مرد نوکر تھا' ظاہر ہے کہ الفریڈو کے پاس مجھے ہی جانا چاہیے تھا لیکن کنسولینا پہلے ہی دوڑ پڑتی۔ اس سے قبل مَیں نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن اب ان کی حقیقت کھلنے لگی۔ اسی شام کچن میں' مَیں نے کنسولینا سے کہا۔

''تم چھوٹے صاحب کو اپنے خیالوں میں بسائے ہوئے ہو' کتنی احمق لڑکی ہو تم! کیا تمہیں وہ ایک بھیڑ کی مانند نہیں لگتا۔''

اس نے تیزی سے پلٹ کر جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے اس کی شکل بھیڑ جیسی ہے تمہاری طرح بکرے جیسی تو نہیں۔''

اس جواب نے مجھے وہ سب سمجھا دیا جو مَیں جاننا چاہتا تھا۔ مَیں نے اسے کچھ نہیں کہا لیکن اس روز سے مَیں نے کنسولینا کی حرکات و سکنات کا تعاقب شروع کر دیا۔

الفریڈو عام طور پر گھر ہی پر رہتا تھا۔ اس کا باپ صبح ہی دکان پر چلا جاتا تھا۔ اس کی ماں اور چھوٹی بہن جب بھی باہر گئی ہوئی ہوتیں' وہ فلیٹ کے آخری سرے پر واقع اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ گھر پر زیادہ وقت گزارنے کے باوجود الفریڈو کو کنسولینا سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔

میری اپنی رائے یہ تھی کہ اس نے کنسولینا کی دلچسپی کو محسوس کر لیا تھا کیوں کہ اس نے کئی بار کنسولینا کے سامنے مجھ سے کہا کہ جب بھی مَیں گھنٹی بجاؤں تم آیا کرو اور ہر بار کنسولینا کا منہ لٹک کر رہ گیا۔ مَیں اس کے لیے کافی' شربت لے کر اس کے وسیع و عریض کمرے میں جاتا تو وہ میز پر پیر پھیلائے بیٹھا ہوتا۔ اور اس کے سامنے ایک آرام کرسی پر اس کی گرل فرینڈ بیٹھی ہوئی ہوتی' یہ ایک دبلی پتلی امریکی لڑکی تھی۔ جس کے سفید چہرے پر پھیلے ہوئے سرخ ہونٹ تازہ زخم کے مانند نظر آتے تھے' اتفاق سے اس لڑکی کا نام کنسولیو تھا جس کے معنی بھی وہی ہیں جو کنسولینا کے ہیں۔ وہ بڑی چست پتلون پہنتی تھی اور اس کے بال لڑکوں کی طرح چھوٹے چھوٹے تھے۔ یہ دونوں گھنٹوں اسی کمرے میں بیٹھے رہتے تاہم مَیں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔ وہ کبھی بوس و کنار کے بھی روادار نہیں ہوتے' کمرے میں ہر طرف دھواں پھیلا ہوتا مَیں ٹرے کو میز پر رکھ کر آتا لیکن ان میں سے کوئی مجھے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

وہ ہر وقت گانے سننے میں مصروف رہتے تھے۔

میں نے کنسولینا سے کہا کہ تم فضول اپنا وقت برباد کر رہی ہو۔ وہ شخص نہ تمھیں دیکھنا پسند کرتا اور نہ تمھاری بات سننا۔ تمھارا تعلق سرگولا ہے اور اس کا نیویارک سے۔ یہی فرق کافی ہے۔ کنسولینا میری اس بات پر غصے سے پاگل ہوگئی۔ وہ کھانا پکاتی تھی لیکن الفریڈو کی واضح ہدایت تھی کہ اس کے لیے کھانا مَیں ہی لے جاؤں۔ اس کے باوجود کنسولینا کسی نہ کسی انداز میں اس پر اپنی محبت ظاہر کرنے کی کوشش کرتی۔

ایک روز کنسولینا نے پھولوں کا ایک گلدستہ خریدا اور چپکے سے الفریڈو کے کمرے میں گئی جہاں وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گانے سننے میں مگن تھا۔

''مجھے یہ پھول پیش کیے گئے تھے مگر مَیں نے سوچا کہ یہ آپ کے کمرے میں زیادہ خوب صورت معلوم ہوں گے۔''

امریکی لڑکی نے گلدستہ دیکھ کر کہا۔ ''آہ کس قدر حسین پھول ہیں۔''

الفریڈو نے اس سے پوچھا۔ ''کیا یہ تمھیں پسند ہیں؟'' پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے کنسولینا تم اس گلدستے کو کاغذ میں لپیٹ دو' یہ اپنے ساتھ لے جائیں گی۔''

کنسولینا پیر پٹختی ہوئی باورچی خانے میں آئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ گلدستے کو کوڑے میں پھینک دے۔ وہ شاید ایسا کر گزرتی کہ مَیں نے گلدستہ چھین کر کاغذ میں لپیٹا اور کمرے میں جا کر دے آیا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت جب گھر میں چھوٹے صاحب کے سوا کوئی نہیں تھا اچانک زور زور سے گھنٹی بجنے لگی۔ اس سے پہلے کہ مَیں کمرے تک جاتا الفریڈو کمرے سے باہر نکلا اس نے ہاتھ سے پیٹ کو دبا رکھا تھا۔ اس کے پیٹ میں شدید درد تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔ کنسولینا ایسے موقع کی ہمیشہ منتظر رہتی تھی وہ بھاگ کر باورچی خانے سے آئی اور اسے سہارا دے کر باتھ روم تک لے گئی جہاں الفریڈو کو زبردست قے ہوئی۔

کنسولینا اس کے سر کو تھامے کھڑی رہی اور بار بار کہتی رہی۔ ''آپ کو بستر پر آرام کرنا چاہیے۔'' الفریڈو اسی طرح کراہتا ہوا واپس اپنے کمرے میں گیا۔ کنسولینا اب بھی اسے سہارا دیے ہوئے تھی۔ پلک جھپکتے میں اس نے الفریڈو کا بستر بچھا دیا۔ پھر اسے کپڑے تبدیل کرائے۔ اس کے بعد وہ بھاگی بھاگی کچن میں گئی تاکہ الفریڈو کے لیے گرم پانی کی بوتل لائے' اس دوران میں اس کے تاثرات دیکھتا رہا۔ وہ بڑی خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی۔ یہ بیماری اس کی خوش قسمتی بن کر آئی تھی۔

اب وہ الفریڈو کے قریب تھی۔ مَیں نے اپنے آپ سے کہا عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ کسی کی بیماری سے بھی فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔ کنسولینا نے پانی گرم ہونے کے لیے رکھ دیا تھا اور وہ کچن کے دروازے پر کھڑی الفریڈو کی آہیں سن رہی تھی۔

''میرے خدا.....آہ.....میرے مولا.....اف میرے خدا.....'' اسی وقت باہر کی گھنٹی بجی۔

وہ دوڑ کر دروازہ کھولنے گئی اور مجھے ہدایت کر گئی کہ پانی کو دیکھتا رہوں۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے پوری حقیقت تو نہیں معلوم لیکن میرا اندازہ ہے کہ جب وہ دروازہ کھولنے گئی تو اس نے امریکی لڑکی کو وہاں پایا ہوگا۔ کنسولینا نے اس سے کہا کہ الفریڈو بیمار ہے' وہ اس وقت تم سے نہیں مل سکتا۔ لڑکی نے کہا کہ وہ ہر حال میں اس سے مل کر جائے گی۔ کنسولینا نہیں چاہتی تھی کہ یہ سنہری موقع اس کے ہاتھ سے نکل جائے چناں چہ اس نے امریکی لڑکی سے کہا کہ وہ فوراً یہاں

چلی جائے لیکن وہ اندر آنے پر بہ ضد تھی۔ کنسولینا نے اسے باہر کی طرف دھکا دیا اور اس نے کنسولینا کو اندر دھکیلا یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئیں اور ایک دوسرے کے بالوں کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا پھر چیخنے چلانے، رونے پیٹنے اور گھونسوں، لاتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد کرسیاں اٹھا کر پھینکنے اور سامان کے الٹنے پلٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ مَیں باہر ہال کی طرف بھاگا وہاں کنسولینا اور کنسولیو ایک دوسرے کے بالوں کو مٹھی میں دبائے فرش پر لوٹ رہی تھیں کنسولینا چیخ رہی تھی۔

''ذلیل وحقیر عورت یہاں سے نکل جا۔''

امریکی عورت نے جواب دیا۔ ''بے وقوف عورت مجھے اندر جانے دے۔''

میں یہ منظر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا اگر یہ دونوں کھڑی ہوں تو بلاشبہ ان میں سے ایک سرگولا کی اور دوسری نیویارک کی لڑکی نظر آئے لیکن فرش پر لوٹتے ہوئے وہ دونوں صرف عورتیں تھیں، احمق لڑکیاں جو ایک ہی مرد کی محبت میں گرفتار تھیں۔ اس دوران بیمار الفریڈو بھی اپنے دروازے میں نمودار ہو چکا تھا۔ وہ بڑی کمزور آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اُف میرے خدا! یہ کیا تماشا ہے؟ خدا کے لیے ان کو چھڑاؤ۔'' وہ اپنے پیٹ کو اب بھی دبائے ہوئے تھا۔ مَیں نے بہ مشکل تمام ان کو علاحدہ کیا۔ کنسولینا کی مٹھی میں امریکی لڑکی کے بالوں کا ایک گچھا اور چہرے پر امریکی لڑکی کے سرخ ناخنوں سے لگے ہوئے نشانات تھے۔ اسی دن کنسولینا نے اپنا بوریہ بستر باندھا اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ چند دنوں کے بعد مَیں نے بھی وہ گھر چھوڑ دیا کیوں کہ مَیں بھی اسی گاؤں سے تعلق رکھتا تھا۔ کنسولینا نے وہاں کے متعلق اچھے تاثرات نہیں چھوڑے تھے۔ کئی روز تک مجھے وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ ابھی تھوڑے دن پہلے مَیں نے اسے اسٹیشن کے قریب ایک باغ میں دیکھا تھا۔ اس کے بال کنسولیو کی طرح کٹے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کی رنگت اور بھی سیاہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہم راہ ایک پستہ قد نوجوان تھا۔ غور سے دیکھنے پر مجھے پتا چلا کہ اس نوجوان کی رنگت صاف اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ ایک کیپ پہنے ہوئے تھا۔ اس لیے اس کا سر نظر نہیں آ رہا تھا البتہ مَیں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس کیپ کے نیچے سنہری بال ہوں گے۔

اندازِ فکر

☆ دنیا میں مہنگی ترین چیز عزت اور دوستی ہے۔

☆ اگر عافیت اور امن درکار ہو تو آنکھ اور کان سے زیادہ کام لو اور زبان بند رکھو۔

☆ پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

☆ مسکراہٹ کے بے شمار فائدے ہیں لیکن اس پر خرچ کچھ نہیں ہے۔

☆ اس شخص سے بچو، جو تمہیں تمہاری حیثیت سے بڑا کہے۔

☆ چند لمحوں کی وقتی خوشی کے لئے کسی کو غمزدہ نہ کرو۔

☆ مت ملو ان سے جو خود غرض ہوں۔

☆ مت چلو ان کے ساتھ جو راہ وفا میں دھوکہ دیں۔

☆ مت سنو ایسی بات جو زندگی کو ویران کر دے۔

☆ بے اعتمادی سے کام کرنا اندھے کنوئیں میں گرنے کے مترادف ہے۔

☆ کسی کو پا لینے کا نام محبت نہیں، دل میں بسا لینے کا نام محبت ہے۔

☆ اعتماد روح کی طرح ہوتا ہے جو ایک دفعہ چلا جائے تو واپس نہیں آتا۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

ابو نے امّی کو عندیہ دے دیا تھا اور باہر کھڑی حوریہ کو جیسے کسی نے دیوار میں چنوا دیا تھا اسے اپنے ارد گرد کی ہر شے گھومتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی پھر جیسے تیسے وہ کمرے میں آئی اس نے بغیر سوچے سمجھے کمپیوٹر کھولا اور دمیر کو میل لکھنا شروع کر دی۔

شازیہ رانا

اس شمارے کی ایک ہنستی مسکراتی کہانی

''اب آئے ہو پونے تین کی موچھوں والے' کرائے کے قاتل' شریف غنڈے اگر میں نے کوئی کام کہہ ہی دیا تھا تو موت کیوں پڑ گئی۔''

وہ بے تکان اسے سنا رہی تھی اور وہ پاؤں کے انگوٹھے سے اپنی جوتی کو مسلتا جا رہا تھا' لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔

''اب یہیں کھڑے کھڑے رات کر دینا گولی کے لائق' امی آنے والی ہیں' وہ ذرا تمہاری اچھی خبر لیتی ہیں کچھڑ۔''

جب دیکھا کہ وہ آگے سے کچھ نہیں بولا تو امّی کی دھمکی لگا کے اٹھنے لگی تو وہ جھٹ سے بولا۔

''تو جو آپ اس وقت سے سنا رہی ہیں کیا وہ سفر کی دعا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ غڑاپ سے کمرے میں گھس گیا اور دروازہ لاک کر لیا اور وہ اس کی بدتمیزی سے تلملا کے مزید اونچی آواز میں بکنے لگی' بس جوتی پکڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

☆☆

حوریہ اور دمیر کزن تھے..... دمیر خالہ کے پاس پڑھنے آیا ہوا تھا..... حوریہ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پہ تھی اس سے چھوٹے داؤد اور حادیہ تھے..... سب کزنز کی آپس میں خوب بنتی تھی..... حوریہ کو اس کے بہن بھائی آپا بلاتے تھے تو ان کی دیکھا دیکھی دمیر نے بھی اسے آپا کہنا شروع کر دیا تھا' سوائے بڑے بھائی وداود کے سب اس سے ڈرتے تھے یا ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے تھے' کبھی کبھی تو ابو بھی اسے حوریہ آپا کہہ کے چھیڑتے.....

دمیر کے ماں باپ سعودیہ میں مقیم تھے اور وہ پڑھنے کے لئے پاکستان آ گیا تھا..... وہ اور وداود ایک ہی یونیورسٹی میں انجینئرنگ میں ماسٹرز کر رہے تھے۔

وہ کبھی کبھی ماں سے پوچھتی کہ وہ دمیر سے بڑی ہے یا چھوٹی تاکہ رعب ڈالنے کا سرٹیفکیٹ مل جائے تو وہ یاداشت کو کھنگال کے قیاس کے سے انداز میں کہتیں۔

''جب تم یا وداود میری گود میں تھے تو تب دمیر پیدا ہوا تھا' مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ان دنوں ہلکی ہلکی بوندا باندی رہتی تھی اور تمہاری دادی ٹوکری بھر تازہ امرود دے جایا کرتی تھیں' کیا خوبصورت' تازہ امرود ہوتے تھے۔''

وہ بری طرح سٹپٹا جاتی کہ موسم کا حال اور امرودوں کی تازگی اب تک یاد ہے پر بچوں کا

حساب بھول گئیں پھر سوچ کے مطمئن ہو جاتی کہ وہ بہرحال اس سے چھوٹا ہی ہے اور وہ اس کی لگائی کی حق بجانب ہے۔

وہ بھی نزدیکی یونیورسٹی سے ایم۔اے اکنامکس کر رہی تھی اور ذہین ہونے کی وجہ سے چھوٹے دونوں بہن بھائی کو خود پڑھاتی تھی' کبھی کبھی تو ودود اور دمیر کی پڑھائی میں بھی ٹانگ اڑا دیتی جس پر اکثر ودود سے سننا پڑتیں اور دمیر پاس بیٹھا دبی دبی ہنسی ہنستا رہتا جس پہ وہ اسے خونخوار طریقے سے گھورتی ہوئی باہر نکل جاتی کیونکہ ودود کے سامنے وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

یونیورسٹی میں جانے کے بعد دمیر کو نجانے کیا سوجھی کہ مونچھیں رکھ لیں..... اچھی بھلی شکل و صورت اور ڈریسنگ کے باوجود دودھ والا لگتا حالانکہ دوست بے انتہا پھبتیاں کستے پر وہ ٹس سے مس نا ہوا۔

''دمیر بھائی میرا دوست کہہ رہا تھا تمہارے بھائی کی مونچھیں ہیں کہ تلوار۔''

یہ بتا کر داؤد پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا تو دمیر اس کی بات پہ اس سے بھی زیادہ ہنسا کہ اچانک حوریہ آ گئی۔

''خیر ہے تم لوگ اتنا ہنس کیوں رہے ہو کہیں دمیر نے کلاس میں ٹاپ تو نہیں کر لیا۔؟''

وہ بھی ہنسنے میں شریک ہو گئی۔

''اگر ایسا ہوتا تو یہ ہنسنے کی نہیں خوشی کی بات ہوتی۔'' اس نے چچا چچا کے جواب دیا۔

''تم سمجھے نہیں' اگر خدانخواستہ ٹاپ کر لیتے تو ذہنی توازن کھو بیٹھتے تو اس حالت میں بندہ ہنستا ہی ہے۔''

اب وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''ویری فنی۔''

وہ یہ کہہ کے اٹھنے لگا تو داؤد نے آواز دے کے پھر روک لیا۔

''اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تم اپنے کپڑے دھو کر دمیر بھائی کی مونچھوں پہ ڈال دیا کرو۔''

اس بار وہ دانت کچکچاتا ہوا باہر نکل گیا تو حوریہ اور داؤد کے فلک شگاف قہقہے اس کا پیچھا کرتے رہے۔

☆☆

''یار دمیر کتنا اسمارٹ ہے بس مونچھوں پہ آ

کے بات رہ جاتی ہے۔''
صفحے پہ آڑھی ترچھی لکیریں مارتے ہوئے فریحہ نے کہا۔
''اُف یہاں تو بیٹھنے کی بھی ڈھنگ کی جگہ نہیں' پتہ نہیں یونیورسٹی کا نام اسے کس نے دے دیا' ہلکی سی بھی بارش ہو جائے تو ایسے جل تھل ہو جاتی ہے جیسے سیلاب آ گیا ہو..... اب دیکھو دور دور تک بیٹھنے کو جگہ نہیں مل رہی اور کمروں میں اسٹوڈنٹس مرغی خانے کی طرح بھرے پڑے ہیں۔''
حوریہ نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے موسم کا رونا رو دیا۔
''تو نہیں لینے تھے اتنے بہترین نمبر کہ اس آؤٹ کلاس یونیورسٹی میں داخلہ ملتا..... کیا آج پھر دمیر لینے آئے گا تمہیں۔؟''
یونیورسٹی پہ چار حرف بھیج کے اس نے پھر دمیر کا ذکر چھیڑ دیا مگر وہ تلملا گئی کہ نمبر کم نہیں آئے تھے' اس نے لیٹ ایڈمشن لیا تھا۔
''غور کیا سمیرا اب کچھ اداس اداس رہنے لگا ہے شاید آصفہ کی شادی ہو گئی ہے..... ہائے بیچارہ ناکام عاشق۔''
اس نے اپنے کلاس فیلو کا ذکر کیا اور آخر میں مصنوعی تاسف سے ہاتھ ملے۔
''سوال چنا جواب گندم' میں اس وقت سے کیا باتیں کر رہی ہوں اور تم بہروں کی طرح کیا جواب دے رہی ہو۔'' اس بار اس نے ذرا غصے سے کہا۔
''ہاں ہے ڈیشنگ پر مونچھیں پتہ نہیں کیوں رکھ لیں..... باقی داوے تم اتنی دلچسپی سے اس کا ذکر کیوں کر رہی ہو۔؟'' اس نے ابرو اچکا کے تفتیشی انداز میں پوچھا۔
''اپنی گندی ذہنیت کا علاج کراؤ میں تو بس حیران ہو رہی تھی کہ آخر کس سے متاثر ہو کے اس نے یہ حسین اضافہ کر لیا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک دھموکا اس کی کمر میں رسید کر دیا۔
''اللہ کرے تمہیں ایسے ہی حسین اضافے والا بلکہ مونچھ پہ منہ کے نشان والا ملے۔''
وہ کمر سہلاتے ہوئے اسے سنا رہی تھی تو وہ ایک دم جاتے جاتے رک گئی۔
''اور جو مرضی کہہ لو پر ایسی ہولناک بد دعا دینے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔''
اس نے جب یہ کہا تو وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی اور جب سمجھ آیا تو دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

☆☆

''اس شعر میں کمین گاہ کا کیا مطلب ہے آپا۔؟''
داؤد اردو کی کتاب کھولے اس سے پوچھ رہا تھا اور جیسے ہی اس نے بتانے کے لئے منہ کھولا تو دمیر جو باہر جا رہا تھا فوراً مڑا۔
''جیسے کوئی بھی پھل لانے پہ خالہ کہتی ہیں ابھی سے اپنا حصہ لے لو بعد میں کمین پن نا کرنا تو میرے خیال میں اس سے ملتا جلتا لفظ ہے۔''
وہ یہ کہہ کر داد لینے کے لئے رکا تو حوریہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی یہ جانے بغیر کہ داؤد کا ہنسی ضبط کرتے کرتے چہرہ لال ہو گیا ہے۔
''کیا تمہارے کسی دوست کے پاس گن ہے۔؟''
داؤد سمجھ گیا تھا کہ آپا کا پارہ چڑھ گیا ہے' اس لئے اب خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔
''ہاں ہے پر اتنی پرانی کہ گولی تو اس سے اب چلتی نہیں تو پھر وہ شرلے ڈال کے غبارے پھوڑتا ہے..... پر آپا خیر ہے آپ کو ضرورت کیوں پڑ گئی۔؟'' وہ خوب ہنسنے کے بعد حیرت سے اسے پوچھ رہا تھا۔
''کوئی بات نہیں میں شرلوں والی ہی سے کام چلا لوں گی۔'' اس نے بے پناہ سنجیدگی سے جواب دیا۔
''تو پھر کیا فائدہ آدھی ادھوری موت کا' یاد

آپ نے پہلے بھی ایک بار خودکشی کی کوشش کی تھی وٹامن کی گولیاں کھا کے تو ڈاکٹر نے خالہ سے کہا تھا فکر کی کوئی بات نہیں' بچی کے ناخن اور بال اچھے ہو جائیں گے۔''

اب کی بار داؤد سے بھی رہا نہیں گیا اور دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے کان پھاڑ قہقہے لگانے لگے۔

''وہ میں تمہارے لئے مانگ رہی ہوں' اچھا ہے شرلے ہیں زیادہ اذیت سے جان دو گے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگی تو وہ دانت نکالتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆

''دمیر بھائی مجھے نہیں پتہ آج تو آپ کو ہمیں آئس کریم کھلانی ہی پڑے گی۔''

حادیہ اور داؤد اس کے سر ہو رہے تھے۔

''کس خوشی میں۔؟'' اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کے پوچھا۔

''مونچھوں سے ٹرک کھینچنے میں جو آپ پہلے نمبر پہ آئے ہیں..... اس خوشی میں۔''

داؤد نے حادیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دانت نکال کے کہہ دیا۔

''اوہ تو تمہیں خبر مل گئی؟ چلو پھر میں اور حادیہ آئس کریم کھانے لبرٹی چلتے ہیں اور تمہارے لئے آتے ہوئے مونگ پھلی' گچک' ریوڑیاں اور بھنے ہوئے چنے لے آئیں گے کیونکہ تم یہی کچھ ڈیزرو کرتے ہو۔''

اس کے جواب میں وہ فہرست بتا کے جوتے کے تسمے باندھنے لگا۔

''آپ آئس کریم کھانے لبرٹی جا رہے ہیں کہ مرید کے۔''

اس کے سوال کو نظر انداز کر کے دونوں باہر نکل گئے۔

''کیا تم نے دمیر کو دیکھا ہے۔؟''

''ہاں جی میٹرک کے بعد سے وہ یہیں ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''داؤد کے بچے کبھی تو سیریس ہو جایا کرو' خالو' خالہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور ہاسپٹل میں ہیں' دمیر کو فوراً بلایا ہے۔''

اس نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔

''بیٹا جتنی جلدی ہو سکتا ہے وہاں پہنچو آپا زیادہ سیریس ہیں..... میر اور دائمہ تو پہنچ بھی گئے۔''

امی نے رو رو کے آنکھیں لال کر لی تھیں اور اس کے آتے ہی یہ روح فرسا خبر سنا کر اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے' بڑے بہن بھائی کے پہنچنے کا بتا کر اب اسے بھی اکسا رہی تھیں لیکن وہ بت بنا کھڑا تھا..... اس نے آج تک اسے اتنا پریشان نا دیکھا تھا۔

☆☆

''الحمدللہ اب آپا خطرے سے باہر ہیں' میری بات ہوئی ہے دائمہ سے۔''

اگلے دن امی نے پرسکون ہوتے ہوئے اسے خبر دی تو نجانے اس کے ذہن میں کیا آیا کہ بے تابی سے پوچھ لیا۔

''دمیر کچھ کب واپس آ رہا ہے۔؟'' اس نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

''اب کیا لینے آنا ہے' شکر ہے ایگزیمز ہو گئے تھے رہ گئی ڈگری تو وہ میں اپنے ساتھ اس کی بھی لے آؤں گا۔''

وہود جو پاس بیٹھا کمپیوٹر پہ کوئی کام کر رہا تھا فوراً بولا تو اس کا جواب سن کے اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی' لگا کہ اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے ایک دم ڈھیروں سناٹا اندر اترتا ہوا محسوس ہوا..... اس سے پہلے کہ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کے باہر نکلتے وہ جلدی سے باہر نکل گئی اور پھر اوندھی لیٹ کر کتنی ہی دیر تک روتی رہی..... وہ اپنی کیفیت پہ خود بھی حیران تھی۔

اگلے دن وہ یونیورسٹی گئی تو سارا دن کسی کام میں جی نا لگا کلاسز بھی برائے نام اٹینڈ کیں..... اریحہ بار بار پوچھتی رہی پر وہ ٹالتی گئی اگلے دو دن بھی یہی حالت رہی تو اس نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا کہ آج تو پوچھ کے ہی چھوڑے گی۔

''دمیر ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔'' وہ اتنا بتا کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی..... کچھ دیر رو کے جی ہلکا ہوا تو اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے پوچھا۔

''کیا تم اس سے محبت کرنے لگی ہو۔؟'' وہ ہنوز اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوانا چاہا تو وہ بولی۔

یہ اداس اداس پھرنا' یہ رتجگے کا تاثر
ہے یونہی نہیں سب کچھ کوئی سانحہ تو ہوا ہے

☆☆

آج صبح سے بارش ہو رہی تھی تو وہ یونیورسٹی نہیں گئی اور اپنے کمرے میں بند ہو کے پڑھتی رہی۔

''آج موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے نا آپا۔''

اچانک کھڑکی سے برستی ہوئی بارش کو دیکھا تو دمیر چھم سے دماغ کے پردے پہ نمودار ہوا۔

''اب تم پکوڑوں کی فرمائش کرو گے پر میں نہیں بنا کے دوں گی کل میرا ایگزیم ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر پھر کتاب آنکھوں کے آگے کر لی تھی۔

''رات کو پڑھ لینا' آپا ان مسکین بچوں کی شکلیں دیکھو خاص طور پہ داؤد تو کسی فقیر کا عکس لگ رہا ہے۔''

اس کی تشبیہ پہ داؤد اس پہ چڑھ دوڑا تھا اور وہ چار و نا چار پکوڑے بنانے کے لئے اٹھ گئی تھی اور داؤد نے ایک پکوڑا اٹھا کے کہا تھا۔

''دمیر بھائی' آپا نے یہ آپ کا مذاق اڑانے کے لئے بنایا ہے لگتا ہے دو بچے ایک آدمی کی مونچھوں کا رسہ بنا کے کود رہے ہیں۔''

پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے تو اس نے کس مشکل سے دونوں کو چھڑایا تھا' یہ سوچ کر ایک دلفریب مسکراہٹ چہرے پہ پھیل گئی تھی مگر ساتھ ہی نمی بھی ہلکورے لینے لگی۔

بارشوں کے موسم میں
تم کو یاد کرنے کی
عادتیں پرانی ہیں
اب کے بار سوچا کہ
عادتیں بدل ڈالیں
پھر خیال آیا کہ
عادتیں بدلنے سے
بارشیں نہیں رکتیں.....

وہ کتاب بند کر کے امی ابو کے کمرے کی طرف آئی اور جونہی ہینڈل پہ ہاتھ رکھا تو امی کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

''زاہدہ آپا باسم کے لئے حوریہ کا ہاتھ مانگ رہی ہیں' ہم سب نے اسے دیکھا تو ہوا ہے خوبصورت' پڑھا لکھا اور کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہے۔''

امی ساتھ والوں کے باسم کا ذکر کر رہی تھیں جن سے ان کے پرانے تعلقات تھے..... اس کے قدم وہیں جم گئے اور ماؤف دماغ کے ساتھ سب سنتی رہی۔

''تو پھر آپ ہاں کر دیں کیونکہ اتنا پرانا ساتھ ہے اور ویسے بھی ہمیں ان کی سب معلومات ہے..... رشتہ داروں والا حساب ہے' حوریہ کی پڑھائی بھی کمپلیٹ ہو گئی ہے تو پھر دیر کس بات کی۔''

ابو نے امی کو عندیہ دے دیا تھا اور باہر کھڑی حوریہ کو جیسے کسی نے دیوار میں چنوا دیا تھا' اسے اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی پھر جیسے تیسے وہ کمرے میں آئی اس نے بغیر سوچے سمجھے کمپیوٹر کھولا اور دمیر کو میل لکھنا شروع کر دی۔

''کچھ دن میں اپنی کیفیت سے دانستہ نظریں

چراتی رہی پر جب دل ضدی پن پہ اتر آیا تو اعتراف کرلیا کہ مجھے تم سے محبت ہے..... امی ابو باسم کا رشتہ آنے پہ ہاں کہنے والے ہیں' وہی باسم جو تمہارا دوست بھی ہے' پلیز دمیر مجھے بچالو میں اب تمہارے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔''

اسے پوری امید تھی کہ جواب مثبت ہی ہوگا لیکن دو دن بار بار ان بکس کھول کے اس کی میل نہ پا کے دل عجیب سے وسوسوں میں گھر گیا جونہی باہر آئی امی شدید پریشان تھیں۔

''باسم کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے' میں ودود کے ساتھ ہاسپٹل جارہی ہوں تم اپنے ابو کو فون کردینا تاکہ وہ بھی وہاں آجائیں۔''

وہ گاڑی میں بیٹھیں اور آناً فاناً نکل گئیں۔

''حوریہ آج گھر پہ باسم کے ابو آرہے ہیں تو تیار رہنا۔''

رات کو فون آیا اور فون اٹھانے پہ امی نے کہا تو وہ ذومعنی بات نا سمجھ سکی اور حیران تھی کہ انکل اتنی جلدی ڈسچارج بھی ہوگئے۔

☆☆

''مبارک ہو بھائی جان۔''

ابو انکل کے گلے مل رہے تھے جن سے کمزوری کے باعث کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا تو ان کو صوفے پہ لٹا دیا گیا..... وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور لگ رہا تھا کوئی بھیانک خواب چل رہا ہے جس کی زد سے وہ چاہ کر بھی نہیں نکل سکتی تھی۔

سلطان صاحب کی خواہش پہ فوراً نکاح کر دیا گیا تھا کیونکہ باسم کی والدہ پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوچکی تھیں تو جب انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تو فوراً نکاح کی درخواست کردی کہ کچھ ہونے سے پیشتر وہ یہ خوشی دیکھ لیں اور رخصتی ان کی مرضی سے اٹھا رکھی۔

اگلے دن دروازے پہ بیل ہونے پہ حادیہ نے دروازہ کھولا اور خوشی سے چلاتی ہوئی اندر آئی کہ دمیر بھائی آئے ہیں' اسے لگا جیسے اس کا دل مٹھی میں لے کے مسل دیا گیا ہے..... وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی پر پھر بھی نجانے کیوں چلی آئی تھی..... وہ ڈارک بلیو سوٹ میں ایک وجیہہ نوجوان لگ رہا تھا اور آنکھوں میں فتح کی بے پناہ چمک اور خوشی چھلک رہی تھی۔

''دمیر بھائی آپ کلین شیو میں کتنے حسین لگ رہے ہیں۔''

حادیہ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''بھئی سب لوگ کہاں ہیں اور تمہاری آپا کدھر ہیں۔؟''

وہ پوچھ رہا تھا اور زور تمہاری آپا پہ تھا۔

''السلام علیکم۔''

اس نے آتے ہی سلام کیا تو حادیہ چائے لانے کا کہہ کے چلی گئی۔

''وعلیکم اسلام' آج میل پڑھی تو آج ہی دوڑا آیا' اصل میں نیٹ کچھ دن سے خراب تھا تو فوراً نہیں پڑھ سکا۔''

اس نے وارفتگی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''مونچھیں کیوں منڈوا دیں۔؟''

اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے میکانکی سے انداز میں پوچھا تو اتنی دیر میں امی بھی آگئیں۔

''ارے تم کب آئے؟ دو دن پہلے آجاتے تو حوریہ کے نکاح میں شرکت کرلیتے..... خیر سے باسم.....۔''

وہ اور بھی کچھ بتا رہی تھیں لیکن اس کی حس سماعت بند ہوچکی تھی اور لگ رہا تھا کہ دل بھی بند ہوجائے گا..... وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکلا تو صرف ایک جملہ کانوں میں گونج رہا تھا

''مونچھیں کیوں منڈوا دیں۔''

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

کمار نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ سب کچھ سچ بیان کردے گا۔ اسے اپنی بات کا آغاز کرنے میں قدرے دشواری ہوئی لیکن ایک بار جب اس نے اسٹارٹ لے لیا تو پھر اسے الفاظ تلاش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اسے اب کسی قسم کی امید نہیں رہی تھی۔ نہ ہی امین سے کسی قسم کے رحم کی توقع کی جاسکتی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ قطعی طور پر نروس نہیں ہورہا تھا۔

محمد صدیق طاہر

اس شمارے کی ایک فکر انگیز کہانی

ٹرین پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی.....

کمار کھڑکی کے ساتھ کی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں کھڑکی سے باہر دور کہیں خلاؤں میں جمی ہوئی تھی۔ وہ نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اسے نزدیک سے گھور رہا ہے۔ اس نے نہایت محتاط انداز میں اپنی نگاہوں کا رخ کمپارٹمنٹ کے اندرونی حصے کی جانب پھیرا۔

کمپارٹمنٹ تقریباً خالی تھا وہاں دو تین مزدوروں کے سوا اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے مزدور کام سے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ دھک دھک کی آواز اس کے ساتھی مسافروں کو نہ سنائی دینے لگے۔ تیز روشنیاں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ یہ روشنیاں کمار کی آنکھوں کو بہت بری لگ رہی تھیں۔ وہ اس وقت مکمل طور پر تنہائی کا خواہاں تھا۔

اس نے محتاط انداز میں اپنے ہاتھ سے پتلون کی جیب کو چھو کر دیکھا۔ ڈپلیکیٹ چابیوں کے ابھار نے اسے قدرے اطمینان کا احساس دلایا۔ چابیاں واقعی اس کی تحویل میں تھیں۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک لفظ نے سر ابھارا۔

''چور۔''

اور پھر وہ چونک پڑا۔ یوں محسوس ہوا' جیسے یہ لفظ اس کے ذہن سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آگیا ہو۔ چور۔

یہ لفاظ ایک ہیولے کی شکل اختیار کرنے لگا اور کسی سائے کی مانند اس کے وجود پر چھا گیا۔ کمار کو یوں لگا' جیسے کوئی نادیدہ قوت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی ہو اور اس کے جرم کو تولنے کی کوشش کررہی ہوں۔

کمار لرز کر رہ گیا۔

ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ صرف چند منٹ کی بات ہے پھر وہ اسٹیشن پر اتر جائے گا' کمار نے سوچا۔ ٹرین کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور بالآخر وہ پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی۔

کمار نے خوفزدہ نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر ٹرین سے نیچے اتر آیا۔ اسے ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔ لوگ ابھی بھی سڑکوں پر چل پھر رہے تھے لیکن بھیڑ نہیں تھی۔ وہ دو رویہ عمارتوں کے درمیان پیدل آگے بڑھتا رہا۔

''کیا اسے بس پکڑ لینی چاہیے۔''

کمار نے اس سوال کو اپنے ذہن میں تولا۔ شاید بس کے انتظار میں اسے قطار میں کھڑا ہونا پڑے۔ اس صورت میں ممکن ہے' کسی شناسا سے مڈبھیڑ ہو جائے یا پھر ممکن ہے کہ اس نامناسب وقت پر قطار ہی نہ ہو۔ بھلا اتنی رات گئے کون کہیں جانے کے لیے بس کے انتظار میں ہوگا۔

بہرحال اسے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے' اس نے سوچا۔ وہ پیدل چلتا رہا۔

اس کے خیالات اپنے باس کی شخصیت پر مرتکز ہونے لگے۔ دراز قامت امین کا نفرت انگیز خاکہ اس کی نظروں سے سامنے ابھر آیا۔

اسٹاف اسے 'ٹائیگر' امین کے نام سے پکارتا تھا۔ اس کے چہرے کی کرخت لکیروں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے تصور ہی سے کمار کو جھرجھری آ گئی۔ خاص طور پر اپنے ماتحتوں سے گفتگو کے وقت اس کے جبڑوں کی حرکت ہی مقابل کو دہلا دیتی تھی۔

اگر کبھی ٹائیگر کو پتہ چل گیا تو۔

اور پھر کمار چونک پڑا۔ سامنے ہی ایک پولیس مین کھڑا تھا۔ کمار کو یوں محسوس ہوا' جیسے قانون کا محافظ اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ مگر یہ محض اس کا گمان تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی لیکن نہیں' پولیس مین کو تو اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ اس نے خود کو اطمینان دلایا۔ وہ پولیس مین کے پاس سے اطمینان سے گزرتا چلا گیا۔

پولیس مین نے ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد کمار خود کو مضمحل سا محسوس کرنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ پلٹ جائے اور گھر واپس چلا جائے۔ یہ سب کچھ اسے بے حد گراں محسوس ہو رہا تھا۔

گھر۔

اپنے گھر کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں

پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کا باپ..... بستر مرگ..... ٹی بی..... دوائیں..... ڈاکٹر کا مشورہ..... دیوتا اس پر نامہربان تھے۔

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی کی امید صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ اسے کسی سینی ٹوریم میں بھیج دیا جائے۔ اور وہ بھی بلا تاخیر۔

لیکن اس کے لیے رقم کہاں سے آتی۔ اس کی ماہانہ تنخواہ صرف پندرہ سو روپے تھی۔ مزید ڈیڑھ سو روپے اسے اورمل جاتے تھے۔ اس میں بچتا ہی کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے علاج کے لیے پس انداز کرسکتا۔

کمار چلتا رہا۔ اگر قسمت میں یہی کچھ لکھا تھا تو پھر یہی کچھ ہونا بھی چاہیے۔ اب کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ اس کے باپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اس کے باپ کو کسی طور پتہ نہیں چلنا چاہیے۔

ایک جانی پہچانی عمارت کے سامنے پہنچ کر کمار رک گیا۔ اس نے ایک محتاط نظر سڑک کے دونوں جانب ڈالی۔ کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔

عمارت کا داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا۔ وہ عمارت میں داخل ہوگیا اور سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔ وہ قدم بہ قدم زینے پر چڑھنے لگا۔ اس کے جوتوں کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اسے یوں لگا' جیسے کوئی آرہا ہو۔

اس کے قدم خود بخود رک گئے اور اس نے اپنا سانس روک کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ محض اس کا تصور تھا۔

خود کو کوستے ہوئے اس نے اوپر کی جانب دوبارہ اپنے قدم بڑھانا شروع کردیے۔

پہلی منزل..... دوسری منزل۔ پھر وہ دائیں جانب گھوم گیا۔ اندھیرے کے باوجود اس نے تانبے کی وہ پلیٹ دیکھ لی جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

''بمبئی ٹیکسٹائل کارپوریشن۔''

اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں رینگ گیا اور چابیاں ٹٹولنے لگا۔ چابیاں نکال کر اس نے ایک چابی کا انتخاب کیا اور اسے دروازے کے تالے میں ڈال کر دیکھا۔

چابی صحیح فٹ ہوگئی۔ اس نے چابی گھمائی۔ تالا کھل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

اس تمام عرصے میں اس کا کردار اور چال چلن نہایت ہی عمدہ تھا۔

یہ اس سرٹیفکیٹ کا اختتامی جملہ تھا جو اس کے پروفیسر نے اسے عطا کیا تھا۔ نہ جانے یہ الفاظ اس کے ذہن میں اس وقت کیوں تازہ ہوگئے تھے۔

اس نے آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کیا اور ٹارچ نکال لی۔ اندر کا ماحول اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ شناسا میزیں' شناسا کرسیاں..... وہ فرنیچر کے درمیان سے راستہ تلاش کرتا ہوا تجوری تک پہنچ گیا۔

روشنی کی شعاعیں تجوری پر مرکوز ہوگئیں۔ اس کا سفر اپنے اختتام پر پہنچ گیا تھا' چابیوں کی کھنکھناہٹ اسے خوفزدہ کررہی تھی..... نوٹوں کی گڈیاں اس کی نظروں کے سامنے تھیں۔

اس نے پیار سے ان گڈیوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی پریشانیاں ختم ہوچکی تھیں۔ کیا واقعی۔ کل وہ مدراس ایکسپریس میں ہوگا..... گھر..... باپ..... سینی ٹوریم۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ کسی کو اس پر شبہ تک نہیں ہوگا۔ اس نے گزشتہ روز ہی دفتر سے ایک مہینے کی رخصت لے لی تھی۔

اچانک بغیر کسی پیشگی اطلاع کے کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

کمار اچھل پڑا۔ اس کا رواں رواں خوف میں جکڑ گیا۔ نوٹوں کی گڈیاں اس کے ہاتھ میں تھیں اور تجوری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

کمار نے خود کو اپنے باس 'ٹائیگر' امین کے روبرو پایا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ کمار کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا' جبکہ امین کے انگ انگ سے بے اعتمادی عیاں تھی۔

ناتمام ہونے والی یہ کیفیت بالآخر اختتام کو پہنچی۔ امین نے قدم آگے بڑھائے' قریب پہنچ کر کمار کے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈیاں لے لیں اور انہیں واپس تجوری میں رکھ دیا۔ پھر تجوری کا دروازہ بند کرتے ہوئے چابی گھمائی اور تالا لگا کر الیکٹ چابیوں کا گچھا اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''بیٹھ جاؤ!'' اس نے گرج دار آواز میں کمار کو حکم دیا۔ کمار نے بزدلانہ طریقے سے حکم کی تعمیل کی۔ امین نے اس کے مقابل کی کرسی سنبھال لی۔

''اب مجھے اس بارے میں سب کچھ بتا دو۔'' اس کا لہجہ بدستور تحکمانہ تھا۔

کمار نے ایک نگاہ اپنے باس پر ڈالی۔ اس کے کسی انداز میں رحم کا شائبہ تک نہ تھا۔ اور اب تو وہ مزید ظالم اور جابر دکھائی دے رہا تھا۔

پولیس.....! جیل..... اس کے باپ کا بستر مرگ! یہ تصویریں اس کے ذہن کے پردے پر بار بار تیزی سے ابھرنے لگیں۔

کمار نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ سب کچھ سچ بیان کر دے گا۔ اسے اپنی بات کا آغاز کرنے میں قدرے دشواری ہوئی لیکن ایک بار جب اس نے اسٹارٹ لے لیا تو پھر اسے الفاظ تلاش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اسے اب کسی قسم کی امید نہیں رہی تھی۔ نہ ہی امین سے کسی قسم کے رحم کی توقع کی جا سکتی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ قطعی طور پر نروس نہیں ہو رہا تھا۔

جب وہ اپنی داستان مکمل کر چکا تو امین بے ساختہ پھٹ پڑا۔

''سفید جھوٹ۔''

کمار نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔ اس شخص سے اس بات کی توقع رکھنا کہ یہ معاملے کو سمجھ جائے گا' ناممکنات میں سے تھا۔ یہ ایک ایسا ظالم و جابر شخص تھا جس سے کسی بھی قسم کے رحمدلانہ احساسات کی امید رکھنا فضول تھا۔ وہ بے حسی کا چلتا پھرتا نمونہ تھا۔

دوسرے لمحے کمار نے خود کو روتے ہوئے پایا۔ آنسو تیزی کے ساتھ اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ ان پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی سی آہ نکل گئی۔

''سفید جھوٹ!'' امین نے دہرایا۔

کمار نے خود پر قابو پانے کی کوشش ترک کر دی اور سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

چند منٹ تک ایک مہیب خاموشی چھائی رہی۔

''تم نے کل روانہ ہونا تھا' یہی بات ہے نا۔'' امین نے اچانک سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' کمار نے سرگوشی کے سے لہجے میں اقرار کیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا میں تمہاری داستان کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ شخص واقعی اپنے مزاج کا ایک ہے' کمار نے خود سے کہا۔ اسے اپنے باس سے اس وقت جتنی نفرت محسوس ہو رہی تھی' پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

امین نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

''کیا آپ مدراس کے لیے نائٹ کوچ میں مجھے دو نشستیں فراہم کر سکتے ہیں..... جی ہاں..... دو کے لیے..... جی ہاں۔ میں اپنے آدمی کو ابھی بھیج رہا ہوں..... جی ہاں..... آل رائٹ۔''

سو یہ معاملہ بھی طے پا گیا۔

امین نے غور سے کمار کی طرف دیکھا۔ کمار نے نظریں نیچی کرلیں۔ یہ اب میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا ہے' کمار نے خود سے کہا۔ بالکل اسی طرح جیسے بلی کسی چوہے سے کھیلتی ہے۔

پھر وقت کو جیسے پر لگ گئے۔ ایک لمحے میں وہ ایرپورٹ پر تھے' دوسرے لمحے جہاز میں اور تیسرے لمحے مدراس میں۔ اس دوران تمام وقت امین خاموش رہا تھا۔

مینا مباکرن سے وہ ٹیکسی میں سوار ہوگئے۔ کمار ڈرائیور کو راستہ بتاتا رہا۔

اب اس شخص کو شکست ہو جائے گی' کمار نے اپنے آپ سے کہا۔ اسے پتا چل جائے گا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ سچ تھا۔ اس شخص کو اس خوشی سے محروم ہونا پڑے گا جو کمار کو جھوٹا ثابت کر کے حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کمار کو اس شخص سے اتنی نفرت ہو رہی تھی کہ اس کی خوشیوں کے ملیامیٹ کرنے کا خیال ہی اس کے لیے باعث اطمینان تھا اور اپنے خوف کے باوجود وہ اس احساس کے تصور ہی سے اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔

چنگل پٹ آ گیا۔ وہ ٹیکسی سے نیچے اتر آئے۔

ان کا استقبال کانوں میں کھانسی کے دورے کی آواز سے ہوا۔ کمار نے بمشکل تمام اپنے آنسو ضبط کیے ہوئے تھے۔ وہ کن حالات میں گھر لوٹ رہا تھا۔ یہ بھی کوئی گھر آنا ہوا۔

دروازے سے ہی اس کی ماں کی آواز آئی۔ ''کمار!'' وہ حیرت اور خوشی سے چیخ پڑی اور اسے لپک کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ پھر ایک اجنبی کو سامنے پا کر وہ قدرے جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ میرے باس ہیں' مسٹر امین۔'' کمار نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ ''یہ باپو سے ملنا چاہتے ہیں۔''

اس کی ماں نے منہ ہی منہ میں خوش آمدید کے کچھ الفاظ کہے جو واضح طور پر سنائی نہ دیے لیکن کمار کے چہرے سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ ان دونوں کو وہاں لے گئی جہاں اس کا شوہر لیٹا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے اٹھنے والی کھانسی کے دورے نے ایک بار پھر ان کا استقبال کیا۔ ایک جھلنگی سی چارپائی پر کمار کے باپو کا وجود سکڑا ہوا پڑا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ان سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی مانند تھا۔ اسے کمرے میں نو واردوں کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

کمار سے اب مزید کچھ برداشت نہ ہو سکا۔ اپنے باپو کے کمزور سے ڈھانچے کو دیکھ کر وہ بے ساختہ رو پڑا اور بستر سے لپٹ گیا۔ پھر اچانک سے پلٹا اور شعلہ بار نظروں سے امین کی طرف گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب آپ کی تسلی ہوگئی ہوگی۔''

امین نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے اور پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور وہاں سے چل دیا۔

چند گھنٹوں کے بعد کمار ہارن کی آواز سن کر حیران رہ گیا جو اس کے دروازے پر کسی گاڑی کے رکنے کے بعد بجا تھا۔ باہر نکل کر اس نے دیکھا تو ایک ایمبولینس کو دروازے پر کھڑا پایا۔

ایمبولینس سے امین نیچے اتر چکا تھا۔ کمار پر اس قدر حیرت طاری تھی کہ وہ کچھ بولنے سے قاصر تھا۔

''میں تمہارے باپو کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔'' امین نے کہا۔ کمار کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر واپس گھر میں پلٹ گیا۔ یہ امین کے لیے گھر میں آمد کا خاموش اشارہ تھا۔ اسٹریچر بردار اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور کمار کے باپو کو اسٹریچر پر لٹا کر

ایمبولینس میں لے آئے۔
وین میں سوار ہونے کے بعد کمار کو اپنے باس کے اس رویے پر شدید الجھن ہونے لگی۔ وہ اپنے باس کے اس رویے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات تو قطعی ناممکن تھی کہ امین یہ سب کچھ رحم دلی کے جذبے کے تحت کر رہا تھا۔ رحم دلی بھی امین کی کمزوری نہیں رہی تھی۔
پھر سینی ٹوریم ...... ڈاکٹرز ...... نرسیں ...... ہلکمرے۔
کمار خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کا باس تمام صورت حال کو جس انداز سے ہینڈل کر رہا تھا' وہ قابل ستائش تھی۔ اس کے باس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جاتا تھا' وہ بات اپنی جگہ درست تھی لیکن یہ اس کے باس کی خوبی تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتا' اپنی شخصیت سے سب کو مرعوب کر دیتا تھا۔ وہ اپنا کام نکالنے کا گر جانتا تھا۔
جب سب کچھ طے پا گیا اور امین تمام انتظامات سے مطمئن ہو گیا تو اس نے اپنی چیک بک نکالی۔ کمار خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
اس نے چیک بک سے ایک چیک پھاڑا اور کمار کی جانب بڑھا دیا۔ کمار نے چیک تھام لیا۔ وہ پچیس ہزار روپے کا چیک تھا۔
کمار آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس نے دوبارہ چیک پر نگاہ ڈالی۔ چیک کے ہندسے واضح اور نمایاں تھے۔ اس کی آنکھیں اسے دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔
پھر اس نے نظر اٹھا کر امین کی طرف دیکھا۔
امین کی آنکھوں میں نرمی اور شفقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ''ہاں کمار' میں جانتا ہوں' تمہیں اس بات پر حیرت ہے کہ میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہوں۔ تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر رہا ہوں۔ کیا یہی بات نہیں ہے۔''

اندازِ فکر

☆ مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے اس لئے اللہ پاک کی رحمت کے ہمہ وقت امیدوار رہیں۔
☆ وقت کو ضائع کر دینا سب سے مہنگی فضول خرچی ہے۔
☆ تیرا اپنے بھائی سے مسکرا کر بات کرنا بھی صدقہ ہے۔
☆ کسی کام میں بھی جلدی نہ کرو تا کہ پھر ''کاش'' نہ کہنا پڑے۔
☆ جو جہالت کے اندھیرے کو علم کی روشنی سے مٹاتا ہے وہ اس کے لئے ہمیشہ کے لئے نور بن جاتا ہے۔
☆ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ہاتھ سے کسی بے گناہ کو نقصان نہ پہنچے تو ''شک'' کرنا چھوڑ دو۔
☆ اگر دشمن بنانا چاہتے ہو تو اپنی برتری جتاتے پھرو اور اگر دوست چاہئیں تو دوسروں کی برتری تسلیم کرو۔
☆ کسی کا دل مت دکھاؤ، ہوسکتا ہے اس کے آنسو تمہارے لئے سزا بن جائیں۔
☆ جھوٹ بولنے سے بہتر ہے کہ سچ بولو اور ہار جاؤ۔
☆ بڑا بننے کیلئے پہلے حالات بدلنے پڑتے ہیں۔
☆ دوسروں کی عزت کرو اس سے تمہاری عزت کا قیام مضبوط ہوگا۔

کمار نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''ہاں' میں جانتا ہوں کہ تم کیا جاننا چاہتے ہو تو سنو۔ پینتیس سال قبل ایک شخص کو اس جرم میں سزا ہوئی تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کو ٹی بی سے بچانے کے لیے رقم چوری کی تھی۔ وہ شخص قید خانے میں سزا کاٹنے کے دوران مر گیا تھا۔ وہ میرا باپ تھا۔''

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

رومانہ اسے جتنا سمجھاسکتی تھی۔ سمجھا چکی تھی۔ رومانہ نے شاید ھی کوئی اچھی نصیحت' اچھی دلیل چھوڑی ھو جو اسے نہیں دی ھو۔ وہ سلمیٰ کا ساتھ دینے کے لیے کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہو رہی تھی مگر سلمیٰ کے ترلے منتوں کے آگے ھار ماننا پڑی۔

ریت کا گھر

عالیہ توصیف

اس شمارے کی ایک جذباتی کہانی

"**تھانے** میں...... ہائے میں مرگئی...... کیوں...... آپ کون ہیں کہاں سے بول رہے ہیں؟ کیا کیا ہے میری بیٹی نے...... میری بات کرائیں اس سے...... آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"ادھر مجھے فون دو۔"

توقیر صاحب نے اپنی بیگم سے فون چھینتے ہوئے کان سے لگایا۔

"کیا بکواس کر رہے ہیں آپ...... زبان سنبھال کر بات کریں۔"

"آپ لوگوں سے اپنی لڑکیاں نہیں سنبھالی جاتیں اور ہم اپنی زبان سنبھالیں۔ پہلے اپنی لڑکیوں کو لگام ڈالیں پھر بات کریں۔"

انسپکٹر نے اپنی ہتک کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے فون پٹخ دیا۔

"کیا ہوا...... کیا کہہ رہے تھے وہ......"

"مجھے تھانے جانا ہوگا۔"

توقیر صاحب' فاخرہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔

"چلو...... بیٹھو...... ادھر...... سر جی...... کہاں......"

ان کے گیٹ سے قدم باہر رکھتے ہی ایک پولیس موبائل آکر رکی اور انہیں دھکیلتے ہوئے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔

"کہاں لے جا رہے ہیں آپ لوگ...... انہیں...... میری بیٹی کہاں ہے؟...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

وہ فاخرہ کی باتوں کے دوران ہی پھرتی سے انہیں گاڑی میں بٹھا کر نکل گئے۔ فاخرہ بیگم اوران کی بڑی بیٹی شبانہ کی حالت غیر ہورہی تھی۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ دو گھنٹے دونوں خاموشی سے کمروں کے چکر لگاتی رہیں۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد پولیس موبائل کی آواز پر وہ دونوں گیٹ کی طرف لپکیں۔ پولیس کے چند سپاہیوں کے ساتھ انہوں نے توقیر صاحب اور رومانہ کو اترتے دیکھا۔ محلے کی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ آس پاس بہت چہل پہل تھی۔ محلے کے لوگوں نے اور پاس پڑوس کی عورتوں نے یہ منظر بہت واضح دیکھا تھا۔

کسی بات کے پیچھے چاہے کوئی بہت کڑوی سچائی نہ بھی پوشیدہ ہو مگر دیکھنے والی آنکھ اسی منظر سے مفہوم اخذ کرتی ہے جو اسے دکھائی دے رہا

ہو۔ چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔ سوچنے والا ذہن وہی سوچنا پسند کرتا ہے جو تصویر اسکرین پر چل رہی ہو۔

''کیا کہا ان لوگوں نے..... کہاں تھی یہ؟ کیا کیا ہے تم نے.....؟''

فاخرہ بیگم اسے دونوں بازوؤں سے جھنجوڑ رہی تھیں۔

''امی میں نے کچھ نہیں کیا ہے میرا یقین کریں..... میں قسم کھانے کو تیار ہوں..... ابو پلیز.....۔''

اس نے توقیر صاحب کو سر جھکائے کمرے میں جاتا دیکھا۔ وہ ابھی تک کالج یونیفارم میں تھی' کالج بیگ اور کتابیں صوفے پر رکھتے ہوئے اس نے ابو کی طرف جانا چاہا۔

''اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو کوئی میرے پاس نہ آئے۔''

''مگر ابو.....''

''کیا کیا ہے تم نے مجھ سے بات کرو..... باپ کا سر ندامت سے جھکا ہوا ہے' دیکھ رومانہ..... تیرے ساتھ ساتھ میں بھی مر گئی ہوں آج۔ تیرا باپ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ آخر منہ کیوں نہیں کھولتی..... کیا کر کے آئی ہو تم۔''

فاخرہ بیگم دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے سر تھامتی ہوئی صوفے پر ڈھے گئیں۔

''امی میرا یقین کریں..... میں نے کچھ نہیں کیا ہے اس سارے معاملہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ نے بھی یقین نا کیا تو میں مر جاؤں گی۔''

رومانہ ان کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

''شبانہ..... میں اللہ رسول کی قسم کھاتی ہوں'' میرا کوئی قصور نہیں ہے' ہاں میری غلطی ہے۔ ایک چھوٹی سی غلطی..... جس کی آنے والے وقت میں سزا کا سوچ کر ہی دل کانپ رہا ہے۔''

رومانہ یاں کے گھٹنوں کو پکڑے شبانہ سے فریاد کر رہی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ جس چیز کی آواز آ رہی تھی' وہ تھی ان تینوں کی سسکیاں۔

☆☆☆

''آج بڑی دیر کر دی میں سب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی' جلدی آیا کرو میری کلاس ٹھیک

ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو جاتی ہے۔''

رومانہ نے سلمٰی کو دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔

''بس یار وہ تیاری میں دیر لگ گئی۔''

''تمہیں تو روز ہی دیر لگ جاتی ہے مجھے کیوں نہیں لگتی؟ اور تم اتنا تیار کیوں ہوتی ہو' ہم کالج جاتے ہیں کسی فیشن شو میں نہیں اور آج کچھ زیادہ ہی تیار ہوئی ہو..... کیوں؟''

رومانہ اپنی فطری سادگی میں بولتی چلی جاتی۔ وہ دونوں بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھیں۔ سلمٰی اس کے گھر کی پچھلی گلی میں رہتی تھی۔ رومانہ گھر سے کچھ فاصلے پر اپنی گلی کے کونے میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرتی اور پھر دونوں ساتھ بس اسٹاپ پر جاتیں۔ دونوں ایف ایس سی پارٹ ٹو میں ایک ہی کالج سے پڑھ رہی تھیں' البتہ دونوں کے سیکشن الگ تھے۔ اسی طرح دونوں کالج سے واپس بھی ساتھ ہی آتی تھیں۔

''تیز چلو..... اتنی آہستہ کیوں چل رہی ہو' اب یہاں رک کیوں گئی ہو' پتا بھی ہے یہاں کیفے ہے صبح اس جگہ ناشتے کے لیے مردوں کا کتنا رش ہوتا ہے۔''

سلمٰی نے کیفے میں چائے پیتے نبیل کو دیکھ لیا تھا۔ نبیل بھی اسے دیکھ کر کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''وہ..... رومانہ..... میں نے تمہیں بتایا نہیں..... وہ آج..... میری ایک دوست کے بھائی نے مجھے لینے آنا تھا۔ میری دوست بیمار ہے میں اس کے گھر جاؤں گی پھر اس کا بھائی مجھے کالج ڈراپ کر دے گا۔''

سلمٰی نے نظریں چراتے ہوئے دھیرے دھیرے بتایا۔

''ہیں..... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے..... تمہاری دوست نے اپنے بھائی کو تمہیں لینے بھیج دیا اور تم بھی جانے کے لیے راضی ہو..... کیا وہ گاڑی پر آیا ہے؟''

رومانہ اپنے گھر کے ماحول کی وجہ سے بہت سادہ طبیعت رکھتی تھی۔

''نہیں..... وہ موٹر سائیکل.....''

''سلمٰی..... موٹر سائیکل..... تم ایک نامحرم کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جاؤ گی۔ نہیں..... منع کر دو اسے..... تمہاری دوست کی طبیعت بہت خراب ہے تو کالج سے واپسی پر ہم دونوں ساتھ چلے جائیں گے اسے دیکھنے۔''

''نہیں وہ..... اس نے کالج میں داخلے کے لیے فارم جمع کرانا ہے۔ میں نے وہ لینا ہے اس سے' اس لیے ملنا ضروری ہے۔''

رومانہ نے بے تاثر چہرے سے اسے دیکھا۔ کوئی سلمٰی سے یہ پوچھے کہ کالج میں اس وقت کون سے داخلے ہو رہے ہیں؟ اور فارم اس کا بھائی اسے لا کر کیوں نہیں دے سکتا تھا' اس کے لیے اس کا دوست کے بھائی کے ساتھ جانا کیوں ضروری تھا۔ رومانہ شک میں ضرور پڑ گئی تھی وہ کچھ کہنے ہی والی تھی جب نبیل ان کے قریب آ گیا۔

''السلام علیکم۔''

اس نے گہری نظروں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

''آپ کی سہیلی بھی ہمارے ساتھ چلے گی؟''

نبیل نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یہ بس پر جائے گی..... ہم.....''

''نہیں سلمٰی بھی میرے ساتھ بس پر جائے گی میں اکیلے کالج نہیں جاتی..... سلمٰی اور میں آپ کی بہن کو ملنے شام کو امی کے ساتھ آئیں گے۔''

رومانہ بہت نیک لڑکی تھی۔ وہ سلمٰی کی باتوں پر یقین کر چکی تھی مگر اس کی چھٹی حس اسے کسی غلطی کی طرف بھی اشارہ کر رہی تھی۔

''میری بہن.....''

نبیل نے ماتھے پر بل ڈالے۔

''نہیں رومانہ میں نے کہا نا...... میں دوسرے پیریڈ تک کالج آجاؤں گی تم بس پر چلی جاؤ...... میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے وہ انکار کررہی ہے میرا۔''

سلمٰی نے پھر وہی بات دوہرائی۔ رومانہ نے دونوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بے فکر رہیں میں آپ کی سہیلی کو خیریت سے کالج چھوڑ دوں گا۔''

اس بار نبیل نے مداخلت کی۔ رومانہ ابھی بھی سلمٰی کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو پڑھنا چاہتی تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی البتہ خاموشی سے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ اس نے دو قدم چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا' وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر وہ تیز قدم اٹھاتی بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگی۔ اس نے دوسرے پیریڈ کے بعد سلمٰی کو کالج کی ہر متوقع جگہ پر دیکھ لیا لیکن وہ کالج میں ہوتی تو نظر آتی۔ چھٹی سے کچھ پہلے بھی اس نے سلمٰی کو دیکھنا چاہا۔ اس نے سلمٰی کی کلاس میٹ سے پتا کیا جس کا جواب سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

''وہ تو آج کالج آئی ہی نہیں۔''

اگلے دن رومانہ کے پہنچنے سے پہلے ہی گلی کے کونے پر سلمٰی اس کا انتظار کررہی تھی۔ رومانہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ سلمٰی کو اندازہ تھا کہ وہ ایسا ہی ردعمل دکھائے گی۔ وہ اسے مناتی رہی۔ جھوٹی سچی طرح طرح کی کہانیاں گھڑتی رہی۔

''تم نے کہا تھا میں کالج آجاؤں گی لیکن تم کالج کیوں نہیں آئی پھر؟''

رومانہ کا غصہ زیادہ دیر نہیں رہ سکا۔

''یار رومانہ...... وہ میں اپنی دوست کے گھر بھی نہیں گئی...... میری ہمت نہیں ہوئی اس کے ساتھ جانے کی...... تمہارے جانے کے بعد میں واپس گھر چلی گئی تھی۔ میرا یقین کرو۔''

رومانہ کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوا تھا جب اس نے کچھ دیر بعد اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''رومانہ...... میں تمہیں ایک بات سچ سچ بتانا چاہتی ہوں...... لیکن پہلے وعدہ کرو تم میرے سچ میں میرا ساتھ دو گی۔ ایک اچھی ہمراز بنو گی۔''

''کیا بات......؟''

رومانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ...... ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں...... آں...... آں...... تم یہ نا سمجھنا اس دن میں نے تم سے جھوٹ بولا...... وہ دوست والی بات بھی صحیح ہے...... نبیل میری دوست...... نازیہ کے بھائی ہیں۔''

سلمٰی نے رومانہ کے کچھ بولتے بولتے بات پکڑ کر کہا۔

''لیکن سلمٰی...... اگر وہ شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ طریقہ صحیح نہیں ہے نا تمہارے لیے نا اس کے لیے یہ رستہ صرف بدنامی کی طرف جاتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے والدین کو بھیجے...... وہ۔''

''ہاں اسی سلسلے میں تو وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کل بھی ہم کوئی بات نہیں کر سکے' میں اپنے گھر چلی گئی اور وہ اپنے کام پر۔ اگلے منگل کو وہ چاہتا ہے کہ ہم کالج کے سامنے والے فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں اس سے ملیں۔ صرف ایک بار۔''

سلمٰی بڑی بے خوفی سے اسے بتارہی تھی۔

''ہم...... ہم سے مطلب؟......''

''تم اور میں...... دیکھو رومانہ میں اکیلے اس سے ملنے نہیں جاسکتی۔ تم میری سہیلی ہو تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے صرف ایک بار...... کی تو بات ہے۔ پلیز......''

وہ التجائیہ نظروں سے رومانہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''سلمٰی..... مجھے سمجھ نہیں آرہا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں..... یہ سب صحیح نہیں ہے۔ میرے گھر والے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بہت عرصے سے جانتے ہیں تمہارا اور تمہارے گھر کا یہ مزاج اور تربیت نہیں ہے اور نا ہی میرے گھر کا کہ ہم صبح کالج کا بول کر کسی ریسٹورنٹ میں چلے جائیں۔ ہمارے ماں باپ ہم پر اعتماد کرتے ہیں تو ہمیں ان کے اعتماد کو بحال رکھنا چاہیے۔ اگر تم میں اتنی ہی دلچسپی رکھتا ہے تو سیدھا طریقہ اپنائے' ملنے ملانے کی بات کیوں کرتا ہے؟ اور تمہاری دوست اسے پتا ہے یہ سب کچھ؟ جانتی ہو اسے پتا چلے گا تو اس کے دل کو کتنی ٹھیس پہنچے گی۔ نا وہ اپنے بھائی کے ساتھ انصاف کر پائے گی اور نا اپنی دوست کے ساتھ۔ تمہاری اس سے دوستی بھی ختم ہو جائے گی۔ دوستی کا رشتہ اور بہن بھائی کی محبت کا رشتہ دونوں ہی بہت مقدس اور قابل احترام ہوتے ہیں۔ تم انہیں پامال کرنے کا اسباب پیدا نہ کرو۔''

رومانہ کو اس وقت جو سمجھ آیا وہ اس نے کہہ دیا۔ سلمٰی وقتی طور پر خاموش ہوگئی مگر اگلے دن پھر وہی بات چھیڑ دی۔

''ایک دن ملنے سے کیا ہوتا ہے صرف تھوڑی دیر کی تو بات ہے' ہم جلدی واپس آجائیں گے' تم جلدی اٹھ جانا وغیرہ وغیرہ۔''

رومانہ اسے جتنا سمجھا سکتی تھی۔ سمجھا چکی تھی۔ رومانہ نے شاید ہی کوئی اچھی نصیحت' اچھی دلیل چھوڑی ہو جو اسے نہیں دی ہو۔ وہ سلمٰی کا ساتھ دینے کے لیے کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہو رہی تھی مگر سلمٰی کے ترلے منتوں کے آگے ہار ماننا پڑی۔

''میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے راضی تو ہوگئی ہوں مگر کان کھول کر سن لو یہ پہلی اور آخری بار ہے اس کے بعد تم اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھو گی۔ وہ اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجتا ہے تو ٹھیک ہے نہیں بھیجتا تو اپنے گھر والوں کے فیصلے کو مقدم سمجھو۔''

رومانہ اپنی کتابیں بیگ میں ڈال رہی تھی۔

''تمہارے لیے کہنا آسان ہے میرے لیے نہیں۔ مجھے اس سے محبت ہے..... میں.....''

''دیکھو یہ محبت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہوتی' فضول چکروں میں مت پڑو اور پڑھائی پر توجہ دو۔''

رومانہ نے سلمٰی کی بات کو اچکتے ہوئے کہا۔

''ہنہ..... تم کیا جانو..... سچ سچ بتانا کیا تمہیں کسی سے محبت نہیں ہے۔''

سلمٰی گھاس نوچ رہی تھی۔

''دیکھو سلمٰی..... محبت کچھ نہیں ہوتی صرف غرض اور ضرورت ہوتی ہے جسے ہم لوگ محبت کا نام دے دیتے ہیں۔ ہم میں.....''

''تو گویا تم محبت کے جذبے پر یقین نہیں رکھتیں؟''

اس بار سلمٰی نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''دیکھو پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ مجھے اس طرح سرعام محبت نبھانے یا محبت کرنے کی اجازت ہو۔ دوسری بات یہ کہ میں محبت پر یقین رکھتی ہوں مگر صرف شادی کے بعد کی محبت پر جو میں اپنے شوہر سے کروں گی اور تمہیں بھی ایسا ہی ذہن بنانا چاہیے۔ اسی میں ہم لڑکیوں کی بھلائی ہے۔''

رومانہ نے طویل دلیل دی۔

''اور اگر نظر میں کوئی سما جائے تو؟''

سلمٰی کہاں ہار ماننے والی تھی۔

''اسی لیے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم ہے۔ نہ نظر اٹھے گی نہ پڑے گی' نہ مشکل ہوگی۔''

رومانہ نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں بہت خوبصورت بات کہہ دی۔ خوبصورت بات کہنے

کے لیے اس کو سننے والا بھی خوبصورتی کو پرکھنے والا ہونا چاہیے۔

''سنو..... رومانہ وہ..... وہاں نبیل کا ایک دوست بھی..... آیا ہوا ہوگا..... وہ دراصل..... وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے..... پلیز..... رومانہ..... تم تھوڑی دیر اس سے بات کر لینا۔ وہ تمہارے لیے بہت سنجیدہ ہے بقول نبیل کے وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

ریسٹورنٹ جانے کے لیے کالج گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے سلمٰی نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے..... تم اچھی طرح جانتی ہو میری بات چیت پکی ہو چکی ہے' میرے تایا کے بیٹے سے..... اگلے چند ماہ میں میری منگنی ہے اور تم پھر بھی۔''

رومانہ بہت برہم ہو رہی تھی۔

''یار بات چیت سے کیا ہوتا ہے' وہ سائڈ پر چلتی رہنے دو اور نبیل کے دوست کو بھی ساتھ ساتھ رکھو۔''

سلمٰی نے عجیب عامیانہ انداز میں بولا۔

''سلمٰی..... تم اس حد تک..... تمہیں کیا ہو گیا ہے..... نہیں بالکل نہیں' میں تمہارے ساتھ بالکل نہیں جاؤں گی اور آج کے بعد تمہاری اور میری دوستی بھی ختم۔ تم اب سمجھنے سمجھانے کی ہر حد پار کر چکی ہو۔ کچھ تو اپنے والدین کی عزت کا خیال رکھو۔ ہم سے ہونے والی ذرا سی اونچ نیچ سے معاشرے کی دوسری لڑکیاں متاثر ہوتی ہیں۔ جو واقعی پڑھنا چاہتی ہیں مگر والدین انہی وجوہات کی بنا پر انہیں علم کے حق سے محروم رکھتے ہیں۔'' رومانہ کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

''اچھا اپنا لیکچر بند کرو اور پلیز ناراض نہ ہو۔''

اس کے بعد رومانہ کو راضی کرنے کے لیے سلمٰی کو ایک بار پھر کئی جتن کرنے پڑے۔ وہ اوور ہیڈ برج کراس کر کے دو طرفہ ٹریفک کی سڑک کے اس پار پہنچ گئی تھیں۔ مطلوبہ ریسٹورنٹ کالج کے سامنے کچھ سائیڈ پر تھا۔ نبیل اور اس کا دوست پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔ کالج کی چھٹی ہو چکی تھی اور کالج کے باہر لڑکیوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ سب اپنی اپنی مطلوبہ روٹ کی بس کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ اندر اے سی نے ماحول قدرے خوشگوار کیا ہوا تھا۔ دیو قامت گلاس کی دیواروں سے باہر کی گرمی اور اسٹاپ پر کھڑی لڑکیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔ اس ریسٹورنٹ میں ان کی طرح اور بھی بہت سے کپلز بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ انہیں بیٹھے تین منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ سلمٰی کو کچھ یاد آیا اور وہ چونکی۔

''اوہ..... رومانہ..... یار..... وہ سامنے اسٹاپ پر ماریہ کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے اپنا کیمسٹری کا جرنل دینا تھا۔ میں نے اس کا کچھ کام کاپی کرنا ہے' کل آخری تاریخ ہے میں بس ابھی آئی اس سے جرنل لے کر۔''

وہ آناً فاناً وہاں سے نکل گئی پیچھے رومانہ مگر مگر ہی کرتی رہ گئی۔ نبیل اور اس کے دوست نے اسے بیٹھنے کو کہا اور اسے تسلی دی کہ وہ ریسٹورنٹ کے سامنے تک ہی تو گئی ہے ابھی آ جائے گی۔ رومانہ اسے دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسٹاپ پر کھڑی تین لڑکیوں میں سے ایک سے محوِ گفتگو تھی۔

''چلو اٹھو..... پکڑو انہیں بیرونی گیٹ بند کر دو کوئی جانے نہ پائے..... ات مچائی ہوئی ہے ان لوگوں نے معاشرے میں..... پکڑو انہیں سب کو پکڑو گاڑی میں ڈالو..... اٹھو بی بی' لے چلو انہیں بھی۔''

سلمٰی کے باہر نکلتے ہی سپاہیوں سے بھری پولیس موبائل داخل ہوئی اور سب کو پکڑنے لگی۔ یہ ایک کمرشل علاقہ تھا یہاں دو تین بینک بھی تھے جن کے ملازمین کی بہت شکائتیں آ رہی تھیں کہ وہ لنچ آور پر بہت دیر تک باہر رہتے ہیں۔ دوسری

طرف کالج کی پرنسپل کو بھی بہت سی شکائتیں موصول ہورہی تھیں کہ کالج کی بہت سی لڑکیاں مشکوک سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ کالج اور بینک یونین نے مل کر قریب قریب کے چند معروف اور مصروف ترین ریسٹورنٹس میں چھاپہ ڈلوادیا۔ لیڈی کانسٹیبل اسے ان دونوں لڑکوں کے درمیان ہی پکڑے کھڑی تھی' اخباری رپورٹر مزے سے تصویریں لینے میں مصروف تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا پانسا ہی پلٹ گیا' ایک لمحے میں کیا سے کیا ہوگیا' وہ منہ سے ایک لفظ نہیں بول سکی وہ قصوروار تھی یا نہیں تھی۔ اس کا ان سے تعلق ہے یا نہیں کچھ بھی نہیں۔ بولنے کی مہلت ہی کب دی گئی کسی کو۔ پولیس پکڑ پکڑ کر سب کو گاڑی میں ڈال رہی تھی۔ گاڑی میں چڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا صرف اندھیرا۔

''شہر کے معروف کالج کی بہت سی لڑکیاں بینک ملازمین کے ساتھ لنچ ٹائم میں ڈیٹ مارتے ہوئے پکڑی گئیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ کالج پرنسپل نے ان تمام طالبات کے نام کالج سے خارج کردیئے ہیں۔ طالبات کالج کا کہہ کر..... طالبات کے والدین..... ذمہ داری..... ان والدین کی ہے.....''

اگلے دن کی اخبار میں بہت سی تفصیلات کے ساتھ پکڑے جانے والوں کی تصویریں اور نام شائع کیے گئے تھے۔ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گھر میں کوئی اس سے کلام نہیں کر رہا تھا۔ باپ کل سے کمرے میں بند تھا۔

''بہن سنا ہے رومانہ کے ان دونوں لڑکوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ رومانہ ایسی لگتی تو نہیں۔''

''ہاں بہن اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے اور بھی بہت سے لڑکوں کے ساتھ دوستیاں ہیں۔ تو قیر صاحب تو اتنے نیک نمازی ہیں..... کچھ تو اپنے باپ کا خیال کرتی۔''

''فاخرہ سنا ہے اس کو کالج سے بھی نکال دیا ہے۔ ظاہر ہے بدکردار لڑکی کو کون کالج میں رکھنا پسند کرتا ہے۔ لگتا تو ایسے ہی تھا کہ یہ سیدھا کالج جاتی ہوگی مگر..... توبہ.....''

اگلے کئی دن تک وہ محلے کی عورتوں کی میٹھی میٹھی باتیں سہتی رہیں۔ کتنا آسان ہوتا ہے نا ہمارے معاشرے میں لڑکی پر کیچڑ اچھالنا۔ کتنا مزہ آتا ہے ہمارے معاشرہ کو ایسی کسی بھی بات کو مزے لے لے کر بڑھا چڑھا کر کرنے میں۔ ایسی باتیں کرتے وقت ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ ایک بیٹی کے متعلق لغویات بول رہے ہیں تو ایک بیٹی گھر میں بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ اتنی دیدہ دلیری سے کسی پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ اس بیٹی کی جگہ اگر ان کی اپنی بیٹی ہوتی تو.....؟ یا ان کی بیٹی بھی ہوسکتی تھی۔ خوف خدا کب ہمارے دل دہلا کر ہمیں باز رہنے پر مجبور کرے گا۔ آخر کب.....؟

''کیا کہا شیراز کے گھر والوں نے؟''

فاخرہ بیگم ایک امید کے ساتھ لپکی تھیں۔

''انہوں نے رومانہ کے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔''

''اف..... میرے خدا..... اب کیا ہوگا؟''

فاخرہ بیگم بیڈ پر ڈھے گئیں۔

''اب..... اکرم شاہ..... سے بات کرنی ہوگی مجھے۔''

''اکرم..... عرف اکو..... آپ کا وہ غریب ان پڑھ رشتہ دار جو عمر میں دس سال بڑا ہے اور ویلڈنگ کرتا ہے۔ جس کا رشتہ آنے پر آپ نے انہیں بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا۔''

فاخرہ بیگم بے چینی سے کھڑی ہوگئیں۔

''ہاں وہی..... اس وقت مجھے بیٹی پر مان تھا..... اعتماد تھا..... میری رگوں میں دوڑنے والا خون تھی وہ..... میرے جگر کا حصہ تھی۔ میں.....''

تو قیر صاحب کپکپاتی آواز اور نم آنکھوں

کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

''صفیہ خالہ آئی تھیں..... میری اور..... ملمان کی منگنی توڑ گئی ہیں۔ سنا تم نے..... میری صحت ادھوری رہ گئی..... تمہاری وجہ سے میرا ابھی کالج جانا چھوٹ گیا ہے۔ جہاں جاؤ سب باتیں کرتے ہیں' مجھ سے سوال کرتے ہیں۔ کس کس کا سامنا کروں میں۔ پھر کہتی ہوں' میں نے کچھ نہیں کیا' میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''کس کس کو فریب دوگی یہ باتیں کر کے بولو..... برائی کرنے والا ہی برا نہیں ہوتا برائی کا ساتھ دینے والا بھی اتنا ہی برا ہوتا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہم سب کی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ ہنہ.....''

رومانہ کی بڑی بہن شبانہ کے آنسو اور نشتر جیسے لفظ اسے بہت تکلیف دے رہے تھے۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے رو رو کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر سب کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا دلا کر تھک چکی تھی۔ وہ گھنٹوں ماں کے گھٹنوں میں بیٹھ کر گڑگڑاتی رہتی' واسطے سوال دیتی' قسمیں کھاتی مگر وہ بھی کیا کرتی۔ اعتماد بہت بڑی قوت رکھتا ہے اور جب اعتماد ہی ٹوٹ جائے تو سب بکھر جاتا ہے۔ وہ رونے پر آتی تو گھنٹوں روتی ہی چلی جاتی۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس کی یہ حالت اسی طرح چلتی رہتی اگر مدیحہ ایک دن صبح صبح اس کے گھر نہ آجاتی تو..... مدیحہ اس کے ساتھ آرٹ اسکول میں پینٹنگ کا کورس کر رہی تھی۔ پچھلے پندرہ دن کی غیر حاضری اور فون بند ملنے پر وہ اس کے گھر چلی آئی۔ وہ اصرار کرنے لگی کہ آج اس کے ساتھ انسٹیٹیوٹ چلے۔ رومانہ کے بتانے کے باوجود کہ وہ اب مزید کورس جاری نہیں رکھ سکے گی۔

''یار پلیز..... تم بات تو بتاؤ کیوں چھوڑ رہی ہو پینٹنگ..... یہ کام سیکھنا تو تمہارا ایشن تھا۔ سر اقبال عالم بھی تمہارے کام کی اتنی تعریف کیا کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں صرف تم ہی ایک مایہ ناز آرٹسٹ بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ سر بھی تمہارے لیے بہت فکرمند تھے پوچھ رہے تھے کہ تم کیوں نہیں آرہی کم از کم ایک بار تو چلو..... پلیز.....''

مدیحہ کے ایسے اصرار کرنے سے وہ ایک ٹک باندھے کچھ سوچنے میں مصروف تھی۔ پھر اچانک ہی ایک نئی امنگ اور جذبے سے اٹھتی ہوئی بولی۔

''ٹھیک ہے..... میں چلتی ہوں..... مجھے رستے میں کچھ اور بھی کام ہے' ویسے بھی میری کچھ چیزیں انسٹیٹیوٹ میں پڑی ہوئی ہیں وہ لینی ہیں اور ایک نامکمل پینٹنگ بھی جسے کوشش کروں گی کہ مکمل ہو جائے۔'' وہ پچھلے کئی دنوں سے گویا گھر میں قید تھی۔ خود اس کا بھی دل بھی نہیں چاہا کہ وہ کہیں جائے اور نا ہی گھر والوں نے ایسا چاہا کہ وہ اب گھر سے قدم باہر نکالے۔ اس نے بہت سے واسطے سوال ڈال کر مدیحہ کے ساتھ جانے کے لیے ماں کو راضی کیا۔

''تمہارے پاس صرف تین گھنٹے ہیں۔ باپ کے گھر آنے سے پہلے گھر آجانا..... ورنہ انجام تم خود جانتی ہو۔''

گھر سے نکلتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے ماں کی آواز سنی۔

''اف..... رومانہ یہ حالت تو دیکھو تم نے کیا بنائی ہوئی ہے۔ تمہارے چہرے پر تو ہمیشہ اتنی فریشنیس اتنا چارم ہوتا ہے اور آج دیکھو جیسے کسی ماتم سے آئی ہو۔''

''مدیحہ مجھے ایک دو ضروری کام ہیں..... تم پلیز..... انسٹیٹیوٹ پہنچو' میں کام نمٹا کر آجاؤں گی۔''

رومانہ نے مدیحہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اسے یہاں آئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا' وہ ستے چہرے اور بجھی آنکھوں کے ساتھ سر اقبال عالم کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

''پلیز..... رومی..... آپ میری سب سے چہیتی..... آرٹسٹ ہو' کیا بات ہے مجھے بتاؤ..... پلیز.....۔''

وہ اکثر پیار سے اسے رومی کہہ جاتے تھے۔ اس کو اپنے ضبط پر اختیار نہیں رہا وہ سب دھیرے دھیرے بتاتی گئی۔

''آپ کو پتا ہے سر میں شیراز سے مل کر آرہی ہوں' میرا ہونے والا منگیتر..... اس نے میری جتنی توہین کی ہے میں الفاظوں میں بیان نہیں کر سکتی..... کوئی کسی کو ایسے بھی دھتکار سکتا ہے۔ اس کی نظروں میں میری اب کوئی وقعت نہیں رہی۔ میں ان دونوں آدمیوں سے بھی ملی ہوں' دونوں بینک کے ملازم تھے۔ نبیل کا جو دوست مجھ میں انٹریسٹ تھا وہ بھی صرف ٹائم پاس والی کہانی نکلا..... اس نے مجھے شیراز سے بھی زیادہ ٹکا جواب دیا ہے۔ اس کی کم تعلیم' محدود آمدنی اور متوسط خاندان کے باوجود میں اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں مگر وہ..... وہ..... مجھے بد کردار کہتا ہے جواب تک درجنوں لڑکیوں کو..... بے وقوف بنانے میں مہارت حاصل کر چکا ہے۔ میرے گھر والے جس سے میری شادی پر آمادہ ہو چکے ہیں اس سے بہتر ہے وہ مجھے اندھے کنویں میں پھینک دیں۔ سر..... آپ.....''

''سر نہیں..... آج سے صرف اقبال کہو..... مجھ سے شادی کرو گی؟''

رومانہ بولتے بولتے پلکیں جھپکنا بھی بھول گئی تھی۔ وہ حیرانی سے ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں رومانہ..... مجھ سے..... مجھے محبت ہے تم سے..... کیا تم نے کبھی محسوس نہیں کی..... میں..... تمہیں یہ پیشکش بہت عرصے سے کرنا چاہ رہا تھا مگر ڈرتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ کینوس اور رنگوں کی نظر کر دیا۔ میں اکیلا رہتے رہتے تھک گیا ہوں پلیز..... مجھ میں اور میری بنائی جانی والی پینٹنگز میں رنگ بھر دو..... پلیز.....۔''

رومانہ کی حیرت ابھی بھی برقرار تھی۔ اس کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ یہ رشتہ اتنی آسانی سے قبول کر لیا جائے گا۔ وہ اس سے عمر میں پندرہ سال بڑے تھے۔ جو بھی تھا والدین کو اس کی ناکردہ غلطی اچھی طرح یاد تھی۔ وہ مہینے کے اندر اندر رومانہ اقبال عالم بن گئی ملک کے نامور مصور کی خوبصورت کم عمر بیوی۔ غربت کے ساتھ کم عمری اور خوبصورتی ہو اس پر کوئی مجبوری آجائے تو فرشتہ انسان بھی مجبوری خریدنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس نے اپنی ادھوری پینٹنگ کو دیکھا جسے لینے کے لیے وہ آئی تھی اور خود رکھ لی گئی تھی۔ کینوس پر ڈوبتے سورج کے آگے دھکتی لہروں کے ساتھ آدھا ڈوبا ہوا اور آدھا بکھرا ہوا ریت کا گھر.....

وہ فطرتاً بہت کینہ پرور اور گھٹیا انسان ثابت ہوا۔ یہ بات اسے شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی پتہ چل گئی۔ وہ اس کی کم عمری اور خوبصورتی کو استعمال کرنا چاہتا تھا..... کہ وہ اس کی بات مان لے اس کے جائز و ناجائز کاموں میں اس کا ساتھ دے؟ اس کے مزموم مقاصد میں اس کو سپورٹ کرے؟ اس کے علاوہ اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا یا پھر وہ اپنے والدین کے گھر چلی جائے۔ یہ عیش یہ عشرت' بنگلہ گاڑی' مال دولت سب چھوڑ دے پھر سے فقیری پر آجائے کسی ویلڈر کی بیوی بن جائے یا پھر ساری عمر والدین کی دہلیز پر اپنی ناکردہ غلطی کی سزا میں بال سفید ہونے کا انتظار کرے؟ وہ اپنے آپ کو بہادر ثابت نہیں کر پائی بہت جلد ہار مان گئی۔

اقبال عالم شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ پیسے کی ریل پیل ہونے لگی۔ وہ ایک کے بجائے بہت سے آرٹ اسکولوں کا مالک ہوگیا۔

☆☆☆

''چلو بی بی بیٹھو گاڑی میں..... لگاؤ ہتھکڑی اسے..... شرم نہیں آتی..... شوہر کو قتل کر دیا۔''

''میں نے قتل نہیں کیا ہے..... میری بات کا یقین کریں..... پلیز..... چھوڑیں مجھے.....۔''

''پکڑو..... گاڑی میں ڈالو.....''

ایک بار پھر وہی منظر تھا ویسی ہی پولیس تھی۔ آس پاس دیکھنے والے ویسے ہی تماشائی تھے۔ وہی رومانہ تھی جسے لیڈی کانسٹیبل ہتھکڑی لگائے پولیس وین میں دھکیل رہی تھی۔ یہاں بھی دیکھنے والی آنکھ اسی نظر سے معنی اخذ کر رہی تھی جیسا اسے دکھائی دے رہا تھا۔

''ملک کے نامور مصور کا دن دھاڑے قتل۔ قتل کے شبہ میں ان کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مزید تحقیقات جاری ہیں۔''

اگلے دن کے اخبار رومانہ اور اقبال عالم کی تصویروں اور شہ سرخیوں سے بھرے پڑے تھے۔

''میرا یقین کریں..... میں نے قتل نہیں کیا ہے..... پلیز..... آپ لوگ ایک بار پھر مجھے جھوٹا گردان رہے ہیں۔ اس وقت آپ لوگوں نے مجھ پر یقین نہیں کیا تھا میں در بدر ہوگئی تھی۔ اس بار میرا ساتھ نا دیا تو میں..... پھانسی.....۔''

رومانہ سلاخوں کے پیچھے ایک بار پھر اسی طرح اپنے والدین سے فریاد کر رہی تھی۔ وہ اگلے دن عدالت کے کٹہرے میں بھی کھڑی اسی طرح اپنی بے گناہی کی یقین دہانی کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''قتل..... میں نے کیا ہے.....''

ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑوں میں' نفاست کے ساتھ سر سے پیر تک سفید چادر اوڑھے' دراز قد پروقار شخصیت کی حامل خاتون کی طرف بھری عدالت کی ہر آنکھ ایک ساتھ متوجہ ہوئی تھی۔

''میں اقبال عالم کی سابقہ بیوی' مکمل ہوش وحواس میں یہ بیان دیتی ہوں کہ قتل میں نے کیا ہے۔ عمر کے اس دور میں آج یہ جس مصور کی قاتل کی حیثیت سے کھڑی ہے' اس عمر میں ایک وقت مجھ پر بھی ایسا ہی آیا تھا کہ میں اپنی عدالت میں کھڑی ہوئی تھی۔ مجھ سے بھی اقبال عالم نے وہی کچھ کہا تھا جو رومانہ اقبال نے سنا ہوگا۔ میں نے بھی اس کو سچ جانا تھا۔ عورت واقعی ناقص عقل رکھتی ہے' کبھی تو مرد کے فطری فریبوں کو پرکھ نہیں سکتی۔ میں بھی نہیں پرکھ سکی۔ جب حقیقت کھلی تو میں نے اسے تسلیم کرنے اور ماننے سے انکار کر دیا۔ اسلام کہتا ہے شوہر کی فرمانبرداری کرو۔ اس کی اطاعت کرو مگر ایسی اطاعت جو اللہ اور رسول ﷺ کے بنائے گئے قوانین کی توہین کرتی ہو وہ کسی بھی قیمت پر قابل قبول نہیں ہونی چاہیے۔ ایسی اطاعت جو عورت کے نام' وقار اور مرتبے کی توہین بن جائے' جو عورت کی حرمت اور مقام پر حرف بن جائے۔ اچھی آرام طلب' عیش و عشرت سے مزین زندگی گزارنا ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے' لیکن ایسی خواہش کی تکمیل کے لیے آلہ کار بننا اور زندگی کے محض چار دن کے سکھ و آرام کی خاطر اپنی آخرت خراب کر لینا کہیں کا منشور نہیں۔ میں نے اقبال عالم کو چھوڑ دیا اس وقت جب ہماری بیٹی لیزا صرف سات ماہ کی تھی۔ اس سخت گیر انسان نے سزا کے طور پر مجھے طلاق کے حق سے محروم رکھا۔ اس کا یہ ستم بھی سہہ لیا۔ گناہ کے راستے سے بچ کر نکلنا اور نیکی کے راستے پر ثابت قدم ہونے میں آزمائشیں تو آتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آزمائشیں ابھی باقی ہیں۔ میں نے ساری زندگی غربت میں تنگ دستی میں' زمانہ کے نرم گرم رویہ کو سہتے ہوئے اپنی اور اپنی بیٹی کے لیے صرف عزت کی دو روٹی حاصل کرنے

میں گزار دی۔ میں چاہتی تو میں ان تمام سہولیات اور آسائشوں میں رہ سکتی تھی جن میں رہنے کے لیے رومانہ نے شوہر کی فرمابرداری کا مکمل ثبوت دیا ہے مگر کیوں؟..... کیوں جج صاحب کیوں؟ میں بھی اسی معاشرے کی عورت ہوں جس کی رومانہ ہے۔ میرے سامنے بھی مسائل اسی طرح منہ کھولے کھڑے تھے۔ مجھے بھی اپنی اگلی اور پچھلی زندگی کے کئی بار موازنے کرنے پڑے میرا بھی دل ڈولا تھا کئی بار ڈولا تھا..... مگر میں..... نفس کو قابو کرنے میں کامیاب رہی۔ عورت کی تخلیق تو خدا نے ایک ہی مٹی سے کی ہے اس کے سینے میں دل بھی ایک جیسا ہی دھڑکتا ہے پھر عورت عورت میں فرق کیوں آجاتا ہے؟ ایک عورت..... کسی غلط قدم سے صرف اپنے وقار کا ہی گلا نہیں گھونٹتی بلکہ ہر عورت کو ایسا لیبل فراہم کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے سے اگر اس قسم کی عورتوں کا خاتمہ ہو جائے تو کسی مرد کی جرأت نہیں ہے کہ وہ کسی عورت کو غلط کام کے لیے اکسا سکے۔ اگر ایک عورت ذلت کی زندگی سے عزت کی موت کو ترجیح دے تو دنیا کا کون سا مرد ہے جو اسے اس امر سے باز رکھے گا۔ برائی کرنے والا ہی برا نہیں کہلاتا برائی کا ساتھ دینے والا بھی اتنا ہی برا ہوتا ہے۔''

اس کی اس بات سے رومانہ کے کانوں میں کئی برس کہے جانے والے اس کی بہن کے جملے گونجے۔

ہمارے معاشرے کے بدلتے ہوئے رویے' رجحانات' مفلسی' غربت نے ایک عجیب طرح کی نفسانفسی پیدا کر دی ہے۔ جس کے تحت پیسے کو ہی سب کچھ مان لیا گیا ہے چاہے وہ حرام زریعہ سے آئے یا حلال سے' اور اس دوڑ میں یقیناً حرام کا رستہ ہی ہر کسی کو سہل لگتا ہے۔ میری بدقسمتی کہ اسی دوڑ کا شکار میری بیٹی بھی ہو گئی۔ میری اچھی تربیت اس خون کے اثر پر حاوی ہو گئی جو اس کی رگوں میں اقبال عالم کے روپ میں دوڑتا تھا۔ رومانہ کے عروج کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اقبال عالم ایک گرا ہوا انسان تھا لیکن اتنا گرا ہوا کہ وہ اپنی بیٹی..... وہ صرف..... ابھرتے سورج کو سلام کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لیزا اس کی بیٹی ہے اور نا ہی لیزا اپنے باپ کے نام کام اور اس کی شکل سے واقف تھی۔ میں مانتی ہوں یہاں میری غلطی ہے مجھے اسے سب بتا دینا چاہیے تھا لیکن..... صد شکر کہ مجھے یہ سب وقت پر پتا چل گیا' مجھے اقبال عالم کے ساتھ قتل اپنی بیٹی کو بھی کرنا چاہیے تھا مگر میں اتنی بہادر نہیں بن سکی۔ آپ بتائیں جج صاحب قصور وار کون ہے مرد یا عورت؟ وہ مرد جو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے عورت کو غلط راستے دکھاتا ہے یا وہ عورت جو مرد کی باتوں میں آکر ایسے راستوں کی مسافر بنا قبول کر لیتی ہے۔ بتائیے جج صاحب..... کیا کسی کے پاس جواب ہے؟ ایک چھوٹی سی غلطی ایک چھوٹا سا قدم چاہے وہ مرد نے اٹھایا ہو یا عورت نے صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ اس کی ذات سے منسلک بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کا گھر اس کا خاندان' اس کا شہر اور سارا معاشرہ..... بتائیے جج صاحب..... میں مجرم ہوں یا وہ مقتول.....؟''

پوری عدالت سانس روکے اس کی بات سن رہی تھی اس کے ایک حرف حرف میں سچائی تھی۔ جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہر حال وہ مجرم تھی اس نے قتل کیا تھا۔

رہائی پانے کے بعد عدالت سے گھر آکر رومانہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی اوٹ سے اسے اپنی ادھوری پینٹنگ دکھائی دی۔

سورج کی دہکتی لہروں کی زد میں آیا۔ آدھا ڈوبا آدھا بکھرا ریت کا گھر.....!

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

سہاگ کی قیمت

آغا دلاور

ٹھیک اسی وقت اتفاق سے ایک اور دیہاتی وہاں سے گزرا۔ اس نے بوڑھے کسان کی موت کا دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اشرف نے جب لات بوڑھے کے سینے پر ماری تھی تو وہ ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا تھا..... بوڑھے کے زمین پر گرتے ہی وہ مسافر اپنے سفر پر روانہ ہوگیا تھا.....!

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

انسان جب اپنے اصولوں کو سچے دل سے پیار کرنے لگتا ہے اور جب وہ ان اصولوں پر چلنے کا صدق دل سے ارادہ کرلیتا ہے تو اس کی نگاہوں میں سچائی' ایمانداری اور نیک نیتی کی ایک پگڈنڈی پھیلتی چلی جاتی ہے جس پر چل کر وہ انسانی عظمت کی بلند ترین چوٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ جب اصولوں کی سچائی اس کے دل میں جاگتی ہے تو دنیا کی ہر چیز اس سچائی کے آگے اسے ہیچ نظر آنے لگتی ہے پھر وہ بڑی سے بڑی سلطنت تک کو ٹھوکر مار دیتا ہے۔ سچائی کے لیے وہ اپنے عزیزوں' رشتہ داروں یہاں تک کہ اپنی اولادوں تک کی پروا نہیں کرتا۔ حق جب انسان کے اندر کے باطل کو شکست دے کر اسے زندگی کی ایک نئی لذت سے آشنا کرتا ہے تو دنیا کی تمام آسائشیں

اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں' گویا وہ ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہے لیکن اپنے اصولوں سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ سچائی پر عمل کرنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہی انسان کے دل میں اس کی اصولوں کی محبت جاگتی ہے اور یہ محبت اس میں ایک نئی روح' نئی طاقت اور نئی ہمت پیدا کر دیتی ہے۔

مغلوں کی شان و شوکت جاہ و جلال اور درباری ٹھاٹ باٹ اس وقت کی آب و ہوا میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ پورے ہندوستان چھوٹے بڑے راجہ مہاراجہ اور حاکم شان و شوکت جاہ و جلال کے اور رنگینیوں کے بہاؤ میں بہہ کر اپنی اپنی حکومتوں میں مغلوں کے رعب اور دبدبے کے سائے بکھیرنے لگے تھے۔

چودھویں صدی کی جوانی کے زمانے نے جاہ و جلال کی شان اپنے سینے میں سنبھال کر پورے ہندوستان کے اوپر جیسے گل مہر کی چادر بچھا رکھی تھی جب اس زمانے کے سر پر سفید بالوں کی لکیر دکھائی دینے لگی اور اس کی جوانی بڑھاپے کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہی تھی اور اس وقت ہندوستان کی ایک ریاست گجرات پر سلطان احمد شاہ حکومت کر رہا تھا۔ اس وقت گجرات ایک آزاد ریاست تھی اور احمد شاہ ایک خود مختار حکمران تھا۔ احمد شاہ اپنی حکومت کو اس وقت کے تغلق بادشاہ کی حکومت کے برابر سمجھتا تھا' اس کی کوشش یہی رہی کہ وہ کسی طرح دہلی کے تخت کو ہڑپ کر لے۔ اس نے اپنی کوششوں سے گجرات کی ریاست کو ہندوستان کی تمام ریاستوں سے ممتاز بنا رکھا تھا۔

گجرات کے تخت پر سلطان احمد شاہ براجمان تھا اور اس کی حکومت کی بھرپور جوانی چاروں طرف کے علاقوں میں کشش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ گجرات اس زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ فن کاروں اور ہنرمندوں کو وہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا' لوگ دوسری ریاستوں سے وہاں تحصیل تعلیم کے لیے آتے تھے..... سلطان احمد شاہ ایک قدر دان حکمران تھا' اس کی قدر دانی کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ دور دور رہنے والے قدر دان اور ہنرمند وہاں کھنچے چلے آتے تھے۔

صرف یہی نہیں بلکہ سلطان احمد شاہ کے دربار میں انصاف کا ڈنکا بھی اتنے زور و شور سے بج رہا تھا کہ اس کی آواز گجرات سے نکل کر آس پاس کے علاقوں سے آگے تک سنائی دیتی تھی۔ اس کے انصاف کے آگے دہلی کے دربار کا انصاف بھی ماند پڑ گیا تھا۔ سلطان احمد شاہ کے انصاف کی نگاہوں میں بڑے سے بڑے درباری اور برے سے برے افسر کی حیثیت ایک عام سے آدمی کی حیثیت کے برابر تھی۔ وہ امیر اور غریب کو ترازو کے ایک ہی پلڑے میں رکھنے کا عادی تھا۔ لوگ اپنے سلطان کو جس قدر نرم دل اور انصاف پسند سمجھتے تھے' اتنی ہی ان کے دلوں میں اس کی دھاک بھی بیٹھی ہوئی تھی' ذات پات اور اونچ نیچ کا کوئی فرق اس کی نگاہوں میں نہیں تھا' یہ فرق اس کی آنکھوں میں انگارہ بن کر چمکتا تھا..... وہ ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھنے کا عادی تھا۔

سلطان احمد شاہ کی ایک ہی بیٹی تھی اور اپنی اکلوتی اولاد سے وہ بے حد محبت کرتا تھا..... ایک طرف تمام دنیا کی محبت تھی اور دوسری طرف اس کی بیٹی کا پیار تھا۔ شہزادی کے چہرے پر وہ ذرا بھی اداسی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ کر وہ دنیا کو الٹ پلٹ کر دینے کا جذبہ رکھتا تھا۔ شہزادی اس کی آنکھوں کا نور اور اس کے دل کا سرور تھی۔ وہ اگر جسم تھا تو اس کی بیٹی اس جسم کی روح تھی۔ بیٹی کے معاملے میں وہ ایک مشفق اور ہمدرد باپ تھا' اسی لیے اس نے اپنی پیاری بیٹی کی شادی بھی اپنے عزیز بھتیجے سے کی تھی۔

سلطان احمد شاہ اپنے اس بھتیجے سے بھی بے

حد محبت کرتا تھا اور یہ محبت تو شادی کے بعد اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ بھتیجا تو تھا ہی لیکن شہزادی سے شادی کے بعد وہ سلطان احمد شاہ کا داماد بھی بن گیا تھا' اس لیے سلطان احمد شاہ اسے پہلے سے بڑھ کر چاہنے لگا تھا۔

ایک دن سلطان کا داماد اشرف اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلنے کے ارادے سے نکلا۔ اسے شکار کا بے حد شوق تھا۔ جنگل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کی تلاش میں گھومتے گھومتے اچانک اس کی نظر ایک ہرنی پر پڑی جو چھلانگیں لگاتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر کر جھاڑیوں میں غائب ہوئی تھی۔ اشرف نے فوراً ہی اپنا گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔

وہ منجھا ہوا شکاری اور عمدہ گھڑ سوار تھا' اس لیے وہ ہرنی اس کے ہاتھ سے نکلنے میں کامیاب تو نہیں ہو سکی لیکن اس نے اشرف کو اتنا بھگایا کہ وہ اس کے تعاقب میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا لیکن اشرف کو اس بات کا علم اس وقت ہوا' جب اس نے ہرنی کا شکار کرنے کے بعد اسے گھوڑے کی پیٹھ پر لادا اور واپس جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا تھا۔ گھنے اور گہرے اندھیرے میں جنگل کے راستے اب اپنا چہرہ چھپانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اشرف اپنی چھاؤنی تک پہنچنے کے لیے جلدی جلدی اس گھنے جنگل سے نکل جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو ادھر ادھر دوڑاتا بھگاتا جھاڑیوں سے باہر تو نکل آیا لیکن اسے وہ راستہ دکھائی نہیں دیا جو اس کی چھاؤنی کی طرف جاتا تھا۔ ابھی وہ آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے کچھ فاصلے پر ایک بوڑھے دیہاتی کو جلدی جلدی ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ بوڑھا پیدل چل رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں کپڑے کی ایک پوٹلی تھی۔ اشرف چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا پھر دوسرے ہی پل اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر اس نے اس بوڑھے کا راستہ روک لیا۔ بوڑھے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو اشرف نے اسے اپنے ساتھ چلنے اور چھاؤنی کا راستہ بتانے کے لیے کہا۔ اس کے لہجے میں التجا نہیں بلکہ حکم تھا.....

بوڑھے کسان نے ایک بار پھر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے اشرف کی طرف غور سے دیکھا اور اس کے شاہی لباس کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ چمکتے دمکتے لباس کو دیکھ کر وہ تاڑ تو جان ہی چکا تھا کہ گھوڑے سوار نوجوان ضرور کوئی شاہی افسر ہے' اس نے اشرف سے کہا۔

''نوجوان..... آپ کا تعلق شاہی کاندان سے ہے' یہ بات مجھے آپ کے لباس سے معلوم ہو چکی ہے لیکن اس وقت میں ایک ضروری کام سے یہاں سے پانچ گاؤں دور جا رہا ہوں' وہاں آج رات میرا پہنچنا بے حد ضروری ہے۔''

بوڑھے کی زبان سے یہ عذر سن کر اشرف کی بھویں تن گئیں۔ اس نے بڑے غصے سے بوڑھے کی طرف دیکھا اور بولا۔

''بوڑھے کسان' ہم دونوں میں سے اس وقت زیادہ ضروری کام کس کا ہے۔ اس کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ میں گجرات کے سلطان احمد شاہ کا داماد ہوں' یہ بات اگر تم نہیں جانتے ہو تو اب جان لو۔ میں راستہ بھول گیا ہوں اور تمہارا پہلا فرض یہی ہے کہ تم مجھے میری چھاؤنی تک پہنچا دو۔''

بوڑھے کے چہرے پر پہلے ہی اداسی چھائی ہوئی تھی وہ کسی ذہنی کرب سے دوچار دکھائی دے رہا تھا۔ اشرف کی یہ بات سن کر اس کی آنکھوں میں اپنی مجبوریوں کے آنسو جھلملانے لگے۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا۔ ''نوجوان شہزادے' تمہیں تو اپنی چھاؤنی میں جانا ہے' جبکہ مجھے تو اپنی بیٹی کے جنازے میں شریک ہونا ہے اگر مجھے دیر ہو گئی تو میں اپنی مرحوم بیٹی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکوں گا' لوگ اسے دفنا دیں گے..... بہتر تو یہ ہے کہ اس

وقت تمہیں مجھ غریب کی مدد کرنی چاہیے۔''

''کیسی مدد.....'' نوجوان اشرف غصے سے بولا۔

''اپنا گھوڑا مجھے دے کر تم میری مدد کر سکتے ہو شہزادے..... تاکہ میں پانچ گاؤں کی طویل مسافت طے کر کے اپنی بیٹی کے جنازے میں شریک ہو سکوں۔'' بوڑھا کسان نہایت عاجزی سے بولا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' اشرف نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ ''اگر میں تمہیں اپنا گھوڑا دے دوں تو کیا میں اپنی چھاؤنی تک پہنچ سکوں گا جہاں میرے ساتھی میرے منتظر ہیں۔''

''تو پھر اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اپنے گھوڑے پر بیٹھا کر مجھے میری منزل تک پہنچا دو..... شہزادے' تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' بوڑھے کسان نے ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر اشرف کی منت کی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کی سفید داڑھی میں جذب ہو گئے' لیکن جوانی کے جوش میں اشرف ایک بوڑھے مجبور اور غریب باپ کے احساسات اور اس کے جذبات کو سمجھ نہیں سکا' اس کے آنسو دیکھ کر بھی اسے رحم نہیں آیا..... بوڑھے کسان نے اس سے اس کا گھوڑا مانگ کر گویا اس کی بے عزتی کی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ غصے سے سرخ ہو گیا اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے بوڑھے کسان کے سینے پر ایک زوردار لات ماری اور چیخ کر بولا۔ ''نالائق بدتمیز' مجھ سے میرا گھوڑا مانگتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آئی۔''

بوڑھے کسان کا دل تو بیٹی کی موت کے صدمے سے دوچار تھا ہی اس لیے نوجوان شہزادے کی لات لگتے ہی اس کا کمزور اور ناتواں جسم زمین پر گر کر بکھر گیا۔ نیچے گرتے ہی اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور پھر ایک ہچکی کے ساتھ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ دیا۔

ٹھیک اسی وقت اتفاق سے ایک اور دیہاتی وہاں سے گزرا۔ اس نے بوڑھے کسان کی موت کا دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اشرف نے جب لات بوڑھے کے سینے پر ماری تھی تو وہ ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا تھا..... بوڑھے کے زمین پر گرتے ہی وہ مسافر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا تھا..... اسی کے ذریعے بوڑھے کسان کے رشتے داروں اور گاؤں والوں کو اس بات کا علم ہوا کہ سلطان احمد شاہ کے نوجوان داماد اشرف نے اس بوڑھے کا قتل کیا ہے۔

بوڑھے کی لاش جنگل سے اٹھانے کے بعد گاؤں والوں نے قاضی شہر سے فریاد کی۔ سارے حالات سننے کے بعد قاضی شہر نے اشرف کو اپنی عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا..... قاضی شہر کا حکم پاتے ہی اشرف عدالت میں حاضر ہو گیا اس دن عدالت میں مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر قاضی شہر کی عدالت کے اندر اور باہر موجود تھا مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ اشرف پر بوڑھے کسان کے رشتے داروں نے جو الزام عائد کیا تھا۔ اسے اشرف نے تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ بے شک غصے اور جنون کی حالت میں اس نے بوڑھے کسان کو لات ماری تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ بوڑھا اتنی جلدی مر بھی سکتا ہے..... اس نے قاضی شہر کے سامنے اپنا جرم قبول کر لیا تھا..... اشرف کے اقرار جرم کے بعد کسی گواہ کو بلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

قاضی شہر نے ملزم کے اقرار جرم کے بعد اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا ''چونکہ شہزادے اشرف کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور اس نے کسی دباؤ کے بغیر خود اپنے جرم کا اقرار کیا ہے اس لیے وہ مجرم ہے..... اس نے ایک بوڑھے کسان کا خون کیا ہے۔ اس لیے شہزادے اشرف کو اس قتل کے جرم میں سزائے موت کا حکم دیا جاتا ہے۔'' قاضی شہر اپنا فیصلہ سنایا اور محافظوں نے اشرف کو اپنے

گھیرے میں لے لیا۔

سلطان کے داماد کے لیے موت کی سزا کا حکم سن کر لوگ دنگ رہ گئے اور عدالت میں سناٹا چھا گیا..... مرنے والے بوڑھے کسان کے جوشتے دار اپنی فریاد لے کر قاضی شہر کی عدالت میں آئے' ان کو اس بات کی توقع ہی نہ تھی کہ بادشاہ وقت کے داماد کو اس عدالت سے اتنی کڑی سزا بھی مل سکتی ہے۔ انہوں نے تو کبھی گمان بھی نہ کیا تھا کہ اشرف کو قاضی شہر موت کی سزا دے گا۔ قاضی شہر کا حکم سن کر ہر ایک چہرے پر ہیبت سی چھا گئی۔ وہ سب اس بات سے ڈر گئے کہ اگر قاضی شہر کے اس فیصلے اور ان کی طرف سے کی گئی فریاد کا علم سلطان احمد شاہ کو ہوگیا تو مرنے والے کا پورا خاندان موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور ان کے ساتھ قاضی شہر کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

مرنے والے بوڑھے کسان کے رشتے دار اس خوف سے کانپنے لگے اور ہاتھ جوڑ کر قاضی شہر کے پیچھے بھاگے انہوں نے قاضی شہر سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ''سرکار..... ہم اپنی فریاد واپس لینا چاہتے ہیں' ہمارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہے مگر ہم شہزادے کی موت کے خواہاں نہیں ہیں' انہیں اس بھیانک سزا سے بری کر دیا جائے۔''

''لیکن عدالت فیصلہ دے چکی ہے' اب عدالت کچھ نہیں کر سکتی..... معافی کا حق اب صرف بادشاہ وقت کو ہے۔'' شہر قاضی نے جواب دیا۔ ''نہیں' آپ یقیناً کوئی راستہ نکال سکتے ہیں جس سے شہزادے کی جان بچ جائے..... ہمیں انصاف مل چکا ہے' حکومت کے عدل و انصاف کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔'' بوڑھے کسان کے رشتے داروں میں سے ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''بے شک' گجرات کے سلطان کا انصاف دہلی کی سلطنت سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے' ہم نے شکایت ضرور کی تھی لیکن سرکار ہم نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ سلطان کے داماد کو موت کی سزا دی جائے۔ ہم تو یہ بھی نہیں چاہتے کہ شہزادے کا بال تک بیکا ہو..... ہم آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ اسلامی قانون کی رو سے مرحوم کے خون کا بدلہ خون کی قیمت ادا کر کے بھی دیا جا سکتا ہے۔ شہزادہ ہمیں اس خون کی جو بھی قیمت ادا کرے گا' وہ ہمیں منظور ہے۔ یہی ایک راستہ ہے سرکار جس سے شہزادے کی جان بچ سکتی ہے۔''

یہ سن کر قاضی شہر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ مگر بات یہ نہیں تھی کہ شہزادے کی نجات کا یہ راستہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ سزائے موت کا حکم سناتے وقت قانون کی رو سے انصاف اور خون بدل کی یہ دلیل اس کے ذہن میں تھی کہ اگر مقتول کے عزیز و اقارب مجرم سے خون کی قیمت وصول کرنے پر رضامند ہو جائیں تو مجرم موت کی سزا سے بچ سکتا ہے لیکن قاضی شہر ابھی تک اس لیے خاموش تھا کہ اگر یہ دلیل اس کی جانب سے فریادی کو پیش کی جاتی تو لوگوں کو یہ گمان ہو جاتا کہ قاضی شہر شہزادے کی طرف داری کر رہا ہے اور انصاف کے تقاضوں سے آنکھیں چرا رہا ہے' اسی لیے خود فریادی کی زبان سے خون بدل کی قیمت کا سن کر اسے راحت سی محسوس ہوئی تھی..... کیونکہ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ مجرم اشرف کو موت کی سزا دی جائے اور سلطان احمد شاہ کی بیٹی کو بھری جوانی میں بیوہ ہونے پر مجبور ہونا پڑے۔

قاضی شہر نے مرحوم کسان کے رشتے داروں کی اس عرضی پر توجہ دی اور کافی دیر تک اس مسئلے پر بحث کرنے کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگوں کو تحریری طور پر یہ لکھ کر دینا ہوگا کہ آپ لوگ اپنی خوشی سے مرحوم کے خون کی قیمت وصول کر رہے ہیں اور ایسا کرنے پر آپ کو کسی نے بھی مجبور نہیں کیا ہے' نہ ہی حکومت کی جانب سے آپ پر کوئی دباؤ ڈالا گیا ہے.....

کیا آپ ایسا کریں گے۔''

''کیوں نہیں سرکار۔'' مرحوم کے رشتے داروں میں سے ایک نے کہا۔ ''ہم حلفیہ طور پر یہ تحریری بیان دینے کے لیے تیار ہیں کہ ہمیں حکومت کی جانب سے پورا پورا انصاف ملا ہے..... ہم اس کے شکر گزار ہیں اور یہ فیصلہ ہم اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے کر رہے ہیں۔''

''تو پھر یہ فیصلہ بھی آپ کو خود کرنا ہوگا کہ آپ اپنے عزیز کے خون کی کیا قیمت شہزادے سے وصول کرنا چاہتے ہیں۔''

قاضی شہر نے کہا۔ ''آپ لوگ آپس میں طے کرلیں اور پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کردیں تاکہ آپ کی درخواست پر غور کیا جاسکے۔''

مرحوم کسان کے رشتہ دار آپس میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ بے چارے سیدھے سادے لوگ تو پہلے ہی شہزادے کی سزائے موت کے فیصلے سے خوف زدہ تھے۔ انہیں تو اپنے عزیز کے خون کی کوئی قیمت بھی نہیں چاہیے تھی..... وہ سب اس بات پر متفق ہوچکے تھے کہ قدرت کو یہی منظور تھا' بوڑھے کسان کی موت ہونی ہی تھی جس کے لیے شہزادے اشرف کی لات ایک بہانہ بن گئی تھی..... لیکن ان کے ساتھ مجبوری یہ بھی تھی کہ خون بدل کی اس درخواست میں انہیں مجرم کی حیثیت دیکھ کر قیمت کی مانگ کرنی تھی' اس لیے کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے شہزادے سے صرف سونے کی دوسو اشرفیاں طلب کیں..... مجرم شہزادہ اشرف یہ سن کر بے حد خوش ہوا لیکن اپنی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اسے صرف دوسو اشرفیوں کا جرمانہ انتہائی حقیر لگ رہا تھا۔ اسے لگا کہ دیہاتی فریادیوں نے اس سے اتنی معمولی رقم کا مطالبہ کرکے اس کی شان و شوکت اور اس کی شاہی حیثیت کا مذاق اڑایا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے قاضی شہر سے کہا۔

''دوسو اشرفیوں کی رقم تو میرے لیے انتہائی معمولی رقم ہے۔''

''یہی ان کا مطالبہ ہے اور وہ اتنی ہی رقم پر خوش ہیں۔'' قاضی شہر نے مغرور شہزادے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ان کے اس مطالبے پر ہم گھٹانے یا بڑھانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔''

''کچھ بھی ہو لیکن میں پانچ سو اشرفیوں سے کم دینے پر ہرگز تیار نہیں ہوں..... یہ میری شان کے خلاف ہے کہ ایک معمولی آدمی کی طرح میں صرف دوسو اشرفیوں کا جرمانہ ادا کروں۔'' شہزادے اشرف نے بڑے فخر سے یہ بات کہی۔

''لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا شہزادے۔'' قاضی شہر نے ایک بار پھر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''درخواست میں دوسو اشرفیوں کی مانگ کا تذکرہ ہوچکا ہے اور عدالت اسے تسلیم کرچکی ہے۔''

قاضی شہر کے لاکھ سمجھانے کے باوجود ضدی شہزادہ ٹس سے مس نہیں ہوا' وہ بدستور اپنی ضد پر قائم رہا کہ وہ دوسو اشرفیوں کے بجائے پانچ سو اشرفیاں ہی دے گا..... دوسری جانب مرحوم کے عزیز اتنی بڑی رقم لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ اگر انہوں نے اپنے مطالبے کو بڑھا دیا تو حکومت کا عتاب ان پر ضرور نازل ہوگا اور وہ سلطان احمد شاہ کے قہر و غضب سے ہرگز ہرگز نہیں بچ سکیں گے..... دونوں فریقین اپنی اپنی ضد پر قائم تھے۔ مرحوم کے رشتہ داروں کا انکار ضدی شہزادے کی انا کو اور بھی بھڑکا رہا تھا۔

مجبوراً قاضی شہر کو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے اس مقدمے کو سلطان احمد شاہ کے سامنے پیش کرنا پڑا..... قاضی شہر نے سلطان احمد شاہ کو لکھا کہ شہزادے اشرف پر قتل کا جرم ثابت ہوچکا ہے اور اس نے خود اس جرم کا اقرار کرلیا ہے..... لیکن شریعت کے مطابق فریق ثانی نے خون کی قیمت لے کر مقدمے کو ختم کرنے کی درخواست میری عدالت میں پیش کی ہے..... مرحوم کے رشتہ دار

اس کے خون کے عوض دوسو اشرفیاں مانگ رہے ہیں جبکہ شہزادہ اشرف اس حقیر رقم کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر دوسو کے بجائے پانچ سو اشرفیاں دینا چاہتا ہے جسے لینے کے لیے وہ لوگ تیار نہیں ہیں کیونکہ انہیں اس سے زیادہ رقم درکار ہی نہیں ہے..... معاملہ دونوں کی ضد کے درمیان پھنس کر رہ گیا ہے اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ آپ خود کریں۔ گجرات کے سلطان احمد شاہ کے سامنے جب اس مقدمے کے کاغذات پیش ہوئے تو محل کے اندر کہرام مچ گیا..... شہزادی نے اپنے باپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن سلطان احمد شاہ نے اپنی بیٹی کی اس خواہش کو رد کرتے ہوئے حکم دیا کہ جب تک اس مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا' وہ محل کی بیگمات اور اپنی بیٹی یا کسی بھی عزیز سے ملاقات نہیں کر سکتا۔

سلطان احمد شاہ کو یوں لگ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی پیاری بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور جذبات کی رو میں بہہ کر انصاف کا خون کر بیٹھے' اسی لیے اس نے اپنی بیٹی کے علاوہ محل کے ہر اس شخص سے ملنے سے انکار کر دیا تھا جو اس قسم کی سفارش کر کے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر سکتا تھا..... اشرف کے مقدمے کے تمام کاغذات کو سلطان احمد شاہ نے بڑے دھیان سے دیکھا' کئی کئی بار اس نے پوری روداد پڑھی اور کئی بار نئے نئے پہلوؤں سے اس پر غور کیا۔ اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کی گہری لکیریں پھیلتی چلی گئیں۔ اس نے فوراً ہی قاضی شہر کو اپنے روبرو حاضر ہونے کا حکم دیا۔

سلطان احمد شاہ قاضی شہر سے سخت ناراض تھا۔ جب قاضی شہر اس کے روبرو حاضر ہوا تو اس نے کہا۔ ''ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم نے جس شخص کو انصاف کی کرسی پر بٹھایا ہے' وہ ہرگز اس عہدے کے لائق نہیں ہے۔''

''ناچیز آپ کا مطلب نہیں سمجھا' عالیجاہ.....'' قاضی شہر بوکھلا کر بولا۔ سلطان احمد شاہ کے چہرے پر غصے کی جھلک دیکھ کر وہ کانپ گیا' اسے لگا کہ اس نے چونکہ سلطان کے داماد اشرف کو مجرم قرار دے کر سزائے موت سنائی ہے' شاید یہی بات سلطان کو ناگوار گزری ہے..... اس خیال کے آتے ہی اس نے سر جھکا کر دست بستہ عرض کیا۔ ''جہاں پناہ آپ کا انصاف پورے ملک میں اپنا ڈنکا بجا رہا ہے۔ آپ کے عدل و انصاف کا دور دور تک شہرہ ہے..... مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے آپ کے بھتیجے اور داماد کے مقدمے میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیا تو مجھے آپ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے گا' اسی لیے میں نے شہزادے کے مجرم ثابت ہونے پر کسی امتیاز کے بغیر فیصلہ دیا ہے..... تاکہ آپ کے عدل و انصاف پر کوئی حرف نہ آئے۔''

''خاموش۔'' سلطان احمد شاہ گرج اٹھا۔ ''تم نے انصاف سے ذرا بھی کام نہیں لیا ہے..... تم نے مجرم کو سلطان کا بھتیجا اور اس کا داماد سمجھ کر اس کی طرف داری کی ہے..... تم نے انصاف کا خون کیا ہے قاضی شہر۔''

''نہیں عالیجاہ۔'' قاضی شہر خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ ''شہزادے کا گناہ اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا اور اس نے خود کسی دباؤ کے بغیر اپنے جرم کا اعتراف کیا ہے' اسی لیے میں نے خون کے بدلے خون کی سزا اس کے لیے تجویز کی تھی لیکن جب شہزادہ اس خون کی قیمت ادا کرنے اور مرحوم کے رشتے دار اس کی قیمت لینے کے لیے تیار ہو جائیں..... تو پھر مجھے تو شریعت کے مطابق اس بات پر عمل کرنا ہی چاہیے۔''

''بس۔'' سلطان احمد شاہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''شریعت کے اس نکتے کا فائدہ اٹھا کر ہی تو تم نے شہزادے کی طرف داری کی ہے اور انصاف کی آبرو کو پامال کیا ہے۔''

''یہ سراسر الزام ہے عالیجاہ! میں نے ایسی کوئی طرف داری نہیں کی جس سے آپ کے انصاف پر دھبا لگ جائے۔'' قاضی شہر ذرا ہمت کر کے بولا۔ ''شریعت میں خون کی قیمت کو قانونی حیثیت حاصل ہے' دونوں فریقین اگر راضی ہو جائیں تو مقدمہ ختم ہو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر قاضی شہر نے اس نکتے کی جانب سلطان احمد شاہ کی توجہ دلائی تھی لیکن سلطان احمد شاہ اس کی بات مکمل ہوتے ہی بول پڑا۔ ''ہمیں پتا ہے لیکن تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ تمہارے اس فیصلے سے ریاست کے امیر امراء اور دوسرے دولت مند لوگوں کو کتنا فائدہ پہنچے گا۔ میری غریب رعایا کی زندگی کتنے خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس طرح تو ہر دولت مند اور ذی حیثیت شخص اپنے سے کمتر اور غریب آدمی کو جان سے مار دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا..... دولت کے بل بوتے پر امرا جب چاہے کسی کی زندگی چھین لیں گے اور اس کی زندگی کی قیمت ادا کر کے باعزت بری ہو جائیں گے تمہارے اس فیصلے سے ایسے لوگوں کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا اور یہ بھیانک جرم اتنا عام اور آسان ہو جائے گا کہ بات بات پر ہماری زمین پر غریبوں کا خون بہنے لگے گا..... قاضی شہر سنو' ہمارے نزدیک ہمارے بھتیجے یا ہمارے داماد کی زندگی ہماری رعایا کے لاکھوں لوگوں کی زندگی سے زیادہ پیاری نہیں ہے..... اس لیے ہم خون کی اس قیمت ادا کرنے والے فیصلے کو رد کرتے ہیں..... بوڑھے کسان کے قتل کے جرم میں شہزادہ اشرف کو سزائے موت ہی ملنی چاہیے۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے..... صرف یہی ہیں بلکہ ہمارے اس فیصلے پر عمل کے لیے تاخیر بھی نہیں ہونی چاہیے..... اس سزا پر آج ہی عمل ہونا چاہئے' یہ ہمارا فرمان ہے۔''

''بہتر ہے عالیجاہ!'' قاضی شہر نے کہا۔

''اور سنو سزا کے بعد شہزادے کی لاش کو شہر کے بڑے دروازے پر لٹکا دیا جائے تاکہ ریاست کے دوسرے لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا ہو' وہ درس عبرت حاصل کریں اور قتل ایسے بھیانک جرم کی بھیانک سزا کو نظرانداز نہ کریں..... شہزادے کی لاش دو دن تک شہر کے پھاٹک پر لٹکتی رہنی چاہیے۔'' اتنا کہہ کر سلطان احمد شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چلا گیا۔

شہزادہ اشرف کو اسی وقت قتل گاہ کی طرف لے جایا گیا..... سلطان کے اس فیصلے سے محل کے اندر ایک شور برپا تھا' ایک قیامت مچی ہوئی تھی..... سلطان احمد شاہ کی بیٹی کو جب اپنے باپ کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی اپنے باپ سلطان احمد شاہ کے پاس پہنچی اور گڑگڑاتے ہوئی بولی۔

''سلطان عالم..... میرے پیارے ابا جان..... میرا سہاگ.....'' بیٹی کی آہ وزاری سن کر سلطان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن یہ آنسو گجرات کے سلطان کے آنسو نہیں تھے' یہ ایک انتہائی مہربان' مشفق اور ہمدرد باپ کے آنسو تھے جو اس وقت انصاف کی سب سے اونچی کرسی پر بیٹھا تھا..... اس نے اٹھ کر اپنی بیٹی کو اپنے گلے لگایا اور بولا۔ ''بیٹی تمہارا سہاگ مجھے عزیز ہے لیکن اس سے بھی زیادہ عزیز مجھے میرا انصاف ہے۔ تمہارا سہاگ تو میری رعایا کے خون کی ایک بے حد معمولی قیمت ہے..... صبر کرو' بیٹی..... صبر کرو میں تمہارے سہاگ کو بچا کر اپنے انصاف کا خون نہیں کر سکتا تھا۔''

گجرات میں جب ایسے انصاف کا بول بالا تھا تو اس وقت دہلی میں انصاف کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ وہاں انصاف تو بہ توبہ کر رہا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے بادشاہ تغلق شاہ کی حکمرانی اور اس کی بادشاہی صرف پانچ مہینے اور اٹھارہ دنوں میں ہی ختم ہو گئی۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

چھ سر ادھر گھومے' چھ جوڑی آنکھیں اسی طرف مرکوز ہوگئیں اور مس ایملیا کو محسوس ہوا کہ اسے جنگ کے لیے قوتیں مجتمع کرنی ہوں گی۔ اس لڑکی کی عمر بیس بائیس سال ہوگی۔ اس کا جسم تو بھرا ہوا تھا مگر چہرہ کسی بچی جیسا تھا اور اس نے اپنے پرکشش بدن کی نمائش پر توجہ بھی دے رکھی تھی۔

محمد اکبر

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

مس ایملیا سج ویگ اس ڈبے میں تھی جس میں تمبا کو نوشی ممنوع تھی۔ اس نے نشست پر بیٹھنے کے بعد اپنا ہینڈ بیگ ایک طرف رکھا پھر اس نے وہ کتاب کھولی جو وہ لائبریری سے لائی تھی اور جنگ کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔ اس کے دشمنوں کی تعداد کم نہ تھی۔ گھٹنے دبانے والے' کندھے مارنے والے' ٹکرانے والے' دھکا دینے والے' مس ایملیا کو ان کا خیال آیا تو اس کے اندر نفرت کا لاوا پھوٹنے لگا۔ اس نے اس نوجوان کو گھور کر دیکھا جو اس کے پہلو میں خالی جگہ پر بیٹھنے کے لیے بڑھا تھا۔ ایملیا کی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور دوسری طرف چلا گیا۔ مس ایملیا اب کسی دوسرے حملے کے لیے منتظر تھی۔

یہ حملہ ایک خاصے فربہ جسم والے ایسے شخص کی طرف سے نمودار ہوا جس نے پرانی وضع کا سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر باؤلنگ ہیٹ تھی' جوتے پالش سے چمک رہے تھے' اس کے چہرے پر تشویش کھدی ہوئی تھی' بیٹھتے ہی اس نے حرکت کرنے میں دیر نہیں کی۔ یہ حملہ سہ طرفہ تھا۔ پہلے اس کا چوڑا شانہ مس ایملیا کے کندھے سے مس ہوا پھر اس کا ایک گھٹنا ایملیا کے گھٹنے سے بغل گیر ہوا پھر اس کے ہاتھ نے ایملیا کے جسم کو ٹرین کے جھٹکے کی طرح دھکا دیا۔ مس ایملیا کے ہونٹ بھنچ گئے اس نے کتاب کو مضبوطی سے پکڑا' حملہ آور کے شانے کا ایک اور دباؤ برداشت کیا۔ گھٹنے کے ایک اور مس کو نظر انداز کیا' اس کے بعد اس نے جوابی کارروائی کا آغاز کیا۔

''مسٹر۔'' اس کی آواز بلند ہوئی۔ آواز اتنی تیز تھی کہ سامنے بیٹھے افراد نے اپنے اپنے اخبار ہٹا کر اس کی سمت دیکھا۔

''برائے کرم اپنی حرکتوں سے باز رہیں۔''

اس کے مخاطب نے اسے خاصی حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کے گول پر گوشت چہرے پر ایک رنگ سا پھیلنے لگا۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اس کے چشمے کے پیچھے موجود آنکھیں پٹ پٹائیں۔ مس ایملیا نے دوسرا وار کیا۔

''میں نے کہا اپنی حرکات سے باز رہیں۔''

''مگر.....'' وہ بڑبڑایا۔ سب کے ساتھ یہ انداز مشترک تھا۔ ''مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا..... میں قسم.....''

''جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ بس شرافت سے بیٹھیں۔''

مزید کچھ کہنا فضول تھا۔ اس نے کتاب دوبارہ کھول لی۔ دوسرے اسٹیشن پر وہ آدمی فوراً ہی ڈبے سے اتر گیا' خاصی سراسیمگی کے ساتھ۔

ایملیا کے بالکل سامنے ایک نوعمر لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بہت تنگ اور اونچا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں' وہ خاصی خوش شکل تھی۔ مس ایملیا نے اس کی پھیلی ٹانگوں کی طرف جلتی نظروں سے دیکھا۔ ان میں نفرت بھری ہوئی تھی۔ ایملیا کے دائیں جانب بیٹھا جوان شخص بے شرمی سے لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔

مس ایملیا کو اپنے باپ کی یاد آئی جو بے حد سخت آدمی تھا۔ ایک بار اسی طرح پیروں کی نمائش پر اس نے' ایملیا کی اچھی طرح پٹائی کی تھی۔ اسے یاد آیا کہ کسی لڑکے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرا دی تھی۔ پتا نہیں کیا نام تھا اس کا..... اس کے باپ نے گھر پہنچ کر اس کی اچھی طرح خبر لی تھی۔ یہ اس کے باپ ہی کی تربیت کا اثر تھا' اسی نے اسے سکھایا تھا کہ یہ دنیا برے آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان سے کس طرح نمٹنا چاہیے۔

مس ایملیا تب سے اب تک یہ جنگ لڑے جا رہی تھی۔ شیطان نڈر نہیں' اس کی فوج ضرور بڑی تھی مگر مس ایملیا کو آج تک کبھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ بے شک اس پر بے شمار حملے ہوئے تھے۔ بے شمار' دھکے' جھٹکے' ٹکراؤ' مگر ان سے اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ خدا نے اسے ایک صحت مند بدن دیا تھا مگر وہ ایسی نہ تھی کہ لوگوں کے جذبات جگا سکتی۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ اس وقت اس کی عمر پچاس سال ہو رہی تھی مگر وہ محفوظ تھی۔ کنوار پن' ایک منجمد صفت بن چکا تھا۔ معصومیت اس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی اور اس کے اندر بھری ہوئی نفرت کی آگ اسے گرم رکھتی تھی۔

اٹھتے ہوئے اسے اس نوجوان کے اوپر تھوڑا جھکنا پڑا جو سامنے والی لڑکی کی ٹانگوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس پر تھوک دے۔

حسد کسی آتش فشاں کی طرح اس کے اندر پھٹ پڑا تھا۔

☆☆

مس ایملیا نے جہاں جہاں ملازمتیں کی تھیں'

اس کے آقاؤں کی قسمیں متنوع تھیں۔ اس کی محنت' شارٹ ہینڈ میں اس کی مہارت' اس کی ٹائپنگ پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا تھا مگر آقا بہرحال آقا ہوتے ہیں۔ وہ کسی ملازم کی طرف سے کسی تنقید کو بھی پسند نہیں کرتے خواہ وہ کتنی مخلصانہ ہو' سو اسے اکثر عہدوں سے ہٹا دیا جاتا تھا اور جب بھی اسے کہیں سے ہٹایا جاتا تھا اس کی نفرت بڑھ جاتی تھی۔

پھر ایک روز اس کے باپ کے خدا نے جس کا وہ ہمیشہ بہت خیال رکھتی تھی' اسے ایک ایسی جگہ فراہم کی جہاں وہ سکون سے رہ سکتی تھی۔ ایک بریگیڈیئر کو ترکے میں ایک کمپنی ملی تھی جو چائے امپورٹ کرتی تھی۔ اس میں چھ کلرک تھے دونوں صنفوں کے۔ یہ سب کے سب پرانے خیالات کے تھے اور درمیانی عمر کے بھی تھے۔ مس ایملیا کو یہاں اپنے موڈ کے مطابق کام پر کوئی پابندی نہ تھی۔

بریگیڈیئر ایک لانبا آدمی تھا جس کے بال سپید ہو چلے تھے۔ شکل وصورت کا اچھا تھا۔ اس کے طور طریق نفیس تھے۔ مس ایملیا کو اس کے انداز پسند آئے تھے۔ ٹکرانا' دھکے دینا' یا جسم مس کرنا وغیرہ جیسی کوئی عادت اس میں نہیں تھی۔ وہ مس ایملیا کے کمرے کو کھولتے ہوئے بھی احتیاط برتتا تھا۔ اسے جب بھی وہ دکھائی دیتی تھی' وہ اسے گڈ مارننگ یا گڈ ایوننگ وغیرہ کہنا نہیں بھولتا تھا۔ خیریت وغیرہ بھی ہمیشہ پوچھتا تھا مزید یہ کہ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ دفتری اوقات میں وہ تمباکو نوشی بھی نہیں کرتا تھا۔ ایملیا کی نگاہ میں تمباکو نوشی نہایت ہی مکروہ عادت تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اپنی ملازم خواتین کی سمت پر ہوس نظروں سے کبھی نہیں دیکھتا تھا۔

وہ وقت کا پابند تھا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے آتا تھا۔ ہر شخص کو نام لے کر پوچھتا تھا اور مس ایملیا کو گردن خم کر کے سلام کرتا تھا۔ مس ایملیا بھی اسے بھرپور احترام دیتی تھی اور اسے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ جاتی تھی۔ جب تک وہ اپنے کمرے میں چلا نہیں جاتا تھا وہ اسی طرح کھڑی رہتی تھی۔ مس ایملیا بہرحال بریگیڈیئر کی محبت میں گرفتار نہ تھی' اسی طرح جیسے وہ اپنے باپ کے خدا سے بھی محبت نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اس کی عبادت کرتی تھی۔ اکثر وہ خواب میں اسے دیکھتی تھی کہ وہ کہیں دور بلندی پر کھڑا ہے اور وہ اس کی سمت دوڑ رہی ہے۔ مگر فاصلہ کم نہیں ہو رہا ہے۔ وہ بھی اس کے باپ کے خدا کی طرح تھا جسے پایا نہیں جا سکتا تھا۔

''مس سج تم برائے کرم میرے پاس آجاؤ۔''

بریگیڈیئر نے اپنے کمرے کے دروازے پر سے اسے آواز دی۔ اس نے نوٹ بک اٹھائی اور چل دی۔ بریگیڈیئر نے انگلیاں پھنسا کر ایک اہرام سا بنایا پھر اپنے سجے بنے مہذب لہجے میں بولا۔

''مس سج' میں نے سوچا اپنی اس چھوٹی سی ٹیم میں کچھ اضافہ کر دوں۔''

''اچھی بات ہے سر۔'' مس ایملیا نے بھوپں سکوڑتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کیونکہ کچھ پتا نہ تھا' وہ کوئی چلتی پھرتی شے بھی ہو سکتی تھی ان معمر افراد میں وہ کوئی جوان اضافہ بھی ہو سکتی تھی۔

''ہاں' میں نے ایک نہایت نفیس کردار کی خاتون کا انتخاب کر لیا ہے۔ وہ پیر سے آئے گی۔''

''مجھے تو بالکل پتا نہ تھا سر۔'' مس ایملیا نے کہا۔ اس کی آواز کچھ بلند تھی۔ ''کہ یہاں انٹرویو ہو چکا ہے یا کوئی اشتہار دیا گیا ہے۔''

''مس ایملیا۔'' بریگیڈیئر نے کہا۔ ''کسی نے اس کی سفارش کی تھی اور پھر مسز پارسن اگلے ماہ ریٹائر ہو رہی ہیں لہٰذا میں نے خرافات میں پڑے بغیر یہ کام کر لیا ہے۔''

''اوہ۔'' مس ایملیا نے آہستہ سے کہا۔ اگر وہ بریگیڈیئر سے متاثر نہ ہوتی تو شاید کچھ بولتی

ضرور۔

''میری خواہش ہے۔'' بریگیڈیئر نے کہا۔ ''مس فرینکلن آئے تو تم ذرا اس کا خیال رکھنا اور کام سمجھانے میں مدد دے دینا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' مس ایملیا زیر لب بڑبڑائی۔

☆☆

پیر کی صبح کا آغاز کچھ اچھا نہ تھا۔

پہلے تو ایک شخص نے اس کے پیر کا انگوٹھا کچل دیا اور جواباً اپنے پیر کی ہڈی پر اسے مس ایملیا کی کک برداشت کرنی پڑی۔ اس نے مس ایملیا کو 'پاگل عورت' کا خطاب بخشا اور اگر وہ رخصت نہ ہوگیا ہوتا تو شاید اسے مس ایملیا کی چھتری کا کچوکا بھی برداشت کرنا پڑتا۔ جس میں ذرا تاخیر ہوگئی تھی۔ اسی لمحے اس کے پاس کھڑے ایک شخص نے سگریٹ کا بہت سا دھواں اس کے چہرے کی طرف اگلا اور ساتھ ہی اس سے کہا بھی کہ وہ اس کے ساتھ پہلے والے آدمی جیسی کوئی حرکت نہ کرے ورنہ وہ بہت بری طرح پیش آئے گا۔ اس آدمی کے انداز میں جارحیت تھی۔

بلاشبہ پیر کی صبح کا آغاز اچھا نہ تھا۔

دفتر میں پرانے معمر ملازمین ہیجان میں تھے۔ سبھی اس خاتون کو دیکھنا چاہتے تھے جو ان میں شامل ہونے والی تھی۔

''کیسی ہوسکتی ہے۔ کوئی آئیڈیا۔'' مس پارسن نے اس سے تیسری مرتبہ پوچھا۔

''نہیں۔'' مس ایملیا کو دھواں پھینکنے والے سے ہونے والی شکست نے خاصا پژمردہ کر رکھا تھا۔ ''مجھے امید نہیں کہ وہ اچھی ہوگی۔''

''اوہ۔''

''ہوسکتا ہے' قابل برداشت ہو۔'' مس ایملیا نے کہا۔

عام طور سے نئے ملازم پہلے دن وقت پر نہیں آتے۔ بریگیڈیئر حسب معمول ساڑھے نو بجے آیا اور سلام وغیرہ کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جب دس بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ آفس کا صدر دروازہ کھلا۔

چھ سر ادھر گھومے' چھ جوڑی آنکھیں اسی طرف مرکوز ہوگئیں اور مس ایملیا کو محسوس ہوا کہ اسے جنگ کے لیے قوتیں مجتمع کرنی ہوں گی۔ اس لڑکی کی عمر بیس بائیس سال ہوگی۔ اس کا جسم تو بھرا ہوا تھا مگر چہرہ کسی بچی جیسا تھا اور اس نے اپنے پرکشش بدن کی نمائش پر توجہ بھی دے رکھی تھی۔ اس کا لباس بھی اشتعال آمیز تھا۔ اس نے اپنے سنہرے بال شانے پر بکھیر رکھے تھے۔

''ہالو.....'' اس کی آواز میں شرمیلا پن تھا نہ جھجک بلکہ اس میں ایک نوع کی برتری تھی۔ ''مجھے این فرینکلن کہتے ہیں۔''

مسٹر نارمن جو بے حد سنجیدہ شخص تھا' چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ مس ایملیا نے اس کی سمت دیکھا تو وہ حیران ہوگئی کیونکہ مسٹر نارمن کی نگاہ میں کوئی ناپسندیدگی نہ تھی۔ تب مس ایملیا خود اٹھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے والد کا خدا بھی.....

اس نے پہلے تو لڑکی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی پھر گڈ مارننگ کے بعد اس سے پوچھا۔

''کیا تم آفس میں یہی لباس پہن کر آؤ گی۔'' لڑکی مسکرائی۔

''میرے پاس سب کپڑے اسی جیسے ہیں۔'' رک کر وہ بولی۔ ''کیا اس میں کوئی برائی ہے۔''

مس ایملیا نے کہا۔ ''یہ آفس خاصا معقول قسم کا ہے۔'' لڑکی پھر مسکرائی۔

''ظاہر ہے' میں اسی لیے یہاں آئی بھی ہوں۔''

مس ایملیا کے اندر کی آگ بھڑکتی ضرور مگر اسی وقت بریگیڈیئر اپنے کمرے سے برآمد ہوا۔ اس نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنی مہذب آواز میں اس نے کہا۔

''اچھا تو تم آ گئیں مس فرینکلن' خوب۔''
اس نے لڑکی کو سر سے پیر تک دیکھا اور بولا۔
''خاصی اسمارٹ لگ رہی ہو۔''
مس ایملیا نے دانت پر دانت جما لیے۔ اپنے کانوں میں اسے باپ کے خدا کی آواز گونجتی سنائی دی کہ اسے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں' وہ ہر وقت اس کے پاس رہتا ہے۔
پھر بریگیڈیئر اس کی سمت متوجہ ہوا۔ اس نے کہا۔ ''میں مس فرینکلن کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے' تمہاری لائق نگرانی میں انہیں کام سیکھنے میں مدد ملے گی۔'' ایملیا نے حسب عادت سر کو جھٹکا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے سر۔''
اس کے آئندہ کے چند روز ایسے ہی تھے' جیسے وہ کوئی شیر ہو جس کی معیت میں مس فرینکلن مسلسل اپنی سڈول ٹانگوں کی نمائش کر رہی تھی۔ وہ کام کے اوقات میں میک اپ کرتی رہتی تھی۔ ہر آنے جانے والے کی سمت مسکراہٹ اچھال رہی تھی۔ مس ایملیا مجبور تھی کہ خود پر قابو رکھے۔ وہ یہ سب کچھ بھی برداشت کر لیتی تھی مگر اس لڑکی کا کام ناقابل برداشت تھا۔
''ایک خط میں چھ غلطیاں۔'' ناگواری سے ہتھے سے اکھڑتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اور تاریخ غلط ہے' سن غلط ہے' مناسب فاصلہ بھی سطور میں نہیں۔''
لڑکی کھلکھلائی' مگر جب اس نے بری نظروں سے اسے گورا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔
''ہاں' اس خط میں غلطیاں رہ گئی ہیں۔''
مس ایملیا نے اسے گھورا۔
''دیکھو مس فرینکلن' تمہیں کام میں محتاط رہنا چاہیے۔''
لڑکی جو سنجیدہ ہو گئی تھی' ایک بار پھر اس کے ہونٹ پھیلے۔
''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بڑھاپا آدمی کو واقعی چڑچڑا بنا دیتا ہے۔''
مس ایملیا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس نے اپنے اسکرٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ دراصل غصے کو برداشت کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ پھر وہ عجلت سے کمرے سے باہر نکلی اور سیدھی بریگیڈیئر کے کمرے کے سامنے رکی۔ اس نے دستک دی اور اجازت کا انتظار کیے بغیر اس نے دروازہ کھولا اور اندر گھس گئی۔ بریگیڈیئر نے اس کی سمت نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس عرصے میں مس ایملیا اس کے میز کے سامنے پہنچ چکی تھی۔
''اوہ مس سچ کوئی خاص بات۔''
''سر..... میں..... وہ لڑکی..... مس فرینکلن۔''
''بیٹھ جاؤ۔'' بریگیڈیئر نے اس کے موڈ کو بھانپتے ہوئے کہا۔
''سر۔''
وہ بیٹھ گئی مگر اس طرح کہ بیٹھنا نہ چاہتی ہو۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔
''ہاں..... کیا مسئلہ ہے۔''
''سر' یہ مس فرینکلن' میں آپ کے فیصلے پر کچھ کہہ نہیں سکتی مگر یہ ضرور بتانا چاہتی ہوں۔ یہ بہت بری لڑکی ہے۔''
''اوہ۔'' بریگیڈیئر نے لمبی سانس لی۔ ''مجھے حیرت ہے۔'' اس نے کہا۔
''آپ ایک عمدہ دل والے آدمی ہیں سر۔ آپ نہیں سمجھ رہے ہیں۔ وہ دفتر کو اپنے حسن کی نمائش گاہ سمجھتی ہے۔ اسے کام کرنے کی تمیز نہیں۔''
''اوہ۔'' بریگیڈیئر نے آواز نکالی۔ ''مس سچ' آج کی نوجوان نسل میں ذمے داری کا احساس بہت کم ہے۔ مگر.....'' رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''ہم اور تم ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے۔''
''مگر سر' آپ ایک فوجی ہیں۔ کیا کوئی فوجی

شکست تسلیم کر لیتا ہے۔''

''نہیں۔'' بریگیڈیئر نے کہا۔ ''لیکن جب شکست یقینی ہو تو پھر حکمت عملی بدلنا پڑتی ہے۔ ایک فوجی تب ہتھیار رکھ دیتا ہے مگر یہ صرف اداکاری ہوتی ہے۔ وہ دشمن کے جتھے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجا لیتا ہے اور اپنے لفظوں کو گولی میں بدل دیتا ہے۔ وہ ایک زیر زمین قوت بن جاتا ہے مس سج۔''

''مگر سر..... اس نے میری توہین کی ہے۔'' مس ایملیا کراہی۔ ''اسے ملازمت سے نکال دیں۔''

''یہ عمل۔'' بریگیڈیئر کی مسکراہٹ دیکھنے والی تھی۔ ''شکست مان لینے کے مترادف ہوگا۔ اگر ہم نے اس لڑکی کو نکال دیا تو اس کی جگہ کسی اور کو رکھنا ہوگا۔ اس سے ہماری واقفیت ہے' اچھا سنو تم ذرا اسے میرے پاس بھیج دو۔''

مس ایملیا اپنی جگہ سے اٹھی۔ عجلت سے گھومی اور دروازے کی سمت چل دی۔ اسے عقب میں بریگیڈیئر کی آواز سنائی دی۔ ''مس سج۔''

''سر۔''

ایک وقفۂ تجسس بھرا جانے کیا کہنے والا ہے۔

''تم میری دست راست ہو۔ ہمیں دشمن کے اندر داخل ہونا ہے۔'' بریگیڈیئر نے کہا۔

خوشی کی ایک لہر کی طرح تھے' یہ الفاظ۔ اس کے لہو نے گیت گانا شروع کر دیا۔ اس کی چال میں رقص کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ وہ باہر نکل کر گرتے گرتے بچی۔ سب اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''مس فرینکلن۔'' اس نے لڑکی سے کہا۔ ''جاؤ تمہیں بریگیڈیئر صاحب نے بلایا ہے۔''

مس فرینکلن بولی۔ ''اوہ میرے خدا۔''

پھر اس نے پرس سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکالا' اپنا عکس دیکھا' میک اپ درست کیا اور اس کے بعد وہ بریگیڈیئر کے کمرے کی سمت چلی' اپنے کولہے مٹکاتی ہوئی۔ یہ کچھ ایسی ہی چال تھی جسے اپنانے کی کوشش میں خود مس ایملیا گرتے گرتے بچی تھی۔ وہ کمرے سے کوئی ندرہ منٹ بعد باہر آئی اور سیدھی مس ایملیا کی طرف گئی۔

''ہاں۔'' مس ایملیا نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

''پلیز مس سج وک' میں معذرت خواہ ہوں کہ میرے ایک جملے سے آپ کو تکلیف ہوئی۔''

مس ایملیا نے منہ بند رکھا تو وہ پھر بولی۔

''اب آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' لڑکی نے کہا۔

''ٹھیک ہے' جاؤ اپنا کام کرو۔'' بالآخر مس ایملیا نے کہا۔ وہ خوش تھی کہ وہ فتح یاب رہی تھی۔

باقی دن اس طرح گزرا کہ مس ایملیا کا ذہن ہواؤں میں رہا۔ اس کیفیت نے مس ایملیا کے ذہن سے اس لچے آدمی کے برے رویے کو بھی معدوم کر دیا جس کا تجربہ اسے ٹرین میں ہوا تھا۔ اس کے بے ہودہ تبصرے کو بریگیڈیئر کے اس جملے نے دور پھینک دیا تھا۔

''تم میری دست راست ہو۔''

اسے اب دشمن دستوں میں گھس کر جگہ بنانی تھی۔ یہی مشورہ اسے دیا گیا تھا۔ انہی کی طرح رہنا تھا اسے۔ آپ سے آپ اس کے ہونٹوں پر ایک رجھانے والی مسکراہٹ ابھری۔ معاً اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا نوجوان اسے حیرت سے دیکھ رہا ہے پھر اس نے منہ سکیڑ کر اس طرح گردن دوسری طرف گھمائی جیسے کہہ رہا ہو۔

''نہیں محترمہ..... یہ جال تم اپنی عمر کے کسی آدمی کی طرف پھینکو۔''

کھسیاہٹ کے ساتھ مس ایملیا نے اخبار اٹھا کر اس کے پیچھے پناہ لی۔ وہ اندر سے ہل کر رہ گئی تھی۔ یہ دنیا بہت ہی بری تھی۔ فضا میں برائی ہی برائی تھی۔ خوشبو میں غازے' رنگ' دھواں' پائپ'

ایک طوفان بدتمیزی تھا ہر طرف۔ اخباری تصاویر' نیم برہنہ جسم' آلودگی' بداخلاقی۔
ہالی ووڈ کی اداکارہ۔ طلاق کی درخواست۔
پادری کا بیان۔ سیکس اہمیت رکھتی ہے۔
سرکاری اسکینڈل۔
اس نے اپنا اخبار تہہ کرنا شروع کیا تو اسے ایک سیاہ سرخی نے روک دیا۔
''ایک انیس سالہ لڑکی کی لاش ویلڈن سے ملی ہے۔ یہ قتل اسی جنسی پاگل کی حرکت قرار دیا جارہا ہے جس کے ہاتھوں پچھلے دو سال میں سات دوسری لڑکیاں ہلاک ہوچکی ہیں۔ یہ لڑکی اس جنونی کا آٹھواں شکار ہے۔ ان وارداتوں میں لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا تھا۔''
مس ایملیا نے اخبار کو گولہ بنا کر فرش پر پھینک دیا۔ اس کی اس حرکت پر اس کے بائیں جانب بیٹھی خاتون نے سہم کر اسے دیکھا۔
''ایسی لڑکیوں کا یہی حشر ہونا چاہیے۔'' مس ایملیا نے پڑوسی خاتون کے کان میں سرگوشی کی۔
اس خاتون نے عجلت سے اپنا بیگ سنبھالا اور کسی سراسیمہ کبوتر کی طرح اٹھی اور دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی اور وہاں سے مس ایملیا کو پرتشویش نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ بدتمیز جوان جس نے اس کی مسکراہٹ کو غلط سمجھا تھا' مسکرا رہا تھا۔ مس ایملیا کا جی چاہا کہ اپنی چھتری کی نوک اس کے منہ میں گھسا دے۔ وہ بہت ممکن ہے' یہ حرکت کر ہی بیٹھتی اگر اسے بریگیڈیئر کے الفاظ نہ یاد آگئے ہوتے کہ وہ اس کی دست راست ہے' اسے کسی قسم کے اشتعال میں نہیں آنا چاہیے۔ اب بریگیڈیئر کی ذات اس کی نگاہ میں' گھنے جنگل میں ایک تناور برگد جیسی تھی۔ وہ اسے ایک ایسا شیر سمجھ رہی تھی جو گیدڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک بار پھر مس ایملیا کسی سنہری ہوا میں اڑنے لگی تھی۔

اس نے اپنے دائیں سمت بیٹھے شخص سے کہا۔ ''تمہارے جسم سے بو آرہی ہے۔''
''آرہی ہوگی۔'' آدمی نے شانے اچھالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خاصی پی لی تھی۔''

☆☆

اس دنیا میں ہونے والے بڑے بڑے سانحوں کا آغاز بہت معمولی انداز سے ہوا ہے۔ مثلاً پوری پوری عمارتیں اس طرح جلیں کہ کسی نے جلتی سگریٹ کا کوئی ٹکڑا بے پروائی سے کسی طرف پھینک دیا تھا۔ یا بس الٹنے کے واقعات اس لیے ہوئے کہ کوئی جانور سڑک پر آگیا تھا۔ مس ایملیا اپنی چھتری آفس سے ساتھ لے کر چلنا بھول گئی تھی۔ اس کا احساس اسے اس وقت ہوا' جب اسٹیشن کی سمت چلتے ہوئے اسے بارش نے آلیا۔ مس ایملیا چھتری کے بغیر ایسی ہی تھی' جیسے گرز کے بغیر تھور..... اس کی چھتری صرف بارش سے بچاؤ کا ایک ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ یہ اور بھی کئی جگہ کام آتی تھی مثلاً اس سے وہ کسی کو کچوکا لگا سکتی تھی۔ منہ پر مار سکتی تھی اور ضرورت پڑنے پر وہ اس سے سر بھی توڑ سکتی تھی۔ چھتری کی نامو جودگی کے خیال سے وہ بڑبڑائی اور ان نادیدہ چیزوں پر اس نے لعنت بھیجی جنہوں نے اس کی یادداشت خراب کردی تھی۔ پھر وہ مڑی اور دوبارہ آفس کی طرف چل دی تاکہ چھتری لاسکے۔
عمارت خالی ہوچکی تھی۔ لفٹ کام نہیں کررہی تھی۔ جب مس ایملیا دوسری منزل پر پہنچی تو اس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے بیگ میں آفس کے بیرونی دروازے کی کنجی تلاش کی' دروازہ کھولا پھر اس نے لائٹ جلائی۔ اس نے اپنی چھتری اٹھائی پھر واپسی کے لیے مڑی۔ معاً وہ ٹھٹک گئی۔ بریگیڈیئر کے کمرے کے دروازے تلے ہلکی سی روشنی کی ایک لکیر نظر آرہی تھی۔
عجیب عجیب سے خیالات اس کے ذہن میں

ابھرنے لگے۔ شاید بریگیڈیئر کسی ضروری کام سے رک گیا تھا یا پھر وہ چلتے وقت بجلی بند کرنا بھول گیا ہوگا یا پھر کوئی آدمی آفس میں گھسا ہوا تھا۔ مس ایملیا کا تجسس اسے اس طرف لے چلا۔ وہ بریگیڈیئر کی دست راست تھی چنانچہ تفتیش لازم تھی۔ اگر بریگیڈیئر مل جاتے تو اور بھی اچھی بات ہوتی۔ اسے فرائض کی بجا آوری پر تحسینی کلمات ملتے۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اسے دھکا دیا۔ مگر دروازہ مقفل تھا۔ گویا بریگیڈیئر بجلی بجھانا بھول گیا تھا۔ مس ایملیا نے کنجی کے گچھے میں سے اندرونی آفس کی کنجی تلاش کی اور اسے کھول دیا۔ اندرونی حصے میں چھت کی بتی جل رہی تھی۔ بریگیڈیئر کی میز صاف پڑی ہوئی تھی۔ دونوں ٹرے خالی تھیں۔ اس کی کرسی ذرا مڑی ہوئی تھی۔ مس ایملیا نے آگے بڑھ کر اس کی کرسی کو ہاتھ سے مس کیا' اسے سہلایا۔

اچانک ایک آواز سی سنائی دی۔ جیسے کسی نے سسکی سی بھری ہو۔ وہ سیدھی ہوگئی۔ اس نے خالی کمرے کو دیکھا اور آواز کی سمت کا اندازہ کیا۔ پھر اس کی نظریں دوسرے دروازے پر جا رکیں۔ یہ آتشدان والی دیوار میں جڑا ہوا تھا۔ ایملیا اس کے اندر آج تک نہیں گئی تھی۔ یہ شاید کوئی ڈریسنگ روم تھا جس میں واش بیسن وغیرہ بھی تھے یا کچھ بھی رہا ہو' یہ بات طے تھی کہ اس وقت اس میں کوئی تھا ضروری۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا بھی تھا اور اندر روشنی ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر ہلکی سی کراہ جیسی آواز سنائی دی یا پھر یہ کوئی دبی دبی سی ہنسی تھی۔ مس ایملیا سمجھ نہ سکی مگر اس کا ذہن برف زدہ ضرور ہوگیا تھا۔ کوئی گڑبڑ تھی ادھر۔

وہ ذرا سی آگے بڑھی تو اسے احساس ہوا کہ ادھر سے الکحل کی بو آرہی ہے۔ وہ تھوڑا اور بڑھی۔ اس نے اس زاویے سے اندر جھانکا کہ ادھر کا منظر دیکھ سکے۔ اسے کمرے میں ایک آئینہ دکھائی دیا جو واش بیسن پر لگا ہوا تھا۔ نزدیک ہی ایک کرسی پڑی تھی جس پر متعدد کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ وہیں ایک کوچ بھی پڑی ہوئی تھی جسے لیٹنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اور.....

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ بریگیڈیئر اور وہ لڑکی مس فرینکلن اس کاؤچ پر موجود تھے۔ ان کے جسم بے لباس تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس قدر منہمک تھے کہ انہیں مس ایملیا کی موجودگی کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

چند منٹ تک مس ایملیا یہ منظر دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن کا ایک حصہ جو اخلاقیات سے قدرے دور تھا' اس منظر کو دلچسپی سے تول رہا تھا' کہ یہ منظر اس کے لیے نیا تھا۔ اس پر یہ کسی انکشاف کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس منظر میں انسانوں کی ایک پوری داستان چھپی ہوئی تھی۔ عزائم' جرائم' لالچ' نفرت' اعزازگی' داستان' وہ محرکات جو بڑے بڑے انسانوں کو قعر مذلت میں گرانے کا باعث تھے' اسے نظر آرہے تھے۔ آہستگی سے مس ایملیا پھر پیچھے ہٹ گئی۔ دبے قدموں کمرے سے باہر نکلی۔ اس نے بیرونی آفس کی لائٹ بجھائی' دروازہ بند کیا' سیڑھیاں اتریں اور جب وہ نیچے پہنچی تو اس کا جسم سردی سے آہستہ آہستہ کپکپا رہا تھا یا پھر یہ لرزہ کسی اور وجہ سے تھا۔

اس شام وہ پیدل ہی چلتی رہی۔ اس نے کافی مٹرگشتی کی۔ اسے بازاروں میں بھی ہر طرف یہی آلودگی پھیلی نظر آئی۔ عورتوں اور مردوں کے پوسٹر' سینما گھر کے پوسٹر' طرح طرح کے عریاں پوسٹر' بک اسٹالوں پر لگی تصویریں' آدمیوں کی پرہوس آنکھیں' عورتوں کے لپے پتے چہرے' مسکراہٹیں۔

بالآخر وہ ایک چھوٹے سے چوراہے پر پہنچی جہاں سبزہ تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا جس میں لوہے کی بنچیں پڑی تھیں۔ وہ ان میں سے ایک پر گر گئی اور شام کے سایوں کو گہرا ہوتے

دیکھنے لگی۔ اب اس کے جسم کی کپکپی ختم ہوگئی تھی۔ اسے اپنے اندر گہری اداسی کا احساس ہوا۔ وہ بالکل گم صم سی ہوگئی۔

پھر بہ آہستگی یہ کیفیت بھی چھٹنے لگی' اس نے اس بری دنیا پر دوبارہ نگاہیں ڈالیں۔ اسے اپنے باپ کا خدا..... مسکراتا ہوا نہیں دکھائی دیا۔ وہ اتنے بڑے شہر میں بالکل تنہا تھی۔ اس کے گرد اس کے دشمن پھیلے ہوئے تھے۔

''مجھے اس طرح کیوں تنہا کر دیا گیا ہے۔''

اس کے ذہن نے سوچا۔ اسے دور کہیں مردوں اور عورتوں کی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ کہیں کوئی مدہوش شرابی بلند آواز سے گاتا جارہا تھا۔ سر کے اوپر ایک جہاز گھڑگھڑاتا ہوا گزر اور تب مس ایملیا کو احساس ہوا کہ وہ کیا ہے۔

میں..... میں ایک جنونی عورت ہوں۔

اس نے دوسرے ہی لمحے اس خیال کو دماغ سے نکال دیا۔ اسے لاشعوری گہرائیوں میں پھینک دیا۔ نفرت میں اسے دفن کر دیا۔ اسے بہت سے چہرے قطار در قطار نظر آرہے تھے اور وہ..... یعنی مس ایملیا۔ ان پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ انہیں مار مار کر بھرتا بنا رہی تھی۔ ان کی ناکیں' دانت' آنکھیں سب کو توڑ پھوڑ رہی تھی۔ یہ چہرے بالکل بے بس تھے کیونکہ اس کے باپ کا خدا اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ یعنی مس ایملیا اس کی دست راست ہے۔ مگر..... وہ حیران تھی کیونکہ اس کے باپ کا خدا تو کہیں بھی نہ تھا۔

جس وقت مس ایملیا چونکی' اسے احساس ہوا کہ اس کی چھتری بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اور لوہے کی بینچ پر لگا ہوا پینٹ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہے۔

دوسرے روز مس ایملیا پھر اپنے آفس میں اپنی ڈیسک پر موجود تھی۔ وہ بالکل نارمل تھی۔ اس نے مس فرینکلن کو غلط ٹائپنگ پر جھڑکا' بریگیڈیئر کی آمد پر کھڑے ہوکر اس کا استقبال کیا' اپنے اردگرد موجود معمر عملے پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی' تاہم وہ لڑکی مس فرینکلن اور بریگیڈیئر ہی اس کی توجہ کا مرکز تھے۔ اس نے انہیں اس طرح دیکھا تھا' جیسے کوئی بھیڑیا دو عدد صحت مند میمنوں کو دیکھتا ہو۔ اس کا ذہن کسی تیل ڈالی ہوئی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ یہ دونوں کیا ہر رات ملتے ہیں۔ اس کا امکان نہ تھا' بریگیڈیئر کی بہت سی سماجی سرگرمیاں بھی تھیں۔ وہ اکثر شہر سے باہر بھی جاتا تھا۔ اس کا امکان تھا کہ ہفتے میں ایک دو بار وہ مل سکتے تھے۔ اسے گویا کچھ انتظار کرنا تھا۔

بریگیڈیئر کے ڈیسک کی ڈائری سے اسے وہ اطلاعات مل گئی تھیں جو وہ چاہتی تھی۔ یہ کام اس نے اس وقت کیا تھا' جب بریگیڈیئر لنچ کے لیے نکلا تھا۔ بدھ کے دن جگہ خالی تھی اور اس پر ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ اس نے سمجھتے ہوئے ایک معنی خیز سانس لی۔ سوال یہ تھا کیا وہ اسی دفتر میں اس سے ملے گا۔ ظاہر ہے کہ بریگیڈیئر کسی ایسی لڑکی کے ساتھ باہر رنگ رلیاں منانے والا نہیں تھا جو عمر میں اس کی بیٹی سے کم تھی۔ مس ایملیا نے بہرحال طے کرلیا تھا کہ اس بات کا پتا ضرور کرے گی۔

بدھ کی شام میں وہ اس لڑکی کے تعاقب میں تھی۔ اتفاق سے یہ کام قطعی مشکل ثابت نہیں ہوا۔ آفس سے باہر نکل کر وہ گرین پارک گئی تھی۔ اس نے ٹرین پکڑی تھی پھر وکٹوریا لائن سے گزر کر وکٹوریا اسٹیشن پر اتری تھی' وہاں سے وہ برج روڈ پر چلی تھی۔ مس ایملیا نے خود کو ایک کونے میں چھپالیا تھا۔ پھر اس نے تیسری منزل کی ایک کھڑکی کو روشن ہوتے دیکھا تھا پھر لڑکی نظر آئی تھی۔ اس نے پردے ہٹائے تھے۔ وہ اب تیار تھی۔ ضرور پڑنے پر وہ کئی گھنٹے بھی اس کا انتظار کرسکتی تھی۔

مگر اسے کئی گھنٹے نہیں صرف بیس منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔ چھ بج کر پندرہ منٹ پر وہ نیچے

آئی تھی۔ اس نے ایک چست سا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا ایک ہینڈ بیگ تھا۔ لڑکی تیز تیز چل رہی تھی اور مس ایملیا اس سے کوئی چالیس پچاس گز پیچھے تھی۔ ہانپنے کے ساتھ مس ایملیا کے دل میں نفرت کا لاوا ابھی ابل رہا تھا۔ لڑکی کا لباس اور ہینڈ بیگ اس کا جیسے مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کے سڈول پیر ایملیا کی نظر میں بری طرح کھٹک رہے تھے۔ یہ لڑکی..... بریگیڈیئر کی سمت جا رہی تھی۔ اسے اس کا بھی غصہ تھا۔ اپنے جسم کو دان کرنے کے لیے۔ اسے معلوم تھا کہ جلد ہی وہ دونوں ایک دلخوش کن دوزخ میں داخل ہونے والے ہیں جس کے دروازے خود اس کے یعنی ایملیا کے اوپر بند ہو چکے تھے۔ یہ بھی ایک المیہ تھا۔

لڑکی اگر پیچھے مڑ کر دیکھتی تو شاید وہ ایملیا کو دیکھ لیتی مگر وہ تو کسی اور ہی نشے میں تھی۔ اسے اپنے عقب میں شعلہ بداماں آنکھوں کا کچھ علم نہ تھا۔ دونوں ساتھ ہی ساتھ کچھا کچھ بھری ٹرین میں گھسے تھے۔ ایملیا کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ ایملیا اس سے اس طرح جڑی ہوئی تھی کہ اس کا سینہ لڑکی کی پیٹھ سے بھنچا ہوا تھا۔ اسے گوشت کا گوشت کے ساتھ مس ہونے کی لذت کا عجیب سا احساس ہوا۔ وہ اپنی جگہ کپکپانے سی لگی۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے کانپ رہے تھے۔ یہ گرمی اس کے اندر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار خود کو لڑکی کی پیٹھ کے ساتھ دبا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا' جیسے ذرا سی دیر بعد یہ لذت عروج پر پہنچ کر گہری طمانیت میں بدلنے والی ہے۔

لڑکی جس وقت ٹرین سے اتری تو مس ایملیا اس سے زیادہ دور نہ تھی۔ پھر وہ تھیٹر میں ضم ہو کر..... لائن کی سمت چلی۔ ذرا دیر بعد اس نے مس فرینکلن کو دیکھا' وہ پلیٹ فارم کے سرے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک اس کے عقب میں جا رکی۔ وہاں بہت مجمع تھا' سب کی نظریں آنے والی ٹرین پر تھیں جس کی گرج سنائی دے رہی تھی۔ مس ایملیا ذرا سا جھکی' اس نے لڑکی کے کان میں سرگوشی کی۔

''حرافہ تو خدا کے ساتھ چال چل رہی ہے۔''

مس فرینکلن ایکدم سے بدکی۔ اس نے گردن گھمائی۔ اسے لمحہ بھر کے لیے مس ایملیا کا چہرہ نظر آیا جس پر وحشت ناچ رہی تھی۔ مگر بس' دوسرے ہی لمحے ایک بلند چیخ فضا میں ابھری۔ سرنگ سے ٹرین باہر آ چکی تھی۔ پھر وہ چیخ اور ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ آپس میں خلط ملط ہو گئیں۔

مس ایملیا کو صرف اپنے کولہے سے ایک دھکا لگا نا پڑا تھا اور وہ نیلا کوٹ' وہ سپید ہینڈل بیگ اور مجمع کی چیخیں سب عام سی باتیں ہو گئی تھیں۔ مس ایملیا نے فوراً ہی جگہ بدل دی۔ اسے مجمع کی دھکم پیل بری نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں کامیابی سے چمک رہی تھیں۔

☆☆

اس نے ایک تیز دھار پھل والا چاقو ایک دکان سے خریدا۔ دکاندار نے اسے پیپر میں لپیٹا' مسکراتے ہوئے مس ایملیا نے اسے لے لیا۔

''قیمے کے لیے یہ اچھا چاقو ہے۔'' دکاندار نے کہا۔ جواباً وہ مسکرا دی۔

اس بار اسے دوسری منزل تک سیڑھیاں چڑھنے میں کوئی پریشانی نہیں محسوس ہوئی۔ بس صرف ایک فکر تھی کہ پتا نہیں بریگیڈیئر آفس میں ہوگا کہ نہیں۔

بیرونی آفس میں پہنچ کر اس نے دروازہ مقفل کر دیا پھر اکڑے ہوئے بدن کے ساتھ وہ بریگیڈیئر کے کمرے کی طرف چلی۔ اسے اندر روشنی کا احساس ہوا۔ اسے اس کا دروازہ بھی قدرے کھلا ہوا ملا۔ اندر سے سیٹی بجانے کی ہلکی

آواز آرہی تھی۔ بریگیڈیئر یقیناً ترنگ میں تھا۔ مس ایملیا نے اپنی چھتری اور بیگ رکھ دیا۔ پھر اس نے چاقو کو ریپر سے نکالا' اس نے اس کی دھار کو دیکھا۔ اس کا ذہن اس سے سرگوشیاں کررہا تھا۔ ہدایتیں دے رہا تھا..... چلو' اس سے قریب ہونا ہے' وہ شک نہیں کرے گا۔ اسے کیا معلوم کہ تم کیا کرنے والی ہو۔ وار سیدھا حلق پر کرنا ہے۔ ٹھیک حلق پر۔

وہ اپنی ڈیسک کے پاس کھڑا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی۔ لانبے قد' فولادی جسم اور پرکشش چہرے والا بریگیڈیئر اسے اس لمحے بہت اچھا لگا۔ اس کی نظریں ایملیا پر پڑیں تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے مگر دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ ایک مسکراہٹ نے لے لی۔ مس ایملیا نے چاقو پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اسے کوٹ تلے چھپالیا۔

''اوہ مس سج ویک' خیریت۔ کیا کچھ بھول گئی تھیں۔'' وہ اس سے اور نزدیک ہوگئی۔

''کوئی بات کہنی ہے۔''

وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور گردن اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ ان آنکھوں میں ایک دلچسپی بھری ہوئی تھی۔

''ہاں۔'' مس ایملیا نے سر ہلایا۔ ''ہاں۔''

''تو پھر تم بیٹھ جاؤ۔''

میز اس کے پیروں سے مس ہورہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس نے چاقو پکڑ رکھا تھا جو کوٹ تلے تھا۔ وہ ایک بار پھر کپکپانے لگی تھی۔ ''مس ایملیا' جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔ مجھ سے کوئی ملنے آرہا ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''اب تم سے ملنے کوئی نہیں آئے گا۔''

بریگیڈیئر ساکت سا ہوگیا۔ مس ایملیا کا لہجہ درشت تھا۔

''وہ حرافہ..... وہ اب نہیں آئے گی۔''

بریگیڈیئر اسی طرح بیٹھا اسے دیکھتا رہا' اس نے کچھ کہا بھی نہیں۔

''میں تم دونوں کو دیکھ چکی ہوں۔ دیکھ چکی ہوں' وہ دوزخی منظر..... اور پھر میں نے وار کیا تھا۔''

بریگیڈیئر نے لمبی سانس لی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا' اس طرح جیسے کوئی باپ کسی بچے کی شرارت پر سر ہلاتا ہے۔ ناگواری اور شفقت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں کچھ رنج گھلا ہوا تھا۔

''مس ایملیا' تم بیٹھ جاؤ پلیز۔ اور ہاں' ذرا اپنا وہ چاقو بھی نکال کر میری میز پر رکھ دو جسے تم نے کوٹ تلے چھپا رکھا ہے۔''

مس ایملیا نے اسے تعجب سے دیکھا۔ اچانک ہی بریگیڈیئر کا لہجہ تلخ اور خطرناک سا ہوگیا تھا۔ ''جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ میں اپنا حکم دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔''

آہستگی سے مس ایملیا نے اپنا ہاتھ کوٹ سے نکالا اور اس میں دبے ہوئے چاقو کو اس نے میز پر رکھ دیا۔ روشنی میں اس کا پھل چمک رہا تھا۔

''ٹھیک ہے' اب بیٹھ جاؤ۔'' بریگیڈیئر نے کہا۔ ایک بار پھر اس کا لہجہ میٹھا ہوگیا تھا۔

مس ایملیا نے کرسی سنبھال لی اور حسب عادت اس کے سرے پر ٹک گئی۔ اس کا جسم اکڑا ہوا سا تھا۔ بریگیڈیئر نے سر سے چاقو کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے' تم نے اس چاقو کو استعمال نہیں کیا ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بریگیڈیئر نے لمبی سانس لی۔

مس ایملیا نے کہا۔ ''میں نے اسے ٹرین کے سامنے دھکا دیا تھا۔''

''میرا خیال ہے' تمہارے اس احمقانہ ایکشن کو حادثہ سمجھا گیا ہوگا۔''

''ہاں۔''

''چلو یہ اچھا ہوا۔'' بریگیڈیئر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''مس سج وک' میں تم سے بہت ناخوش ہوں۔ کیا میں نے تم سے چند دن پہلے اسی جگہ نہیں کہا تھا کہ دشمن کی صف میں گھسو۔ اسی جیسی حرکات کو اپناؤ' رہو کچھ اور مگر نظر آؤ انہی کی طرح۔''

''یس سر..... مگر.....'' مس ایملیا کی عقل خبط ہو رہی تھی۔ وہ ڈری ہوئی بھی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے کوئی بڑی غلطی ہوئی ہے۔ بریگیڈیئر کے نقوش اور سخت ہو رہے تھے۔

''کسی قسم کی معذرت یا وضاحت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں مس سج وک۔ تم کو اس قسم کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس جگہ جنرل میں تھا اور یہ میرا کام تھا کہ فیصلہ کروں' کسے ٹھکانے لگانا ہے۔ سن رہی ہو تم۔''

''جی..... جی سر۔'' ایملیا ہکلائی۔ ''آئی ایم سوری..... مگر۔''

''تمہارے سوری کرنے سے میری مہم پر نازل ہونے والی بلا ٹلنے کی تو نہیں۔ میرے پاس تمہارے لیے بہت شاندار منصوبے تھے۔ میں شاید تمہیں اس میدان میں کام کرنے کے لیے بھی کہتا۔ مگر اب۔''

بریگیڈیئر نے شانے اچھالے' ایملیا کے آنسو پھوٹ نکلے' سسکتے ہوئے اس نے کہا۔

''سر' مجھے معاف کر دیں۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔'' مگر بریگیڈیئر نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ کرسی سے پشت ٹکا کر نیم وا نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''ابھی تک یہ ایک شاندار مہم تھی۔ آٹھ کو میں ٹھکانے لگا چکا تھا اور میرے کام کی شہرت اس خطے میں پھیل رہی تھی۔ سراہی جا رہی تھی۔ اخبار اسے اچھال رہے تھے۔ یہ سب کی سب میرے پاس آ رہی تھیں' اپنے اپنے گرم نرم جسموں کے ساتھ جادو جگاتی ہوئی اور میں انہی کی طرح ظاہر کر رہا تھا کہ میں بھی انہی جیسا ہوں اور پھر ان سے لطف اندوز ہونے کے بعد بالآخر میں انہیں رخصت کر دیتا تھا۔ انہیں کسی تنہا مقام پر لے جاتا تھا اور انہیں ٹکڑوں میں بدل دیتا تھا تاکہ زمین ان سے پاک ہو جائے۔''

خود کلامی کے سے انداز میں بولتے ہوئے وہ ایک دم سنبھل کر سیدھا ہو گیا۔ اس نے بسورتی ہوئی مس ایملیا کو گھورا۔

''تم۔'' وہ پھنکارا۔ ''مس سج وک' تم نے بے مقصد ترنگ میں آ کر میرے نویں شکار کو تباہ کر دیا ہے۔''

ایملیا روتے ہوئے جھک گئی۔

''سر' مجھے معاف کر دیں۔''

بریگیڈیئر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں کے شعلے کچھ بجھ گئے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ مس ایملیا کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ اس کے والد کا خدا..... پھر اس کے لیے بلندی سے نیچے آ گیا تھا۔ وہ گنہ گاروں کی اس دنیا میں پھر اس کی پشت پر آ کھڑا ہوا تھا۔ گیدڑوں میں شیر کی طرح۔ درختوں میں برگد کی طرح۔ بالآخر وہ پھر اس سے نزدیک ہو گئی تھی۔ اسے زبان مل گئی تھی۔

''مس سج وک۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم مخلص تھیں۔ تمہاری نیت صاف تھی۔'' اسے بریگیڈیئر کی آواز سنائی دی۔ ''ہمارے سامنے ایک مشکل کام ہے۔ اسے ہم دونوں کو مل کر انجام دینا ہے۔ یہاں ان کی بہت بڑی تعداد ابھی موجود ہے جسے ٹھکانے لگانا ہے۔ اچھی بڑی تعداد کو ہمیں ابھی روانہ کرنا ہے۔ زمین پاکی کے لیے ترس رہی ہے۔''

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

لیکن پھر ایک حادثے نے ہماری خوشگوار زندگی میں جیسے زہر گھول دیا۔ ایک گرم ویک اینڈ پر میں نے اور ڈان نے بچوں کے ساتھ قریبی جھیل پر پکنک کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ جھیل پر ایک جگہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے لگے لیکن دس سالہ جوائے اکیلا ہی دور نکل گیا۔ اس نے کپڑے اتارے اور تیراکی کے لیے جھیل میں اتر گیا لیکن کبھی واپس نہ آسکا۔

سید ذوالفقار حیدر

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

ٹونی کے بازوؤں میں کسمساتے ہوئے میں نے ایک طویل سانس لی۔ میرے چہرے سے محبت کی کرنیں جیسے پھوٹتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اس کی قربت ہمیشہ ہی میرے لیے باعث اطمینان اور باعث سکون رہی تھی اور میں اسے بے حد پسند کرتی تھی۔

''کاش یہ سب کچھ امر ہوجائے اور ہم ایک دوسرے کو اسی طرح چاہتے رہیں۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا لیکن اگلے ہی لمحے میں خوفزدہ ہوگئی۔ اسی طرح کی سوچوں نے پہلے بھی میری زندگی عذاب بنادی تھی۔

ٹونی نے مجھے اپنے قریب کرلیا۔ مجھے اس کی سیاہ آنکھیں اپنے چہرے پر لگی محسوس ہورہی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت اور ہینڈسم شخص تھا۔

''میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں' فینی!'' اس کی سرگوشی میری لمبی گردن کو گدگدا رہی تھی۔

''بتاؤ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں۔''

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اوہ! میں نے کرب سے سوچا۔ خوشیوں اور مسرتوں کی اس رات میں ایک بار پھر ہم پرانی بحث کا آغاز کرنے جا رہے تھے۔ بس اس ایک بحث کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔

میں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کا چہرہ قریب لانا چاہا لیکن وہ پیچھے ہٹ گیا۔ تب میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ٹونی نے مجھے گھسیٹ لیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ تھام لیا اور میری آنکھوں کو سامنے کرنے کی کوشش کی تاکہ میں اسے براہ راست دیکھ سکوں۔

''میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ تم میرے سوال کا صاف صاف جواب دے دو۔'' اس نے دھیمے پن سے کہا۔ ''میں یہ جاننے کا حق رکھتا ہوں کہ آخر ہمارا یہ تعلق کس طرف جا رہا ہے۔''

''یہ کوئی ضروری تو نہیں۔'' میں نے کسمساتے ہوئے خود کو اس سے دور کرنے کی کوشش کی۔ ''تم آخر شادی کو میرے اور اپنے درمیان سے نکال کیوں نہیں دیتے' ٹونی! مجھے اس طرح تم سے ملان اور ایک دوسرے کے سنگ وقت گزارنا بہت اچھا لگتا ہے۔ تم شادی کے بارے میں باتکر کے ان خوش کن گھڑیوں کو تباہ کیوں کر دیتے ہو۔''

ٹونی نے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کا ماتھا لکیروں سے بھر گیا تھا۔ ''ہم ہمیشہ اسی طرح نہیں رہ سکتے فینی!'' اس کا لہجہ خاصا سخت تھا۔ ''تمام لوگ شادیاں کرتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے زندگی گزار سکیں۔ تم آخر یہ سب کیوں نہیں سمجھتیں۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ میری آنکھیں نمناک ہونے لگی تھیں۔ ''لیکن اس سے میرے احساسات پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن میں کبھی تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی' خاص طور پر اپنے ماضی کی روشنی میں۔''

''اس لیے کہ تم نے غلطیاں کیں۔''

''ہاں' دو بڑی غلطیاں' جنہیں میں اب کبھی دہرانا پسند نہیں کروں گی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جب میں اپنے دوسرے بندھن سے آزاد ہوئی تھی' تب ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب میں کبھی اس صلیب پر نہیں چڑھوں گی۔''

ٹونی ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گیا۔ ''تم میری باتوں کو سمجھ نہیں پا رہیں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''ہم ڈیڑھ دو سال سے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ تم اس عرصے میں مجھے اچھی طرح پہچان چکی ہو۔ میرے ظاہر اور باطن کو اچھی طرح جانتی ہو اور میرے خیال میں' میں تمہارے اور بچوں کے لیے درست آدمی ہوں' ورنہ تم عرصہ دراز پہلے مجھے چھوڑ چکی ہوتیں۔''

میں خاموش رہی۔ ٹونی نے مجھے جھنجوڑ کر جیسے بیدار کیا تھا۔ ''بولتی کیوں نہیں۔''

میں نے نمناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم مجھے یوں شادی کے لیے مجبور تو نہیں کر سکتے اور اگر تم ایسا کرنے کی کوشش کرو گے تو میں تم سے دور ہو جاؤں گی۔''

وہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا' اسے میری بات سے دکھ پہنچا تھا۔

''درحقیقت تم ایک اور خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں ہو' کیوں یہی بات ہے نا۔''

''شاید! لیکن اگر تم اپنے دعوے کے مطابق مجھ سے واقعی بے تحاشا محبت کرتے ہو تو شادی کا بھول جاؤ اور میرے ساتھ یونہی رہتے رہو۔'' میں پھر اس کے قریب ہو گئی۔ ''تم جانتے ہو کہ تم کسی بھی وقت یہاں آ سکتے ہو۔ بچوں کو میں سنبھا

لوں گی' وہ بھی تم سے پیار کرتے ہیں۔''

''نہیں۔'' ٹونی نے جبڑے بھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ایسے کسی سیٹ اپ کے حق میں نہیں۔ تم مجھے قدامت پسند کہہ لو یا کچھ اور' مگر میرا یہ فیصلہ ہے کہ شادی ہوگی ورنہ کچھ نہیں .....'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''تب پھر کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنا ضبط کھو بیٹھی۔ میں دوبارہ کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگا سکتی' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

ٹونی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ شاید اسے مجھ سے ایسے فیصلے کی توقع نہ تھی۔ خود میری حالت بھی بہتر نہ تھی میرے ہونٹ کانپ رہے تھے اور یوں لگتا تھا' جیسے میں ابھی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دوں گی لیکن بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا۔

''کیا کہہ رہی ہو' تم۔'' وہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد بولا تھا۔

''میں صحیح کہہ رہی ہوں' جو تم اپنے لیے بہتر سمجھتے ہو۔ تم کرو اور جو میں مناسب سمجھتی ہوں' مجھے کرنے دو۔''

ٹونی چند ثانیے خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مجھ پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔

میں بستر پر لیٹی تو کوشش کی کہ اس بارے میں نہ سوچوں کہ اس کا مجھ پر اور میرے بچوں پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ اسکاٹ اور گلین دونوں ہی ٹونی سے محبت کرتے تھے۔ چند ثانیے تو میں اپنے ارادے پر قائم رہی لیکن پھر میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں سسکیاں لے کر رونے لگی۔

ٹونی نے اور میں نیا یک دوسرے کی معیت میں بہت اچھا وقت گزارا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی یوں چپکے سے جدا ہو جائیں گے۔

میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ میری سسکیاں کم ہوگئیں اور میں حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی لیکن تب بھی میری سوچیں ٹونی کے گرد ہی گھومتی رہیں۔ کیا واقعی ٹونی کبھی واپس نہ آنے کے لیے چلا گیا ہے۔ اس سوچ نے مجھے اتنا خوفزدہ کیا کہ میں چونک کر اٹھ بیٹھی اور کچھ دیر میں سر پکڑے بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔ نیند نہیں آ رہی تھی' سوچا کہ چائے بنا کر پیوں شاید اسی طرح دل کو کچھ قرار آ جائے۔

آخر میں ٹونی کو کیوں نہیں سمجھا سکی کہ اب میں شادی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی! مجھے اس بات پر حیرت تھی۔ میں نے دو ناکام تجربے کیے تھے جن کی وجہ سے میرے پاس کافی دلائل تھے لیکن میں ان میں سے کوئی بھی دلیل نہیں دے سکتی تھی۔

اگر مجھے ایک بار طلاق ہوئی ہوتی تو یہ کوئی ایسی خاص بات نہ تھی لیکن مجھے پے در پے دو بار اپنا گھر چھوڑنا پڑا تھا جس کی وجہ سے لوگ بھی حیران تھے اور وہ مجھے ہی قصوروار سمجھتے تھے۔

میں نے اپنے پہلے شوہر مائیک سے اس وقت شادی کی' جب میری عمر سولہ سال تھی۔ اس شادی کی صرف ایک وجہ تھی کہ میں ماں بننے والی تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ مائیک اپنے بھورے بالوں' رسیلی آنکھوں اور دل خوش کن مسکراہٹ کی مانند خود بھی حیرت انگیز ثابت ہوگا۔ ہم ایک پارٹی کے بعد تنہائی میں ملنے کے مجرم ہوئے تھے اور اسی تنہائی نے ہماری زندگی بدل ڈالی تھی۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اس کا اظہار اس وقت تک نہیں ہوا' جب تک میں نے مائیک کو یہ نہیں بتایا کہ میں اس کے وارث کو جنم دینے جا رہی ہوں۔ ہمارے والدین اس صورتحال سے زیادہ خوش نہ تھے لیکن انہوں نے ہماری ہر ممکن مدد کی۔

مائیک اس زمانے میں اپرنٹس شپ پر تھا' چنانچہ مجھے اپنے خاندان کے ساتھ ہی رہنا پڑا۔ ممی' ڈیڈی اور میری بہنوں نے کبھی اس پر ناک بھوں نہیں چڑھائیں لیکن خود مجھے اور مائیک کو تنہائی کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔

میرے والدین ہمیں اکثر و بیشتر نصیحتیں کرتے رہتے کہ ہم اپنے ہونے والے بچے کا نام کیا رکھیں اور یہ کہ مائیک کی کم تنخواہ کو ہمیں کس طرح خرچ کرنا چاہیے لیکن میرے اپنے خیالات تھے چنانچہ جب میرا بچہ پیدا ہوا تو میں نے اسے اسکاٹ کے نام سے پکارنا شروع کردیا۔ مائیک نے حیرت انگیز طور پر اس میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔

اسکاٹ کی پیدائش کے بعد' مائیک نے مجھے ایک مقامی دکان میں پارٹ ٹائم جاب کے لیے کہا۔ اس کے باوجود میں اسکاٹ کو بہت چاہتی تھی لیکن گھر پر رہ رہ کر بور ہوجانے کے باعث میں نے فوراً اس پر رضامندی ظاہر کردی۔ ممی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ بچے کا ہر ممکن خیال رکھیں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر میں ملازمت شروع کردیتی تو ہم لوگ بہت جلد اپنا الگ گھر لینے کے قابل ہوجاتے۔

میں نے ملازمت شروع کردی اور پھر ایک روز ہم لوگ اپنے فلیٹ میں منتقل بھی ہوگئے۔ یہ کوئی بڑا گھر نہیں تھا محض ایک لونگ روم' ایک بیڈ روم' چھوٹے سے کچن اور ایک باتھ روم پر مشتمل تھا لیکن یہ میرے اور مائیک کے لیے جنت سے کم نہ تھا اس لیے ہم دونوں ہی بے حد خوش تھے۔

بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ میری اور مائیک' دونوں کی عمریں بھی کم تھیں اور ہم میں سے کوئی بھی ابھی شادی کی بھاری ذمے داریاں اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ میں نے الگ گھر اس لیے لیا تھا کہ ہم دونوں مل کر اپنی زندگی گزاریں گے لیکن' مائیک کو تو گویا آزادی کا پاسپورٹ مل گیا اور وہ مجھے اور اسکاٹ کو تنہا چھوڑ کر راتوں کو اپنے دوستوں کے ساتھ باہر رہنے لگا۔

میں نے صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ جب کبھی میں اور مائیک تنہا ہوتے' میں اسے مختلف انداز میں سمجھاتی لیکن معاملات روز بروز بگڑتے گئے۔ مائیک میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ حتیٰ کہ ہمارا بچہ بھی ہمارے درمیان پل نہ بن سکا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ بچے' میاں بیوی کے درمیان رابطے اور پل کا کام دیتے ہیں لیکن شاید میں اور مائیک بہت ہی زیادہ نوجوان اور ناتجربے کار تھے کہ اس رابطے سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

دن رات یونہی گزرتے رہے' حتیٰ کہ مجھے دوسری بار اپنے اندر تبدیلیاں محسوس ہوئیں۔ میں ایک بار پھر ماں بننے والی تھی۔ میں نے اور مائیک نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی ناکامی ہی ہوئی۔ ایک بچہ ہماری شادی کو سہارا نہ دے سکا تو ظاہر ہے' دوسرا بھی ناکام ہی رہتا۔ چنانچہ ہم دونوں نے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔

میں اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوئی کہ ممی نے کسی اعتراض کے بغیر میری ملازمت کے دوران اسکاٹ اور گلین کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لی۔

''یہ میرے نواسا نواسی ہیں۔'' میں اگر کبھی ان کا شکریہ ادا کرتی تو وہ مجھے خاموش کرادیتیں۔

لیکن ممی کے تعاون اور مدد کے باوجود میں دو بچوں کی ذمے داریاں نبھانے کو تنہا تھی۔ زندگی اچانک ہی میرے لیے مشکل ترین ہوگئی تھی۔ مائیک اتنا بے پروا اور بے فکر ثابت ہوا کہ اس نے پلٹ کر میری اور بچوں کی خبر بھی نہ لی' چنانچہ میں نے زندگی کو اپنے ڈھب سے گزارنا شروع کردیا۔ تب مجھے ڈان ملا' وہ اپنے انکل کی بیماری کے باعث اس کے جنرل اسٹور پر کام کے لیے

آیا تھا۔ اس سے ملنے سے پہلے ہی میں اس کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی تھی۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت محنتی شخص ہے' اس کا ایک بچہ بھی ہے جو گلین سے چند ماہ بڑا ہے۔ اس کی بیوی بچے کی پیدائش کے دوران انتقال کر گئی تھی۔ میں اس کے بارے میں خاصی تجسس سی تھی چنانچہ ایک روز میں اس کی دکان پر چلی گئی۔

وہاں کونے میں رکھے خالی ڈبوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

''یہ میرا بیٹا جوائے ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''اسے میں اپنے ساتھ دکان پر لے آتا ہوں کیونکہ ابھی تک مجھے اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہیں ملا۔''

''میں اسے اپنے ساتھ گھر لے جاتی ہوں۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''تم کام ختم کر کے لے جانا۔''

''میں شکر گزار ہوں گا۔'' اس نے ممنونیت سے مجھے دیکھا۔ ''جب میں اسے لینے آؤں گا تو تم میرے ساتھ ڈنر پر چلنا۔''

''یہ شاید نہ ہو سکے۔'' میں نے اپنے انکار کو مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کی۔ ''میرے اپنے دو بچے ہیں اور۔''

''صرف پزا پارلر تک چلیں گے۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''سب کو ساتھ لے لیں گے' جوئے پزا بہت شوق سے کھاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے دونوں بچے بھی پسند کریں گے۔''

اور یوں میرے اور ڈان کے مابین باہمی تعلق پیدا ہوا۔ میں جوائے کے سلسلے میں اس کی مدد کرتی اور وہ اسکاٹ اور گلین کا خیال رکھتا۔ چھ ماہ بعد اس نے مجھ سے شادی کو کہا۔

میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی اس لیے مجھے اعتراف تھا کہ میں ڈان سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن میرے دل میں اس کی بے حد عزت تھی۔ ذاتی طور پر میں بہت تھک چکی تھی کیونکہ سارا دن کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے کھڑے میرے پاؤں دکھنے لگتے تھے جس کے بعد گھر آ کر مجھے اسکاٹ اور گلین کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔

یہ شاید میرے اندر کی آواز تھی کہ ڈان ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا اور میں پھر سے اچھی بیوی بن جاؤں گی۔ رہ گئی محبت تو مجھے وہ محبت ہرگز نہ تھی جس کے بارے میں' میں نے صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ شادی کے بعد بھی شاید میں نے مائیک سے کتابوں والی محبت نہ کی تھی لیکن میرا ارادہ تھا کہ میں ڈان کے ساتھ وہ غلطی نہیں دہراؤں گی۔

چند سال یہی ہوا۔ ڈان کے ساتھ میں کامیاب زندگی گزارنے لگی تھی۔ ہمارے درمیان کبھی لڑائی تو درکنار تلخ کلامی بھی نہیں ہوئی۔ ڈان کے انکل کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ہم انہی کے گھر میں رہ رہے تھے۔

لیکن پھر ایک حادثے نے ہماری خوشگوار زندگی میں جیسے زہر گھول دیا۔ ایک گرم ویک اینڈ پر میں نے اور ڈان نے بچوں کے ساتھ قریبی جھیل پر پکنک کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ جھیل پر ایک جگہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے لگے لیکن دس سالہ جوائے اکیلا ہی دور نکل گیا۔ اس نے کپڑے اتارے اور تیراکی کے لیے جھیل میں اتر گیا لیکن کبھی واپس نہ آ سکا۔

اس کی موت کے بعد گزرنے والے دن' ہفتے اور مہینے واقعتاً کربناک تھے۔ ڈان مجھے اپنے غم میں حصے دار نہ بنا سکا جبکہ میں خود اپنے دل پر پتھر رکھے ہوئے تھی۔ اس کے خیال میں مجھے جوائے کی موت کا کوئی خاص دکھ نہیں تھا کیونکہ اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا لیکن وہ غلطی پر تھا۔ میں بھی جوائے کے لیے ڈان جتنی ہی افسردہ تھی' فرق صرف اتنا تھا کہ میں اپنے دکھ کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ ڈان اس حادثے کے بعد بتدریج بدلتا چلا گیا۔ اس نے میرے پاس آنا

چھوڑ دیا۔ وہ رات گئے تک دکان پر کام کرتا رہتا اور گھر واپس آنے کے بجائے کسی پب میں بیٹھ کر شراب پینے لگتا۔

چند ایک بار میں نے بچوں کو ایک بے بی سٹر کے پاس چھوڑا اور شراب خانے گئی تاکہ ڈان سے بات کرسکوں اور اسے وہ اچھے دن یاد دلاسکوں جو ہم نے ایک دوسرے کے سنگ سنگ گزارے تھے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ڈان ہمیشہ کندھے اچکا کر رخ پھیر لیتا اور میں ناکام واپس آجاتی۔

میں نے اپنا دکھ اپنے بچوں سے بھی چھپایا تھا' اس توقع پر کہ ڈان ایک دن اپنے ہوش وحواس میں لوٹ آئے گا لیکن صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس کے برعکس مجھ تک یہ افواہیں بھی پہنچیں کہ ڈان اب اکیلے مے نوشی نہیں کرتا بلکہ ایک عورت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ عورت کا نام روز تھامپسن تھا اور وہ ایک بیکری چلاتی تھی۔

روز ایک عام سی عورت تھی۔ ایک آدھ بار میں بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ بظاہر اس میں کوئی ایسی کشش نہ تھی کہ ڈان اس کی طرف راغب ہوتا لیکن دونوں میں ایک بات ضرور مشترک تھی۔

روز کا ایک بیٹا جو جوانی سے کچھ چھوٹا تھا' ایک حادثے میں چل بسا تھا اور ڈان کے خیال میں وہ اس کا دکھ جانتی تھی اور اس طرح اس کے غم میں حصے دار بن سکتی تھی جس طرح میں نہیں بن سکتی تھی۔

میں نے یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ میرا شوہر کسی اور عورت کے ساتھ معاشقہ لڑا رہا ہے' کوشش کی کہ اپنی زندگی معمول کے مطابق جاری رکھوں لیکن دکھ تو اپنی جگہ بہرحال تھا جس کا میرے پاس کوئی علاج نہ تھا۔

تب ایک رات ڈان نے مجھ سے طلاق کے بارے میں پوچھا تاکہ وہ روز سے شادی کرسکے۔

میں دکھ اور غصے کی شدت سے چلا اٹھی۔ ڈان نے مجھے شانوں سے پکڑ کر اپنی سمت گھما لیا۔ ''ہماری زندگی میں پہلے سے ایک بات کی کمی رہی ہے۔'' اس نے مجھے بتایا۔ ''اور تم جانتی ہو کہ اس کی کیا وجہ ہے۔''

جس بات کی طرف وہ اشارہ کررہا تھا' میں اسے بخوبی سمجھ رہی تھی۔

''دیکھو فینی! میں تمہارا اور تمہارے بچوں کا پوری طرح خیال رکھوں گا۔'' ڈان نے مجھے یقین دلایا۔ ''تم گھر' کار' فرنیچر اور جو چاہو اپنے پاس رکھ سکتی ہو۔ میں صرف اپنی آزادی چاہتا ہوں۔''

میں نے جب ڈان سے شادی کی تھی' اس وقت میرے پاس ایک پنس بھی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے میں ڈان کی شکر گزار تھی لیکن اس کے باوجود مجھے اس کے فیصلے سے بے انتہا دکھ ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا' جیسے وہ مجھ سے اور میرے بچوں سے جان چھڑانا چاہتا ہو۔ چنانچہ اسی وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اب شادی نہیں کروں گی۔

مجھے اس کا اعتراف تھا کہ میرے مسائل کے حل کے لیے شادی ضروری نہیں تھی' میں تنہا بھی خوش رہ سکتی تھی۔ ڈان کی یقین دہانی نے زندگی کو میرے لیے محفوظ اور آسان بنا دیا تھا۔

کچھ عرصے بعد مجھے ٹرینی ہیئر ڈریسر کی حیثیت سے دوبارہ ملازمت مل گئی۔ میں نے مطلوبہ امتحانات پاس کیے اور پھر خود کو اپنے بچوں کے لیے وقف کردیا۔

میں زندگی میں پہلی بار اپنی ذات اور زندگی کی مالک بنی تھی اس لیے میں نے اپنے طور پر بہت سے ایسے فیصلے کیے جو میرے لیے بہتر ہوسکتے تھے' چنانچہ میں نے کارمینٹی نینس کے ایک نائٹ اسکول میں داخلے کا فیصلہ بھی کیا تاکہ اپنی کار کی خود مرمت کرسکوں۔

ٹونی نائٹ اسکول کا انسٹرکٹر تھا اور پہلے ہی دن جب میں کلاس میں داخل ہوئی تو اسے بلیک

بورڈ کے پاس کھڑے دیکھ کر میرا دل زور سے اچھلا تھا اور پھر جب وہ رجسٹر سے میرا نام پکارتے ہوئے مسکرایا تو اسی وقت مجھے پتا چل گیا کہ وہ میری زندگی میں کوئی اہم مقام حاصل کرنے والا ہے۔

اس رات ٹونی نے بتایا کہ نصف کلاسز تو کالج میں ہوں گی اور باقی نصف اس کے گیراج میں جہاں وہ بعض عملی کام جیسے آئل تبدیل کرنا اور ریڈی ایٹر وغیرہ صاف کرنا بھی سکھائے گا۔ اس کا پہلا لیکچر صرف اسی بارے میں تھا کہ بونٹ کے نیچے کیا ہوتا ہے۔

کلاسز کے درمیان بیس منٹ کا وقفہ تھا' چنانچہ ٹونی کلاس ممبرز کو کینٹین پر لے گیا۔

''یہاں ویڈنگ مشینیں لگی ہوئی ہیں۔'' اس نے اسٹوڈنٹس کو آگاہ کیا۔ ''اپنی پسند کے مطابق چائے یا کافی حاصل کرلو۔''

اس نے ہمیں طریقہ بتایا اور پھر پورے وقفے میں وہ ہمارے درمیان بیٹھا خوش گپیاں کرتا رہا۔

ٹونی کے بارے میں میرے احساسات یک طرفہ نہ تھے بلکہ اس شام کئی بار اسے بھی میں نے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ جب بھی وہ کسی سوال کا جواب دیتا' میری طرف ضرور دیکھتا اور مسکرا دیتا۔

ٹونی نے پہلی مرتبہ مجھے اپنے ساتھ باہر چلنے کو اس وقت کہا' جب ہم اس کے گیراج میں بیٹری کی جمپ اسٹارٹ کے بارے میں عملی کام سیکھ رہے تھے۔

میں نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس کی توقع تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ آتش عشق یک طرفہ نہیں۔

ٹونی کا دفتر خاصا بڑا تھا جس میں وہ آرام چیئرز اور پرانی میز' دو ویڈنگ مشین اور ایک ویڈیو گیم موجود تھا۔ ''اس سے گاہکوں کے بچے خوش ہوتے ہیں۔'' اس نے کافی بناتے ہوئے مجھے بتایا پھر وہ میری طرف پلٹ آیا۔ ''میں نے تمہاری انگلی میں شادی کی انگوٹھی نہیں دیکھی۔''

میں نے چند ثانیے سوچا اور پھر اسے مختصراً اپنی زندگی کے بارے میں بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹونی یہیں سے واپس ہو جائے گا لیکن جب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اندازہ ہوا کہ میرے ماضی کا اس کے مستقبل کے منصوبوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

''زندگی سیکھتے رہنے کا نام ہے۔'' اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''میں نے کبھی شادی نہیں کی لیکن میرے چند بہت قریبی احباب۔''

''تم نے کبھی شادی نہیں کی۔'' میں نے اس کا جملہ کاٹا کیونکہ میں حیران تھی کہ اس ہینڈسم کی تنہائی کی وجہ کیا ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''درحقیقت میں وقت' جگہ اور لڑکی ان کو کبھی بیک وقت اکٹھا نہیں کرسکا۔'' وہ ہنسا اور اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ میرا پورا بدن جھنجھنا اٹھا۔ ''جمعے کی رات کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' اس نے پوچھا۔ ''شہر میں ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے' کیا تم میرے ساتھ وہاں جانا پسند کرو گی۔''

''کیوں نہیں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

جمعے کی رات کا ڈنر میرے اور ٹونی کے درمیان دوستی کا آغاز ثابت ہوا۔ چند ہی ماہ میں حالت یہ ہوگئی کہ ہم نے کھانا اکٹھے کبھی اس کے اور کبھی میرے گھر کھانا شروع کردیا۔ ہم بچوں کو اکثر باہر لے جاتے اور بیشتر وقت میں اور ٹونی ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارتے۔

پورا ایک سال ہم نے ایک دوسرے کی قربتوں میں گزارا لیکن اس کے باوجود میں ٹونی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی تھی اور نہ اس سے شادی کرسکتی تھی۔ یہ ہم دونوں کے لیے ہی دکھ کا

باعث تھا لیکن مجھے امید نہ تھی کہ کوئی بھی اپنی سوچ میں تبدیلی لاتا۔

اس کے باوجود کہ ٹونی ناراض ہو کر گیا تھا' مجھے یقین تھا کہ ٹونی کل مجھے فون کرے گا اور ہم ہمیشہ کی طرح دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔

صبح جب میں سیلون پہنچی تو بہت سا کام میرا منتظر تھا' چنانچہ مجھے ٹونی کے بارے میں سوچنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ دوپہر کے وقت میں نے گھڑی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ اس نے لنچ ڈیٹ کے بارے میں فون نہیں کیا لیکن جانے کیوں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور لنچ کے لیے اس کیفے کی طرف چل دی جہاں ہم عموماً لنچ لیا کرتی تھے۔

میں نے کیفے میں نگاہ دوڑائی لیکن ٹونی وہاں موجود نہ تھا' مجھے مایوسی سی ہوئی۔ اب بات میرے بس میں نہ رہی تھی' چنانچہ لنچ کے بعد اس کے گیراج کی طرف چل پڑی۔

ٹونی گریس میں لتھڑا ہوا میرے سامنے آیا۔ وہ اس وقت ایک کار کے نیچے گھسا ہوا تھا۔

''سوری' ایک غیر متوقع بریک جاب آ گیا تھا۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔''

''تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ شاید وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے تعلقات پر نظر ثانی کر لیں۔''

میں ایک لمحے کے لیے تو کچھ نہ کہہ سکی۔

''کیا میں نے یہ کہا تھا۔'' بالآخر میں نے پوچھا۔

ٹونی ہاتھ صاف کرتا ہوا مجھے اپنے دفتر کی طرف لے چلا۔ ''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن تم نے مجھے وہ کرنے کو کہا تھا جو میرے لیے درست ہے اور میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔''

''تو اس کا کیا مطلب ہوا۔'' میں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ٹونی نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے میرا جائزہ لیا اور بولا۔ ''میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کا دردِ سر نہ بنیں۔ تم مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں اپنا ذہن تبدیل کرنے کو تیار نہیں اور میں موجودہ صورت حال سے تھک گیا ہوں۔ میں افیئر سے زیادہ شادی چاہتا ہوں۔'' وہ رکا کہ شاید میں کوئی احتجاج کروں گی لیکن جب میں خاموش رہی تو وہ بولا ''میرے خیال میں ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ اب وقت نہیں گزارنا چاہیے۔

میرا حلق خشک ہو گیا اور مجھے اپنی پلکوں کے عقب میں آنسوؤں کی گرمی محسوس ہونے لگی۔

''کیا ڈیڑھ سال کی رفاقت کا انجام یہی ہوتا ہے۔''

''تب پھر مجھ سے کیا چاہتی ہو۔'' ٹونی نے رکھائی سے پوچھا۔ ''یہ انجام نہیں' تمہاری خواہشوں کی تکمیل ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اب تم یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہو جیسے میں نے تمہیں چھوڑا ہے حالانکہ مجھے یہاں تک پہنچانے میں سارا قصور تمہارا ہے۔''

''او کے' میں سمجھ گئی۔'' میں نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اپنی زندگی میں تمہاری کمی شدت سے محسوس کروں گی۔''

اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے رخسار پر آ جانے والی بالوں کی ایک لٹ ہٹائی۔ ''میں ہمیشہ تمہاری زندگی میں رہوں گا لیکن زیادہ نہیں۔'' اس نے طویل سانس لی۔ ''تم میری بہترین دوست ہو۔ ہم اب بھی اکٹھے لنچ اور ڈنر لیں گے۔ میں ہمیشہ کی طرح بچوں سے ملنے بھی آؤں گا اور جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے' چند ہفتوں میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر تم میری زندگی سے نکلنا چاہتے ہو تو اس طرح نہیں

مکمل طور پر نکل جاؤ۔ میرے ساتھ لنچ یا ڈنر کھانے یا میرے بچوں سے بھی ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی کیونکہ مجھے علم تھا کہ اگر میں ایک منٹ بھی مزید ٹھہر جاتی تو اس کے بازوؤں میں قید سسکیاں لے رہی ہوتی۔

لیکن جب میں کار میں سوار ہوئی تو آنسو میرے گالوں سے بہہ بہہ کر نیچے ٹپک رہے تھے۔ میں سسکیاں لیتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی اور کافی دیر تک خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

میں سوچ رہی تھی کہ میرے ساتھ گڑبڑ آخر کیا ہے۔ میں نے خود ہی تو ٹونی سے کہا تھا کہ وہ اپنے لیے جو درست سمجھتا ہے کرے' اب اگر اس نے میری نصیحت پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میں رو کیوں رہی تھی۔

میں نے کار اسٹارٹ کی۔ ہم جس نہج پر پہنچ گئے تھے' وہاں تعلقات کی تجدید کا امکان نہیں رہ گیا تھا۔ ''اب میں کیا کروں۔'' میں نے سوچا۔

''کچھ نہیں!'' اپنے ہی سوال کا میں نے یہ آواز بلند جواب دیا لیکن اس سے بھی میری ذہنی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

میرا غصہ چونکہ عروج پر تھا' اس لیے میں نے ٹونی کو مکمل طور پر اپنی زندگی سے نکال باہر کیا لیکن اگلے ایک آدھ ہفتے ہی میں مجھے بری طرح محسوس ہوا کہ کہنے سے کرنا زیادہ مشکل ہے۔ میں ٹونی کی کمی محسوس کر رہی تھی۔ میں روزانہ اس کے ٹیلی فون اور میرے تحفظ کے لیے موجود ہونے کی یقین دہانیوں کی عادی سی ہوگئی تھی۔ ٹونی نے اپنے طور پر کوشش کی تھی۔ اس نے فون بھی کیے لیکن میں نے لنچ پر اس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔

اس انکار کی وجہ سے میرے بچوں نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے۔ انہیں بھی ٹونی کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ ''جب سے آپ نے ٹونی کو چھوڑا ہے' آپ عصیلی ہوگئی ہیں۔'' گلین نے ایک روز شکایتاً کہا۔

''نہیں اس کے آنے یا نہ آنے سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہ تھی کہ وہ درست کہہ رہی ہے۔

''آپ آخر ٹونی سے شادی پر تیار کیوں نہیں ہو جاتیں۔'' اسکاٹ نے لب کشائی کی۔ ''میرا اور گلین کا خیال ہے کہ وہ بہت اچھا باپ ثابت ہوگا۔''

''یہ اتنا آسان کام نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو کہ میری شادی کامیاب نہیں ہوئی اور میں نہیں چاہتی کہ مجھے ایک اور طلاق ہو' میں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس سے پہلے کسی بہتر آدمی سے شادی نہ کی ہو۔'' گلین نے سنجیدگی سے کہا۔

''ممکن ہے۔'' میں اس کی تائید کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ آپ دونوں کی ناراضگی کے باعث ہم بھی اس سے نہیں مل پا رہے۔'' اسکاٹ بولا۔

''کل ٹونی نے فون کیا تھا۔'' گلین نے انکشاف کیا۔ ''اس نے مجھے اور اسکاٹ کو ہفتے کے روز اسٹاک کار ریسز دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ ہم اس کے ساتھ جانا چاہتے ہیں' کیا آپ اجازت دے دیں گی۔''

یہ کوئی اچھی بات نہ تھی کہ وہ میرے اختلافات کی بھینٹ چڑھتے' جبکہ دوسری طرف میں صورت حال پر بھی تفصیلی غور کرنا چاہتی تھی۔ ''ٹھیک ہے' دیکھیں گے۔'' میں نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ نہیں۔'' گلین بھی ایک آفت کی پرکالہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکاٹ بھی مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے دونوں کو مجھ سے ایسی امید نہ تھی۔

☆☆

اس رات میں بلک بلک کر روئی۔ ٹونی کی جدائی مجھ سے برداشت نہ ہو پا رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ ہونے والی بات چیت سے بھی یہ ثابت ہوگیا تھا کہ ٹونی ہماری زندگیوں کے لیے خاصی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور بچے صرف اسی کو باپ کی حیثیت سے قبول کریں گے۔ اس لحاظ سے اگر میں انہیں اس کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دیتی تو پرلے درجے کی خودغرض ہوتی۔

اگلے روز سیلون پر بھی میں بے حد نروس رہی۔ میری باس ونڈا نے میری حالت کو فوراً محسوس کرلیا۔

''کیا بات ہے فینی۔'' اس نے پوچھا۔

''پریشان لگ رہی ہو۔'' میں خاموش رہی تو وہ پھر بولی۔ ''یوں کرو، باقی وقت کی چھٹی کرلو اور گھر جا کر فریش ہو جاؤ۔''

میں نے دانتوں پر دانت جما کر اثبات میں سر ہلایا اور باقی ماندہ گاہکوں کی طرف زبردستی کی مسکراہٹ اچھالتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

باہر ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ ٹونی کار لیے سامنے موجود تھا۔

''میں تم سے اسکاٹ اور گلین کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے مجھے حیران ہونے کا موقع دیے بغیر کہا۔ ''انہوں نے مجھے آج فون پر بتایا ہے کہ تم انہیں مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں دے رہیں۔''

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ ''دیکھو فینی! ہم دونوں کے لاکھ اختلافات سہی لیکن ہمیں بچوں کو کوئی تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ میں ان سے پیار کرتا ہوں اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں، کیا تم ہفتے کے روز انہیں میرے ساتھ ریس پر چلنے کی اجازت دے دو گی۔''

وہ کچھ اور قریب سرک آیا۔ اب میں اس کے آفٹر شیو لوشن کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ ''تم بھی کیوں نہیں آجاتیں۔''

ٹونی کو قریب پاکر، اس کی آواز سن کر اور اس کا لمس محسوس کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ میں کس شدت سے اس کی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ میں اس کے قریب رہنا چاہتی تھی۔

''ٹھیک ہے، ہم سب تمہارے ساتھ ریس پر چلیں گے۔'' اس سے پہلے کہ میرا ذہن بدلتا، میں نے فیصلہ سنا دیا۔

اس نے میرا ہاتھ دبایا اور مسکرا دیا۔ ''یہی میں سننا چاہتا تھا۔ میں مین ریس میں ڈائیو کر رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تم میرا حوصلہ بڑھانے کو وہاں موجود رہو گی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے بعد کافی دیر خاموشی سے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ میں اس کے بازوؤں میں سما جانا چاہتی تھی لیکن دل پر جبر کر کے میں نے اسے خدا حافظ کہا اور واپس چل دی۔

ہفتے کا دن گرم تھا لیکن یہ گرمی میرے موڈ پر قطعی اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ میں ٹونی کے قریب رہنے کے تصور سے واقعتاً بے حد خوش تھی۔

☆☆

کاریں ایک قطار میں کھڑی ہونی شروع ہوئیں تو میں آگے کو جھک آئی تاکہ ٹونی کی کار پہچان سکوں۔ اسی وقت اسٹارٹر نے جھنڈی دکھائی اور کاروں نے دوڑنا شروع کر دیا۔

ٹونی نے فوراً کار آگے بڑھا دی اور جب اس نے ٹریک کا چکر پورا کیا تو وہ تیسرے نمبر پر

تھا۔ گلین اور اسکاٹ مارے جوش کے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ٹونی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

اچانک ہی ٹائر چرچرانے اور لوہے کے رگڑنے کی آواز پیدا ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ٹونی کی کار نے کئی قلا بازیاں کھائیں اور ٹریک کے اختتام پر لگے پفرز سے جا ٹکرائی۔

کار رک گئی۔ پورے گراؤنڈ میں شور مچ گیا اور لوگ صورت حال جاننے کے لیے اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی ان میں موجود تھی اور اس وقت میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ انتظامیہ کے لوگ ٹونی کی کار کی طرف بھاگے۔ میں ان کی افراتفری دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میرے گھٹنوں نے میرا وزن برداشت کرنے سے انکار کر دیا اور میں نے گرنے سے بچنے کے لیے اسکاٹ کے کندھوں کا سہارا لے لیا۔

اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں ٹونی سے پیار کرتی ہوں' اس شدت کے ساتھ کہ پہلے کسی سے نہیں کیا۔ اس کے ساتھ تمام باتیں مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہوگئیں اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ٹونی کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔ اے میرے خدا! تو ٹونی کو محفوظ رکھنا۔

ٹونی کی کار کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہجوم کی طرف دیکھ کر اپنا ہیلمٹ لہرا رہا تھا۔

ٹونی اسٹینڈ کی طرف چلا تو میں نے خوش ہو کر گلین اور اسکاٹ کو بھینچ لیا۔ ٹونی کی نگاہیں ہمیں تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے بچوں کو وہیں چھوڑا اور دیکھنے والے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹونی کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔

چند ہی ثانیوں بعد میں اس کے بازوؤں میں تھی۔

''میں تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتی ہوں۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ابھی اور اسی وقت۔''

''بولو۔''

''میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں ٹونی!'' میں نے بے ترتیب سانسوں کے درمیان کہا۔

''یعنی تم کنویں میں چھلانگ لگانے کو تیار ہوگئیں۔''

ٹونی نے مجھے چھیڑا۔

''ہاں!'' میں نے شرما کر سر جھکا لیا اور ٹونی نے مزید شدت سے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

اندازِ فکر

☆ سکون پانا ہے تو دوسروں کی برائی کرنا اور قرض لینا چھوڑ دو۔

☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔

☆ فقیر سے فقیر پیشہ بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔

☆ توبہ کرنا آسان ہے اور گناہ چھوڑنا مشکل۔

☆ میں علم کے اس درجے تک یوں پہنچا کہ جو کچھ مجھے معلوم نہ تھا وہ میں نے معلوم کرنے میں شرم محسوس نہ کی۔

☆ اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے بلکہ ہر شخص کو اپنے سے بہتر سمجھنا چاہیے۔

☆ عیاری اور مکاری چھوٹے کمبل کی مانند ہیں کہ سر چھپاؤ گے تو پاؤں ننگے ہو جائیں گے۔

☆ غریب کی تعریف کرنا آسان ہے مگر اس کو برداشت کرنا مشکل۔

☆ عادت اکثر ضرورت میں بدل جاتی ہے۔

☆ سونا کان سے کان کنی کے بعد نکلتا ہے اور بخیل کے ہاتھ سے جان کنی کے بعد۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

محمد مقصود خان

قوت ارادی مضبوط ہو تو انسان بہت کچھ کرسکتا ہے۔ قبر سے بھی واپس آسکتا ہے بشرطیکہ اسے زندہ دفن کر دیا گیا ہو۔ رچرڈ میتھسن کی تازہ ترین خوفناک کہانی۔ اس لرزہ خیز تحریر کو رات میں پڑھنے سے احتراز کریں۔

اس شمارے کی ایک خوفناک کہانی

گھمبیر تاریکی میں سردی کے ساتھ پیاس کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جارہا تھا۔ آنکھ کھلنے کے بعد کئی سیکنڈ تک وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے لیکن نہ تو یادداشت کام دے رہی تھی اور نہ ہی تاریکی میں کچھ سجھائی دے رہا تھا۔ جس سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا۔ اس نے جمائی لیتے ہوئے اٹھنا چاہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کراہتا ہوا پشت کے بل ڈھیر ہوگیا۔ اٹھنے کی کوشش میں اس کی پیشانی کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ وہ پیشانی سہلانے لگا لیکن چوٹ کچھ ایسی لگی تھی کہ درد پورے سر میں پھیلتا چلا گیا۔

کچھ دیر تک وہ اسی پوزیشن میں لیٹا پیشانی سہلاتا رہا' اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ بھی نتیجہ پہلے سے مختلف ثابت نہیں ہوا تھا۔ اب کے اس کے منہ سے نکلنے والی کراہ پہلے کی نسبت زوردار تھی۔ وہ ایک بار پھر پیشانی سہلاتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ کونسی جگہ ہوسکتی ہے۔ مگر جب کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تو وہ......

دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنا حدود اربع معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ اوپر کسی ملائم اور ٹھوس چیز سے ٹکرائے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو حرکت دیتا رہا۔ جہاں تک اس کے ہاتھوں کی پہنچ تھی' وہاں تک چکنی اور ٹھوس چھت کا احساس ہورہا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دونوں مرتبہ اٹھنے کی کوشش میں اس کا سر اس ٹھوس سطح سے ٹکرایا تھا۔ یہ چھت اتنی نیچی تھی کہ بیٹھنے تک کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اپنے جسم کو بائیں طرف موڑنے لگا اور بمشکل کروٹ لینے میں کامیاب ہوسکا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھانا چاہا مگر اس کی طرف بھی اتنی گنجائش نہیں تھی۔ ہاتھ کسی چکنی سی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس نے دائیں طرف کروٹ بدلی اور اس کے ساتھ ہی یوں محسوس ہوا جیسے دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔ اس جانب بھی چند انچ کے فاصلے پر دیوار اس کا راستہ روکے ہوئے تھی۔ اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں اور رگوں میں خون ابلنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو ٹٹولنے لگا۔ اس کے جسم پر پورا لباس موجود تھا۔ پتلون' کوٹ' قمیض' ٹائی' بیلٹ اور پیروں میں جوتے تک موجود تھے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سیدھا کرلیا اور آہستہ آہستہ پتلون کی جیب میں داخل کرنے لگا۔ پسینے میں بھیگی ہوئی انگلیاں کسی ٹھنڈی اور ٹھوس چیز کا لمس محسوس کرنے لگیں۔ اس

چیز کو گرفت میں لے کر وہ بڑی مشکل سے اسے جیب سے باہر لانے میں کامیاب ہوسکا اور چہرے کے سامنے لاکر چند لمحے لرزتی ہوئی انگلیوں سے ٹٹولتا رہا پھر انگوٹھے کے دباؤ سے اس کا ڈھکنے کی طرح کا ایک حصہ اوپر اٹھا دیا۔ انگوٹھے ہی کی مدد سے ایک چھوٹی سی گراری گھمانے لگا۔ چند چنگاریاں سی پھوٹ کر رہ گئیں۔ دوسری مرتبہ کوشش کرنے سے لائیٹر جل اٹھا۔ لائیٹر کی زرد روشنی میں وہ چند لمحے اپنے آپ کو دیکھتا رہا پھر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ صورتحال کا اندازہ ہوتے ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔ وہ اس وقت ایک تابوت میں بند تھا۔ اسے زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔

یہ احساس ہوتے ہی لائیٹر اس کے ہاتھ سے گر کر بجھ گیا اور اس کے اطراف میں ایک بار پھر قبر کی تاریکی چھا گئی۔ سانسوں اور دل کی دھڑکن کے علاوہ اسے کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ وہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ یہاں کب سے ہے۔ منٹ، گھنٹے یا یہ دورانیہ دونوں پر محیط تھا۔

وہ اپنی ذہنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دل کو تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا کہ اس صورت حال کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ محض ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو تسلی دینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ حقیقت کو بھلانا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ کوئی ڈراؤنا خواب نہیں ٹھوس حقیقت تھی۔ وہ قبر میں بند تھا۔ اسے تابوت میں لٹا کے زندہ دفن کر دیا گیا تھا' اس کا ذہن جب کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ اس کی خوب صورت بیوی ٹریسی' جو عمر میں اس سے تقریباً پندرہ سال چھوٹی تھی۔ ان دونوں نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بڑی اچھی ترکیب سوچی تھی اور خود اس کے خیال میں بھی شاید اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا تھا کہ انسان کو زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ اس کی لاش تک دریافت نہ ہوسکے۔

تنگ اور تاریک تابوت میں لیٹتے ہوئے جیری کا جسم ہولے ہولے کپکپانے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک بار پھر سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

لیکن اس نے فوراً ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا اور سوچنے لگا کہ وہ انہیں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ وہ دونوں اسے زندہ دفن کر کے اس کے وسیع و عریض کاروبار اور لاکھوں کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن جیری کے خیال میں یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوسکتا تھا۔ جتنا انہوں نے سوچا ہوگا۔

لائیٹر تلاش کرتے ہوئے' جیری ایک بار پھر ان کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اپنے طور پر اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر مطمئن ہو چکے تھے۔ لیکن جیری کے خیال میں ان سے بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہو چکی تھیں۔ ایک بڑی غلطی تو یہ لائیٹر تھا جو اس کی جیب میں رہنے دیا گیا تھا۔ سونے کا لائیٹر ٹریسی نے اس کی چالیسویں سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔ جس پر چند حروف کندہ تھے۔ ''ٹریسی کی طرف سے محبت کا تحفہ۔''

''ٹھیک ہے۔'' جیری نے سوچا۔ تم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔ جائیداد بنانے اور کاروبار پھیلانے میں میں نے بڑی محنت کی ہے۔ تم لوگ اسے آسانی سے ہضم نہیں کرسکو گے۔ اس کے لیے تمہیں ناکوں چنے چبانے ہوں گے۔

جیری کو اچانک ہی یاد آ گیا کہ تقریباً ایک سال پہلے اس نے ایک وصیت نامہ تیار کیا تھا۔ جس کی رو سے اس کے مرنے کے بعد اس کی ساری جائیداد اور کاروبار اس کی چہیتی بیوی ٹریسی کو منتقل ہو جاتا لیکن اس کے کچھ ہی عرصہ بعد جب ٹریسی کے معاشقے کا انکشاف ہوا تو وہ سنجیدگی سے وصیت تبدیل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ٹریسی کا محبوب اس کی اپنی ہی کمپنی کا اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس دوران جیری نے ایسے لفظوں میں ٹریسی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اکاؤنٹنٹ سے اس کے تعلقات کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ٹریسی سنبھل گئی تو اسے وصیت نامہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن نہ تو ٹریسی نے اس کی باتوں پر توجہ دی اور نہ ہی وہ کاروباری مصروفیات کے باعث اب تک وصیت نامہ تبدیل کر سکا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وصیت نامے کی رو سے وہ بڑے اطمینان سے اس کی جائیداد اور کاروبار پر قابض ہو جائے گی۔

لائیٹر تلاش کر کے جیری نے ہاتھ سینے سے قدرے اوپر اٹھا کر گراری گھما دی۔ ننھی ننھی سی چنگاریاں خارج ہوتے ہی لائیٹر جل اٹھا۔ وہ اس مدہم روشنی میں اپنی اس قبر کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چاروں طرف چند انچ سے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ اس مختصر سی جگہ میں سانس لینے کے لیے کتنی ہوا ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے لائیٹر کا بھی خیال آ گیا جو اگر جلتا رہا تو زیادہ دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے لائیٹر بجھا دیا اور تاریکی میں گھورتے ہوئے سوچنے لگا کہ اپنے آپ کو اس قبر سے نکالنے کے لیے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ بالآخر حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ تابوت کی چھت پر ٹکا دیے اور جسم کی تمام تر قوت صرف کر کے ڈھکنے کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن ڈھکنے نے اپنی جگہ سے ذرا سی حرکت بھی نہیں کی۔ اس کے ہاتھ نیچے گر گئے۔ چند لمحوں کے بعد وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گھونسے برسانے لگا۔ چت لیٹے ہوئے اوپر کسی چیز پر پوری قوت سے گھونسہ مارنا آسان نہیں تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس کا جسم پسینے میں تر ہونے لگا۔ سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اب اس کے گھونسوں میں وہ طاقت نہیں رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پہلوؤں میں پھیلا لیے اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کیلوں سے جڑا ہوا تابوت کا ڈھکنا اس قدر مضبوط ثابت ہوا تھا کہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود وہ اسے معمولی سی حرکت بھی نہیں دے سکا تھا۔

اس نے پتلون کی بائیں جیب میں ہاتھ

ڈال کر کی چین نکال لی جس میں دو چابیاں موجود تھیں۔ چابیوں کو جیب میں پا کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اسے تابوت میں زندہ دفن کرتے ہوئے انہوں نے غالباً یہ سوچا ہوگا کہ دفتر اور کار کی چابیوں سے اب وہ مزید کوئی کام نہیں لے سکے گا۔ اس لیے یہ دونوں چابیاں اس کی جیب میں رہنے دی گئی تھیں اور جیری کے خیال میں یہ ان کی ایک اور غلطی تھی۔ کیونکہ یہ چابیاں قبر میں بھی اس کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی تھیں۔

اس نے ایک چابی انگلیوں میں پکڑ لی اور اس کے دوسرے سرے سے تابوت کی چھت پر کوئی جوڑ وغیرہ تلاش کرنے لگا۔ اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ چابی ایک جوڑ میں پھنس گئی۔ وہ چابی کو دائیں بائیں حرکت دے کر جوڑ کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ تابوت کا ڈھکنا لکڑی کا تھا۔ عام طور پر ڈھکنے کے اندر کی سمت فولادی چادر جڑ دی جاتی ہے لیکن جیری کے خیال میں یہ بھی ان لوگوں کی ایک اور غلطی تھی۔ غالباً کسی عجلت کے باعث وہ ایسا نہیں کر سکے تھے۔

''ولد الحرام!'' جیری ڈھکنے کے جوڑ میں چابی گھماتے ہوئے بڑبڑایا۔ پھر اس نے چابی کھینچ لی اور اس کے ڈھکنے پر ایک بار پھر گھونسے مارنے لگا۔ اب سانس لینے میں اسے کچھ دشواری سی پیش آ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر لائیٹر جلا لیا اور اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ جہاں چابی استعمال کرتا رہا تھا۔ جوڑ ذرا سا کشادہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر چابی جوڑ میں داخل کر کے ہاتھ کو حرکت دینے لگا۔ لکڑی کے نئے نئے پرزے نیچے گرنے لگے۔ اس کے دل میں ایک امید سی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یکے بعد دیگرے نیچے گرتے رہے اس دوران لائیٹر کئی مرتبہ لینا تھا۔ جسے بار بار جلانا پڑا تھا۔ بالآخر یہ سوچ کر کہ تابوت میں موجود آکسیجن لائیٹر کے شعلے کی نذر نہ ہو جائے اس نے لائیٹر بجھا دیا لیکن ہاتھ بدستور چلتا رہا اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کی گردن اور ٹھوڑی پر گرتے رہے۔ اس کی انگلیاں پسینے میں تر ہو رہی تھیں۔ جس سے چابی پر گرفت مشکل ہو رہی تھی۔ اس کے بازو میں بھی درد ہونے لگا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ اگر وہ اسی طرح تسلسل کام کرتا رہا تو اس کی قوت جواب دے جائے گی اور وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ اس نے چابی سینے پر رکھ لی اور ایک بار پھر لائیٹر جلا کر اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے لگا۔ جوڑ کی لمبائی کے رخ پر صرف چند انچ لکڑی ٹوٹ سکی تھی اور اس کے خیال میں یہ کارکردگی اطمینان بخش نہیں تھی۔ اس کی یہ کاروائی تابوت کے مضبوط ڈھکنے پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا لیکن پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس طرح محدود آکسیجن چند سانسوں میں ہی ختم ہو جائے گی۔ ویسے بھی وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اب سانس لینے میں کچھ دشواری پیش آنے لگی تھی۔ وہ جھنجھلاہٹ میں ایک بار پھر ڈھکنے پر گھونسے برسانے لگا۔

''کھل جاؤ..... کم بخت کھل جاؤ.....'' وہ چیخا' اس کی گردن کی رگیں پھر رکنے لگیں۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر پہلوؤں میں گر گئے اور وہ سوچنے لگا کہ اگر جلد ہی ڈھکنا کھولنے میں کامیاب نہ ہوسکا تو دم گھٹ کر ختم ہو جائے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ اس نے آج تک کسی سے شکست نہیں مانی تھی۔ زندگی میں ایسے کئی موڑ آئے تھے کہ اسے بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن ہمت ہارنے کے بجائے اس نے بڑی خندہ پیشانی سے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے وقت کو شکست دی تھی' وہ جانتا تھا کہ جب کسی کام کا ارادہ کر لے تو

دنیا کی کوئی طاقت اسے مات نہیں دے سکتی تھی۔ اسے اپنی قوت ارادی پر فخر تھا۔ اس قوت ارادی کے بل بوتے پر ہی وہ راستے میں ہر رکاوٹ کو توڑتا ہوا آیا تھا۔ لیکن اب وہ اس تابوت میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے ذہن پر مایوسی طاری ہونے لگی لیکن اس نے فوراً ہی ذہن کو جھٹک دیا اور طے کرلیا کہ وہ اپنی اسی قوت ارادی کے سہارے آج موت کو بھی شکست دے گا۔

جیری نے لائیٹر کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کر جلا لیا۔ لائیٹر کا شعلہ دم توڑتے ہوئے دیے کی طرح ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ یہ شاید اس کے ہاتھ پر طاری رعشہ کا اثر تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو سہارا دیا اور لائیٹر کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ اس نے اس تابوت سے نجات حاصل کرنے کے لیے انتہائی خوفناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں رہائی کے امکان کے ساتھ ایک انتہائی اذیت ناک موت کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لائیٹر تابوت کے ڈھکنے کے قریب پہنچ گیا اور اس کا ننھا سا شعلہ اس جگہ مرکوز ہوگیا جہاں سے چابی کی مدد سے لکڑی کے کچھ ٹکڑے توڑ چکا تھا۔

اس کا سانس خود بخود تیز ہوگیا۔ لکڑی کے جلنے کی بو تابوت سے پھیلنے لگی تھی۔ وہ لائیٹر کا شعلہ ڈھکنے کے ٹوٹے ہوئے جوڑ کے ساتھ ساتھ ہلاتا رہا۔ چند سیکنڈ بعد بہت ننھی ننھی سی چنگاریاں نظر آنے لگیں۔ اس نے خط ایک جگہ مرکوز کردیا۔ چند سیکنڈ بعد اسے ذرا سا آگے بڑھا دیا۔ لکڑی سلگنے لگی۔

دفعتاً ایک شعلہ سا چمکا۔ لکڑی کی پالش یا روغن نے آگ پکڑ لی تھی۔ دھویں کا مرغولہ سا اٹھا جیری پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے کھانسنے سے شعلہ بجھ گیا لیکن لکڑی بدستور سلگتی رہی۔ تابوت میں آکسیجن ختم ہو رہی تھی۔ آکسیجن کی کمی اور دھویں کی وجہ سے اسے سانس لینے میں اب خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے کسی کارخانے کی چمنی کے منہ پر بٹھا دیا گیا ہو۔ اس کا حلق اور پھیپھڑوں میں جلن سی ہونے لگی۔ قوت مدافعت جواب دے رہی تھی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر یہی صورت حال رہی تو چند منٹ کے اندر اندر اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا اور اور ٹریسی جیت جائے گی۔

''نہیں نہیں! یہ نہیں ہوسکتا۔ میں ٹریسی کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ موت میرا راستہ نہیں روک سکتی۔''

جیری بڑبڑایا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ میں ایک نئی قوت محسوس کرنے لگا۔ اس کی قوت ارادی عود کر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ گریبان پر ڈال کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ قمیض پھٹ گئی۔ ایک بڑا سا ٹکڑا قمیض سے الگ کر کے اس نے اپنے ہاتھ اور کلائی پر لپیٹا اور تختے پر اس جگہ گھونسے برسانے لگا جہاں لکڑی سلگ رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی چنگاریاں اس کے چہرے اور گردن پر گریں۔ وہ دوسرے ہاتھ سے چنگاریاں ہٹانے لگا کچھ چنگاریاں سینے پر بھی گری تھیں۔ جنہیں اس نے اگرچہ ہاتھ مار کر الجھا دیا تھا لیکن چنگاریاں اس کے جسم کو داغ چکی تھیں۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ جسم کے متاثر حصے سہلاتے ہوئے کراہنے لگا۔

تختے کا ایک حصہ دہک رہا تھا جس کی تپش اس کے چہرے تک پہنچ رہی تھی۔ وہ سرکتا ہوا تابوت کی دیوار سے جا لگا اور اپنے چہرے کو گرتی ہوئی چنگاریوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ تابوت دھویں سے بھر چکا تھا۔ سانس کے ساتھ اندر داخل ہونے والا دھواں اس کے سینے میں جلن پیدا کر رہا تھا۔ وہ تختے پر گھونسے برساتا رہا۔ راکھ اس کے حلق اور نتھنوں میں داخل ہو رہی تھی۔ جس سے اسے سانس لینے میں اور بھی دشواری پیش آنے لگی۔ اس کی ہمت ایک بار پھر جواب دینے لگی۔ اس نے قوت مجتمع کر کے ایک

بار بھر پور گھونسا مارا۔

جلتے ہوئے تختے کا ایک حصہ اچانک ہی ٹوٹ کر نیچے گرا۔ چنگاریاں اس کے چہرے، گردن اور سینے پر پھیل گئیں۔ وہ کپڑے میں لپٹے ہوئے ہاتھ سے چنگاریوں کو مسل مسل کر بجھانے لگا۔ دھویں کے ساتھ اب گوشت کے جلنے کی بو بھی نتھنوں میں جا رہی تھی۔ اس کا جسم کئی جگہوں سے جھلس چکا تھا۔ وہ چیختے ہوئے اس اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

جلتا ہوا ٹکڑا الگ ہو جانے کی وجہ سے ڈھکنے پر لگی ہوئی آگ بجھ گئی چند چھوٹی چھوٹی چنگاریاں رہ گئی تھیں اور وہ بھی دم توڑ رہی تھیں۔ دھویں کے ساتھ ایک اور مخصوص سوندھی سوندھی سی بو محسوس کر کے وہ چونک گیا۔ اس نے لائیٹر تلاش کر کے جلایا اور اس کی مدھم روشنی میں جو کچھ بھی نظر آیا۔ وہ اسے دہلا دینے کے لیے کافی تھا

اس کے اوپر مٹی کا ڈھیر تھا۔ اس کا دل تند ہوا کی زد میں آئے ہوئے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ تابوت قبر میں دفن تھا۔

جیری نے لائیٹر کچھ اور اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے مٹی کو ٹٹولنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ لائیٹر کی مدھم روشنی میں سیاہ چیونٹے اور قبروں میں پائے جانے والے سفید رنگ کے لمبے لمبے کیڑے مٹی پر رینگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بعض کیڑے لٹکے ہوئے تھے۔ گویا نیچے کودنے کی تیاری کر رہے ہوں ان کا فاصلہ جیری کے چہرے سے چند انچ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ ممکن حد تک پیچھے سمٹ گیا اور اپنے چہرے کو ان کیڑوں کی زد سے بچانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس دوران تقریباً آدھا انچ لمبا ایک سفید کیڑا اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ وہ جیری کے اوپر اوپر والے ہونٹ پر گرا۔ اپنے ہونٹ پر کیچوے کی طرح کیڑے کا لمس محسوس کر کے ابکائی کے ساتھ ہی جیری کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس نے سر کے زوردار جھٹکے سے کیڑے کو ہٹایا اور پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر کی زمین کودنے لگا۔ مٹی کے ساتھ کیڑے بھی نیچے گرنے لگے۔ وہ سر کے مسلسل جھٹکوں سے اپنے چہرے کو کیڑوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر مٹی گرتی رہی جو ناک اور حلق میں بھی گھسی جا رہی تھی۔ جس سے اس کا سانس رکنے لگا لیکن اس پر جنون سا طاری ہو چکا تھا۔ وہ کسی مشین کے پسٹن کی طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتا رہا۔

جیری کے سینے اور گردن پر مٹی کا ڈھیر سا جمع ہو گیا۔ جس میں لمبے لمبے کیڑے بھی رینگ رہے تھے۔ اس نے ٹوٹے ہوئے ڈھکنے کا کنارہ پکڑ کر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو اوپر اٹھانا شروع کیا ساتھ ہی وہ خود کو ہلکے ہلکے جھٹکے بھی دے رہا تھا۔ جس سے اس کے جسم پر جمع ہونے والی مٹی نیچے گر گئی۔ جیری کے پھیپھڑے اس مشقت سے پھٹے جا رہے تھے۔ انگلیاں شل ہو رہی تھیں، ناخن مڑ گئے تھے لیکن اس کے ہاتھ نہیں رکے زندگی اور موت کے درمیان صرف چند سیکنڈ کا فاصلہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ رک گئے تو موت اس پر غلبہ پا لے گی۔ مٹی نیچے گرتی رہی اور وہ اپنی جدوجہد میں لگا رہا۔

تکلیف جب انتہا کو پہنچ جائے تو اس کا احساس باقی نہیں رہتا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت جیری کو بھی تھی۔ پھیپھڑوں پر اگرچہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا لیکن ہاتھوں کی انگلیوں اور بازوؤں میں تکلیف کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ ایڑیوں کی ٹیک سے وہ کچھ اوپر سرک گیا۔ اب وہ عجیب سی پوزیشن میں تھا۔ اسے نہ تو نیم درازی کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی بیٹھنے کی پوزیشن۔ اس کے گھٹنے مڑے ہوئے تھے اور وہ ایڑیوں کے سہارے اپنی اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کی کوشش کے ساتھ

دونوں ہاتھ سر سے اوپر کیے۔ جنونی انداز میں مٹی کھودنے میں مصروف تھا۔ وہ اپنے آپ کو مسلسل حرکت کرتے رہنے پر اکسا رہا تھا۔ ہارنے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن وہ اس وقت موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی مضبوط قوت ارادی اسے حرکت کرتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

جیری انچ بہ انچ اپنے جسم کو اوپر اٹھاتا چلا گیا اور اوپر سے گرنے والی مٹی اس کے سر اور کندھوں پر جمع ہو رہی تھی۔ اس کے جسم پر آدم خور لمبے لمبے کیڑے رینگ رہے تھے۔ پھیپھڑے پھٹ پڑنے پر تیار تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی منٹ سے سانس نہ لیا ہو۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر پھیپھڑوں میں اتنی قوت بھی نہیں رہی تھی کہ چیخنے میں اس کے ارادے کا ساتھ دے سکتے۔ اس نے سانس لینے کے لیے منہ کھولا لیکن مٹھی بھر مٹی اس کے حلق میں گھس گئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ نیم آلود مٹی حلق میں گھسنے سے ابکائیاں سی آنے لگیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مٹی اس کی آنتوں تک میں گھس گئی ہو۔ سانس کی نالی بند ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اور دماغ کی نسوں میں اس حد تک تناؤ آ گیا تھا جیسے کسی بھی لمحہ پھٹ جائیں گی۔ اس کیفیت کے باوجود اس کے ہاتھ متحرک تھے لیکن جیری کو احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ زیادہ دیر تک اس صورت حال کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ مایوسی اس پر غالب آنے لگی۔

دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ایک انگلی زمین کی تہ کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی ہو۔ اس نے ایک لمحہ کو سوچا۔ امید کی یہ کرن دیکھ اس کی قوت ارادی عود کر آئی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ چند سیکنڈ بعد اس کا ہاتھ مٹی کی تہ سے باہر نکل چکا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس خلا کو چوڑا کرنے لگا۔ دم توڑتی ہوئی زندگی کو توانائی مل گئی تھی۔ گزرنے والے ہر لمحہ کے ساتھ خلا کشادہ ہوتا چلا گیا۔

جیری نے دونوں بازو باہر نکال لیے اور کہنیاں زمین پر ٹکا کر اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچنے لگا خلا اتنا چوڑا نہیں تھا کہ وہ آسانی سے باہر نکل سکتا۔ وہ رگڑ کھاتا ہوا سینے تک باہر آ گیا۔ ایک لمحہ کو رک کر اس نے ایک بار پھر اپنی قوت کو مجتمع کیا اور جسم کو اوپر کھینچنے لگا۔ بالآخر وہ اس قبر سے نکل آیا اور کنارے پر لیٹ کر تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ حلق اور نتھنوں میں مٹی بھری ہوئی ہونے کی وجہ سے اسے سانس لینے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ تھوک تھوک کر مٹی حلق سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر اس کا حلق اور نتھنے اس حد تک صاف ہو گئے کہ تازہ ہوا اس کے پھیپھڑوں تک پہنچنے لگی اور وہ اپنے آپ میں ایک نئی زندگی محسوس کرنے لگا۔

وہ موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے زخمی ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ اس نے اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر موت کو شکست دے کر ٹریسی اور اس کے عاشق کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں اس کے انتقام سے نہیں بچا سکے گی۔

اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد جیری اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ قریب سے مختلف گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ گھٹنوں کے بل اونچا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحہ تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ سڑک پر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس جگہ کے محل وقوع کے بارے میں تو کوئی اندازہ نہ لگا سکا لیکن یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ قبرستان ہائی وے کے کنارے واقع تھا۔ اپنے اطراف میں زندگی کی گہما گہمی دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ سڑک کے دائیں بائیں

دیکھنے لگا۔ دائیں طرف بہت دور سڑک کے کنارے ایک اونچے پول پر پیٹرول پمپ کا نیون سائن دیکھ کر وہ اٹھ کر اس طرف چل دیا۔

جیری کو پہلے تو چلنے میں خاصی دشواری پیش آتی رہی لیکن چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کی یہ مشکل قدرے کم ہوگئی۔ لڑکھڑا کر چلتے ہوئے وہ ذہن میں ایک منصوبہ بھی ترتیب دے رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ پیٹرول پمپ کے ریسٹ روم میں نہا کر اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد وہ کسی سے کچھ رقم قرض لے کر فون پر ٹیکسی طلب کرے گا اور اچانک ہی گھر پہنچ کر اپنی بیوی ٹریسی اور اس کے عاشق کو حیران کر دے گا۔ جو اس وقت یقیناً جشن طرب منا رہے ہوں گے۔

ان کے خیال میں جیری کا خاتمہ ہو چکا ہوگا لیکن اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ یقیناً چیخ اٹھیں گے اور پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں جیری کے انتقام سے نہیں بچا سکے گی' یہ سوچ کر اس کی رفتار خود بخود تیز ہوگئی۔ اس کے قدموں میں اب لڑکھڑاہٹ نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر قبرستان کی طرف دیکھا اور تقریباً دوڑنے والے انداز میں پیٹرول پمپ کی طرف چلنے لگا۔

پیٹرول پمپ سے چند گز کے فاصلے پر وہ رک گیا۔ وہ اس ابتر حالت میں کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا..... وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک مختصر سا چکر کاٹتا ہوا پیٹرول پمپ کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ باتھ روم اس طرف تھے اس نے ایک باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

باتھ روم میں پبلک فون دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی اور اس کے ہاتھ بے اختیار اپنے لباس کی تلاشی لینے لگے۔ کوٹ کی ایک جیب میں اسے چند سکے مل گئے۔ اس کی جیب میں سکے چھوڑ دینا ان لوگوں کی ایک اور غلطی تھی۔ جس سے وہ فائدہ اٹھانے جا رہا تھا۔ اس نے مطلوبہ سکہ سلاٹ میں ڈال کر ریسیور اٹھایا اور اپنے گھر کا نمبر ڈائل کر لے گا۔

کال ٹریسی ہی نے ریسیو کی تھی لیکن جیری کی آواز سنتے ہی ریسیور پر ٹریسی کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ وہ اس طرح ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی جیسے کسی بھوت کو دیکھ کر لیا ہو۔

''تت..... تم کون ہو اور..... یہ..... کیسا مذاق ہے!'' بالآخر ٹریسی کی دہشت زدہ سی آواز سنائی دی۔

''یہ مذاق نہیں ڈالنگ! میں ہوں' جیری' تمہارا شوہر' ابھی ابھی قبر سے نکل کر آیا ہوں۔ کچھ دیر میں گھر پہنچ جاؤں گا اور تم۔''

جیری کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹریسی ایک بار پھر پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہا اور لائن کاٹ دی' جیری نے بھی ریسیور ہک پر لٹکا دیا اور مڑ کر دیوار میں نصب آئینے میں دیکھنے لگا۔

اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ دہشت زدہ سی نظروں سے سامنے دیکھتا رہ گیا۔ آئینے میں جو چہرہ نظر آیا تھا۔ اس کے رخساروں کا گوشت غائب تھا اور جبڑوں کی ہڈیاں اندر تک نظر آ رہی تھیں۔ اسے ٹریسی کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو فون بند کرنے سے پہلے اس نے چیخوں کے درمیان کہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ ٹریسی نے کہا تھا کہ اسے مرے ہوئے سات ماہ ہو چکے تھے۔

سات مہینے۔

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے آئینے کی طرف دیکھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اب کوئی بھی اسے زندہ انسان کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرے گا۔ اس دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ اسے مات ہوگئی تھی۔ اس نے بے اختیار جیب سے لائیٹر نکال لیا اور اس پر کندہ حروف کو گھورنے لگا۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

رعایتی سیل کا زمانہ ہے۔ ہر چیز میں رعایت دی جا رہی ہے تجہیز و تکفین کا سامان بھی بارعایت دستیاب ہے۔ آپ بھی اس سیل سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ امریکہ کے ایک قصبے کا دلچسپ و عجیب قصہ

رعایتی سیل

حسن علی خان

اس شمارے کی ایک خوفناک کہانی

تجہیز و تکفین کا سامان فروخت کرنے والی ایک فرم نے جب سے عظیم رعایتی سیل کا اعلان کیا تھا' قطب ٹاؤن میں شرح اموات کافی بڑھ گئی تھی' لوگوں نے دھڑا دھڑ مرنا شروع کر دیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ اپنے پسماندگان کو تجہیز و تکفین کے بھاری اخراجات سے بچانے کے لیے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہوں۔ عظیم رعایتی سیل پر لوگوں کی دیوانگی کو اس حد تک بڑھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا ہوگا۔ کپڑوں اور جوتوں کی رعایتی سیل تو الگ چیز ہے۔ یہاں تو تابوت بک رہے تھے۔ موت کا بازار گرم تھا۔ عظیم رعایتی سیل جاری تھی لوگ دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ اور پولیس پریشان تھی کہ ان واقعات کو قانون کے کسی خانے میں فٹ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

آخر ایک دن چیف انسپکٹر بارلے اس عظیم رعایتی سیل' کے کرتا دھرتا پر چڑھ دوڑا۔

''سنو والٹ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ رعایتی سیل بند کر دو۔ ورنہ اس قصبے کے آدھے..... یا شاید سارے ہی آدمی ملک عدم کو سدھار جائیں گے۔ اس قسم کی رعایتی سیل آج تک دیکھی ہے نہ سنی ہے۔''

''سبھی ایسا کرتے ہیں۔'' والٹ نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ ''ہر کاروباری اپنے بوسیدہ اور سال خوردہ مال کو ختم کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرتا ہے پھر آخر میں کسی سے کیوں پیچھے رہوں۔''

''کیوں کہ تم تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والے ہو اس لیے تمہارے لیے یہ سالانہ رعایتی سیل ضروری نہیں ہے۔''

''میں یہ بات نہیں مان سکتا۔''

چیف انسپکٹر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے چباتا ہوا والٹ کو گھورتا رہا۔

والٹ کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی' وہ سیاہ بالوں والا لحیم شحیم آدمی تھا۔ اس نے بہت ہی نرم لہجہ میں کہا۔ ''میں اپنے اوپر سے پرانے تابوتوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں' میں ان کی جگہ نیا اسٹاک کروں گا..... اور ہاں بھئی میرے پاس ایک نہایت اعلیٰ قسم کا تابوت ہے۔ اگر تم.....''

''میری بات اڑانے کی کوشش مت کرو۔ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ اچھا نہیں ہے۔'' چیف انسپکٹر نے کہتے ہوئے رومال سے چہرہ صاف کیا۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا والٹ نے

اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اچھی بات ہے نیڈ! تم مجھے سمجھانے کی کوشش کرو۔ مجھے حیرت ہے کہ ان پانچ سالوں میں تم کتنا بدل گئے ہو۔ پہلے تم کسی کے کاروبار میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔''

چیف انسپکٹر ہارلے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں خلا میں کسی غیر مرئی نکتے پر جم گئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا طائر خیال ماضی کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا ہو۔

ایک طویل عرصے تک کنوارہ رہنے کے بعد پانچ سال پہلے جب نیڈ ہارلے نے شادی کا فیصلہ کیا تو اس کے عزیز ترین دوست والٹ نے اسے بہت سمجھایا بجھایا۔ مصیبت میں پڑنے سے خبردار کیا۔ لیکن نیڈ ہارلے سے وہ غلطی ہو ہی گئی۔ اور وہ عیلا پرسن کا شوہر بن گیا۔

عیلا پرسن بہت بدزبان اور منہ پھٹ عورت تھی۔ اس کا علم اس وقت ہوا جب شادی کو کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ نیڈ ہارلے کے دوستوں کو سخت ناپسند کرتی تھی اور یہ مسئلہ دونوں میاں بیوی میں جھگڑے کا سبب بنتا رہتا تھا۔

نیڈ ہارلے اور والٹ جمعرات کی شام شطرنج کھیلنے گرما گرم کافی پینے اور تمباکو نوشی میں گزارتے تھے' جب ہارلے کی بیوی نے اسے والٹ سے ملنے سے منع کیا تو اس نے عیلا کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کوشش کی کہ عیلا اس کے دوست والٹ کو پسند کرنے لگے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ عیلا اپنی ضد پر اڑی رہی لیکن ہارلے بھی اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ کشیدگی بڑھتی رہی اور پھر روز روز کی تو تکار سے بچنے کے لیے نیڈ ہارلے چھپ چھپ کر والٹ سے ملتا رہا۔ یہ ملاقاتیں بڑے رازدارانہ انداز میں ہوتیں۔ مگر عیلا بہت چالاک تھی' اسے کسی طرح حقیقت کا علم ہو گیا۔ پھر اس نے ایک دوسری چال چلی۔ والٹ کے کاروبار کے متعلق عجیب عجیب افواہیں اڑانا شروع کیں چند من گھڑت کہانیاں سارے قصبے میں مشہور ہو گئیں' کیونکہ وہ چیف انسپکٹر کی بیوی تھی۔ لہٰذا ہر شخص اس کی باتوں پر یقین کر لیتا تھا۔ بدنامی سے بچنے کے لیے نیڈ ہارلے کو مجبوراً والٹ سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

پانچ سال گزر گئے اور اس طویل عرصے کے بعد آج وہ پھر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ والٹ کا ڈرائنگ روم تھا۔ آتشدان کے قریب میز پر شطرنج کی بساط بچھی ہوئی تھی اور مہرے بھی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

والٹ نے بڑی حیرت سے ان چیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اب زیادہ شطرنج نہیں کھیلتا۔ کبھی کبھی برابر والے جنرل اسٹور کا مالک آجاتا ہے تو ایک آدھ بازی ہوجاتی ہے لیکن وہ کمینہ بہت بے ایمان ہے۔ آہ! نیڈ..... کیا تم اس وقت رعایتی سیل کے جھگڑے کو فراموش نہیں کرسکتے..... کیا اچھا ہو کہ ہم پانچ سال پہلے کی یاد تازہ کریں۔ گرم گرم خوشبودار کافی کا ایک ایک پیالہ اور شطرنج کی بازی۔''

''تمہارے کاروبار کی بات زیادہ اہم ہے والٹ!'' چیف انسپکٹر نے کہا۔ ''قصبے کی شرح اموات کافی بڑھ چکی ہیں۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔'' والٹ اپنا دایاں رخسار کھجاتا ہوا بولا۔ ''میں نے جب سے رعایتی سیل کا اعلان کیا ہے مجھے پانچ منٹ کی بھی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اگر تم آگئے ہوتے تو میں اس وقت بھی مصروف ہوتا لیکن بہرحال یہ رعایتی سیل لوگوں کے لیے کافی مفید ثابت ہوئی ہے۔''

''میں پھر کہتا ہوں کہ تمہیں یہ رعایتی سیل بند کر دینی چاہیے کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ ہر شخص مرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے' میں سمجھتا ہوں کہ آدھی قیمت کے تابوتوں کے سبب جتنی اموات ہوئی ہیں وہ سب کی سب طبعی نہیں ہیں گو کہ انہیں قتل ثابت نہیں کیا جاسکتا۔''

''تم مجھ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ برابر کے کمرے میں جو چند مردے اپنے تابوتوں میں لپٹے ہوئے ہیں انہیں قتل کیا گیا ہے۔''

''بہرحال میں چاہتا ہوں کہ یہ رعایتی سیل بند ہوجائے ورنہ شرح اموات ہرگز کم نہ ہوگی۔''

''لیکن بہت سے لوگ تو حادثات میں مرے ہیں۔'' والٹ نے کہا اور پھر وضاحت کرتا ہوا بولا۔ ''ہارڈ لیسٹی سیڑھیاں اترتے ہوئے پاؤں پھسل جانے کے سبب گر پڑا جس سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ بے چارہ وہیں چل بسا۔ گیمبٹ کی موت کپڑوں میں آگ لگ جانے کی وجہ سے ہوئی وہ بے چارہ چائے بناتا ہوا بری طرح جھلس گیا تھا اور ٹام فرینکلین۔''

''یہ ٹھیک ہے' یہ سب اتفاقات تھے۔'' نیڈر ہارلے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو مشکل آپڑی ہے کہ ہم کسی بھی موت کو قتل ثابت نہیں کرسکتے۔ کسی کو بھی چاقو نہیں مارا گیا' زہر خورانی کی بھی کوئی واردات نہیں ہوئی لیکن اس بات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سے لوگ قبل از وقت مر گئے اور اس طرح ان کے رشتہ داروں کو تجہیز و تکفین میں کافی بچت ہوگئی۔''

''ٹھیک ہے۔'' والٹ نے آہستگی سے کہا۔ ''تمہاری ہر بات ٹھیک ہے لیکن میں رعایتی سیل بند کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''ہارڈ لیسٹی کو ہی لے لو۔'' چیف انسپکٹر کہتا رہا۔ ''ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے اپنے بھتیجے کے لیے بیس ہزار ڈالر چھوڑے ہیں' کیا یہ ممکن نہیں کہ بھتیجے نے اپنے چچا کو پیچھے سے دھکا دے دیا ہو اور اس طرح ایک بہت بڑی رقم کا مالک بن گیا ہو' اس کے علاوہ گیمبٹ کے بارے میں بھی میرا ایک نظریہ ہے سبھی جانتے ہیں کہ گریسن کی بیوی سے اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملہ میں گریسن کا ہاتھ ہوگا لیکن ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اس کی موت گیارہ بج کر بیس منٹ پر واقع ہوئی تھی اور گریسن نے ثابت کردیا ہے کہ وہ اس وقت کسی اور جگہ موجود تھا۔ تیسرا واقعہ فرانک کا ہے' وہ صندوق بنانے والے کارخانے میں پچیس سال سے کام کررہا تھا میں اس کی موت و بھی قتل ثابت نہیں کرسکتا لیکن جب وہ فیکٹری کے چھجے سے نیچے گرا تو اس کا مالک

پارکر اس کے پیچھے ہی کھڑا ہوا تھا۔''

''ہاں۔'' والٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''فرانک واقعی جھگڑالو قسم کا اور چرب زبان آدمی تھا۔ میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں نیڈ..... فرانک نے سارے قصبہ میں مشہور کر رکھا تھا۔ کہ پارکر اس کی پوری تنخواہ نہیں دیتا۔''

''اب تم خود ہی سوچو اگر میں ان حالات کے پیش نظر ان اموات کو قتل سمجھ رہا ہوں تو یقیناً غلطی پر نہیں ہوں۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ والٹ نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔'' وہ ماؤتھ پیس پر بولا۔ ''جی ہاں' میں والٹ بول رہا ہوں..... اوہو یہ تو بہت برا ہوا..... جی ہاں..... جی ہاں..... مگر خدا کی مرضی میں کسی کو دخل ہے..... بہت افسوس ہوا یہ سن کر..... آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''

والٹ نے ریسیور رکھ دیا۔ نیڈ ہارلے اسے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا کوئی اور مر گیا والٹ۔''

''ہاں!'' والٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لوسی روز وائلڈ چل بسی بے چاری قصبے کے باہر تالاب میں گر کر ڈوب گئی۔ یہ بڑا افسوسناک حادثہ ہے۔''

''ایک اور قتل!'' نیڈ ہارلے غرایا۔ ''لیکن اسے بھی قتل ثابت نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ قصبے کا ہر فرد لوسی سے نفرت کرتا تھا وہ ہر ایک سے لڑتی رہتی تھی۔ لہٰذا اگر کسی کو حقیقت کا علم ہوگا تو بھی وہ پولیس کو نہیں بتائے گا۔ میں پھر کہتا ہوں والٹ کہ تم اپنی رعایتی سیل بند کر دو۔''

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ لوگ اس عظیم رعایتی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن مجھے اس سیل سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اب دیکھو نا! میرے پاس بہترین شیشم کی لکڑی کا ایک خوب صورت تابوت ہے جس کے اندر ریشمی کپڑے کے گداز تکیے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے خرید کر بڑی غلطی کی تھی کیونکہ اس قصبے کے لوگ اسے خریدنے کی سکت نہیں رکھتے' میں نے تجہیز و تکفین کے متعلقہ سامان کی قیمت بھی آدھی کر دی جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔''

ایک مرتبہ پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی' والٹ نے ریسیور اٹھایا اور پھر ایک طویل سانس لے کر نیڈ ہارلے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بیوی کا فون ہے' نیڈ! وہ بہت غصے میں معلوم ہوتی ہے۔''

''خدا خیر کرے' یہ عورت تو راڈار کی مانند ہے۔'' نیڈ ہارلے بڑبڑایا۔ ''مجھے یہاں آئے ہوئے بیس منٹ بھی نہیں گزرے اور اسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں۔''

نیڈ ہارلے نے ریسیور کان سے لگایا اور ڈیڑھ دو منٹ تک بیوی کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا۔ جب اس نے ریسیور رکھا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور ہونٹوں پر مغموم سی مسکراہٹ تھی۔

''اب نمٹو اس سے۔'' والٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں رعایتی سیل کم از کم ایک دن کے لیے اور جاری رکھوں پھر سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔''

دوسرے دن قصبے کا ہر فرد کہہ رہا تھا کہ عیثا ہارلے کی جیسی شاندار تدفین کسی کی بھی نہیں دیکھی گئی۔ رعایتی سیل کے باوجود بھی اس کی تجہیز و تکفین پر بہت بڑی رقم خرچ ہوئی تھی اور نیڈ ہارلے کے عزیز دوست والٹ نے اس میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیا تھا۔

عیثا ہارلے کی موت بھی ایک حادثے کا نتیجہ تھی۔ پورٹر کی پہاڑی پر اس کی کار کا بریک فیل ہو گیا تھا۔ عیثا ہارلے کے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اسٹیرنگ اس کے پیٹ میں گھس گیا تھا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی تھی۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

کرم الٰہی چوہدری

بھرحال جیلی نے اپنی کتاب 'پہاڑی کے دامن میں شعلے' میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا۔ مگر 1976ء کے اوائل میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس پر..... تبصرہ ضرور ہوا۔ مگر اس کے بعد یہ کتاب گوشہ گمنامی میں چلی گئی اور اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہوا۔

اس شمارے کی ایک جنگی کہانی

یہ ان تاریک دنوں کی کہانی ہے جب امریکہ' ویت نام سے اپنی بساط لپیٹ چکا تھا۔ وہاں باقی رہ جانے والے فوجی جلد از جلد واپس بھیجے جا رہے تھے۔ امریکی فوجی وطن واپسی پر بہت خوش تھے۔ سائیگون کا 'کرسپانڈنٹ کلب' امریکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس رات بار میں بہت ہجوم تھا۔ جیلی اسی کلب کے بار میں ہیری فوسٹر کے ساتھ بیٹھی شراب نوشی میں مصروف تھی کہ ہیری نے ایک دراز قد آدمی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اسے اپنی طرف آنے کی دعوت دی۔ اس تنگ سے بوتھ میں وہ تینوں بڑی مشکل سے ٹھنس کر بیٹھ گئے۔

''جیلی! یہ میرا دوست مائیک کارٹر ہے۔ اس کا تعلق 'پیرس میچ' سے ہے۔'' ہیری نے جیلی سے نووارد کا تعارف کرایا۔ ''پیرس میچ' ایک رسالہ تھا اور مائیک اسی کا نمائندہ بن کر ویت نام آیا تھا۔ پھر اس نے مائیک سے جیلی کا تعارف بھی کرایا۔

''یہ جیلی جیک مین ہے۔ ایک کتاب لکھنے آئی ہے۔''

''مائیک! تم امریکی ہوتے ہوئے 'پیرس میچ' کے لیے کام کر رہے ہو' حیرت ہے!'' جیلی نے کہا۔

''پہلے میں امریکہ کے ایک اخبار سے وابستہ تھا۔'' مائیک نے بتایا۔ ''ایک بار پیرس جانا ہوا تو وہاں اس رسالے نے مجھے جاب آفر کی اور میں نے قبول کر لی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے..... ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔'' جیلی نے مائیک سے سوال کیا۔

''بالکل! چند ہفتوں میں ہمیں بہر صورت یہاں سے نکلنے ہوگا۔'' مائیک نے کہا۔ ''تم بتاؤ' کیا لکھ رہی ہو۔ کوئی ناول وغیرہ۔''

''یہ کتاب کیا ہے' ویت نام کے حالات کی مکمل روداد ہے..... اس کتاب کو لکھنے کے لیے میں نے متعدد مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے خیالات سے آگہی حاصل کی اور وہ حالات معلوم کیے جو ان کے ساتھ ملک میں پیش آئے تھے۔'' جیلی نے کہا۔

''یہ ایک مشکل کام تھا۔'' ہیری نے درمیان میں دخل دیا۔ ''بہرحال یہ اسی کی ہمت ہے کہ اس نے یہ کام کر ڈالا۔''

اس کے بعد حالات توقع سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ ویت نام سے

امریکیوں کی واپسی پر مذاکرات جاری تھے کہ تھیو نے استعفیٰ دے دیا اور شمال کی فوجیں سائیگون کی طرف بڑھنے لگیں۔

اٹھائیس اپریل تک وہ شہر سے صرف نصف میل دور رہ گئے تھے۔ اگلے روز امریکی سفارت خانے کی چھت سے ہیلی کاپٹرز کے ذریعے امریکی فوجیوں کو لے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لوگوں نے امریکی سفارت خانے کو گھیر لیا تھا۔ جب لڑائی شہر کی حدود تک پہنچ گئی اور امریکی ہیلی کاپٹر امریکی فوجیوں کو لے جانے کے لیے سفارت خانے کی چھت پر اترے تو شہر کے حالات ایک دم کشیدہ ہوگئے۔ ان حالات میں جیلی ایک جیپ میں سائیگون کی سڑک سے گزر رہی تھی کہ اس کی مائیک کارٹر سے دوسری ملاقات ہوئی۔ ایک چوراہے پر مائیک نے ہاتھ دے کر اسے روکا اور پوچھا۔ ''یہی جیپ تمہاری ہے۔''

''یہ ہیری کی جیپ ہے۔ مگر وہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے واپس چلا گیا ہے۔'' جیلی نے جواب دیا۔

''مجھے ایک ضروری کام سے ایر پورٹ جانا ہے۔'' مائیک نے جیلی سے کہا۔ ''اور تم میری مدد کرسکتی ہو۔''

''مگر وہاں تو خطرہ ہے۔'' جیلی نے کہا۔

''مجھے وہاں ایک ضروری چیز چیک کرنی ہے۔'' مائیک نے کہا۔ ''بمشکل دو' تین منٹ لگیں گے۔''

''ٹھیک ہے..... چلو۔'' جیلی نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد کہا اور وہ صدارتی محل کے پاس سے ہوتے ہوئے ایر پورٹ جانے والی سڑک پر آ گئے۔

''کل اس شہر میں ویٹ کانگ آرہے ہیں۔'' راستے میں مائیک نے جیلی کو بتایا۔ ''جتنی جلدی ممکن ہو شہر سے نکل جاؤ۔''

''اور تم..... تم کیا کرو گے۔'' جیلی نے پوچھا۔

''میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔ مگر تم کل تک نکل جاؤ۔'' مائیک کارٹر نے جواب دیا۔

''کیا تم واپس پیرس جاؤ گے' اپنے بیوی' بچوں کے پاس۔'' جیلی نے نہ چاہتے ہوئے بھی

مائیک سے سوال کر ڈالا۔

''میں نے شادی کی تھی۔ مگر وہ زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ یہ دس سال پہلی کی بات ہے۔'' مائیک نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

ایر پورٹ جانے والی سڑک ویران تھی۔ راستے میں انہیں جلتی ہوئی گاڑیاں نظر آئی اور بموں کے خول بھی۔ ہر طرف تباہی پھیلی نظر آ رہی تھی۔ آخر ان کی جیپ دروازے کے ذریعے ایر پورٹ کے اندر داخل ہوگئی اور ٹرمینل کی طرف بڑھی۔ راستے میں کوئی گارڈ تھا اور نہ محافظ۔

''سنا ہے سی آئی اے نے تمام انٹیلی جنس ڈیٹا خراب کر دیا ہے۔'' جیلی نے کہا۔ ''دوسرے انہوں نے یہاں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکالنے کا کام بھی بروقت شروع نہیں کیا ہے۔''

''اس طرح کی باتیں اس طرح کے کاموں میں ہوتی ہی ہیں۔'' مائیک کارٹر نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ٹرمینل کے پاس بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ''ہر مرتبہ ناکامی کا الزام کسی نہ کسی پر ڈالا جاتا ہے اور کسی نہ کسی کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے۔''

''کدھر جانا ہے۔'' جیلی نے مائیک سے پوچھا۔

''اس سڑک کے کونے پر ایک گودام ہے۔ اس کے سرے پر پہنچ کر جیپ واپس موڑ لینا۔ میں بھاگتا ہوا جاؤں گا اور تیزی سے واپس آ جاؤں گا۔'' مائیک نے کہا۔

جیلی نے مائیک کو گودام کے سامنے اتارا۔ مگر جیپ کو واپس موڑنے کے بجائے سیدھا لے گئی اور یہی اس کی غلطی تھی۔ سڑک کے اختتام پر نصف درجن سے زائد سیاہ پوشوں نے جو ویت کانگ تھے۔ اسے گھیر لیا۔ جیلی کے حلق سے چیخ نکلی تو ایک سیاہ پوش نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اسے نیچے اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیلی کا برا حال تھا۔

''میں جرنلسٹ ہوں..... پریس سے تعلق رکھتی ہوں۔'' وہ چیخی۔ مگر سیاہ پوشوں نے غالباً اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔ وہ اسے نیچے کی طرف کھینچتے رہے۔ وہ انہیں اپنا پریس کارڈ دکھانا چاہ رہی تھی لیکن وہ سیاہ پوش اسے کوئی موقع نہیں دے رہے تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔

ان کے سامنے کسی بھی طرح کی مزاحمت بے کار تھی۔

آخر انہوں نے اسے زبردستی کھینچ کر نیچے اتار ہی لیا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی کتاب کا یہی اختتام تھا۔ اچانک ایک سیاہ پوش چیخا تو جیلی نے بھی سامنے کی طرف دیکھا۔ جدھر سے مائیک کارٹر چلا آ رہا تھا۔

''مائیک! واپس جاؤ۔'' جیلی گلا پھاڑ کر چیخی۔

''یہ ہمیں نہیں ماریں گے۔'' یہ کہہ کر مائیک نے اپنی جیپ سے پریس کارڈ نکال کر ان کو دکھایا۔

انہوں نے کارڈ ہاتھ میں لیے بغیر ان دونوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور آپس میں مقامی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ وہ زبان نہ مائیک سمجھتا اور نہ جیلی۔ یکا یک مائیک نے سامنے والے سیاہ پوش کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا اور چیخ کر جیلی سے کہا۔ ''بھاگو۔''

ساتھ ہی اس نے خالی ہاتھوں سے مسلح سیاہ پوشوں پر حملہ کر دیا' جیلی اس دوران جیپ میں سوار ہوگئی۔ اس نے جیپ موڑ کر روکی اور چیخ کر مائیک کو بلایا۔ مگر سیاہ پوشوں نے جیپ پر فائرنگ شروع کر دی۔ ساتھ ہی انہوں نے مائیک کو بھی نشانہ بنایا۔ مائیک کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور چیخا۔ ''جیلی! بھاگ جاؤ..... فوراً..... دیر نہ کرو۔''

جیلی ابھی تک ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ وہ اس

شخص کو اکیلا درندوں میں کیسے چھوڑ جاتی۔ جس نے اسے بچانے کے لیے خود کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ مگر جب فائرنگ نے شدت اختیار کی تو اس نے جیپ واپسی کے لیے دوڑا دی۔ اس کی آنکھوں میں تھے۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ''مجھے معاف کر دینا مائیک۔''

جاتے جاتے اس نے یہ منظر دیکھا کہ مائیک کا جسم خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا اور سیاہ پوش ویت کانگ مسلسل اس پر گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ جیپ چلا رہی تھی۔ مگر اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ دکھ اور بے بسی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

یہ ایک خوفناک خواب تھا۔ جو شخص اس کا پرانا شناسا نہ تھا اور جس سے اس کی ایک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اس کو بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اور خاص طور پر ویت نام کے لوگوں کو بتانا چاہتی تھی کہ دوستی کسے کہتے ہیں اور دشمنی کیا ہوتی ہے۔ اس کی چیخیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔

☆☆

تیس اپریل کو باغی ویت کانگز سے بھری ہوئی ایک جیپ شہر میں داخل ہوئی۔ ان کے پیچھے شمالی ویت نام کے ریگولر فوجی تھے۔ جیلی امریکی سفارت خانے کی چھت سے پرواز کرنے والے آخری ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور اس طرح اس کے لیے جنگ کا اختتام ہو گیا۔

جیلی نے امریکہ پہنچ کر 'پریس میچ' کے ایڈیٹر کو ٹیلی گرام دیا۔ جس میں مائیک کارٹر کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ مگر اسے اس تار کا جواب نہ ملا۔

دی ٹائم میگزین کے ایک نمائندے نے اس کی واپسی پر اس سے ایئر پورٹ پر گفتگو کی۔ اس وقت جیلی نے تمام وقعات بیان کیے۔ جن میں مائیک کارٹر کی موت کا ذکر بھی تھا۔ مگر اس نے ٹائم میگزین کے کسی شمارے میں اس حوالے سے کچھ نہیں پڑھا۔

بہر حال جیلی نے اپنی کتاب 'پہاڑی کے دامن میں شعلے' میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا۔ مگر 1976ء کے اوائل میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس پر..... تبصرہ ضرور ہوا۔ مگر اس کے بعد یہ کتاب گوشہ گمنامی میں چلی گئی اور اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہوا۔

دو، تین سال بعد جیلی ایک پارٹی میں شریک تھی کہ اس کی ملاقات ہیری فوسٹر سے ہوئی۔ وہ دونوں سائیگون کے بعد پہلی بار ملے تھے۔ اس کے بال سفید ہونے لگے تھے اور وہ کچھ بوڑھا سا نظر آ رہا تھا۔ مگر اس نے جیلی کو پہچان لیا۔

''جیلی! مجھے افسوس ہے کہ تمہاری کتاب کو وہ پذیرائی نہیں ملی، جس کی وہ مستحق تھی۔'' ہیری نے جیلی سے کہا۔

''دراصل لوگ ویت نام کی تلخ یادوں کو فراموش کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس قصے کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' جیلی نے کہا۔ ''بہر حال تم سناؤ، کیا کر رہے ہو۔''

''بس کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔'' ہیری نے کہا۔ ''تم نے اپنی کتاب میں مائیک کارٹر کی موت کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر وہ مرا نہیں زندہ ہے۔''

''کیا۔'' یہ سنتے ہی جیلی اچھل پڑی۔ ''مگر میری آنکھوں کے سامنے ویٹ کانگ سیاہ پوشوں نے اس پر خوب گولیاں برسائی تھیں۔''

''ہاں یہ سچ ہے کہ وہ ان باغیوں کی فائرنگ سے زخمی ہوا تھا۔ وہ مردوں سے بھی بدتر حال میں تھا لیکن چونکہ اس کی زندگی باقی تھی۔ اس لیے بچ گیا۔ وہ کافی عرصے تک ویت نام کی ایک جیل میں قید رہا۔ مگر بیماری کی وجہ سے اسے رہا کر دیا گیا تھا۔'' ہیری نے کہا۔

''لیکن اس کے بارے میں کسی اخبار نے کچھ نہیں چھاپا۔'' جیلی نے حیرت کا اظہار کیا۔

''مائیک ہمیشہ شہرت سے دور بھاگتا تھا۔'' ہیری نے کہا۔ ''وہ گوشہ نشیں قسم کا آدمی ہے۔''

''وہ 'پیرس میچ' کا نمائندہ تھا۔ اس رسالے نے بھی اس کے بارے میں کوئی خبر شائع نہیں کی۔'' جیلی بولی۔

''وہ اس رسالے کو چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے اس کے بارے میں رسالے نے کچھ نہیں چھاپا تھا۔'' ہیری نے کہا۔

''میری کتاب شائع ہوگئی۔ مائیک نے بھی ضرور دیکھی ہوگی۔ اس نے مجھ سے رابطہ تک نہیں کیا۔'' جیلی کی آواز میں شکوہ تھا۔

''ممکن ہے تمہاری کتاب اس کی نظر سے نہ گزری ہو۔'' ہیری نے کہا۔ ''اسے خوامخواہ الزام نہ دو۔''

''وہ کہاں رہتا ہے۔ میں اس سے ملنے جاؤں گی۔'' جیلی نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

''مجھے اس کی رہائش کا علم نہیں' میں نے اسے اوورسیز پریس کلب میں دیکھا تھا۔'' ہیری نے کہا۔ ''ممکن ہے وہاں سے اس کا پتا مل جائے۔''

☆☆

دوسرے روز جیلی نے اوورسیز پریس کلب فون کیا اور وہاں سے مائیک کارٹر کا پتا حاصل کیا۔ یہ ایک مشرقی گاؤں کا پتا تھا۔ پتے کے ساتھ کلب والوں نے اس کا فون نمبر بھی دیا تھا۔ جیلی نے اس نمبر پر فون کیا۔ ایک نوجوان عورت نے فون ریسیو کیا اور جیلی کو بتایا کہ مائیک کارٹر شہر سے باہر گیا ہوا۔

''دراصل مائیک یہاں رہتا نہیں۔ وہ اس پتے اور فون نمبر کو رابطے کے لیے استعمال کرتا ہے۔'' عورت نے بتایا۔

''بات یہ ہے کہ میں کل رات تک یہی سمجھ رہی تھی کہ مائیک کارٹر ویت نام میں ہلاک ہو چکا ہے۔ کل رات ہی مجھے پتا چلا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ مجھے اس سے فوراً ملنا ہے۔'' جیلی نے کہا۔

''میں کہہ نہیں سکتی کہ وہ کب واپس آئے گا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

جیلی' مائیک سے ملنے کے لیے جتنی بے تاب ہو رہی تھی' مائیک اس سے اتنا ہی دور ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس عورت کی زبانی مائیک کی ادھوری اطلاع پا کر اس کی بے چینی میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا اور اس کی یہ بے تابی اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

''میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے' نہ جانے کتنے لوگوں کو میں یہ بتا چکی ہوں کہ وہ مر چکا ہے۔ اب جب حقیقت میرے علم میں آ چکی ہے تو یہ سب کو معلوم ہونی چاہیے۔'' جیلی نے کہا۔

''میرا خیال ہے وہ ہرن کے شکار پر گیا ہے۔'' دوسری طرف سے نوجوان عورت نے بتایا۔ ''شاید پٹسلوانیہ میں ہو۔''

''اس کا پتا مل سکتا ہے۔ وہ کہاں ٹھہرا ہوگا۔'' جیلی نے بڑی عاجزی سے سوال کیا۔

''بکس کاؤنٹی میں نیو ہوپ کے قریب ایک ہوٹل ہے' دی گرین ہل ان..... وہ وہاں ملے گا۔'' دوسری طرف سے نوجوان عورت نے کچھ رک رک کر بتایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ اسے یہ بات بتانی بھی چاہیے یا نہیں۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ!'' جیلی نے کہا اور فون بند کر کے ایک نقشے پر جھک گئی' وہ جگہ مین ہٹن سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ چنانچہ اس نے 'گرین ہل ان' کا فون نمبر حاصل کیا اور وہاں فون ملایا۔ ڈیسک کلرک نے بتایا کہ مائیک کارٹر اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ اگر پیغام دینا ہے تو دیدیں۔ جیلی نے رابطہ منقطع کر دیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆

نیو جرسی سے سو میل کا فاصلہ طے کرتی ہوئی دو گھنٹے بعد جیلی بکس کاؤنٹی میں داخل ہوگئی۔ گیس اسٹیشن کے ایک ملازم نے اس کی رہنمائی کی اور بتایا 'دی گرین ہل ان' شکار پر آنے والوں کے لیے ایک پرائیوٹ قیام گاہ ہے جو چند سال پہلے بند

کر دی گئی تھی مگر حال ہی میں چند لوگوں نے مل کر اسے خرید لیا ہے۔ یہ سب لوگ اس ریاست کے نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق مختلف ریاستوں سے ہے۔

جیلی اپنی گاڑی میں روانہ ہوگئی۔ ایک گندی سی اور ناہموار سڑک کے اختتام پر اسے شہتیروں سے بنی ہوئی سرائے کی عمارت نظر آ گئی' جس کی پیشانی پر 'دی گرین ہل ان' کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس سرائے میں چاروں طرف کیبن بنے ہوئے تھے' دو شکاری ایک مردہ ہرن کو اپنی کار کی چھت پر رکھ رہے تھے' جیلی کی کار وہاں جا کر رکی وان شکاریوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی نظریں بتا رہی تھیں کہ اس علاقے میں عورت کا گزر ہی نہیں ہے۔

ڈیسک کلرک نے جیلی کو بتایا کہ مائیک کارٹر اپنے کمرے میں نہیں ہے' وہ اپنی پارٹی کے ساتھ باہر ہے۔ وہ وہیں بیٹھ کر مائیک کا انتظار کرنے لگی۔

وہ سوچ رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے مائیک کو تقریباً مردہ حالت میں دیکھا تھا اور اس کے خیال میں مائیک کے بچنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔

''اب تو ملنے پر ہی اصل حقائق کا علم ہوگا۔''

اس نے بالآخر یہ سوچ کر اپنا شانہ اچکایا اور گہری سانس فضا میں خارج کی۔

کچھ دیر بعد مائیک آ گیا' اس نے بڑے عام سے انداز میں جیلی سے ملاقات کی۔

''جیلی! کیسی ہو تم۔'' اس نے ایسے کہا جیسے ہفتہ بھر پہلے اس سے ملا ہو۔

''مائیک مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ...... تم...... تم زندہ ہو۔'' جیلی بول نہیں پا رہی تھی۔ جذبات کی شدت کی وجہ سے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''میں آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔'' مائیک نے کہا۔

''آؤ ادھر بار میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

دونوں بار میں جا بیٹھے۔ جیلی بہت خوش تھی۔

''اب بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا تھا۔'' جیلی نے پوچھا۔ ''میرے سامنے تم پر شدید فائرنگ کی گئی تھی۔''

''ہاں دو گولیاں میرے پھیپھڑے میں پیوست ہوگئی تھیں اور دو پہلوؤں میں...... مگر خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی خطرناک ثابت نہیں ہوئی۔ میری حالت بہت خراب تھی میں مردوں سے بھی بدتر تھا۔ اگر وہ میرا خصوصی علاج نہ کراتے تو شاید میں مر جاتا' ابتدا میں انہوں نے مجھے جیل میں رکھا اور جب میرا پھیپھڑا صحیح ہوگیا تو انہوں نے مجھے رہا کر دیا۔''

''اس دوران میں نے سبھی کو بتا دیا کہ تم مر چکے ہو۔'' جیلی نے شرمندگی سے کہا۔

''مجھے تم سے رابطہ کرنا چاہیے تھا...... خاص طور پر تمہاری کتاب کی اشاعت کے بعد۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے وہ کتاب دیکھی تھی۔''

''ہاں میں تمہارا شکر گزار ہوں تم نے کتاب کے ایک باب میں میرا تذکرہ بڑے خاص اور رومانی انداز سے کیا ہے۔'' مائیک کارٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مائیک! تم ایک رپورٹر ہو تم ویت نام سے واپس آئے تھے موت کے منہ سے نکل کر آئے تھے تمہاری کہانی اس سال کی سب سے زبردست کہانی ہوتی مگر تم نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اسے کسی عام واقعہ کی طرح نظر انداز کر دیا۔ ایسا کیوں کیا تم نے۔'' جیلی نے مائیک سے سوال کیا۔

''بس مجھے اس واقعہ میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔''

''شاید اسی لیے میں نے اسے لکھنے کی کوشش نہ کی۔'' مائیک نے سرسری انداز سے کہا۔

''میں نے 'پیرس میچ' کو تمہاری موت کی

اطلاع دی تھی۔ وہاں سے بھی نہ کوئی جواب ملا اور نہ انہوں نے وہ خبر شائع کی۔'' جیلی نے کہا۔

''میرا ان سے معاہدہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد انہیں اس سے کیا غرض تھی کہ میں زندہ ہوں یا مر گیا۔'' مائیک کارٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

دور پہاڑیوں میں کہیں فائرنگ ہو رہی تھی شاید شکاری اپنے کام میں مصروف تھے۔

''میں نے تمہارے رابطے کے نمبر پر فون کیا تھا۔'' جیلی بولی۔ ''اور وہاں سے تمہارا پتا معلوم کیا تھا۔ اس عورت نے تمہیں اطلاع تو دی ہوگی۔''

''ہاں مجھے تمہاری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔'' مائیک نے بے پروائی سے کہا تو جیلی کو ذرا سا دکھ ہوا۔ وہ اس شخص سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی اور وہ بے حسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''مائیک! تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔'' جیلی نے پوچھا۔

''ارے نہیں' مجھے تمہاری آمد کی بہت خوشی ہوئی ہے۔'' مائیک نے کسی بزرگ کے انداز سے اس کے بازو کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم واپس جاؤ طویل سفر کرنا ہے تمہیں..... رات ہو گئی تو سفر مشکل ہو جائے گا۔'' اس کا رویہ دیکھ کر جیلی کو بہت دکھ ہوا۔

''مائیک! بات کیا ہے۔ تم مجھ سے اس قدر بے اعتنائی کیوں برت رہے ہو۔'' جیلی پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

باہر اب بھی فائرنگ ہو رہی تھی اس بار یہ آوازیں قریب سے آ رہی تھیں۔

''مائیک! ویت نام میں ان لوگوں نے تمہیں کیوں چھوڑ دیا۔ آخر تم نے ان کے ساتھ ایسا کیا سلوک کیا تھا جو وہ تم پر مہربان ہو گئے۔'' جیلی نے پوچھا۔

''میں تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں اس سے زیادہ میرے پاس تمہیں بتانے کو اور کچھ نہیں ہے۔''

''میں تمہارے پاس کچھ سننے یا کوئی کہانی تیار کرنے نہیں آئی تھی۔ تم نے میری جان بچائی تھی تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی اور بس..... جا رہی ہوں میں۔''

اسی لمحے ایک شخص اندر داخل ہوا اور اس نے مائیک سے کہا۔ ''سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔'' مائیک نے اپنے ساتھی سے کہا' پھر وہ جیلی سے مخاطب ہوا۔ ''اچھا تم اپنا فون نمبر دے جاؤ تم سے میں بعد میں بات کروں گا۔''

''میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' جیلی نے ناگواری سے کہا۔

''میں تم سے.....'' مائیک نے کہا تو جیلی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''چھوڑو مائیک! ایک لڑکی گھر پر تمہاری منتظر ہے۔''

جیلی کے لہجے میں افسردگی نمایاں تھی جسے مائیک نے بہت واضح طور پر محسوس کر لیا اور اس کے چہرے پر اپنی نگاہ مرکوز کرتے ہوئے انتہائی تیزی سے اس کے خیال کی تردید کر دی۔

''وہ میری صرف دوست ہے۔'' مائیک نے کہا وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے' باہر لگ بھگ ایک درجن شکاری کھڑے تھے۔ ایک دراز قد ان سے اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے کوئی فوجی انسٹرکٹر ہدایات دیتا ہے۔

مائیک گویا جان بوجھ کر جیلی کو اس گروپ سے دور لے گیا۔

''یہ لوگ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔'' جیلی نے پوچھا۔

''تم اپنی کار کی طرف چلو۔'' مائیک نے اس کی بات کاٹی۔ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

''یہ لوگ شکاریات پر لیکچر سن رہے ہیں تاکہ شکار کے دوران محفوظ بھی رہیں اور کامیاب بھی۔''

''مائیک!'' جیلی نے اپنی کار کے پاس

رکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک فلم دیکھی تھی جس میں ایک بحری جہاز پر ایک عورت نے ایک ایسے شخص کو اپنے زیر اثر کرلیا تھا جس کے بارے میں وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سب مردہ ہیں۔ اس بحری جہاز کا ہر مسافر مر چکا ہے اور وہ سب رفتہ رفتہ کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔''

یہ سنتے ہی مائیک کارٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ''مگر بے فکر رہو جیلی! میں زندہ ہوں اور یہاں موجود ہر شخص زندہ ہے۔'' وہ خاموش ہوگیا۔ ایک دم اس کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کی بات کوئی نہیں سن سکتا تو اس نے جیلی سے کہا۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں زندہ کیوں ہوں اور اس جہنم سے میں نے کس طرح نجات حاصل کی! وہ لوگ مجھ پر کیوں اور کیسے مہربان ہوگئے تھے۔ سب کچھ بتاتا ہوں تمہیں۔''

کہتے کہتے وہ رکا اور بولا۔ ''مگر اس کے بعد تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کروگی۔''

''ٹھیک ہے۔'' جیلی نے سرد آہ بھری۔

''ان لوگوں نے مجھے اس لیے زندہ رکھا تھا کہ میں ایک ایسی چیز کے بارے میں جانتا تھا جس کی انہیں ضرورت تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ چیز کہاں ہے اور جب میں نے انہیں اس چیز کے مقام کے بارے میں بتا دیا تو انہوں نے بطور انعام مجھے رہا کردیا۔''

''وہ کیا چیز تھی مائیک۔'' جیلی نے سوال کیا۔

''جنوبی ویت نام کی حکومت کا سرکاری خزانہ!'' مائیک نے کہا۔ ''دوسو بیس ملین ڈالرز..... وہ بھی سونے کی سلاخوں کی صورت میں!'' مائیک نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''مائیک! کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔'' جیلی نے پوچھا۔

''سی آئی اے کو وہ خزانہ آخری دن ایک طیارے کے ذریعے ویت نام سے لے جانا تھا مگر حالات خراب ہوگئے اور وہ خزانہ نکالا نہ جاسکا۔ میں اسی کو چیک کرنے اس دن تمہارے ساتھ ایرپورٹ گیا تھا۔''

''تم نے ایسا کیوں کیا۔'' جیلی نے سوال کیا۔

''وہ خزانہ ہمیں تو مل نہیں سکتا تھا۔'' مائیک نے کہا۔

''وہ بہرحال جلد یا بدیر ان ہی لوگوں کے ہاتھ لگنا تھا' لہٰذا میں نے انہیں اس کا پتا بتا دیا اور اپنی جان بچالی۔''

''حکومت کو یہ معلوم ہے۔ تمہیں سزا ملی ہے۔'' جیلی نے پوچھا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مزید سوال نہیں کروگی۔'' مائیک نے کہا۔ ''بس اب تم واپس جاؤ۔''

جیلی اپنی گاڑی میں سوار ہوئی اور واپس روانہ ہوئی۔ مائیک نے ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہا۔

دوسرے روز اخبار میں پہلے صفحے پر یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ ''شکار کی مہم کے دوران حادثاتی طور پر سی آئی اے کا سابق سربراہ ہلاک۔'' یہ خبر پڑھ کر جیلی سن ہوکر رہ گئی۔ یہ یقیناً کوئی حادثہ نہیں تھا حکومت کی ایجنسی نہ جانے کب سے مائیک کے پیچھے تھی۔ آخر اس نے اسے تلاش کر ہی لیا اور اس کے کیے کی سزا دے دی۔

جیلی ایک بار پھر حیران ہوکر سوچ رہی تھی کہ مائیک نے اسے اتنی سختی سے کیوں مزید سوال کرنے سے روک دیا تھا۔ شاید وہ یہ راز مرتے دم تک اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میری وجہ سے..... اور اس سے آگے جیلی کی سوچوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

تیسری قسط

تم سے ہی وہ نہیں

غزالہ جلیل راؤ

اشرف المخلوقات ہی ہر کہانی کا مرکز ہوتا ہے باقی بہت سے ذی روح ہیں لیکن سب کے سب انسان کے تابع۔ ان کی ہر کہانی انسان سے منسوب ہوتی ہے۔ میں نے ہر دور کو دیکھا ہے۔ اس سے لطف اندوز ہوا ہوں۔ اسے لکھا ہے۔ میں نے انسان کو تاریخ سے روشناس کرایا ہے' مجھ میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ میں ماضی کا شناور ہوں۔ میں حال کا مسافر ہوں اور میں ہی سب سے پہلے مستقبل میں جھانکوں گا۔ ایسے تو میری شناوری میں بہت سے نت نئے تجربات ہیں' میں سائنس داں ہوں۔ میں ماہر نفسیات اور بہت کچھ ہوں۔ بڑے دلچسپ تجربات ہیں میری زندگی میں لیکن جس چیز کو میں نے سب سے زیادہ محسوس کیا ہے وہ ہے 'تضاد' ہاں انسانی فطرت کا تضاد حالات کی وجہ سے۔ ماحول کی وجہ سے۔ کہیں مشکلوں کے دریا سے گزر کر سکون کے مرغزار اور کہیں سکون کی وادیوں کے سفر کا اختتام خارزاروں پر۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک انوکھی داستان

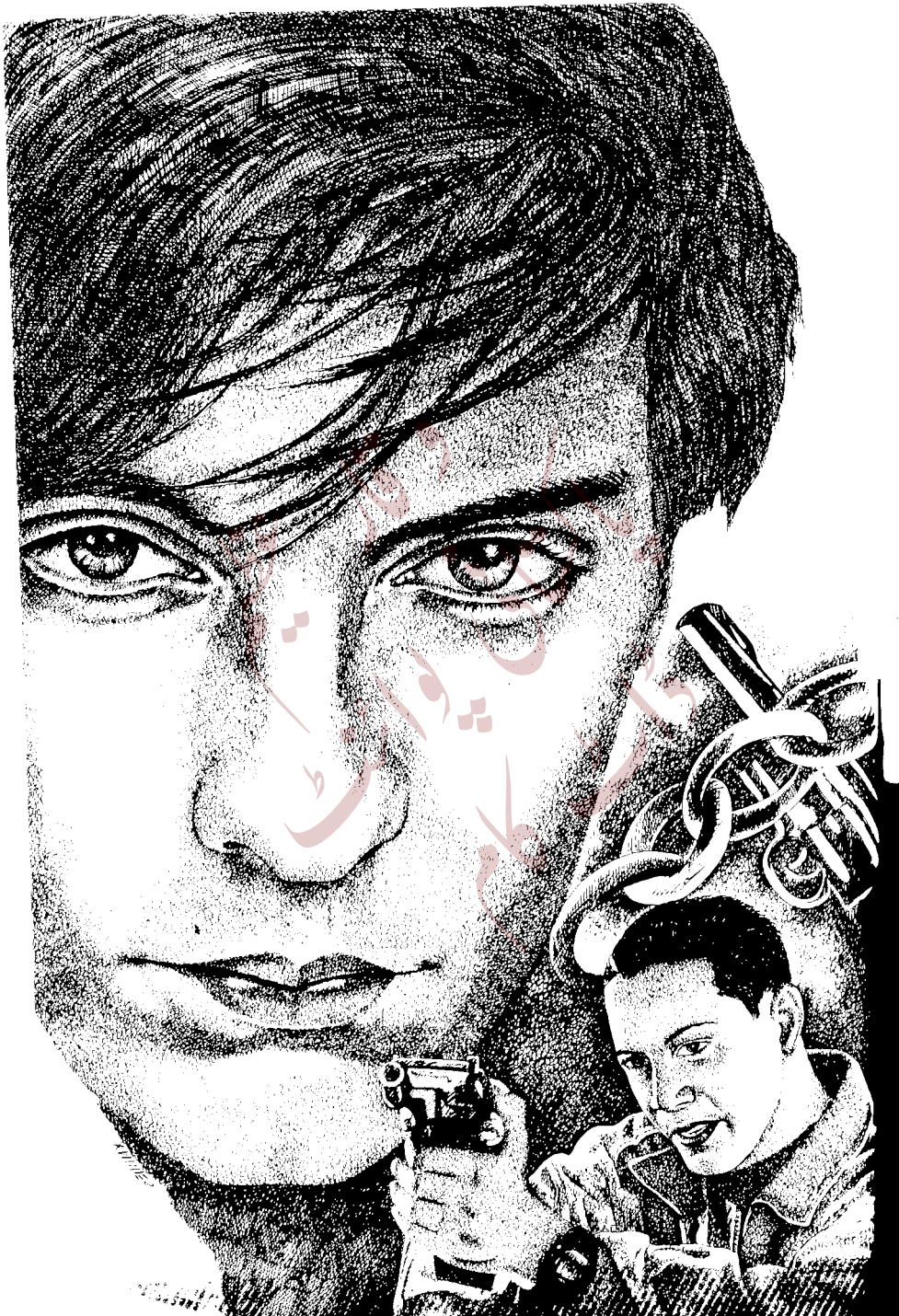

آوازیں علی شاہ کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

''یہ کون ہے۔''

یہ کیا کہے گی۔ کیا کہے گی یہ انہیں باتوں میں سے ایک یا پھر یہ کوئی نئی بات کہے گی۔ علی شاہ نے دھندلائی آنکھوں سے دوبارہ شیشے کی طرف دیکھا۔ دونوں سائے ایک شیشے کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔

کیا واقعی یہ شاداب ہے اور کون ہوسکتا ہے اس گھر میں' اس کا تو سایہ بھی پہچانا جا رہا ہے اور وہ دوسرا۔ کیا شاداب کے بچپن کا ساتھی کیا کروں' دونوں کو رنگے ہاتھ پکڑ لوں۔ دونوں کو قتل کر دیں یا پھر' یا پھر۔

اچانک اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ دروازہ کھلا اور دو افراد باہر نکل آئے۔ اسے اور کچھ نہ سوجھا۔ اس نے پھرتی سے کار گیئر میں ڈالی اور تیر کی طرح آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور جا کر کار روکی اور عقب نما آئینے میں دیکھنے لگا۔ دور سے اسے اس شخص کا چہرہ تو نظر نہیں آیا لیکن اس کی جسامت اور اس کا حلیہ دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ جینز پہنے ہوئے تھا اور اچھے تن و توش کا جوان نظر آ رہا تھا۔ باہر نکل کر اس نے پیدل ایک طرف کا رخ اختیار کیا تھا۔

علی شاہ کا دل تو چاہا کہ کار موڑ کر واپس لائے اور اس نوجوان کو کچلتا ہوا نکل جائے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو اس ارادے سے روکا تھا۔ اور خود کو سمجھایا تھا کہ کم از کم اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش تو کرے۔

وہ اپنی جگہ رکا گہری گہری سانس لیتا رہا۔ پھر کار کو آگے لے جا کر گھمایا اور آہستہ آہستہ اسے کوٹھی کے گیٹ تک لایا۔ آٹو میٹک گیٹ کار کی چابی میں پڑے ریموٹ سے کھلتا تھا اور اسی سے بند ہو جاتا تھا۔ اس نے کار پورچ میں روک دی۔ ملازم فضل خان نے صدر دروازہ کھولا تو وہ چونک پڑا۔ اس نے گہری نظروں سے فضل خان کو دیکھا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ فضل خان بہت کچھ جانتا ہوگا۔ بیشک وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا لیکن وہ گھر کے حالات سے بے خبر نہیں ہوگا گھر کے ملازم ہر بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔

آہ' آج پھر ایک عورت اپنے اصل روپ میں سامنے آ گئی۔ آہ..... میں کیوں بھول گیا کہ شاداب عورت ہے' بے وفا' بدکردار..... جو کسی سے مخلص نہیں ہوتی چاہے وہ شوہر ہو' بیٹا ہو' بھائی ہو..... شاداب بھی فریبی نکلی۔ خورشید اور نوید کی طرح۔ جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور..... آہ پھر غلطی ہوگئی۔ پھر دھوکہ ہوگیا دیکھ چکا تھا میں عورت کو سمجھ چکا تھا۔ اسے اچھی طرح برت چکا تھا۔ پھر یہ کیا ہوگیا۔ میں نے عورت پہ اعتبار کیوں کرلیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ صدر دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ سارا وجود شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ عورت' عورت ایک نظریہ قائم کیا تھا اس کے بارے میں پھر کیوں بھول گیا' کیوں دوبارہ اس طلسم کا شکار ہوگیا۔ دوبار تجربہ ہوا تھا۔ ایک ماں تھی۔ ایک بہن اس سے زیادہ مضبوط رشتے اور کون سے ہوسکتے تھے۔ جب وہ کچے دھاگے تھے پھر ایک اجنبی بالکل اجنبی وجود پر بھروسہ کیا معنی رکھتا تھا۔

اندر داخل ہو کر وہ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دیر تک وہاں کھڑا آہٹیں لیتا رہا۔ وہ کیا کر رہی ہوگی' شاداب..... اجنبی' اندر نائٹ بلب جل رہا تھا اس نے بہ آہستگی دروازہ کھولا۔ شاداب بڑے الہڑ انداز میں سو رہی تھی۔ شب خوابی کے لباس میں ملبوس بکھرے بال چہرے پہ بلا کی معصومیت آہ کتنا پرفریب وجود ہے' یہ کم بخت کتنی اچھی اداکاری کر رہی ہے۔ قطعی نہیں سو رہی یہ۔ اسے میرے آنے کا پتا ہے۔ مکاری کر رہی

ہے سونے کی' اے میرے خدا۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں آگ دہک رہی ہے۔ کتنی مکار ہے کمبخت' جاگ رہی ہے۔ سو فیصدی جاگ رہی ہے۔ کئی بار اسے احساس ہوا کہ شاداب نے آنکھوں میں جھری سے دیکھا ہے۔

کوئی غلط فہمی ہے سب کچھ واضح ہو گیا ہے۔ کوئی دھوکہ نہیں ہوا ہے۔ ایک بار پھر چوٹ کھائی ہے۔ ایک بار پھر دل میں سوراخ ہوا ہے۔

اب کیا کروں۔

اس نے جوتے اتارے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔ دوسری صبح بخار میں بھن رہا تھا۔ شاداب نے اس کا گرم بدن دیکھا اور بیتاب ہو کر اٹھ گئی۔ وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے شاداب کی پیشانی دیکھی اور اندر ہی اندر جھلسنے لگا۔

یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ خورشید بھی تو اتنا ہی پیار کرتی تھی۔ نویدہ کا منہ بھی بھائی' بھائی کہتے خشک ہوتا تھا۔ اور سب غائب ہو گئیں۔ سب نے آنکھیں پھیر لیں اور اس کا نام بیوی ہے لیکن' لیکن اس کا اصل نام عورت ہے۔ خالص عورت' خالص عورت۔

''علی میری جان۔'' شاداب نے بڑے پیار سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تمہیں بخار ہو گیا ہے علی اور..... اور..... علی بولو۔''

''ہوں!'' وہ بولا۔

''تمہیں بخار ہو گیا ہے۔''

''ہاں۔''

''کب..... کیسے۔''

''پتا نہیں' کیا بتاؤں۔''

''مجھ سے غلطی ہو گئی چندا' نیند آ گئی۔ تمہارے آنے سے پہلے سو گئی۔ کمبخت نیند آ گئی۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہوں!'' اس نے کہا۔

''کیا کروں۔ ڈاکٹر کو فون کر کے بلواؤں یا ہسپتال چلیں۔''

''نہیں کچھ نہیں۔''

''اٹھو میری زندگی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ ہائے کتنا تیز بخار ہے۔''

فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ رات کو کر لیا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی ایسی بات تھی جس میں کسی سے مشورہ کیا جاتا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''منہ ہاتھ دھولوں کپڑے بدل لوں' ہسپتال چلوں۔ ڈاکٹر مذاق نہیں اڑائیں گے کہ معمولی سے بخار کے لیے ہسپتال آ گئے۔''

''مگر بخار ٹھیک تو ہونا چاہیے۔ پہلے تو کبھی آپ کو بخار نہیں چڑھا۔''

''چڑھا تھا کمبخت اتر گیا بس تقدیر کی بات ہے۔ انسان تو دھوکے دیتا ہی ہے تقدیر اگر دھوکا دے تو طوفان آ جاتا ہے۔''

''علی!'' شاداب حیرت سے بولی اور وہ جلدی سے اٹھ گیا۔

''ارے ارے آہستہ کیوں اٹھ گئے۔''

''واش روم جا رہا ہوں۔ چائے بنوا دو..... اور ہاں سنو چائے میں کچھ ملوا دو تو بہتر ہے۔'' اس نے لفظ چبا چبا کر کہا۔

''کیا ملوا دوں۔'' وہ سہمی سہمی آواز میں بولی۔ اسے علی شاہ کی باتیں بڑی عجیب عجیب لگنے لگی تھیں۔

''ڈر گئیں۔ سرسام نہیں ہوا بابا۔ کوئی ایسی دوا جس سے بخار اتر جائے۔ تمہیں معلوم ہے ویسے تو میں کوئی دوا کھانے سے رہا۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واش روم کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے باہر آیا تو چائے کے برتن سامنے رکھے تھے۔

''بھوک بھی لگ رہی ہے۔'' وہ بولا۔

''شاہدہ ناشتہ تیار کر رہی ہے۔ میں جلدی

ناشتہ لگاتی ہوں۔'' وہ مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔ شاہدہ فضل خان کی بیوی تھی۔ علی شاہ نے چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔ دہکتی ہوئی چائے کے جلتے ہوئے گھونٹوں نے سینہ جھلسا کر رکھ دیا۔

''دھت تیرے کی۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

''مکار ہے' چالاک نہیں۔ حالانکہ میں نے اشارہ بھی دیا تھا کہ چائے میں کچھ ملا دے۔ جیت جائے گی' لیکن ہار گئی۔ چلو اچھا ہے ایک عورت سے تو انتقام لینے کا موقع مل جائے۔ پھر..... پھر تو میں بھی جیوں گا۔ بے وقوف کہیں کی۔''

وہ کچھ دیر میں ہی واپس آئی۔ شاہدہ ناشتے کی ٹرالی ڈھکیلتی رو رہی تھی۔ ''میں نے ناشتہ میز پر نہیں لگوایا۔ بستر میں بیٹھ کر ہی کر لو۔ یہ ٹیبلٹ لے لو۔ بخار کے لیے ہیں۔''

''لاؤ' لاؤ ممکن ہے تمہاری تقدیر تمہارے حق میں فیصلہ دے دے۔'' اس نے دونوں گولیاں حلق میں ڈال کر پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ پھر ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

وہ سامنے بیٹھی یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ علی شاہ اسے ناشتے کے لیے کہنا بھی بھول گیا تھا جبکہ دونوں ایک ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ ناشتے سے فارغ ہو گیا۔ تبھی شاداب کی آواز ابھری۔

''علی۔''

''ہوں۔''

''ناراض ہو۔''

''نہیں۔''

''کیا بات ہے۔''

''بیمار ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم جیسی پیاری لڑکی سے کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ بخار میں بہک گیا ہوں۔ لیکن لگ رہا ہے بخار اتر گیا۔ دیکھو میرا ہاتھ دیکھو۔'' علی شاہ نے اپنی کلائی آگے کر دی اور اس نے علی شاہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شاداب کا ہاتھ برف کی طرف ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''ابھی نہیں اترا۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

''اترے گا۔ ضرور اترے گا۔ کچھ بخار دیر سے اترتے ہیں۔ آؤ باہر چلیں' کمرے میں بری طرح دم گھٹ رہا ہے۔'' وہ شہر سے نیچے اتر آیا۔ پھر بولا۔ ''کہاں چلیں۔''

''باہر لان پر اور کہاں۔''

''ارے لان پر کیا فائدہ۔ کہیں دور' بہت دور۔''

''نہیں اتنی صبح کہاں جائیں گے۔''

''لانگ ڈرائیو پر۔ تم آرام کرو۔ میں چلا جاتا ہوں۔''

''نہیں علی۔ پلیز تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام کرو' میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔'' وہ پراضطراب لہجے میں بولی۔

''ارے واہ۔ واقعی کہیں نہیں جانے دو گی۔''

''علی..... میرے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ مجھے بتا تو دو۔ کوئی غلطی ہوئی ہے مجھ سے۔ بتا دو پلیز۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ بہت بڑی ہو تم بچی نہیں ہو آؤ۔ آؤں پھر چلیں۔ آج تمہیں ایک نئی جگہ دکھاؤں۔ آؤ' آؤ۔'' وہ تیزی سے اٹھا اور کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ شاداب اس کے پیچھے جھپٹی تھی۔ علی شاہ اس کمرے میں آ گیا جہاں قید خانے میں جانے کا راستہ تھا۔ تبھی علی شاہ نے شاداب کے چہرے پر سکون کے آثار دیکھے۔

''میرے خدا۔'' شاداب گہری سانس لے کر بولی۔

''خیریت..... کیا ہوا۔''

''سمجھ گئی۔ اب سمجھی ہوں۔''

''ویری گڈ..... اچانک سب کچھ سمجھ گئیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''جی سمجھ گئی تمہیں کسی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ میں تہہ خانے میں گئی تھی۔ افوہ یہ ہے تمہاری ناراضگی کا راز۔ مگر خدا کی قسم علی یہ صرف اتفاق سے ہوگیا تھا۔''

علی شاہ نے اس کی پوری بات بھی نہیں سنی اور قید خانے کا دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگا۔ وہ بدستور اس کے پیچھے آئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''قسم کھائی ہے میں نے' میں جان بوجھ کر قید خانے میں نہیں گئی تھی۔ وہ بس اتفاق تھا اور اور مجھے بھی تم سے شکایت ہے۔''

اس نے شاداب کی بات سنی ان سنی کر دی تو وہ بولی۔

''مجھے تم سے شکایت ہے کہ تم نے اس قید خانے کا راز مجھ سے کیوں چھپایا۔ آخر اس میں ایسی کیا بات تھی۔ جبکہ میں تمہاری زندگی بھر کی۔''

علی شاہ نے آگے بڑھ کر روشنی کا سوئچ آن کر دیا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ''کیسی جگہ ہے۔''

''میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' وہ تم سن بھی نہیں رہے۔''

''کیوں نہیں سن رہا۔''

''کیا کیا ہے میں نے' بتاؤ۔''

''یہی کہ تم یہ قید خانہ دیکھ چکی ہو۔''

''اور وہ صرف اتفاق تھا۔''

''ہوتا ہے' ہوتا ہے۔ کبھی کبھی عجیب اتفاقات ہو جاتے ہیں۔ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ ان اتفاقات کے بارے میں۔ لیکن وہ..... ہو جاتے ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''تم نے یہ الماریاں بھی دیکھی ہوں گی۔''

''ہاں.....'' وہ مجرمانہ انداز میں بولی۔ 'سوری مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''ان میں سب کچھ دیکھا تم نے۔''

''ہاں۔''

''کیا ہے ان میں۔''

''صرف کپڑے۔''

''ہاں صرف کپڑے..... یہ الماری میری ماں کے ملبوسات کی ہے۔ بہت فیشن ایبل ہوگئی تھیں وہ..... حالانکہ جب ہم غریب تھے تب ان بے چاری کے پاس بہت ہی معمولی سے چند کپڑے تھے۔ میں بہت دکھی تھا اس بات پر اور سوچتا تھا کہ ماں کی الماری کپڑوں سے کیسے بھر دوں۔ تب میں دوبئی چلا گیا۔ وہاں سے میں نے اتنی دولت بھیجی کہ ماں کی الماری کپڑوں سے بھر گئی۔ مگر سارا کھیل بگڑ گیا۔ میں اپنی ماں' اپنی بہن اور اپنے باپ کے قدموں میں ہر خوشی ڈال دینا چاہتا تھا اور میں نے شدید محنت کر کے یہ سب کچھ کر ڈالا۔ لیکن عورت' عورت کچھ نہیں ہے۔ نہ ماں' نہ بہن' نہ نہ نہ.....'' علی شاہ کی آنکھیں خون اگلنے لگیں۔ ''ہاں صرف عورت عورت کے..... بھول گیا تھا۔ آہ بھول گیا تھا کیوں بھول گیا تھا۔''

ایک بار پھر..... ایک بار پھر..... وہ بری طرح کانپنے لگا۔ شاداب نے اسے دیکھا اور بری طرح بدحواس ہوگئی۔

''واپس چلو علی واپس چلو تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔''

''کیوں بھول گیا تھا میں۔ کیوں بھول گیا تھا کہ تم بھی عورت ہو۔ میں کیوں بھول گیا تھا۔ غلطی میری ہے۔ میں پھر اکیلا رہ گیا۔ ہائے میں پھر اکیلا رہ گیا۔ کیا کروں۔ مر جاؤں۔ میں تو پہلے بھی مرنا چاہتا تھا اور اب میں کیا کروں۔ مر جاؤں' مگر کیوں' ہر بار میں ہی کیوں مروں۔ مجھے جینا چاہیے اور تم۔'' اس نے خونی نظروں سے شاداب کو دیکھا۔

''علی پلیز..... واپس چلو۔ پتا نہیں تمہیں کیا ہو رہا ہے۔'' شاداب سوکھے پتے کی طرح لرز

رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔

''اور تم..... ہاں اس بات تم مرو۔ اس بار..... کیا سمجھا ہے تم سب نے مجھے۔ کیا سمجھا ہے۔'' اس نے چیتے کی طرح چھلانگ لگائی اور شاداب کے قریب پہنچ گیا۔ شاداب کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ علی شاہ نے خونخوار انداز میں شاداب کی گردن دبوچ لی۔

''علی..... علی۔'' شاداب اس کے شکنجے سے گردن چھڑانے لگی۔

''اب میں جیوں گا اور انہیں مرنا پڑے گا جو مجھے مار دینا چاہتے ہیں۔ اس بار تمہیں مرنا ہوگا عورت اس بار تم مرو گی۔''

''میری' میری بات تو سنو علی میری بات تو سنو' میں تو..... میں تو تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ آہ تم نے علی آ' آپی..... سنو تو۔''

''یہی نا کہ تم' تم بچپن سے اسے چاہتی تھیں۔ مگر حالات کی مجبوریوں نے تمہیں یہی بتانا چاہتی تھیں تم مجھے۔ میرے لیے یہ کونسی نئی بات ہے۔ پھر مجھے کیوں' مجھے کیوں۔''

اس نے شاداب کے حلق میں انگلیاں گڑا دیں۔

''آآ آ۔'' شاداب کے حلق سے خرخراہٹ بلند ہونے لگی۔ اس کا چہرہ تیزی سے نیلا پڑتا جا رہا تھا وہ جانکنی کے عالم میں اپنے کمزور ہاتھوں سے گردن چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ نیچے لٹک گئے' آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں اور چند لمحوں کے اندر اندر ان میں زندگی کی چمک مفقود ہوگئی۔ لیکن علی شاہ پوری قوت سے اس کی گردن دباتا رہا۔ اس پر شدید جنون طاری تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

''میرے باپ کو مار دیا تو نے۔ میرے معصوم باپ کو..... میں تجھے کیسے زندہ چھوڑ سکتا ہوں۔'' پھر اسے احساس ہوگیا کہ شاداب کے اندر اب زندگی کی رمق باقی نہیں رہ گئی ہے تو اس نے اس کی گردن چھوڑ دی اور شاداب کا بے جان بدن زمین پر آ گیا۔

☆☆

رشید احمد بھائی کو دل کی بات بتاتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ ان کے چہرے پر شدید کشمکش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے جمال کہ میں نے سیدھی سادی زندگی گزاری ہے۔ کبھی ٹیڑھے میڑھے رستوں پر سفر نہیں کیا بیٹی اور بیوی کے علاوہ تم بھی میری ذمے داری تھے۔ میں نے حتی الامکان یہ ذمے داری پوری کرنے کی کوشش کی۔ تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی ناجائز پیسے نہیں کمائے اور تنگی ترشی سے زندگی گزاری سب ایک ہی بات کہتے تھے کہ نواب احمد دنیا بہت بدل گئی ہے۔ اس دور میں عزت ذہانت اور شرافت کا مفہوم بدل گیا ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو' عزت دار کون ہے۔ کسے عزت دار کہتے ہیں۔ خیر میں ان بکھیڑوں میں نہیں پڑتا۔ میرا نظریہ آج بھی وہی ہے۔ نیکیوں کا ایک مقام ہے تاہم اب میرا نظریہ متزلزل ہو رہا ہے۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میری سوچ غلط ہے اس ایمانداری کی وجہ سے دو بار نوکری سے نکالا گیا۔ ہر طرح کی ذلت اٹھائی۔ گویا وقت ہی بدل گیا۔ اور اب بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں جمال احمد۔''

''کیا بھائی صاحب۔''

''تم میرے لیے بیٹے کی طرح ہو۔''

''طرح نہیں بھائی صاحب۔ میں بیٹا ہوں۔''

''ہاں بیشک۔ اور تمہاری ایک بہن بھی ہے۔ بہن کہہ لو۔ بھتیجی کہہ لو۔''

''جی بھائی صاحب۔''

''بڑی ہو رہی ہے۔ لیکن۔''

''جی آگے کہیے۔''

''نہ تمہارے لیے..... نہ اس کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ اسے عزت و آبرو کی زندگی دینا میرا ہی نہیں تمہارا بھی فرض ہے۔''

''کیوں نہیں بھائی صاحب۔''

''وقت کے تقاضے بدل گئے ہیں۔ دور دور تک کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی کہ میں اکلوتی بیٹی کو اچھی جگہ رخصت کر سکوں۔''

''مجھے احساس ہے بھائی صاحب..... آپ کے ذہن میں کوئی بات ہے تو مجھے بتائیے۔ یا پھر ہم دونوں مل کر کچھ سوچتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔''

''ہاں میرے ذہن میں کچھ ہے۔''

''ہے.....'' جمال اچھل پڑا۔

''ہاں۔''

''کیا.....'' جمال نے پوچھا اور رشید احمد سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر گہری سانس لے کر بولے۔

''بعض اوقات انسان کے سامنے کچھ مرحلے آجاتے ہیں لیکن اس کی ذہنی پسماندگی اسے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ میرے ساتھ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ آج بھی یہ سچ ہے جمال کہ میں خود بے بس پاتا ہوں۔ لیکن تمہارا سہارا مجھے تقویت دیتا ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں کر سکتا ہوں..... کچھ بھی نہیں۔''

''آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں بھائی صاحب تو پھر اتنا تکلف کیوں کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی آپ سے سرکشی نہیں کی ہے۔''

''ہاں میں اعتراف کرتا ہوں۔''

''تو پھر پریشان کیوں ہیں۔ میں جس قابل ہوں حاضر ہوں۔ آپ کے لیے جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔ آپ مجھے یہ حکم دے سکتے ہیں۔''

''میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔ احمد کمال صاحب کے پاس ایک شخص آیا جس کا نام طارق بلبن تھا۔ طارق بلبن نے ایک عجیب کہانی سنائی' نواب رشید احمد نے ایک ایک لفظ یاد کر کے جمال کو پوری کہانی سنائی اور جمال جدائی سے رشید احمد کی صورت دیکھتا رہا۔'' یہاں تک کہ نواب رشید احمد پوری کہانی سنا کر خاموش ہو گئے۔ تب جمال نے گہری سانس لی اور بولا۔

''ہمارا اس کہانی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے بھائی صاحب۔''

''گہرا تعلق ہے۔''

''مجھے بتائیے۔''

''جمال جو خیال میرے ذہن میں آیا ہے وہ بہت عجیب ہے۔ یوں سمجھ لو ایک طرح سے کچھ فلمی سی سچویشن ہے لیکن فلموں میں بھی انسان زندگی کی کہانیاں پیش کی جاتی ہیں۔''

''جی..... بیشک۔''

''بیلا..... یہ کردار ذہن میں ہے نا۔''

''جی..... بالکل۔''

''ہمیں بیلا کو سامنے لانا ہے۔''

''ہمیں۔''

''ہاں۔''

''مگر ہم اسے کہاں تلاش کر سکتے ہیں۔''

''تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیلا ہمارے پاس ہے۔''

''ایں..... ہمارے پاس۔''

''ہاں..... شرمین۔''

''میں بالکل نہیں سمجھا بھائی صاحب۔''

نواب احمد کچھ لمحے خاموش رہے پھر ایک گہری سانس لے کر بولے۔

''ہاں نازنین ہماری نازنین' وہ شرمین نہیں بیلا ہے۔''

''آپ کیا بات کر رہے ہیں بھائی جان۔ ہماری نازنین اور بیلا۔''

''ہاں' میں نے جو تجویز سوچی ہے اس کے

بارے میں تمہیں تفصیل بتا رہا ہوں۔ ایک شخص جس کا نام عامل شاہ ہوگا یعنی ہمارا اپنا آدمی جو عامل شاہ کی حیثیت سے سامنے آئے گا۔ اور کسی مخصوص نواحی علاقے میں ایک ایسی جگہ منتخب کرنا ہوگی جہاں ایک لڑکی رہتی ہے۔ جس کا نام بیلا ہے۔''

جمال ایک بار پھر اچھل پڑا۔

''سنتے رہو۔ کہانی میرے ذہن سے نکل جائے گی۔'' رشید احمد نے کہا۔

''جی بھائی صاحب۔''

''ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ وہ لڑکی طارق بلبن کی پوتی ہے۔ یعنی ازلہ کی بیٹی ہے۔ کیا سمجھے۔ خالق بلبن کی اولاد سمجھ رہے ہو نا میری بات۔''

''نہیں بھائی صاحب پلیز ذرا تفصیل۔'' جمال نے بے چارگی سے کہا۔

''بے وقوف وہ لڑکی ہماری نازنین ہوگی۔''

طاہر ایک بار پھر اچھل پڑا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے رشید احمد کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''مم..... مگر شرمین۔''

''ہاں' شرمین اس لڑکی کا کردار ادا کرے گی اور ہم جس طرح بھی ممکن ہو سکے گا شرمین کو بیلا کی حیثیت سے طارق بلبن کے پاس پہنچائیں گے۔ بڑی لمبی پلاننگ کرنی ہوگی طاہر اور اس کے لیے تم سے بہتر آدمی اور کون ہو سکتا ہے۔''

طاہر تھوڑی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا پھر بولا۔

''ایک بات بتایئے بھائی جان آپ کو خدا کی قسم سچ بتایئے۔''

''ہاں پوچھو۔''

''کیا آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

''کیسا مذاق۔''

''امتحان لے رہے ہیں میرا۔ میں آپ سے کہتا رہتا ہوں کہ اس کے بعد کوئی غلط کام نہیں کروں گا اور آپ..... آپ۔'' رشید احمد نے گردن جھکالی اور آہستہ سے بولے۔

''نہیں' یہ مذاق نہیں ہے۔''

''تو پھر۔''

''میں سنجیدہ ہوں۔ مجبوری ہے جمال۔ بالکل مجبوری ہے میں بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ۔''

''میں اگر ناکام رہا تو میرا جو بھی حشر ہوگا میں اسے برداشت کرلوں گا۔ ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں گا۔ میں اکتا گیا ہوں میں اس زندگی سے کیا کچھ نہیں کیا میں نے..... ساری زندگی نیکیوں کی تلاش میں گزاری۔ بچپن بھی ایک عذاب تھا۔ جوانی رو رو کر کاٹی۔ چلو میرا تو کچھ بھی ہوا لیکن میری شرمین اس کے لیے میرا دل' ہمیشہ روتا ہے کیا ملا ہے بیچاری کو میں تن کے کپڑے اور پیٹ کی روٹی میں نے تو جدوجہد کرتے زندگی گزار دی لیکن نازنین کے لیے میرے خراب اس کے اعلیٰ مستقبل سے سجے ہوتے ہیں' میں خوابوں میں اسے اچھی زندگی گزارتے دیکھتا ہوں اور جب حقیقت کی دنیا میں آتا ہوں تو ہاتھ ملنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا میرے وسائل ہی نہیں ہیں کچھ کوشش نہیں کی میں نے آج تک وہیں کے وہیں کھڑا ہوں۔''

طاہر کے چہرے پر گہرا تعصب نظر آ رہا تھا۔ چند لمحے اس پر جذباتی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر اس نے کہا۔

''بھائی صاحب اگر یہ بات ہے تو آپ اپنے اس کھوٹے سکے کو چلا کر دیکھ لیجیے۔ آزما لیجیے ایک بار۔ آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کا یہ نامعقول بھائی کیا چیز ہے۔'' رشید نے ایک گہری سانس لی۔ طاہر پھر بولا۔

''اور آپ کا کہنا بالکل ٹھیک ہے یہ دنیا کچھ

نہیں دیتی کسی کو آپ شرافت کا ڈھول گلے میں ڈال کر پیٹتے پھریں۔ لوگ آپ کو صرف ایک ڈھول ہی سمجھیں گے۔''

''میں جانتا ہوں اور خوب تجربے کر چکا ہوں۔''

''جی بھائی جان۔''

''لیکن جمال بات خطرے کی ہے۔''

''میں جانتا ہوں' لیکن آپ مجھے وہ عمل بتا دیجیے جو خطرے سے باہر ہو۔'' جمال نے کہا۔

نواب احمد بولے۔

''ہاں جس شخص نے اتنی دولت کمائی ہے اور جو زندگی کے ان تمام نشیب و فراز سے گزرا ہے وہ احمق نہیں ہوگا۔''

''یقیناً ایسا ہی ہے۔ کیا آپ کو اس شخص کے بارے میں اور کچھ بھی معلوم ہے۔''

''بالکل نہیں۔ میں نے بس وہ کاغذات دیکھے ہیں جو طارق بلبن نے احمد کمال صاحب کو پیش کیے ہیں۔''

''ان سے اس کے بارے میں مناسب معلومات حاصل ہوئی ہیں۔''

''کسی حد تک۔ ملک سے باہر اس کا وسیع کاروبار تھا۔ اسے فروخت کر کے وہ یہاں آ گیا اور اس نے بہت بڑا سرمایہ یہاں منتقل کر لیا۔ جس کی واحد وارث اب اس کی پوتی بیلا ہوگی۔ میں نے ان کاغذات کو دیکھنے کے بعد بخوبی یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ بے پناہ دولت اب بیلا ہی کی ہے اور شرمین کو کامیابی کے ساتھ بیلا کا کردار ادا کرنا ہوگا۔''

جمال ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''بھائی صاحب اس سلسلے میں پلاننگ آپ کی ہوگی یا مجھے سوچنا ہوگا۔''

''اگر تم مجھ سے متفق ہو بہتر تجویز تم ہی سوچو۔''

''ٹھیک ہے مجھے چوبیس گھنٹے دے دیجیے اور اس کہانی کی ساری تفصیل مجھے فراہم کر دیجیے۔''

''وہ میرے پاس موجود ہے۔ میں نے اس کے پرنٹ تیار کر کے اپنے پاس بھی محفوظ کر لیے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ میں آپ کی اس تجویز پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' طاہر نے گردن جھکا کر کہا اور رشید احمد نے محبت سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم میرے دست راست ہو۔ میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو ہوں اور تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کے لیے آمادہ ہوں۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آج تک اور کیا ہی کیا ہے۔ میرے پاس کام کے ایسے ایسے لوگ ہیں جو آسمان میں سوراخ کر دیں۔'' طاہر نے کہا اور رشید احمد فکرمند انداز میں گردن ہلانے لگے۔

آخر کار رشید احمد نے وہ تفصیل جمال کو فراہم کر دی اور جمال نے حسب وعدہ چوبیس گھنٹے کے بعد اپنا منصوبہ نواب احمد کو پیش کر دیا۔

''ہمیں بہت ہی سادگی سے کام کرنا ہے بھائی صاحب۔ بھابی کو بھی اس کام میں شریک کرنا پڑے گا اور یہ ذمے داری آپ کی ہوگی۔''

''لیکن۔؟''

''نہیں آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ باقی ساری ذمے داری میری ہوگی۔ میں آپ کو شریک نہیں کروں گا۔ آپ بالکل اجنبی نہیں رہیں۔ آپ کی ذمے بس یہ ہوگی کہ احمد کمال صاحب جو کچھ کر رہے ہیں اس کی رپورٹ مجھے ملتی رہے۔ باقی سب خیر ہے۔''

''مجھے ذرا تفصیل تو بتاؤ۔ تمہارے اقدامات کیا ہوں گے۔''

''سب سے پہلے بھائی صاحب ہمیں شرمین کو تیار کرنا ہوگا۔ کیا وہ مان جائے گی۔''

''امکان تو ہے۔''

''پہلے نمبر پر ہمیں اسے تیار کریں گے۔ اسے ٹریننگ دینا ہوگی۔''

''ٹریننگ۔؟''

''ہاں یہ کام میں کرلوں گا۔ میرے پاس بہت سے ایسے ساتھی ہیں جو ضرورت کے تمام معاملات سنبھال لیں گے۔ ہمیں ایک عامل شاہ تیار کرنا ہوگا جو ہمارا پہلا کردار ہوگا۔''

''ہاں یقیناً۔''

''ایک ایسا بوڑھا جسے ایک کچی آبادی سے برآمد کیا جائے گا اور آپ کسی اچھے اخبار میں عامل شاہ کے بارے میں اشتہار دیں گے۔'' رشید احمد کی پیشانی شکن آلود ہوگئی بات شاید ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ان کے کچھ بولنے سے پہلے طاہر نے کہا۔

''اصل میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر عامل شاہ کا کوئی وجود ہے تو وہ ہماری تحویل میں آجائے۔ اور ہمارا تیار کیا ہوا عامل شاہ وکیل صاحب تک پہنچے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' نواب احمد نے کہا۔

''لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کمال احمد صاحب کے اقدامات سے آگاہ رہیں اور مجھے ان اقدامات کے بارے میں اطلاع دیتے رہیں۔''

''ہاں یقیناً۔''

''نقلی عامل شاہ کو وکیل صاحب تک پہنچا جائے گا اور ظاہر ہے احمد کمال صاحب اس سے سوالات کریں گے اور اس شخص کی ٹریننگ میں کر لوں گا اس کے بعد ہم مطلوبہ علاقے میں ایک ایسا گھر دریافت کریں گے۔ جہاں ہمیں ازالہ کی بیٹی بیلا ملے گی اور ہم اسے وہیں سے برآمد کریں گے۔ یعنی ہماری شرمین۔'' نواب احمد نے گہری سانس لی اور طاہر کی طرف دیکھنے لگے اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولے۔

''جمال تم شرمین کے مزاج سے واقف ہو کیا وہ ان معاملات کے لیے تیار ہوجائے گی۔''

''اس کے لیے میں آپ سے ایک درخواست کروں گا بھائی صاحب۔''

''ہاں بولو۔''

''میں جو کچھ کرلوں مجھے کرنے دیں۔ اس میں کوئی مداخلت نہ ہونے پائے۔''

''ٹھیک ہے تم بالکل بے فکر رہو۔'' رشید احمد نے کہا۔

☆☆

علی شاہ کی حالت جنونیوں جیسی ہورہی تھی۔ حالانکہ اس نے کوئی خاص مشقت نہیں کی تھی۔ نرم و نازک شاداب کے جسم میں اتنی طاقت تھی ہی کہاں کہ وہ اس کی وحشت میں دخل اندازی ہوتی اور شدید مدافعت کرتی۔ وہ تو بڑی آسانی سے مر گئی تھی اور اس کا بے جان جسم فرش پر مڑا تڑا ہوا تھا لیکن علی شاہ کے چہرے پر دکھ کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر گردن جھٹکی۔

''حد ہے یار کیا دنیا ایسی ہی ہوتی ہے۔ کیا اس دنیا میں رہنے والے محبتوں کو اس طرح پامال کرتے ہیں۔ کیسے زندہ رہتے ہیں یہ لوگ اور وہ کون ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی کی آخری سانس تک گزارہ کرلیتی ہیں یا پھر یہ سب کچھ میری ہی تقدیر میں تھا۔ ماں جس نے باپ کو زہر دے دیا۔ بہن جس کے ہاتھ پکے کرنے کے خواب بڑی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ دیکھے تھے لیکن اس نے اپنے ہاتھ پہلے ہی کالے کرلیے تھے۔ پھر یہ ساری کہانیاں کیا معنی رکھتی ہیں۔ عشق و محبت وصل جدائی۔ یہ کہانیاں صرف انسانوں ہی میں ہوتی ہیں۔ کتابوں سے الگ کی دنیا یہ ہوتی ہے۔ یہ یہ..... یہ.....'' اس نے شاداب کی لاش کو دیکھا اور اس کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔

''نہیں مانتا میں۔ محبت کے لفظ کو ہی نہیں

مانتا۔لعنت میں بے شمار الفاظ صرف فریب دینے کے لیے ہیں۔کہیں نہیں ملتا ان الفاظ کا مفہوم..... اونہہ نہ ملے۔جہنم میں جائے۔ میں کیوں دینا چھوڑوں میں جانتا ہوں۔ یہ عورت کچھ عرصے کے بعد مجھے زہر دینے والی تھی۔ چونکہ اس کا محبوب اس کے قریب پہنچ چکا ہے۔اب سے پہلے وہ کہاں تھی۔لعنت ہے۔عنایت صاحب پر جنہوں نے میرے لیے انتخاب بھی کیا تو انہی عورتوں میں سے ایک کا جن کے درمیان سے میں گزر چکا ہوں۔ یعنی محترمہ خورشید بیگ اور ان کی صاحبزادی نوید بیگم..... دھت تیرے کی چلیں محترمہ آرام کریں میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔اپنے محبوب کے ساتھ آپ داد عیش نہ دے سکیں اور زندگی بازی ہار بیٹھیں۔آپ مجھے زہر دینے میں ناکام رہیں اور میں نے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔پہلی بار جیتا ہوں میں سمجھیں آپ اور اب میں اس جیت کی خوشی مناؤں گا۔آپ جہنم کی جانب سفر کریں۔''

یہ کہہ کر وہ واپس پلٹا اور تہہ خانے کے سیڑھیاں چڑھتا ہوا باہر آ گیا۔ بڑے اطمینان سے اس نے دروازہ بند کیا۔تہہ خانے میں شاداب کی لاش پڑی ہوئی تھی۔لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔تہہ خانے کے بارے میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا وہ تو چالاک شاداب نے یہ تہہ خانہ دیکھ لیا تھا۔اف کتنی شاطر تھی کم بخت' کتنی صفائی سے مجھے اپنے دام میں پھانس لیا۔کتنی خدمت کی میری اور اپنی زندگی کو گل زار بنا لیا اور اس کے بعد کیا ہوتا۔

ہیں کیا ہوتا۔ جناب علی شاہ مطلب خاموشی سے کچھ کھاتے پیتے بے ہوش ہوتے پھر انہیں خون کی الٹی ہوئی اور اس کے بعد اخباروں میں خبر چھپی ہوتی کہ شہر کے ایک بڑے دولت مند شخص کی اچانک موت واقع ہوگئی اس کی نوجوان بیوہ اس کے غم میں سوگوار ہے۔ اور پھر اس نوجوان بیوہ کا محبوب کالے رنگ کے لباس میں ملبوس اس بیوہ کو اپنے سینے سے لگا کر یہ احساس دلاتا کہ بے شک اس کا شوہر نہیں ہے وہ تو ہے۔غم نہ کر میری روح میں تو تیرے ساتھ ہوں تیری ہر آرزو پوری کرنے کے لیے۔ ہاہاہا۔علی شاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔''آہ..... آہ کاش وہ بھی میرے ہاتھ آ جاتا۔کاش میں تھوڑی سی ہمت کر کے اسے اپنی کار کے نیچے کچل سکتا۔لیکن نکل گیا کمبخت۔مگر جائے گا کہاں۔اپنی محبوبہ کو تلاش کرتا ہوا ضرور آئے گا۔ضرور آئے گا اور پھر میں دونوں کو یکجا کر دوں گا۔دوسرے جہان میں۔''

وہ کمرے میں آ گیا۔اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بستر پر لیٹ گیا۔ پورے بدن میں تپش محسوس ہو رہی تھی۔ شاید بخار ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔شاداب کی لاش ٹھکانے لگانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔تہہ خانہ تھا اس کے سڑنے کی بدبو باہر نہیں آ سکتی تھی' لیکن اس کی گمشدگی کا پتا تو چل جائے گا۔ خاص طور سے ملازم ضرور سوچیں گے کہ وہ کہاں گئی۔

اس نے شاہدہ کو آواز دی اور شاہدہ آ گئی۔

''جی سر جی۔''

''شاہدہ' ٹھنڈا پانی لے آؤ۔''

شاہدہ پانی کا جگ اور دو گلاس ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ پانی پینے کے بعد اس نے شاہدہ سے کہا۔''تمہیں معلوم ہے وہ کہاں گئی ہے۔''

''کون صاحب جی۔''

''شاداب کی بات کر رہا ہوں۔''

''مجھے معلوم نہیں ہے سر جی۔''

''جھگڑا کر کے چلی گئی ہیں۔''

''ارے' مجھے نہیں پتا چلا سر جی۔''

''کوئی سامان بھی نہیں لے گئیں۔ پتا نہیں کہاں پریشان پھر رہی ہوں گی۔''

''ہمیں کچھ نہیں معلوم صاحب جی۔'' شاہدہ نے سادگی سے کہا۔

''فضل خان کہاں ہے۔''

''باہر کیاری میں کام کر رہا ہے۔''

''اسے بلاؤ۔''

''جی صاحب جی۔'' شاہدہ باہر نکل گئی۔

علی شاہ کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ شاداب کو اس نے کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا لیکن اب عشل ٹھوکے دے رہی تھی اس کو چھپانا بھی تھا۔ اس کے لیے کام کرنا ضروری تھا۔

''سلام صاب جی۔'' فضل خان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''فضل خاں تمہیں معلوم ہے شاداب کہاں تھی۔''

''نہیں صاحب جی۔ ابھی شاہدہ نے ہمیں بتایا ہے۔''

''کیا۔''

''یہی کہ بیگم صاحب ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہیں۔''

''تم نے انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''بالکل نہیں صاحب جی۔''

''گیٹ تو کھلا دیکھا ہوگا تم نے۔''

''نہیں جناب جی۔''

''سنا ہے کوئی رشتے دار آیا تھا ان کا ان سے ملنے۔ دونوں میں کچھ جھگڑا بھی ہوا تھا۔''

''رشتے دار۔''

''ہاں کون تھا وہ۔''

''صاحب جی۔

''جو پوچھ رہا ہوں کھل کر بتاؤ۔ کون تھا وہ اور کب سے آ رہا ہے۔''

''صاحب جی ہمارے سامنے آج تک کوئی نہیں آیا۔''

''ہوں کسی نے مجھے بتایا ہے۔ خیر تو میں تم دونوں کو بتا رہا تھا کہ بیگم صاحبہ ناراض ہو کر کہیں چلی گئیں۔ پتا نہیں کہاں گئی ہے پاگل۔''

تھوڑی دیر تک دونوں ملازم پاس رہے پھر چلے گئے۔ اسے تھوڑا سا اطمینان ہو گیا۔ اس نے ایک جواز بنا لیا تھا۔ لیکن اسے افسوس بہت تھا اس بات پہ کہ خورشید اور نوید کے کردار سے واقف ہونے کے باوجود اس نے ایک عورت پر بھروسہ کر لیا تھا۔

اب کیا کروں۔ پہلے بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا اور اب کیا کروں۔ ایک انسان کی زندگی لے لی ہے۔ ماں اور بہن کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی غلطی کی تھی۔ ان دونوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے تھا' بچ گئیں دونوں میرے ہاتھوں سے تلاش کروں گا انہیں بھی مل گئیں تو تینوں کو اکٹھا کر دوں گا۔ ہاہاہا تینوں بدکردار ایک جگہ جمع ہو جائیں گی لیکن ایسا کبھی ہوگا جب میں زندہ رہوں۔ لیکن میرا زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔ کم از کم اپنے آپ کو اس تیسری حماقت کی سزا دینا بھی ضروری ہے۔

لیکن یہ سزا میں اسی طرح دے سکتا ہوں کہ اس کربناک زندگی کے زخموں کو برداشت کروں۔ اس زندگی سے دل چسپی لوں اور جہاں بھی کہیں ایسے گھناؤنے کردار کی کوئی شخصیت نظر آئے تو اس سے اپنے ماضی کا انتقام لوں۔

وقت گزرتا رہا اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلے کرتا رہا۔ پھر دوسرے دن اس نے عنایت صاحب سے کہا۔

''اس نے آپ سے تو نہیں رابطہ قائم کیا۔''

''کس نے.....'' عنایت صاحب حیرت سے بولے۔

''شاداب کی بات کر رہا ہوں۔''

''نہیں کس سلسلے میں۔''

''وہ ناراض ہو کر گھر سے چلی گئی ہے۔''

''ارے کب' کیسے۔''

''اس کا مطلب ہے اس نے آپ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔''

''پر بات کیا ہوئی' کہاں چلی گئی وہ۔''

''بس عنایت صاحب۔ آپ کو اندازہ ہے کہ میں نے اسے دنیا کا ہر عیش فراہم کر دیا۔ آدھی دنیا کی سیر کرادی۔ لیکن عنایت صاحب کیا کردار ہوتا ہے انسان کا کس طرح وہ سب کچھ فراہم کر دیتا ہے۔''

''لیکن سر معافی چاہتا ہوں۔ بات کیا ہوگئی۔''

''بہت معمولی سی بات اور اس نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔''

''کپڑے وغیرہ بھی لے گئی ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں کب ان باتوں پر غور کرتا ہوں۔''

''مجھے خود حیرت ہے سر۔ آپ کے درمیان تو ایک مثالی محبت ہے لیکن آپ پریشان نہ ہوں خود واپس آجائیں گی۔''

''ایک بات پوچھوں عنایت صاحب۔''

''جی ضرور۔''

''شاہ صاحب آپ کو کچھ ایسی جگہ کا پتا ہے جہاں وہ جاسکتی ہے۔''

''خدا کی قسم نہیں' ایک اشتہار کے جواب میں آئی تھیں اور بتایا تھا کہ وہ کرائے کے ایک فلیٹ میں رہتی ہیں۔ پتاہ بھی لکھوایا تھا ایک بلڈنگ کا۔''

''لیکن شادی کے بعد اس نے وہ فلیٹ کہاں رکھا ہوگا۔ کرائے کا فلیٹ تھا۔ لیکن عنایت صاحب آپ ایک تکلیف کرلیں۔ معلوم کریں اس فلیٹ پر جا کر ہوسکتا ہے کچھ پتہ چل جائے۔ میرے تو حواس معطل ہیں۔''

''جو حکم سر۔''

علی شاہ اپنے اردگرد مضبوط حصار قائم کر رہا تھا۔ عنایت صاحب سے اس گفتگو کا دہرا فائدہ ہوسکتا تھا۔ ایک تو شاداب کی گمشدگی کے کئی گواہ بن جائیں گے۔ ضرورت پیش آسکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ پاس پڑوس سے اس کے کسی عاشق کا پتا چل جائے۔ معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھا۔ کہاں تھا اور اتنے عرصے سے اس نے شاداب سے ملاقات کیوں نہیں کی۔ یا پھر دونوں بہت ہی چالاکی سے ملتے رہتے تھے۔ پتا تو چل جائے کہ شاداب کو بہکانے والا کون تھا۔ وہ جو راتوں کو اس سے ملنے آتا تھا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اسے بھی شاداب کے پاس پہنچا۔ ایک قتل کرنے کے بعد ایک اور قتل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اب تو ہاتھ کھل گیا تھا۔

وہ اس طرح کا اظہار کرتا رہا۔ جیسے اسے شاداب کے چلے جانے کا بہت دکھ ہو عنایت صاحب اظہار ہمدردی کرتے رہے تھے۔ انہوں نے بہت سی تسلیاں بھی دی تھیں اور اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں۔

''آپ مطمئن رہیں سر وہ واپس آجائیں گی وہ آپ سے اتنی محبت کرتی ہیں آپ سے دور نہیں رہ سکتیں۔''

دل تو چاہا کہ عنایت کے صاحب کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دے۔ لیکن وہ بے قصور تھے۔ ایک وہ ہی تو اس کے ہمدرد اور محسن تھے لیکن اس ردعمل سے اس پر شک بھی ہوتا تھا۔

رات کو جب فضل اور اس کی بیوی شاہدہ اپنے کوارٹر میں جا کر سو گئے تو علی شاہ نے بیرونی دروازہ بند کیا اور تہہ خانے والے کمرے میں داخل ہوگیا۔

لیکن تہہ خانے میں اترتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے قدموں سے قدم ملا کر چل رہا ہو۔ یہ احساس اسے کئی بار ہوا تھا۔ وہ رک رک کر اپنے ساتھ چلنے والے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نظر نہیں آیا۔ وہم ہے میرا اس نے چلتے چلتے سوچا اور نیچے پہنچ کر روشنی کا سوئچ آن کر دیا۔ تہہ خانے میں تیز روشنی پھیل گئی۔

شاداب کی لاش اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کا بے نور چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ پھر

اچانک ہی اس کے ذہن پر ایک خوشگوار سی کیفیت طاری ہوگئی۔

''ہیلو شاداب کیسی ہو۔'' وہ شاداب کی موت کا مذاق اڑا رہا تھا اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں شاداب کے چہرے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

اچانک ہی اسے محسوس ہوا جیسے شاداب نے آنکھیں کھول دی ہوں۔ اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شاداب کو دیکھا۔ شاداب نے دوبارہ آنکھیں بند کرلی تھیں۔

کچھ لمحوں تک اس کے اعصاب کشیدہ رہے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہم ہے سب کچھ وہم ہے۔ وہ مرچکی ہے۔ کچھ لمحے وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر شاداب کی لاش کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بغور اسے دیکھا۔ شاداب کے اندر اچانک زندگی کیسے بیدار ہوگئی۔ خاص طور سے اس نے شاداب کی آنکھوں کے پپوٹے چھو کر دیکھے' شاداب کا بدن لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ زندگی کی کوئی رمق اس کے جسم میں موجود نہیں تھی۔ آہ شبہ تھا۔ صرف شبہ تھا۔ وہ مرچکی ہے۔ وہ صرف ایک لاش ہے ایک ایسی لاش جس میں اب تک بدبو کا نام ونشان نہیں ہے مگر اس کے ذہن نے اس انداز میں نہیں سوچا۔ وہ تو اپنی ہی آگ میں جھلس رہا تھا۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''مجھے صرف اتنا بتا دو میری جان کہ میرے پاس تمہیں زندگی کی کون سی کمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں آدھی دنیا دکھا دی۔ ہر خوشی تمہاری جھولی میں ڈال دی۔ پناہ محبت کی تم سے۔ اگر مجھ سے پہلے تمہارا کوئی محبوب تھا تو تمہیں میری محبت کے سامنے اسے نظر انداز کر دینا چاہیے تھا اور پھر تمہارے اوپر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ تم چاہتیں تو مجھ سے شادی نہ کرتیں' چند جملے کہہ سکتی تھیں کہ سر میں آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔ میرے دل میں کوئی اور بسا ہوا ہے۔ لیکن عورت ہونا..... عورت میری ماں کی طرح۔ جس نے زندگی بھر میرے باپ کو بے وقوف بنایا اور پھر جب بھی اسے موقع ملا اس معصوم انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں بھی یہی کرنا تھا۔ چند روز کی زندگی دے دی تم نے مجھے تمہارا شکریہ شاداب تمہارا شکریہ بے حد شکریہ۔''

جواب میں اسے اپنے عقب سے ایک سسکی سی سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی رویا ہو اس نے چونک کر پیچھے دیکھا لیکن دور دور تک کسی کا وجود نہیں تھا۔ اس کی حیران نگاہیں چاروں طرف کا طواف کر کے شاداب کی لاش پر آنکھیں اور اس کا دل بری طرح اچھل پڑا۔ لاش کے چہرے پر کرب کے نقوش تھے۔ وہ ہی نقوش جو اس کی گردن دباتے ہوئے اس کے چہرے پر نمودار ہوگئے تھے۔

اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں شاداب کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں۔ اس کی دماغی کیفیت بری طرح خراب ہو رہی تھی۔ پہلے بھی اسے یوں لگا تھا جیسے شاداب نے آنکھیں کھولی تھیں۔

سب فراڈ ہے۔

سب جھوٹ ہے۔

اس پر دیوانگی سی سوار ہوگئی۔ وہ تہہ خانے کے دروازے کی طرف بھاگا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ پوری عمارت کے اندر بھاگتا رہے۔

بمشکل تمام خود کو سنبھالا اور اپنے بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ بستر پر لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ فضل خان ہاتھ میں دودھ کا جگ لیے ہوئے آ گیا۔ ٹرے میں دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔

یہ معمولات میں تھا۔ شاداب اور وہ سونے سے پہلے دودھ پیا کرتے تھے۔ دو گلاس دیکھ کر

اسے غصہ آ گیا۔

''فضل خان تجھے معلوم ہے کہ شاداب چلی گئی ہے۔ پھر یہ دو گلاس کیوں لایا ہے۔'' فضل خان سہم گیا۔

''معافی چاہتا ہوں صاحب غلطی ہوگئی۔'' فضل خان نے کہا۔ لیکن اچانک ہی علی شاہ نے فضل خان کے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے میں لات ماری۔ ٹرے گلاس اور جگ سمیت اچھل کر دور جا گری۔ وہ تو زمین پر قالین بچھا ہوا تھا ورنہ خوب صورت بلوری گلاس اور جگ کرچی کرچی ہو جاتے۔

فضل خان بری طرح سہم گیا تھا۔ کچھ لمحے وہ سکتے میں کھڑا رہا۔ پھر جھک کر گلاس اور جگ اٹھائے اور باہر نکل گیا۔

علی شاہ غصے سے کھولتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد اسے نیند آئی تھی لیکن رات بھر بار بار اس کی آنکھ کھلتی رہی۔ اسے ایک عجیب سے خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے میں ٹھنڈک بڑھ گئی ہو۔ حالانکہ ایئر کنڈیشن نہیں چل رہا تھا۔ پھر بھی کمرے کا ماحول بہت سرد ہو رہا تھا۔ تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ چلنے والی قدموں کی آہٹ۔

شاداب کی لاش کا آنکھیں کھولنا۔

سسکیوں کی آوازیں۔

صبح تقریباً ساڑھے پانچ بجے پھر آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر پر لیٹا رہا۔ تب ہی اچانک اسے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحے تک تو اس نے توجہ نہیں دی۔ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ شاداب اتنی ہی صبح اٹھ کر غسل کیا کرتی تھی۔

''شاداب.....'' وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا اور خوفزدہ نگاہوں سے غسل خانے کے دروازے کو دیکھنے لگا۔

رات کو واش روم گیا تھا سارے نل بند کر کے آیا تھا پھر یہ پانی گرنے کی آواز۔

اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب..... غسل خانے میں کون ہے۔ بمشکل وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سہمے سہمے قدموں سے غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ اسے سخت حیرت تھی۔ بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کوئی آ بھی نہیں سکتا تھا اور کسی کی مجال بھی نہیں تھی کہ کوئی آ جائے۔

پھر.....

لرزتے ہاتھوں سے اس نے واش روم کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکنے لگا۔ ایک شاور سے پانی گر رہا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ غسل خانے میں بہترین فٹنگ تھی۔ کوئی چانس نہیں تھا کہ کوئی شاور خود کھل جائے پھر۔

وہ کچھ لمحے یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر اس کے حلق سے سہمی سہمی آواز نکلی۔

''کون ہے۔ کون ہے یہاں۔'' اپنی اس آواز کے ساتھ ہی اس کے اپنے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس سے پہلے زندگی میں وہ خوف سے کبھی آشنا نہ ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے بدن میں تھرتھری سی دوڑ رہی تھی۔ وہ دوبارہ چیخا۔

''کون ہے۔'' لیکن اس بار اس کی آواز کے ساتھ ہی شاور ایک دم بند ہوگیا۔

فرش پر کافی پانی جمع تھا۔ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔ کوئی نادیدہ ہستی غسل کر رہی تھی اور اس نے ان کی آواز پر شاور بند کر دیا تھا۔

''کون..... کیا شاداب کیا شاداب کی روح۔''

وہ غسل خانے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر ہمت کر کے اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ پورے وجود میں سرد

لہریں دوڑ رہی تھیں۔ یہ احساس یقین کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کہ غسل خانے میں کوئی نادیدہ وجود موجود ہے۔

لیکن کدھر۔

کہاں۔

اور کون.....۔

اس کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شاور کے نزدیک پہنچ گیا دیکھنا چاہتا تھا کہ شاور کیسے کھلا تھا اور بند کیسے ہو گیا۔

ابھی وہ شاور کے پاس پہنچا ہی تھا کہ غسل خانے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا' اس کے حلق سے بے اختیار آواز نکلی۔

''میں پوچھتا ہوں کون ہے۔ کون ہے.....

رکو' رک جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ تھوڑے فاصلے پر وارڈ روب تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وارڈ روب کا دروازہ کھلا اور چند لمحوں کے بعد بند ہو گیا۔ اس نے بہت تیزی سے واڈ روب کی جانب چھلانگ لگائی۔ لیکن اسی وقت اس کے کمرے کا دروازہ جو اندر سے بند تھا کھلا اور یوں لگا جیسے کوئی باہر نکل گیا ہو۔

یہ وہم نہیں تھا۔ کچھ ہو رہا ہے۔ کوئی ایسا عمل ہو رہا ہے جو نا قابل فہم ہے۔ کیا شاداب کی روح بھٹک رہی ہے۔ کیا وہ اسے تنگ کر رہی ہے۔ اچانک اس کے اعصاب تن گئے۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نے سب کچھ بھول کر تجھے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا شاداب' مجھے ایک دم زندگی سے پیار ہو گیا تھا۔ تو نہیں جانتی تھی کہ میں نے کتنے کرب میں زندگی گزاری تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ اور بہن کے لیے اپنے وجود کو فنا کر لیا تھا۔ لیکن میری ماں نے میرے باپ کو زہر دے دیا۔ جس طرح میرا باپ معصوم تھا اسی طرح میں بھی معصوم ہوں۔ لیکن تم سب نے مل کر میرے وجود میں ایک شیطان کو جگا دیا ہے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے میں تجھ سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ براتم نے کیا اور میں نے تجھ سے بدلہ لیا۔ آ رہا ہوں میں تیرے پاس۔ دیکھتا ہوں تو میرا کیا بگاڑتی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ غصے میں ڈوبا ہوا تہہ خانے کی جانب چل پڑا اور راہداری طے کرتا ہوا اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ جہاں تہہ خانے کا دروازہ تھا۔

لیکن یہاں آتے ہوئے اسے مستقل طور پہ اندازہ ہوا تھا کہ کوئی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔ لیکن اب اس کے دل سے خوف نکل چکا تھا۔

تہہ خانے کا دروازہ کھول کر وہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ تہہ خانے کی روشنی جلائی تہہ خانے کی فضا میں ہلکا ہلکا تعفن پیدا ہو گیا تھا۔ شاداب کا حسین جسم اب سڑنے لگا تھا۔ اس کی لاش اسی انداز میں پڑی ہوئی تھی۔ بگڑا ہوا چہرہ کھلی ہوئی آنکھیں اسی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

وہ شاداب کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔

''تیری روح تو بھٹکتی پھر رہی ہے لیکن اپنے وجود کو تو جنبش بھی نہیں دے سکتی۔ میں اس تہہ خانے کو تیرے ناپاک وجود سے پاک کر دوں گا تو سمجھتی کیا ہے خود کو میں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی زیادتی تو نے میرے ساتھ کی ہے۔

ایک بار پھر مجھے پھر ہنستی بولتی زندگی سے دور کر دیا ہے جسے میں نے بڑی مشکل سے دوبارہ اپنایا تھا۔ بول کیا کروں تیرا۔ تیرا کیا کروں میری تخلیق تیرا یہ حسن جواب بدبو دینے لگا ہے میری ہی تخلیق ہے یاد تو ہو گا تجھے کس مشکل میں میرے سامنے آئی تھی اور کیا نہیں دیا میں نے تجھے۔ آہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔''

وہ سوچنے لگا کہ مزید کچھ دن تک اگر یہ لاش اسی طرح پڑی رہی تو پورے گھر میں تعفن پھیل جائے گا۔ پھر کیا کرنا چاہیے۔ کیا اس سڑی ہوئی

لاش کو لے کر رات کو گھر سے نکلوں گاڑی میں ڈال کر کسی ویرانے میں جاؤں لیکن اس طرح تو زندگی ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر پولیس نے یا کسی اور نے مجھے دیکھ لیا تو پھر بھلا بچنے کا کیا سوال ہوگا۔ شاداب کا مجھ سے تعلق تو دنیا کو معلوم ہے یہ خبریں پھیل جائیں گی کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ کیوں کر دیا یہ معلوم کرنے کی کوشش کوئی نہیں کرے گا۔ نہیں شاداب میں یہ خطرہ نہیں لے سکتا۔ اگر میں تیرے اس حسین جسم کو ٹوکے کے وار کر کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دوں تو پھر بھی مجھے اسے ٹھکانے لگانا پڑے گا اور یہ ایک مشکل کام ہوگا۔

وہ سوچتا رہا اور پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ کیوں نہ اسے تہہ خانے میں اس کے بدن کو خاکستر کر دیا جائے۔ یہ بات اس کے دل کو لگی۔ بہترین طریقہ ہے اس سے نجات پانے کا اور وہ اپنی سوچ کے تانے بانے بننے لگا۔ ہندو اپنے مردے کی چتا جلا دیتے ہیں۔ بہت ساری لکڑیاں جمع کر کے ان میں آگ لگا دیتے ہیں اور انسانی جسم ان پر رکھ دیا جاتا ہے۔ ویری گڈ میرا خیال ہے مجھے بھی یہی کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دل کو مطمئن کر کے وہ مصروف ہو گیا۔

رات کو فضل خان پر خوب ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ دونوں میاں بیوی سہمے سہمے سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اصل بات ان کے خوابوں میں بھی نہیں تھی' علی شاہ مصروف رہا۔ اس نے ایسی بہت سی چیزیں جمع کیں' جو اس کے کام آ سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس قدر مضبوط اور پیپ تھا کہ گوشت جلنے کی خوشبو باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اسے یہ اطمینان تھا۔ چنانچہ وہ انتظامات کرتا رہا پٹرول کا ایک ٹن حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اپنے کام کے لیے اس نے رات کا وقت منتخب کیا تھا جب فضل خان اور شاہدہ اپنے کوارٹر میں پہنچ جاتے تھے' کواٹر بند کر کے وہ اس طرح ہوتے تھے کہ پھر انہیں کوئی خبر نہیں رہتی تھی۔ یہی وقت اس کے لیے بہتر تھا۔

غرض یہ کہ تمام تیاریاں کرنے کے بعد وہ طے خانے میں پہنچ گیا پٹرول کا کین اور دوسری ایسی چیزیں جو آسانی سے آگ پکڑ سکتی تھیں اس کے پاس موجود تھیں اس نے یہ چیزیں شاداب کی لاش کے گرد چن دیں پھر پیٹرول کے کین کا ڈھکن کھول کر شاداب کے پورے بدن کو پیٹرول میں بھگو دیا۔ اس کے بعد ماچس کی ایک تیلی نے شاداب کے پورے وجود کو شعلوں میں لپیٹ دیا' وہ خاصی دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید جنون کے آثار تھے۔

شاداب کے پورے وجود نے آگ پکڑ لی تھی۔ علی شاہ اس کے بدن سے جلتے ہوئے گوشت اٹھنے والی بدبو سے بھی بیگانہ ہو گیا تھا۔ ایک پتھر کے انسان کی طرح وہ کچھ فاصلے پر کھڑا شاداب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو جلتے دیکھ رہا تھا۔

ٹرافلگر لندن کے اسکوائر میں اوور کوٹ پہنے ایک خوب صورت ٹوپی لگائے شاداب اس کے ساتھ کھڑی کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ پھر تری دیورائے کے فوارے کے پاس سکے ڈال کر مرادیں اور منتیں مانگ رہی تھی۔ پیرس ایفل ٹاور کے پاس کھڑی سہمی ہوئی نگاہوں سے رسیالی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز علی شاہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ لگتا ہے اس کا دوسرا سرا آسمان میں پیوست ہو جائے گا۔''

بوئے ڈی بولون کی خوب صورت نہر کے پاس ان کا لنچ کو دیکھ رہی تھی جو سارے کے سارے پھولوں سے بنے محسوس ہو رہے تھے۔ سرخ اور سفید پھول جو اس وقت شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے شاداب کی لاش پر پٹرول ڈالتا رہا تاکہ اس کی ہڈیاں تک سلگ جائیں اور ایسا ہی ہوا شاداب کے جسم کی ہڈیاں راکھ ہوکر زمین پر پھیلنے لگیں۔ مسلسل آگ میں جلنے کے بعد اس کا بدن جلی ہوئی راکھ بن کر رہ گیا۔ اس بدن کی ہڈیاں تک اس طرح جلا دی گئی تھیں کہ وہ ریزہ ریزہ ہوگئی تھیں یہی وہ چاہتا تھا کہ یہاں کوئی نشان باقی نہ رہے۔ اس راکھ کو با آسانی ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ شدید تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ یہ کام دوسرے دن کے لیے چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد وہ تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ طے خانے سے باہر آنے کے بعد اس نے کمرے میں کھڑے ہوکر یہ جائزہ لیا کہ نیچے تہہ خانے سے اٹھنے والی بدبو باہر فضا میں تو نہیں پھیلی ہے۔ لیکن دروازہ ایئر ٹائٹ تھا اور بدبو باہر نہیں آ رہی تھی۔

وہ مطمئن ہوکر واپس اپنے کمرے میں آیا اور غسل خانے کی جانب بڑھ گیا کافی دیر تک شاور کے نیچے نہاتا رہا۔ اس کے دل میں خوف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بلکہ پچھلے دن اس نے غسل خانے میں بڑے عجیب حالات کا سامنا کیا تھا۔

نہانے سے طبیعت پر چھایا ہوا بوجھ کافی کم ہوگیا۔ وہ باہر نکل آیا اس نے اپنے آپ کو مطمئن رکھنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن سب چند گھنٹے اور اس کے بعد وہ ہی سب کچھ شروع ہوگیا۔ اسے اپنے پاس سانسوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے لاکھ اس عجیب وغریب احساس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہوسکا۔ اسے شاداب کی کراہوں کی آوازیں تک سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں میں کوئی لفظ تشکیل نہیں ہوا تھا۔ بس آہٹیں ادھر ادھر چلنے کی آوازیں جو سو فیصد ہی شاداب کی ہوتی تھیں' کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اسے شاداب کے لباس کی سرسراہٹ اپنے بالکل قریب سنائی دیتی۔ وہ ذہنی مریض بنتا جا رہا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ کوئی اور بات نہیں ہوئی تھی۔ عنایت صاحب شرمندہ شرمندہ سے رہتے تھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ انہوں نے منصوبے کے تحت شاداب کو سکریٹری رکھا تھا۔ اور پھر علی شاہ سے اس کی شادی کرادی تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ اس کے پس پردہ صرف علی شاہ کی محبت تھی اور کچھ نہیں۔

لیکن..... شاید علی شاہ کی تقدیر میں یہ سب کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ خاموش رہنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے اس کی زندگی میں بہاریں آئی تھیں اور بس۔

عنایت صاحب نے کہا۔ ''سر آپ کچھ دن کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں۔'' علی شاہ بڑی بے بسی سے مسکرایا۔

''کس کے ساتھ۔'' علی شاہ نے کرب زدہ لہجے میں کہا اور عنایت صاحب لاجواب ہوگئے۔

اس دن بھی وہ اپنے کمرے میں بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا کہ اچانک ہی دروازہ کھلا اور یوں لگا جیسے کوئی اندر آیا ہو۔ اس نے پہلے آنے والے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں لیکن جب کوئی نظر نہ آیا تو وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔

''کون ہے۔ کون ہے۔'' لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ البتہ قدموں کی چاپ صاف سنائی دی۔ کوئی الماری کی طرف جا رہا تھا۔ پھر الماری کا پٹ کھلا تھوڑی دیر تک کھلا رہا۔ پھر بند ہوگیا اندر کیا ہوا اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔

وہ پتھر کا بت بنا کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کی ہمت نہیں پڑی کہ آگے بڑھ کر الماری کے پاس جائے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ الماری کے پاس کوئی موجود ہے اور الماری میں کوئی کاروائی ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد الماری کا پٹ بند ہوا' اس کے بعد قدموں کی چاپ دروازے تک پہنچی دروازہ دوبارہ کھلا اور اس کے بعد بند

ہوگیا۔

مکمل خاموشی طاری تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آہ کیا کروں۔ کیا کروں اب یہ تو بڑی سنگین صورت حال ہے۔ اگر شاداب کی روح بھٹک رہی ہے تو میں اسے کیسے روک سکتا ہوں۔ کیا کروں کیسے کروں۔ کسی سے دل کی بات کہہ بھی نہیں سکتا ورنہ اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ کمرہ چھوڑ دے گا۔ اسی کمرے میں وہ شاداب کے ساتھ زندگی کا بہت بڑا حصہ گزار چکا تھا۔ وہ اسے کمرے میں آتی ہے۔ ممکن ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرے میں نہ آئے۔ اس واقع کے بعد وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ شدید بے چینی تھی۔

بہت دیر تک وہ سونے کی کوشش کرتا رہا پھر اٹھ کر باہر نکل آیا۔ راہداری سے نکل کر سامنے والے حصے میں پہنچا۔ جہاں خوب صورت لان لگا ہوا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے کوئی سنبل کے درخت کے نیچے بینچ پر بیٹھا ہوا ہو۔ سنبل کے درخت کے نیچے ایک خوب صورت سنگ مرمر کی بنچ لگی ہوئی تھی۔ ایسی تین بنچیں یہاں آس پاس موجود تھیں۔

''یہ کون ہے۔'' اس نے سوچا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ فضل خاں اور اس کی بیوی شاہدہ تو یہاں نہیں آسکتی تھیں۔ اس کے قدم رک گئے اور وہ سائے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

پھر اچانک سایہ بینچ سے اٹھ گیا اور ایک طرف چل پڑا۔ اس کا دل چاہا کہ چیخ کر اسے آواز دے۔ اسے پکارے۔

''شاداب..... رک جاؤ شاداب' رک جاؤ۔ کیوں مجھے تنگ کر رہی ہو۔ کیوں بھٹک رہی ہو اب۔ کیا کیا تم نے میرے ساتھ کیوں نہیں بتایا مجھے کہ تم کسی اور سے محبت کرتی ہو۔ اگر تم مجھے بتا دیتیں تو میں تمہیں کبھی اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ میں تو پہلے ہی سے زخم خوردہ تھا۔ میں تو..... میں تو ہر بار ہی بے قصور رہا ہوں۔ سنو میری بات سنو۔ تم مجھے خوفزدہ نہیں کرسکتیں۔ نہ ہی میں اتنا برا انسان ہوں کہ کسی کی محبت کو چھیننے کی کوشش کرتا۔ میں تمہیں آزاد چھوڑ دیتا شاداب اور خود زندگی سے دور ہو جاتا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے تو تمہیں خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کی مگر تم نے میرے ساتھ غلط کیا۔ سنو مجھے اس شخص کے بارے میں بتا دو جو ہماری زندگی میں یہ برا وقت لانے کا باعث بنا ہے۔ شاداب میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے بھی تمہارے پاس بھیج دوں گا۔''

نہ جانے کیا کیا بڑبڑاہٹیں اس کے منہ سے نکلتی رہیں۔ پھر وہ وہیں ایک صاف ستھری جگہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اندر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے غنودگی سی آ گئی۔

نجانے کتنی دیر وہ اسی طرح نیم غنودہ رہا۔ پھر اس وقت چونک پڑا جب اچانک ہی اسے اپنے قریب سانسوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور خود سے تھوڑے فاصلے پر کسی کو بیٹھے دیکھ کر دہشت زدہ ہوگیا۔ اس کے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی۔

''کون..... کون ہے۔ کون ہے.....۔''

''میں ہوں صاحب۔ میں ہوں۔'' فضل خاں کی آواز سنائی دی۔

''کون..... کون۔''

''فضل خان صاحب..... فضل خان۔''

''ہیں..... ہیں۔'' اس کا سانس پھولنے لگا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ صبح کا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ فضل خان کی آواز ابھری۔

''صبح ہوگیا ہے صاحب۔''

''اوہ..... اوہ۔'' وہ زمین پر ہاتھ ٹکا کر

اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔
فضل خان نے جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی۔
''نہیں فضل خان ٹھیک ہے۔''
''آپ کی طبیعت خراب ہے صاحب۔''
''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ چلو اندر چلو۔ مجھے چائے پلاؤ۔'' اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ فضل خان نے ایک گہری سانس لی اور اس کے آگے آگے چل پڑا۔ اس نے کہا۔
''میں تھوڑی دیر آرام کروں گا فضل خان' آفس سے فون آئے تو کہہ دینا دیر سے آفس جاؤں گا اور ہاں سنو ابھی چائے نہیں پیوں گا۔''
فضل خاں کے قدم ایک لمحے کے لیے رکے پھر وہ آگے بڑھ گیا۔
اوپر اپنے بیڈروم میں جانے کے بجائے علی شاہ نچلی منزل کے ایک کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اسے لیٹتے ہی گہری نیند آ گئی۔ پھر وہ ایک بجے تک سوتا رہا تھا۔ جاگا تو طبیعت بشاش تھی۔ فضل خاں نے ناشتا لگایا اور پھر وہ تیار ہو کر آفس چلی گئیں۔
''تمہاری یاد نے نڈھال کر دیا ہے شاداب۔ لیکن اس بار میں خود کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ زندہ رہوں گا اور جینے کے راستے تلاش کروں گا۔ اب میرے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔''
آفس میں عنایت صاحب نے اس سے اس کی خیریت دریافت کی پھر جب وہ پرسکون ہو گیا تو انہوں نے کہا۔
''فلیٹ کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئی ہیں صاحب۔''
''ہوں..... کیا۔'' اس نے کہا۔
''میڈم چار سال تک اس فلیٹ میں رہی ہیں۔''
''ان کا اپنا فلیٹ تھا۔''
''نہیں کرائے پر تھا۔''
''اوہ یہ پتا چلا کہ فلیٹ کا مالک کون ہے۔''
''جی سر۔ چوہدری زمان ہیں اس کے مالک۔''
''وہ کہاں رہتے ہیں۔'' وہ دلچسپی سے بولا۔
''کریم شاہ روڈ پر..... ان کا اپنا گھر ہے۔''
''اور کوئی خاص معلومات۔''
''نہیں۔''
''شاداب کے کسی عزیز کا کوئی پتا نشان۔''
''نہیں سر..... لیکن ایک سوال میرے ذہن میں ہے۔''
''کیا۔''
''میڈم نے خود اپنے کسی عزیز رشتے دار کے بارے میں آپ کو نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا۔''
''نہیں عنایت صاحب کچھ غلطی میری بھی ہے۔ میں نے شاداب سے کبھی اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ حالانکہ کئی بار۔'' علی شاہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
عنایت صاحب گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے تھے۔
باقی وقت اس نے آفس کے معاملات کو دیکھتے ہوئے گزارا تھا۔ شام کو گھر واپسی ہوئی۔ اندر جا کر اسے احساس ہوا کہ شاہدہ اور فضل خان بہت پرجوش ہیں۔ دونوں اس کے پاس پہنچ گئے۔
''کچھ کہنا چاہتا ہوں صاحب۔''
''کیا بات ہے فضل خان۔''
''صاحب جی' صاحب جی۔'' فضل خان پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولا۔
''میں بتاتی ہوں صاحب جی مولا قسم بیگم

صاحب کہیں نہیں گئیں۔ وہ گھر میں ہی موجود ہیں صاحب جی۔''

''کیا۔''

''جی صاب جی۔ وہ گھر میں ہی کسی جگہ چھپی ہوئی ہیں۔'' فضل خان نے کہا۔

☆☆

جی جناب سچ بتایئے۔ لطف آ رہا ہے نا۔ میں آپ کو ایسے لاکھوں قصے سنا سکتا ہوں۔ دیدہ ور وقت ہے اور داستان گو میں۔ میں اس کی سنائی کہانیاں رقم کرتا ہوں۔ ہمارے درمیان بڑی ہم آہنگی ہے۔ یہ انسان۔ یہ انسان اسی میں انوکھی داستانوں کا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ رشید احمد نے جو کام اپنے بھائی جمال احمد کے سپرد کیا تھا اور جس کے لیے جمال احمد نے کہا تھا کہ اب باقی ذمے داری اس پر چھوڑ دیں۔ تو جمال صاحب نے کیا کہا۔

شرمین کے قدم رک گئے اور عارض نے چونک کر اسے دیکھا شرمین بوڑھے فال والے کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا شرمین۔ تم بوڑھے پاپا سے زیادہ ہی متاثر ہوگئی ہو۔''

''میرا دل چاہتا ہے عارض کہ بابا کے سامنے رکھے سارے لفافے کھول کر دیکھ لوں۔ یقین کرو۔ اس دن کی تحریریں میرے دل پر نقش ہیں میں تمہیں کیا بتاؤں یوں سمجھو۔''

بات کرتی ہوں مکر جاتی ہوں
جو میرے دل میں ہو کر جاتی ہوں
اس لیے شہر کو چھوڑ آئی میں
ذکر تیرا ہے جدھر جاتی ہوں
کیا بتاؤں کہ میں چلتے چلتے
اپنے سائے سے بھی ڈر جاتی ہوں
میں سر شام زمانے کے لیے
اک دیا بام پہ دھر جاتی ہوں
کوئی خوشبو نہ ہوا ہوں میں غزل
پھر بھی ہر دل میں اتر جاتی ہوں

عارض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بہت جذباتی ہو رہی ہو۔ آؤ دیکھیں آج طوطا کیا کارنامہ دکھاتا ہے۔'' دونوں طوطے والے بابا کے پاس پہنچ گئے۔ طوطے نے لفافہ اٹھایا شرمین نے تحریر پڑھی لکھا تھا۔

''ایثار یہ نہیں ہے کہ موٹا جھوٹا پہن لیا جائے روکھی سوکھی کھا لی جائے۔ ایثار یہ ہے کہ اپنی خواہشات مسرتوں اور چاہتوں کی قربانی دی جائے۔''

کاغذ شرمین کے ہاتھ میں تھا اور اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ عارض نے بابا کو پیسے نکال کر دیے اور بولا۔

''آیئے باقی کل کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ آج اتنا ہی کافی ہے۔''

''چلو۔'' شرمین نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور ان کے قدم کافی کیفے کی جانب بڑھ گئے۔

باقی آئندہ ماہ

اندازِ فکر

☆ یہ غلط ہے کہ وقت گزر جاتا ہے وقت ٹھہرا رہتا ہے ہم گزر جاتے ہیں۔

☆ صورت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی دوا ہے۔

☆ آدمی مطالعے سے بیدار ہوتا ہے مکالمے سے تمیز آتی ہے اور لکھنے سے اس کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔

☆ خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیاروں کے کام آتی ہیں۔

☆ انسان کا یہ گناہ کافی ہے کہ اسے کہا جائے اللہ سے ڈرو اور وہ کہے جا اپنا کام کر۔

لیکن میرا اپنا خیال یہ ھے کہ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ھوں' میں فطرتاً بوہ مین واقعی ھوا ھوں اور ھر وہ شخص جو اس سماج میں مطمئن نہیں ھے اور جس کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہیں ھے' وہ بد حواسی کے عالم میں زندگی سے بھاگتا پھرتا ھے اور اسی لیے میں زندگی میں کسی بھی ترتیب کا قائل نہیں ھوں۔

شوکت صدیقی

اردو کے ایک نام ور ادیب کے قلم سے ایک فکر انگیز تحریر

جب اور کوئی پروگرام سمجھ میں نہ آیا' تو میں نے سوچا' چلو تھوڑی سی پیتر ہی پی ڈالی جائے۔ اس روز موڈ ہی کچھ ایسا تھا۔

ستمبر کی راتیں بڑی سہانی ہوتی ہیں اور یہ ان سہانی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ ہوا میں کچی کلیوں کی مہک تھی' تیکھا پن تھا اور بڑی خوشگوار خنکی تھی۔ ہر طرف ہلکی چاندنی بکھری ہوئی تھی اور اس بکھری ہوئی چاندنی میں ولیر یو بار میں داخل ہو گیا۔ باہر لان میں میزیں پڑی تھیں اور ملی جلی آوازوں کے ساتھ تیز قہقہے گونج رہے تھے۔ ہلکی نیون لائٹ میں ساری فضا خواب میں ڈھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ میں چپ چاپ ایک خالی میز کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ آنے کو تو میں یہاں آ گیا' مگر اس احساس سے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی کہ میں بالکل تنہا ہوں اور تنہا آدمی مجھے شراب پیتا ہوا بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر تقریر کرنے کی مشق کر رہا ہو۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ برابر والی میز پر کسی نے بے تکلفی کے سے انداز میں کہا۔

''آیئے' اسی طرف آ جایئے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' وہ بھی اکیلا تھا۔ اس کے سامنے گلاس رکھا ہوا تھا۔ جس میں ابھی تھوڑی سی شراب موجود تھی۔ وہ میری طرف نظریں اٹھائے ہوئے بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس کو پہچاننے کی کوشش کی' مگر میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ مجھے اس طرح خاموش دیکھ کر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور میرے پاس آ کر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا اور ہنس کر کہنے لگا۔

''آپ تو خواہ مخواہ تکلف کرنے لگے' لیجئے میں خود ہی یہاں آ گیا۔''

ایک دفعہ میں بھی مسکرا دیا' وہ میری طرف جھک کر بتانے لگا۔

''دراصل ایک شخص سے میرا یہاں اپائنٹمنٹ تھا' مگر خدا معلوم وہ کیوں نہیں آئے اور میں ان کے انتظار میں یہاں اکیلا بیٹھا ہوا بور ڈم محسوس کر رہا ہوں۔ دراصل اکیلے بیٹھ کر پینا بڑا آکورڈ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے سوچا آپ بھی تنہا ہیں اور میں بھی' خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے۔'' اور وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ لیکن مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ اس لیے کہ وہ جس تیزی سے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا' میں اسی قدر تکلف محسوس کر

رہا تھا۔

پھر اس نے بیرے کو بلایا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''آپ کے لیے کیا منگواؤں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو صرف بیئر پیوں گا۔''

کہنے لگا۔ ''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی' کچھ اور پیجیے۔''

مگر جب میں نے اصرار کیا' تو اس نے بیرے کو ایک بیئر اور ایک وسکی کا آرڈر دے دیا۔ لیکن جب دونوں چیزیں میز پر آ گئیں تو وسکی کو دیکھ کر میری نیت کچھ بدلنے لگی۔ اس لیے کہ میں بیئر کو شراب نہیں سمجھتا۔ بیئر پینا تو ایسا ہی ہے کہ بجائے پکچر دیکھنے کے صرف ٹریلر پر اکتفا کر لیا ہو۔

وہ گلاس میں سوڈا ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تفصیلی انٹروڈکشن تو پھر ہوتا ہی رہے گا' لیکن میں اتنا تو بتا دوں کہ میرا نام دلاور ہے' حالانکہ میں بڑا بزدل واقعی ہوا ہوں اور خاص طور پر بھوتوں سے بہت ڈرتا ہوں۔''

اور میں نے ہنس کر کہہ دیا۔ ''آپ یقین مانئے میں بھوت نہیں ہوں۔ مجھے فہیم کہتے ہیں۔''

اس بات پر ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

آخر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے ڈرامائی انداز میں کہنے لگا۔ ''ہائے کیا چیز ہوتی ہے یہ ظالم بھی۔ کتنا سکون ملتا ہے اس میں' زندگی کی کتنی تلخیاں ہیں جو میں نے اس میں ڈبو دی ہیں۔ غم غلط کرنے کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی سہارا نہیں۔ کیوں فہیم صاحب کیا خیال ہے آپ کا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''بات تو یہی ہے۔''

حالانکہ شراب نہ تو میں غم غلط کرنے کے لیے پیتا ہوں اور نہ گو نہ بے خودی کے لیے' اس لیے کہ نہ میں عاشق نامراد ہوں' نہ آرٹسٹ ہوں' شراب تو میں صرف اس لیے پیتا ہوں کہ کبھی کبھی ذرا ڈان ژوان پوز کرنے کو دل چاہتا ہے۔

پھر اس نے گلاس ہونٹوں کے قریب لے جا کر کہا۔ ''اس رات کی یاد میں۔'' اور گھونٹ پی کر بڑبڑانے کے سے انداز مین آہستہ سے کہنے لگا۔ ''یوں تو ہم آئندہ بھی ایک ساتھ پیتے رہیں گے' لیکن یہ رات زندگی میں یادگار رہ جائے گی۔ ایک بار جام ٹکرانے کے بعد ایک دوسرے کو بھول جانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔''

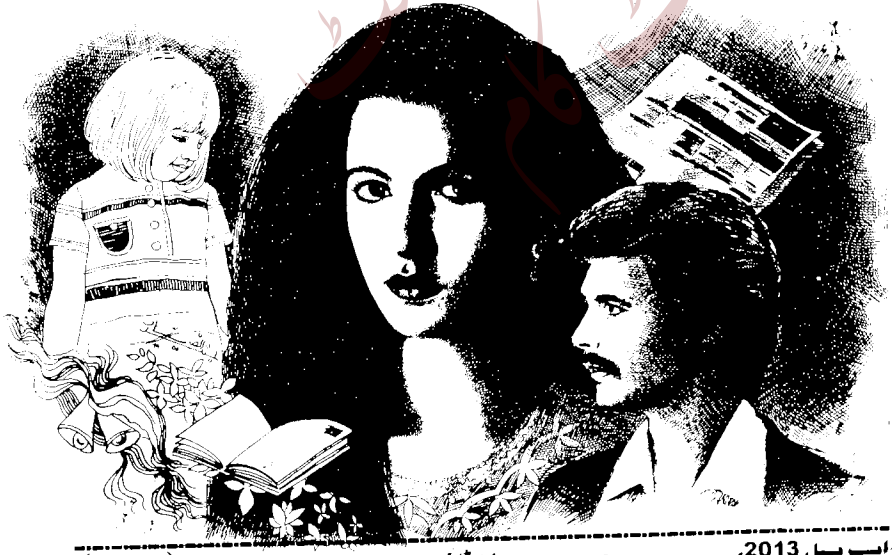

اور پھر ہوا بھی ایسا ہی' گیارہ بجے کے قریب جب ہم دونوں ولیریو سے باہر نکلے تو ہم آپس میں اتنی باتیں کر چکے تھے جیسے ایک دوسرے کو عرصہ سے جانتے ہوں۔

دوسرے روز شام کو اس نے کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا تھا' لیکن نو بجے رات تک انتظار کرنے کے بعد بھی وہ وہاں نظر نہ آیا۔ پھر میں کئی روز تک وہاں جاتا رہا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کے نہ ملنے پر مجھے کچھ کوفت بھی ہوئی۔ اس لیے کہ ان دنوں میں بالکل اجنبیت کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی میں میرا اسی مہینے میں تقرر ہوا تھا۔ میں یہاں بالکل نووارد تھا۔ اور جس طرح نیا گھوڑا پہلے پہل اصطبل میں جاتے ہوئے بدکتا ہے اسی طرح میں بھی دفتر کے ماحول سے کتراتا ہوں اور کلرکوں کے طبقے سے تو مجھے یوں بھی ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ میں کئی بار پبلک سروس کمیشن سے قسمت آزما چکا ہوں اور ہر بار ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑا ہے لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے یہ تو سب قسمت کا کھیل ہے اور قسمت صرف ری سورسز ہی سے قابو میں آسکتی ہے۔ اس لیے کہ نہ تو میں کسی منسٹر کا بھتیجا ہوں اور نہ کسی ڈپٹی سیکرٹری کا ہونے والا داماد ہوں اور نہ کبھی میرے باپ کو ایم ایل اے ہونے کی توفیق ہوئی ہے' میرے ری سورسز تو صرف اسی قدر ہیں جن کے بل پر میں ٹھاٹ سے کلرکی کرتا ہوں اور اٹھانوے روپے ماہوار پر پی ڈبلیو ڈی کی عالی شان عمارت میں فائلوں سے الجھا رہتا ہوں۔

پھر ایک سہ پہر کو جب میں دفتر سے واپس لوٹ رہا تھا تو وہ مجھے بس اسٹینڈ کے پاس مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس طرح بے تکلفی سے بولا۔

''اوہو فہیم صاحب آپ ہیں' کہئے کہاں سے آرہے ہیں بڑے مضمحل اور پریشان نظر آرہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو دفتر سے آرہا ہوں' مگر آپ آج کل کہاں رہتے ہیں' اس دن سے بعد کہیں نظر ہی نہیں آئے۔''

کہنے لگا۔ ''آج شام کے وقت زیادہ تر بلیرڈ روم میں رہتا ہوں اور شام ہی پر کیا منحصر' آج بھی دوپہر سے وہیں تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''اچھا تو اب کیا پروگرام ہے۔''

کہنے لگا۔ ''میں تو اب سیدھا گھر ہی جاؤں گا' وہاں سے پھر نہا دھو کر آؤں گا' طبیعت بڑی مکدر ہو رہی ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''اگر صرف اسی غرض سے آپ واپس جا رہے ہیں تو میرا مکان یہاں سے قریب ہے' وہیں نہا دھو لیجئے گا۔''

اور پھر کسی اصرار کے بغیر وہ میرے ہمراہ چل دیا۔ میرے یہاں اس نے غسل کیا' چائے پی اور وہاں سے ہم دونوں کافی ہاؤس چلے آئے اور کوئی دو گھنٹے تک ہم دونوں وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور کافی پیتے رہے۔ پھر اس کو کسی کالج کا ایک پروفیسر مل گیا اور وہ مجھ سے اجازت لے کر اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں ذرا دیر تک کافی ہاؤس میں اور بیٹھا رہا اور جب میں باہر سڑک پر آیا تو میں نے دیکھا وہ پروفیسر کے ہمراہ سیوائے بار میں داخل ہو رہا تھا لیکن اس روز کے بعد بھی وہ اکثر مجھ سے ملتا رہا۔ میں نے اس کے ساتھ کافی ہاؤس میں شامیں گزاریں' ولیریو میں قہقہے لگائے اور کبھی کبھی رات گئے تک ہم دونوں سنسان سڑکوں پر محض آوارہ گردی کرتے رہے اور جہاں تک راتوں کی اس آوارہ گردی کا تعلق ہے' سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی شب بیداری کا مرض ہے' حالانکہ جب سے میں نے یہ ملازمت اختیار کی ہے' مجھے اپنی اس عادت سے اکثر بڑی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ اس لیے کہ میں دن چڑھے تک سونے کا عادی ہو گیا ہوں اور ہمیشہ دفتر دیر سے

پہنچتا ہوں اور اس تاخیر کے لیے کئی بار ایگزیکٹو آفیسر کی ڈانٹیں سن چکا ہوں اور ایک بار تو ایسا ہوا کہ میں اس مرض سے ایسا عاجز آ گیا کہ ڈاکٹر کے پاس سنجیدگی سے علاج کرانے کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے پوری توجہ کے ساتھ میرا معائنہ کیا آنکھیں دیکھیں' زبان نکلوا کر دیکھی اور پھر بہت سے ادھر ادھر کے سوالات کرنے کے بعد اس نے بتایا کہ میں ذہنی انتشار کے مرض میں مبتلا ہوں۔

مگر ڈاکٹر کے اس انکشاف سے مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے انتشار تو پوری سوسائٹی میں ہے اور جب سماج میں پراگندگی ہو تو اس سماج میں بسنے والوں کو سکون کہاں نصیب ہو سکتا ہے' مگر یہ بات میں کہہ نہ سکا۔ اس لیے کہ میں اپنا علاج کرانے آیا تھا۔ سوشیالوجی پر بحث کرنے نہیں آیا تھا۔

لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوں' میں فطرتاً بوہیمین واقع ہوا ہوں اور ہر وہ شخص جو اس سماج میں مطمئن نہیں ہے اور جس کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہیں ہے' وہ بدحواسی کے عالم میں زندگی سے بھاگتا پھرتا ہے اور اسی لیے میں زندگی میں کسی بھی ترتیب کا قائل نہیں ہوں۔ یوں تو میرے سر کے بال ہمیشہ الجھے ہوئے رہتے ہیں اور قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں' بال پریشان اور چاک گریباں تو میں رہتا ہی ہوں' لیکن جن لوگوں نے میرا کمرہ دیکھا ہے' وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا کمرا بکھری ہوئی چیزوں کے انبار میں اچھا خاصا کباڑ خانہ معلوم ہوتا ہے اور مجھے کباڑیوں کی دکانیں پسند بھی ہیں۔ میں وہاں اکثر جاتا ہوں اور دیر تک پرانی چیزوں کو دیکھتا رہتا ہوں اور سجی سجائی دکانوں پر تو میں خوامخواہ جاتا ہوں اور بلا ضرورت بہت سا سامان نکلوا کر بکھیر دیتا ہوں اور اس کے لیے بلاوجہ مجھے کچھ نہ کچھ خریدنا بھی پڑتا ہے اور یہی نہیں مجھے آج تک کسی نے کیو میں کھڑے ہوئے نہیں دیکھا ہے' بلکہ میں تو کیو کو درہم برہم کرنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ اور اس کوشش میں ایک بار تو پٹتے پٹتے بال بال بچ گیا لیکن اس قدر بے ترتیبی کا قائل ہونے کے باوجود بھی اکثر سوچتا ہوں کہ مجھے باقاعدگی اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اب میں پی ڈبلیو ڈی میں کلرک ہوں اور کلرکی کے لیے تنظیم پہلی شرط ہے۔ حالانکہ راز کی بات تو یہ ہے کہ یہ تنظیم ایسی ہی ہے جیسے انگریز لوگ اپنے کتوں کی دمیں جسمانی تناسب کے لیے کٹوا دیتے ہیں اور یہ تنظیم ذہنیت کو مسخ کرنے کے لیے عائد کی جاتی ہے۔

دلاور کے ساتھ اسی طرح میرا وقت گزرتا رہا اور جب ہم دونوں نے ایک دوسرے میں اپنے وجود کو پیدا کر لیا اور ایک دوسرے کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے تو وہ اچانک پھر کہیں غائب ہو گیا۔

میں پھر تنہائی محسوس کرنے لگا اور یہ تنہائی کا احساس ایسا ہی تھا جیسے کسی بے تحاشا سگریٹ پینے والے کو ایک دم سگریٹ نوشی چھوڑ دینا پڑے اور یہ انہی دنوں کی بات ہے' اس روز رات کو بھی میں حسب معمول دیر کو سویا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے کے اندر کسی کے گہرے خراٹوں کی آواز ابھر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے' اس لیے کہ میرے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا۔ میں خوفزدہ ہو کر ذرا دیر اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا۔ پھر میں نے سہمی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔

''کون ہے۔''

جواب تو کوئی نہ ملا البتہ کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اور خراٹے بھی بند ہو گئے۔ میں اور بھی سہم گیا۔ اس دفعہ میں نے ذرا زور سے آواز دی۔

''کون ہے بولتے کیوں نہیں۔''

اور پھر کمرے کے اندھیرے میں مجھے

دلاور کی آواز سنائی دی۔ وہ بگڑنے کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تم اتنا چیخ کیوں رہے ہو' ہوگا کون' میں ہوں۔''

میں نے بجلی کا سوئچ دباتے ہوئے پوچھا۔

''تم یہاں آ کدھر سے گئے۔''

اور میں نے روشنی میں دیکھا کہ وہ کونے والی کرسی پر سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

''آ کدھر سے جاتا سامنے والے دروازے سے آیا ہوں۔ تمہیں دروازہ تک تو بند کرنے کا ہوش نہیں رہتا۔'' پھر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور بڑبڑانے لگا۔

''خوامخواہ نیند خراب کردی۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہو' تم نے مجھے جگا لیا ہوتا اور اس کرسی پر تمہیں نیند کیسے آ گئی۔''

کہنے لگا۔ ''چار بجے رات کے بعد مجھے ہر جگہ نیند آ جاتی ہے۔''

میں نے دریافت کیا۔ ''اس وقت تم کہاں سے آ رہے ہو' اتنے دنوں سے رہے کہاں۔''

بڑی بیزاری کے سے انداز میں بولا۔

''ارے بھئی' کچھ پوچھو نہیں' وہ سالا چوپڑا آج کل دہلی سے آیا ہوا ہے کسی وقت پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ گھر سے لے کر آ جاتا ہے امپیریل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ رات بھر اس کے کمرے میں پوکر ہوتا ہے اور دور چلتا ہے۔ اس وقت بھی وہیں سے آ رہا ہوں' وہ لوگ تو سالے ابھی تک جٹے ہوئے ہیں مگر مجھے نیند معلوم ہو رہی تھی تو اپنی جان چھڑا کر بھاگا۔''

میں نے کہا۔ ''تو اب سو جاؤ' صبح چائے پی کر چلے جانا۔''

ہنس کر بولا۔ ''اب کون سی صبح ہوگی' چھ تو بج رہے ہیں۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے پاس کچھ روپے ہوں گے۔ میں تو وہاں سب کچھ ہار آیا۔''

مجھے اس ہفتے تنخواہ ملی تھی ابھی تک کچھ روپے موجود تھے۔ میں نے اٹھ کر کوٹ کی جیب میں سے روپے نکالے اور اس سے پوچھنے لگا۔

''کتنے روپے تم کو چاہئیں۔''

کہنے لگا۔ ''بس بیس روپے ہوں تو دے دو' ابھی تو انہیں سے کام نکل جائے گا' پرسوں ہی تو ابا سے روپے لیے تھے' آج کہوں گا تو بھڑک اٹھیں گے۔''

میں نے بیس روپے نکال کر دے دیئے' وہ ذرا دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ اس رات کے بعد وہ پھر کچھ دنوں کے لیے لاپتہ ہو گیا اور اسی طرح اچانک ایک روز شام کے وقت وہ میرے مکان پر کچھ گھبرایا ہوا سا آیا اس نے آتے ہی اپنا کوٹ اتار کر پلنگ پر پھینک دیا اور سیدھا غسل خانے میں گھس گیا۔ اور جب وہ نہا دھو کر باہر نکلا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''کوئی اچھا سا سوٹ ہو تو نکالو' گھر تک جانے کا وقت نہیں' ذرا جلدی میں ہوں۔'' اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر میرا نیا سوٹ ہینگر سے اٹھا کر پہننے لگا۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ آج کہاں جانے کی تیاریاں ہیں۔''

مسکرا کر بولا۔ ''آج عارف کے یہاں بنارس والی ستارا کا مجرا ہے' اچھا پروگرام ہے' چلو تم بھی۔''

مگر میں نے جانا مناسب نہ سمجھا اور وہ ذرا دیر ٹھہرے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر چلا گیا اور اس دن کے بعد وہ پھر کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو گیا۔

لیکن ایکا ایکی وہ پھر اسی طرح مجھ سے ملنے لگا۔ اس دفعہ جب میں نے غائب رہنے کی وجہ پوچھی تو وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ کبھی کبھی وہ خوامخواہ مسکرایا کرتا تھا۔

اکثر تو میں یہی سمجھا کہ وہ میری کسی بات پر

مسکرا رہا ہے اور جب میں نے کچھ جاننے کی کوشش کی تو اس کی مسکراہٹ اور بھی پراسرار ہو جاتی۔ اس مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خود اس کی شخصیت بھی ایک مسٹری' معلوم ہونے لگتی۔

ان دنوں اس کی جیبیں بالکل خالی رہا کرتی تھیں اور مہینے کی آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے میں بھی پھکڑ ہو رہا تھا۔ سگریٹ کے لیے تو اس نے کئی دکانوں پر اپنا ادھار چلا رکھا تھا۔ لیکن صرف یہی نہیں بلکہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اکثر ڈرنک کر کے آتا ہے اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ یہاں کے کسی بھی بار میں کریڈٹ نہیں چلتا۔ آخر ایک روز رات کو جب وہ بری طرح پیے ہوئے تھا اور اس کے قدم نشے سے لڑکھڑا رہے تھے میں نے اسے پوچھ ہی لیا۔

''معلوم ہوتا ہے تم نے بار میں بھی اکاؤنٹ شروع کر دیا ہے' لیکن یہ ہوا کیسے۔''

وہ شرابیوں کی طرح ڈرامائی سا قہقہہ لگا کر بولا۔ ''بغیر اکاؤنٹ چلائے ہوئے بھی کہیں اپنا کام چلتا ہے۔ ارے یہ تو شراب ہے اپنا تو بالا خانوں پر بھی کریڈٹ چلتا ہے اور یقین نہ ہو تو ابھی میرے ساتھ چل کر دیکھ لو' بولو کیا کہتے ہو۔''

میں سچ مچ بھونچکا سا رہ گیا۔ مگر وہ کہتا ہی رہا۔ ''آؤ چلو' آج یہی سہی' تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے سابقہ پڑا تھا۔''

مگر میں آمادہ نہ ہوا۔ اس لیے کہ وہ تو خوب چڑھائے ہوئے تھا اور میں نے تو کافی تک بھی نہیں پی تھی۔ ان دنوں جیب میں اتنے بھی پیسے نہ تھے۔ لیکن اس مفلسی کے باوجود بھی اس نے ایک ٹیکسی کر لی اور ہم دونوں ویران سڑکوں پر ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے گھومتے رہے۔ آخر میرے گھر پر آ کر اس نے ٹیکسی ٹھہرائی اور ہم دونوں نیچے اترے۔ میں تو گھبراہٹ کے خیال سے بدحواس تھا۔ مگر اس نے اطمینان سے سگریٹ نکال کر سلگائی پھر ٹیکسی ڈرائیور سے بولا۔

''بھئی کیا نام ہے تمہارا۔''

اس نے بتایا۔ ''ساب مجھے عبداللہ کہتے ہیں۔''

دلاور کہنے لگا۔ ''دیکھو بھئی عبداللہ' اس وقت تم ہم اپنی جیبیں بالکل خالی کر چکے ہیں۔ اب رات بہت ہو چکی ہے گھر پر کسی کو جگایا نہیں جا سکتا۔ تم سویرے آ کر اپنا کرایہ لے جانا۔''

عبداللہ ٹیکسی ڈرائیور کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے جھٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کو دی اور ذرا بے تکلفی سے کہنے لگا۔

''لو تم سگریٹ تو پیو اور اس سامنے والے دروازے کو پہچان لو' صبح یہیں آ کر آواز دے لینا اور اگر تم سویرے یہاں نہ آنا چاہو تو شام کو 'ولیز یو' کے پاس اسٹینڈ پر مل جانا' تمہارا نمبر کیا ہے۔'' اور وہ جھک کر ٹیکسی کا نمبر دیکھنے لگا۔

عبداللہ نے کوئی حیل و حجت نہیں کی' بلکہ سگریٹ سلگاتا ہوا ٹیکسی کے اندر چلا گیا اور ہم دونوں مکان میں آ گئے۔ اور جب میں کپڑے تبدیل کر کے اطمینان سے بیٹھا تو میں نے دلاور سے پوچھا۔

''یہ تم نے صبح ٹیکسی ڈرائیور کو بلا تو لیا ہے مگر سویرے ہی سویرے کرائے کا انتظام ہو گا کیسے۔''

وہ بے نیازی سے کہنے لگا۔ ''صبح کی صبح دیکھی جائے گی اس وقت کیوں بے کار میں نیند خراب کر رہے ہو' اور بھئی وہ صبح آئے گا ہی نہیں' تم دیکھ لینا۔''

لیکن مجھے یقین نہ آیا اور میں دیر تک بستر پر لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ صبح اگر عبداللہ آئے گا تو کیا ہو گا۔ مگر دلاور مزے سے پڑا ہوا سو رہا تھا اور پھر وہی ہوا جو اس کا خیال تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور میرے دفتر کے جانے کے وقت تک آیا نہیں اور دلاور اسی طرح پڑا سوتا رہا۔

یہ تو خیر ایسی کوئی بات نہیں تھی' وقتی الجھن

تھی۔ مگر اسی دوران میں واقعی ایک پریشانی میں مبتلا ہوگیا۔ وہ ہوا یہ کہ جس مکان میں میں رہتا تھا' وہ وحید احمد کا تھا۔ وہ میرے ہی دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے اور کسی زمانے میں بڑے بھائی کے خلاف فیلورہ چکے تھے۔ اسی لیے مجھ سے بھی کچھ جان پہچان تھی۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ جیسے ہی میرا تقرر ہوا' انہی دنوں وحید احمد اکاؤنٹنٹ دو مہینے کے چھٹی لے کر اپنے قصبے کو جارہے تھے چنانچہ مجھے رہنے کے لیے آسانی سے جگہ مل گئی۔ مگر اب ان کا خط آیا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں کے ہمراہ واپس آرہے ہیں۔ یہ مکان اتنا بڑا بھی نہ تھا کہ میرے رہنے کے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی۔ مجبوراً مجھے کہیں نہ کہیں جلد ہی اپنے لیے کوئی انتظام کرلینا ضروری ہوگیا۔ کسی ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لینا میرے بس کی بات نہ تھی اور بڑے شہروں میں مکان کا ملنا محال ہے۔ آخر میں نے دلاور سے اپنی اس پریشانی کا تذکرہ کیا وہ اسی طرح بے نیازی سے بولا۔

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے' تم میرے ساتھ یہاں آجاؤ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں' بس میں نے اسی روز سامان اٹھایا اور دلاور کے یہاں چلا گیا۔ یہ کشادہ کمروں اور طویل دالانوں والی قدیم طرز کی بارہ دری تھی۔ مجھے جو کمرہ رہنے کے لیے ملا تھا وہ باہری رخ تھا۔ دروازوں پر ہلکے بادامی پردے پڑے ہوئے تھے اور دھنسے ہوئے کوچوں والا ایک صوفہ سیٹ تھا۔ دیواروں کا گہرا نیلا رنگ ماند پڑ گیا تھا۔ ان پر قرون وسطی کے شکاریوں کی تصویروں کے ساتھ عمر خیام کی ایک مصور رباعی بھی آویزاں تھی۔ کمرے کی اس سج دھج میں گئی گزری ہوئی جاگیرداری آن بان جھلکتی تھی اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

دلاور کا تعلق کھیم پور کے جاگیرداروں کے خاندان سے تھا۔ جاگیر تو اب برائے نام ہی رہ گئی تھی' مگر دلاور کے باپ کو گورنمنٹ کی طرف سے کچھ گزارہ ملتا تھا لیکن ابھی تک ان کی وضع داری میں وہی رئیسانہ ٹھاٹھ باٹ تھا۔ کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے جب کسی بات پر ان کی تیوری پر بل پڑ جاتے اور غلافی آنکھیں ذرا اوپر کو اٹھ جاتیں تو خواہ مخواہ ان کے اس انداز سے مرعوب ہونا پڑتا۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں پڑے پیچوان پیا کرتے اور برابر رکھے ہوئے خاصدان سے پان نکال نکال کر کھایا کرتے۔ البتہ شام کو کھانا کھا کر باہر چلے جاتے تھے۔ وہ بھی جج صاحب کی کوٹھی تک اور وہاں اکثر رات گئے تک شطرنج کھیلا کرتے یا کبھی کبھار ٹہلتے ہوئے میرے پاس آجاتے اور باتیں کرنے لگتے۔ ان کی باتیں ہمیشہ جاگیر کے متعلق ہوا کرتیں۔ جس کے تباہ ہو جانے کا ان کو بڑا دکھ تھا لیکن اس سے بھی زیادہ دلاور کی بے راہ روی پر کڑھتے تھے اور اس کی بات کرتے کرتے اکثر ان کو اپنی بیگم یاد آجاتیں جن کو مرے ہوئے کئی سال ہوگئے تھے' وہ گہری سانس بھر کر کہتے۔

''اللہ بخشے مرنے والی تو بڑی نیک عورت تھی' مگر بھئی اس لڑکے کو تو انہیں کے لاڈ پیار نے تباہ کیا ہے۔''

گھر کی دیکھ بھال ایک بوڑھی عورت کرتی تھی اور اس کے علاوہ نادرہ تھی جو دلاور سے کوئی سال بھر چھوٹی ہوگی' کسی کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پردہ کرتی ہوگی' مگر ایک روز جب وہ ناشتہ کا سامان لے کر میرے کمرے میں آگئی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس دن بوڑھی خادمہ بیمار تھی۔ اس کے علاوہ گھر میں اور کوئی ملازم بھی نہ تھا۔ نادرہ زردی مائل چہرے والی کچھ بیمار سی لڑکی تھی اور اپنے سن کے اعتبار سے متوسط طبقے کی روایت کے مطابق اب تک نہ صرف اس کی شادی ہو جانا چاہیے تھی بلکہ اسے ایک آدھ

بچے کی ماں ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی خاموشی سے چائے بناتی رہی اور میں غور کرنے لگا کہ اس کے بیمار چہرے پر ایک دلاویزی ہے اور اس دلاویزی میں اتنا پیتھاٹس تھا کہ مجھے ایک بارگی اس پر ترس آ گیا۔ وہ مجھے کلاسکس کی ایک ایسی کتاب معلوم ہوئی جو کسی الماری میں لائبریری کی شان بڑھانے کے لیے رکھ دی جائے اور پھر گرد و غبار کے ساتھ ساتھ اسے دیمک چاٹنا شروع کر دے۔

اور دلاور ان نوجوانوں میں سے تھا جن کو بڑے بوڑھے عاقبت نا اندیش کہتے ہیں۔ خود اس کے باپ کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے۔

''میری آنکھیں بند ہو جانے دو' پھر صاحبزادے کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ بھئی اپنا کیا ہے' اپنی تو جیسے تیسے کٹ ہی گئی' تھوڑی سی زندگی جو رہ گئی ہے وہ بھی گزر ہی جائے گی' مگر ان کا کیا حشر ہوگا۔ یہی تو کوفت مجھے کھائی جاتی ہے۔''

وہ اسی کوفت میں گھلتے جا رہے تھے اور دلاور ہر روز شام کو گھر سے بن سنور کر نکلتا اور رات کے پچھلے پہر آ کر آہستہ سے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور جب میں دروازہ کھولتا تو دبے پاؤں صوفے پر جا کر تھکا ہوا سا دراز ہو جاتا اور گھر میں اس کے باپ کھانستے ہوئے اس آہٹ سے ان کی آنکھ کھل جاتی تھی اور دلاور ان کی ناراضگی کے ڈر سے اکثر وہیں سو جاتا۔

ان دنوں پیر میں چوٹ آ جانے کی وجہ سے میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی اور ہر وقت اپنے کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دلاور کی طرف اکثر دکانداروں کے حسابات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے گھر پر آ کر تقاضا کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے خود بھی اکثر یہ دیکھا تھا کہ کتنے ہی ایسے راستے تھے جدھر سے گزرتے ہوئے وہ کتراتا تھا اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ تھوڑے سے فاصلے کے لیے خواہ مخواہ لمبا سا چکر کاٹنا پڑتا۔ میں نے کبھی پوچھا تو وہ ہنس کر کہہ دیتا۔

''آج کل یہ راستہ 'آؤٹ آف باؤنڈ' ہے۔''

اور پھر اس 'آؤٹ آف باؤنڈ' راستے کو صاف کرنے کے لیے اکثر مجھے قرض چکانا پڑتا۔ مگر اس کے انداز میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

اس کی ان حرکتوں کا تو اب میں کسی حد تک عادی ہو چکا تا' لیکن ایک روز ایسا ہوا کہ کسی نے آ کر میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اس وقت موجود تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ چھریرے جسم کا ایک سیاہی مائل نوجوان سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اس کو اندر بلا لیا۔

وہ کہنے لگا۔ ''دلاور علی خان اس وقت گھر میں موجود ہیں۔''

وہ صبح ہی سے غائب تھے چنانچہ میں نے کہہ دیا۔ ''وہ تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔''

پھر اس نے کچھ نہ کہا اور بلا جھجک الماری کے پاس جا کر اس سوٹ کو اٹھانے لگا جس کو کل رات دلاور یہیں چھوڑ گیا تھا۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''یہ آپ اس سوٹ کو کہاں لے جا رہے ہیں۔''

وہ میری طرف توجہ دیئے بغیر کہنے لگا۔ ''یہ سوٹ میرا ہے' اس لیے اسے لیے جا رہا ہوں۔ آپ دلاور سے کہہ دیجیے گا۔''

وہ بگڑ کر بولا۔ ''وہ کبھی ملتے بھی ہیں' کتنی بار یہاں آ چکا ہوں' مگر ان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ ایک روز کے لیے مانگا تھا اور آج کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ میں نے اس لیے تو اس کو نہیں سلوایا تھا کہ وہ ٹھاٹھ کیے ہوئے اکڑتے پھریں اور میں احمقوں کی طرح ان کے گھر کے چکر لگاتا پھروں۔''

میں نے اپنی مجبوری کا ذکر کیا تب جا کر کہیں وہ باز آیا' ورنہ وہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ مجھے

دلاور کی اس حرکت پر بڑا تاؤ آیا' اور آتے ہی میں نے ذرا سختی سے اس بات کا ذکر کیا۔ مگر وہ مطلق نہ پسیجا۔ ڈھٹائی سے ہنس کر کہنے لگا۔

''تم بھی کیا باتیں کرتے ہو' اس کی شکل کیا اس قابل ہے کہ اتنا گرینڈ سوٹ پہنے اور میں جو پہنتا ہوں تو اس سوٹ میں جچتا ہوں کہ نہیں۔ تمہیں انصاف سے کہہ دو۔ گھبراؤ نہیں اب کے ایک سوٹ تمہیں بھی رشوت میں دلوادوں گا' کیا یاد کرو گے کہ کوئی دلاور علی خاں ملا تھا۔'' اور پھر اس نے جیب سے سگریٹ کا ٹین نکالا اور میرے سامنے کر کے بولا۔

''لو بلیک اینڈ وائٹ پیو' بھائی اپنے تو یہی ٹھاٹھ ہیں۔''

اور بے فکری سے ہنستا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس پر میں اور جھنجلا گیا۔ میں نے غصے میں آ کر سگریٹ کو جوتے سے مسل دیا۔ اتنے میں نادرہ بھی کمرے میں آ گئی' پوچھنے لگی۔

''یہ آپ کس چیز کو اس طرح جھنجلائے ہوئے رگڑ رہے ہیں۔''

میں نے تیزی سے کہا۔ ''کچھ نہیں' البتہ میں یہاں سے جلد ہی کہیں اور جانے والا ہوں۔''

کہنے لگی۔ ''خیر تو ہے یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے ہو کیا گیا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''بات یہ ہے کہ دلاور کی حرکتیں اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں' اس لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے میں یہاں سے چلا ہی جاؤں گا۔''

میری اس بات پر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح مضمحل اور تھکا ہوا سا نظر آنے لگا۔ اور وہ مسکراہٹ جو لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر ابھری تھی وہ نہ جانے کہاں ڈوب گئی۔ اس دفعہ مجھے اس پر کوئی ترس نہیں آیا۔ بلکہ ایک بارگی میں بڑا رومانٹک ہو گیا اور رومانٹک ہمیشہ ردعمل کے طور پر ہی ہوا جاتا ہے ہر جذبہ ایک لہر ہے جو کسی بوجھ سے دب کر ہمیشہ دوسری جگہ سے سر نکالتی ہے۔ ایسی باتیں میں اکثر سوچا کرتا ہوں' اس لیے کہ بدقسمتی سے میں فلاسفی کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں۔ یہ بات دوسری ہے کہ مجھے کلرکی کرنا پڑتی ہے اور ایسی فائلوں سے الجھنا پڑتا ہے جن میں کوئی فلسفہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے امکانات ہوتے ہیں جن کے بل پر پی ڈبلیو ڈی کی مشینیں چلتی ہیں اور یہ مشین عوام الناس کی بہبودی کے لیے چلائی جاتی ہے اور عوام الناس صرف ایک ہی فلسفہ سمجھتے ہیں جس کے لیے وہ پی ڈبلیو ڈی کی سڑکوں پر چیختے پھرتے ہیں۔

''کیا چاہتا ہے مزدور کسان۔''

''روٹی' کپڑا اور مکان۔''

لیکن جس نظام میں مجھے فلسفہ پڑھ کر کلرکی کرنا پڑتی ہے وہ نظام عوام الناس کا فلسفہ بھلا کس طرح سمجھ سکتا ہے' لیکن سمجھنے اور سمجھانے کا دارو مدار مدت پر ہے اور اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ نادرہ میرے چلے جانے کی خبر سے اداس ہو گئی ہے اور ایک بارگی میں نے بڑے پیار سے اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے بکھیر دیا اور پھر میں نے چاہا کہ اس کے رخسار کو چوم کر کہوں۔ نادرہ میں کہیں نہیں جاؤں گا میں یہیں رہوں گا۔ مگر وہ ایک دم جھنجھلا کر بولی۔

''ہٹئے' مجھے یہ بدتمیزی اچھی نہیں لگتی۔''

لیکن اس بات پر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہی کہے گی اور میں نے اطمینان سے دھنسے ہوئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم برا مان گئیں' مگر یہ بدتمیزی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب یہی دیکھو کہ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے' کہ کھانا بائیں ہاتھ سے کھانا بدتمیزی ہے' لیکن ماڈرن سوسائٹی میں لوگ کھانا کھاتے وقت بائیں ہاتھ میں کانٹا پکڑتے ہیں۔''

وہ اسی طرح ناراضگی کے انداز میں بولی۔

''خدا آپ ہی کو یہ ماڈرن سوسائٹی مبارک کرے۔ ایسی حرکتیں وہیں کیا کیجئے' بھلے گھر کی لڑکیوں کے لیے ان کی عزت ہی بہت کچھ ہے۔ وہ اپنی عصمت کے لیے جان دے سکتی ہے۔ آخر آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے۔''

''دہت تیری کی۔'' یہ بھی راشد الخیری کے ناولوں کی ہیروئن ہی نکلی اور میرے دل میں آیا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ نادرہ بیگم جس عصمت کے لیے تم جان دے سکتی ہو' اس کا نیلام رات بھر کے لیے کبھی سو روپے تک ہوتا ہے اور کبھی چند ہزار سکہ رائج الوقت کے وعدے پر زندگی بھر کے لیے۔ ناک چاہے سامنے سے پکڑو چاہے گھما کر' بات ایک ہی ہے۔ بلکہ لمبے سودے میں ہمیشہ گھاٹا ہوتا ہے۔ اس سماج میں ہر چیز کا مول تول ہوتا ہے۔ اب مجھ کو ہی دیکھ لو۔ میں اٹھانوے روپے میں مہینہ بھر تک پی ڈبلیو ڈی کے آفس میں جھک مارتا ہوں۔ اپنے محنت بیچتا ہوں' اپنی خودی بیچتا ہوں' لیکن ایک طوائف صرف رات بھر کے لیے اپنا جسم بیچ کر مجھ سے زیادہ معاوضہ پا سکتی ہے مگر یہ سب کچھ میں اس سے کہہ نہ سکا۔ اس لیے کہ جو لڑکی اپنے باپ کی جاگیر کی طرح خود بھی کسی کی جائداد بننے کے لیے تلی ہوئی ہو' اس کی سمجھ میں میری بات آ بھی کیسے سکتی ہے' میں نے مسکرا کر صرف اس قدر کہہ دیا۔

''معلوم ہوتا ہے تم نے فضلی برادرز کی فلمیں بہت دیکھی ہیں۔''

اس دفعہ بھی وہ اسی طرح تیزی سے بولی۔ ''جی ہاں' دیکھی تو ہیں مگر آپ اپنی کہیے۔''

بات ایسی تلخ تو نہ تھی مگر نہ جانے کیوں میں بھی جھلا گیا۔ میں نے کہا۔ ''کم از کم مجھ کو اپنے متعلق کوئی مغالطہ نہیں ہے لیکن تمہیں اپنے متعلق بڑی غلط فہمی ہے۔ تمہارے اوپر تو وہ جوانی بھی نہیں رہی جس پر کوئی عورت اترا سکتی ہے اب تو صرف اس کا احساس رہ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔ بلکہ یہ تو تم پر میرا احسان تھا۔ میں نے تو چاہا تھا کہ تمہاری اس جوانی کو سنوار دوں جو سو چکی ہے' جو دم توڑ رہی ہے۔''

میری باتوں سے وہ ایک دم سے تلملا کر وہاں سے چل دی اور پھر غصے میں آ کر مجھے کوسنے لگی۔ ''اللہ کرے منہ سڑ جائے' ڈھائی گھری کا ہیضہ ہو جائے۔''

اور پھر مجھے اس کی سسکیاں ابھرنے کی آوازیں دور تک سنائی دیں۔ وہ رونے لگی تھی۔ اس بات پر مجھے خود بھی دکھ ہوا۔ اور اس سے بھی زیادہ دکھ مجھے یہ سن کر ہوا۔ جب دلاور نے مجھ سے یہ بتایا کہ نادرہ کو بخار آ رہا ہے اور ڈاکٹر حنیف نے اسے کیلشیم کے انجکشن دیے ہیں' اس لیے کہ اس کے جسم میں خون بالکل نہیں رہا ہے اور اس کے بعد مجھے یہ معلوم ہوتا رہا کہ اس کو برابر انجکشن دیے جا رہے ہیں۔ پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر حنیف کی کار بارہ دری کے سامنے آ کر رکی' وہ نادرہ کو دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ اس بات پر میں واعی پریشان ہو گیا مگر جب میں نے دلاور کے باپ سے اس کی بیماری کے لیے پوچھا تو کہنے لگے۔

''اب تو خدا کا شکر ہے۔ اس کی طبیعت بالکل سنبھل گئی ہے مگر ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ ابھی علاج نہ رکوایا جائے۔ اس لیے ابھی تک اس کو انجکشن دیے جا رہے ہیں۔''

میں نے کہا 'ڈاکٹر صاحب خود گھر پر آ کر انجکشن دیتے ہیں یہ تو بہت کاسٹلی پڑتا ہے۔''

وہ بولے۔ ''بھئی یہ ڈاکٹر حنیف میرا بڑا خیال کرتا ہے یہاں آنے کی کوئی فیس نہیں لیتا' بلکہ اب تو اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ انجکشن اور دوائیوں کا پے منٹ میں اس وقت لوں گا جب نادرہ بالکل تندرست ہو جائے گی۔''

پھر میں نے یہ بھی غور کیا کہ جب ڈاکٹر گھر آتا ہے تو نادرہ کے قہقہے طویل دالانوں والی بارہ

دری میں گونجنے لگتے ہیں۔

انہی دنوں میرا ٹرانسفر اکاؤنٹ سیکشن میں ہوگیا۔ یہاں آ کر مجھے کنٹریکٹروں کے پے منٹ کے بلوں کو پاس کرنا پڑتا تھا اور اس لیے رشوت میں اچھی رقم مل جایا کرتی تھی۔ اسی زمانے میں ایک روز میں سیوائے بار میں پی ڈبلیو ڈی کے ایک کنٹریکٹر نے مجھے ڈرنکس پر بلایا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا وسکی پی رہا تھا کہ اتنے میں دلاور بھی وہاں آ گیا اور مجھ پر کوئی توجہ دیے بغیر اس کنٹریکٹر سے بڑی بے تکلفی سے بولا۔

''کہیے بھئی احمد صاحب۔ آج کتنی دیر تک جمنے کا ارادہ ہے۔ اس روز تو آپ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے' کہئے آج بھی کچھ ہمت ہے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''ہاں کیوں نہیں' تم آج کے بل کو اسٹینڈ کرو گے' بولو کیا کہتے ہو۔''

دلاور کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ ''بھئی آج تو اپنے بھگوان روٹھے ہوئے ہیں۔''

وہ تیزی سے بولا۔ ''تمہارے بھگوان کبھی راضی بھی رہتے ہیں' ہم نے تو ہمیشہ تمہاری جیبیں خالی ہی دیکھیں۔''

دلاور اس کی بات کو بالکل ٹال گیا۔ ''ارے بھئی' وہ ہیلن پھر نظر آنے لگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اب اس نے انشورنس کمپنی والے منیجر کو چھوڑ دیا ہے' مگر بھئی کیا سدا بہار عورت ہے۔ سالی اس ٹھسے سے آتی ہے کہ کلیجے پر چھریاں چل جاتی ہیں۔''

پی ڈبلیو ڈی کا کنٹریکٹر مسکرا کر کہنے لگا۔ ''چلو یہ بھی اچھا ہوا اور اس کی بدولت تم کو بھی پینے کو مل جایا کرے گی' تم تو اس کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو۔''

لیکن دلاور نے اس کی بات کا ذرا بھی برا نہ مانا۔ ہنس کر بولا۔ ''کیوں خوامخواہ کے لیے بدنام کرتے ہو۔''

وہ اس طرح باتیں کرتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ دلاور کی نگاہیں ہر بار شراب گلاسوں کی طرف للچائی ہوئی سی پڑتی ہیں' مگر اب تک پی ڈبلیو ڈی کے کنٹریکٹر نے اس کے لیے کوئی آرڈر نہیں دیا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بیرے کو بلا کر اس کے لیے بھی ایک پیگ وسکی کا منگوا دیا۔ میری اس حرکت پر کنٹریکٹر کچھ خاموش سا ہوگیا اور جب دلاور اٹھ کر اس ٹیبل پر سے کہیں چلا گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔

''فہیم صاحب' آپ ان لوگوں کو ابھی جانتے نہیں' ان سالوں کا کام ہی یہی ہے کہ شام ہوتے ہی 'پارس' مین منڈلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی نہیں ہوا تو کمپنی کے لیے کبھی کبھار بٹھا لیا۔ مگر اب تو یہ مصیبت بن گئے ہیں۔ اب اس دلاور ہی کو آپ نے دیکھ لیا' کیسا ڈھیٹ بنا بیٹھا تھا۔''

وہ یہ سب کچھ کہتا رہا اور میں غور کرتا رہا کہ دلاور واقعی بڑا ذلیل ہے' مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔

لیکن دلاور سے علیحدگی اختیار کرنے کے لیے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے اسی دوران میں ایک اور ایسی حرکت کی کہ مجھے اس سے نفرت ہوگئی۔ ہوا یہ کہ میرے ایک ہونے والے سالے کی نیو مارکیٹ میں جنرل مرچنٹ کی شاپ تھی۔ اس زمانے میں وحید احمد اکاؤنٹنٹ کے ذریعے ایک ایسا ہی سلسلہ چل رہا تھا۔ ایک روز مجھے اس کی دکان پر جانا پڑا تو میرے ہمراہ دلاور بھی تھا۔ میں نے دونوں کا تعارف کرایا۔ کئی دن بعد میں پھر وہاں گیا۔ تو وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

''کہئے خیریت تو کیسی ہے۔''

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''میری طبیعت تو ادھر بالکل ٹھیک رہی۔''

وہ کہنے لگا۔ ''کیا معلوم وہ آپ کے دوست دلاور صاحب ابھی پرسوں آئے تھے۔ کہنے لگے کہ کسی کنٹریکٹر نے آپ کو پلا ولا دی ہے یا نہ

معلوم کیا ہوا' بہر حال آپ سے کسی دکان کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا جس سے آپ کو چوٹ بھی آ گئی تھی اور اسے شیشے کے لیے کچھ پے منٹ وغیرہ کرنا تھا اس کے لیے وہ یہاں سے پچیس روپے لے گئے تھے مجھے تو صرف اتنا ہی معلوم ہوا بات دراصل کیا ہے وہ تو آپ ہی بہتر سمجھتے ہوں گے۔''

مجھ کو دلاور کی اس کمینی حرکت پر بے حد غصہ آیا۔ ظاہر ہے وہ نسبت تو ختم ہو ہی گئی' لیکن مجھے اس کا مطلق افسوس نہ تھا' البتہ مجھے ان لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے کا بڑا دکھ پہنچا۔ یوں تو دلاور میرے جاننے والوں سے میرا نام لے کر روپیہ قرض لے آیا کرتا تھا مگر وہ اتنا گر جائے گا مجھے کبھی گمان بھی نہ تھا اور پھر اسی روز دلاور کے یہاں سے سامان اٹھوا کر میں نے ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور وہیں رہنے لگا اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس حال میں رہا۔

پھر ایک روز وہ اچانک میرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور وہ بھی چپ بیٹھا رہا۔ خلاف معمول میں نے اس کو اس قدر خاموش دیکھا تو مجھ سے نہ رہا گیا میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''کہیے دلاور صاحب' آج کیسے زحمت کی' میرے لیے کوئی خدمت۔''

وہ مجھے لحظہ بھر تک بھرپور نظروں سے دیکھتا رہا' پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''تم مجھے سو روپے دے سکتے ہو' لیکن یہ روپے بھی ہمیشہ کی طرح شائد میں ادا نہ کر سکوں گا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں بے پناہ کرب تھا پھر بلا کچھ غور کیے ہوئے میں نے ایک دم طے کر لیا کہ یہ روپیہ اس کو ضرور دوں گا۔ اسی روز مجھ کو ایک کنٹریکٹر سے پانچ سو روپے رشوت میں ملے تھے اور ابھی تک میری جیب میں موجود تھے۔ میں نے بغیر کچھ کہے ہوئے اٹھ کر روپے نکالے اور اس کو سو روپے کا ایک نوٹ دے دیا۔ لیکن نوٹ لے کر وہ اسی طرح گہری خاموشی میں ڈوبا رہا' پھر ایک بارگی اٹھ کر اس نے میرے پیروں پر سر رکھ دیا۔ اس حرکت پر میں واقعی گھبرا گیا۔ میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

''دلاور' یہ سب تم کیا کر رہے ہو۔''

اور میں نے اسے سنبھال کر کرسی پر بٹھا دیا' وہ آبدیدہ سا ہو کر کہنے لگا۔

''فہیم' تم نہیں جانتے کہ آج تم نے میرے اوپر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ میں ہر طرف سے ناامید ہو کر تمہارے پاس آیا تھا اس میں میری ضرورت کو دخل نہیں ہے' یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اب تم سے کیا چھپانا اس لیے کہ تم میرے لیے کبھی غیر نہیں ہو سکتے۔ بات یہ ہے کہ فہیم یہ ڈاکٹر حنیف جو نادرہ کا علاج کر رہا ہے' مجھے وہ کچھ اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ ابا جان تو سیدھے آدمی ہیں وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی سالا ڈاکٹر اس طرح کسی کا مفت علاج نہیں کر سکتا' گھوڑا گھاس سے آشنائی کرے گا تو کھائے گا کیا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر کو جو بل ہے اس میں سے سو روپے دے کر اس کا گھر پر آنا جانا بند کر دوں۔''

اور پھر جب وہ چلا گیا تو میں سوچنے لگا کہ دلاور کو مجھ پر کس قدر اعتماد ہے اور خود میں کس قدر ذلیل ہوں کہ میں نے اس کے اعتماد کو فریب دے کر وہی کچھ کرنا چاہا جس کے لیے وہ ڈاکٹر حنیف سے نفرت کرتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ دلاور میں بہت سی خامیاں ہیں مگر اس میں اس کا اتنا قصور نہیں جتنا اس جاگیردارانہ ماحول کو دخل ہے جس میں اس نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا۔ وہ زادراہ اس لیے ہے کہ وہ اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں کہ میری طرح کہیں کلرکی ہی کر سکے۔ وہ جھوٹی وضعداری کا ایک سمبل ہے' ایک اشارہ ہے۔ ایک نمونہ ہے۔ میں بہت دیر تک اسی طرح دلاور

کے متعلق سوچتا رہا اور پھر ایک بارگی سے خیال آ گیا کہ اس سو روپے سے اس کا کام نکل سکے گا' اس کو ابھی اور روپے کی ضرورت ہوگی اور پھر یہی سب کچھ سوچ کر میں نے کپڑے پہنے اور جب میں روپے ڈال کر اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ وہ آج وہاں ضرور موجود ہوگا۔

اور جب میں بارہ دری کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ باہر دروازے کے پاس دیوار کی طرف منہ موڑے ہوئے نادرہ سہمی ہوئی سی کھڑی تھی۔ اس کو اس طرح مشتبہ حالت میں کھڑے دیکھ کر میں کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

''نادرہ تم یہاں اس طرح کیوں کھڑی ہو۔''

مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے پھر کہا۔ ''تم بولتی کیوں نہیں' آخر تم یہاں کیسے کھڑی ہوئی ہو۔''

اس دفعہ بھی وہ خاموش کھڑی رہی۔ میں ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑا انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے جل کر کہہ دیا۔

''ڈاکٹر صاحب کا انتظار کر رہی ہو۔''

اور ایک بارگی اس نے تلملا کر میری طرف دیکھا۔ میں سہم کر رہ گیا۔ اس کے ماتھے پر سے خون بہہ رہا تھا اور اس خون میں لتھڑا ہوا اس کا چہرہ ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھ کو خونخوار نظروں سے گھورتی رہی۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''دلاور بھائی اندر ہیں۔''

بات یہاں تک پہنچ جائے گی' اس کا مجھے وہم تک نہ تھا۔ نادرہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہ کہا اور چپ چاپ اندر چلا گیا۔ طویل دالانوں اور شکستہ محرابوں والی بارہ دری بالکل سنسان معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا ایکا ایکی اوپر دلاور کے کمرے میں چھناکے کے ساتھ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز گہری خاموشی میں ابھری میں تیزی سے زینے پر چڑھتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ دلاور اپنے کمرے میں کھڑا ہوا ہانپنے کے سے انداز میں لمبی لمبی سانسیں بھر رہا تھا اور فرش پر شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اندر داخل ہو کر کہا۔

دلاور' یہ تم نے کیا اودھم مچا رکھا ہے۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور ناراضگی کے سے انداز میں بولا۔ ''بہتر ہوگا نہیم صاحب کہ اس وقت آپ یہاں سے چلے جائیں۔''

میں نے خود کو بے قابو نہیں ہونے دیا' بلکہ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''آخر بات کیا ہوئی' کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔''

اس دفعہ اس نے جھلا کر کہا۔

''آپ میرے سرپرست ہیں یا آقائے ولی نعمت' آپ کو میرے معاملے میں دخل وغیرہ کا کوئی حق نہیں۔''

میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس کے منہ سے شراب کے تیز بھبکے نکل رہے تھے۔ یہ معلوم کر کے مجھے بھی کچھ غصہ آ گیا۔ لیکن اب کے بھی میں خود کو سنبھالے ہی رہا۔ میں نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔

''تو اسی لیے تم نے مجھ سے روپے مانگے تھے' لیکن ڈاکٹر حنیف تم کو زیادہ روپے دے سکتے تھے' ان کے پاس بھی گئے تھے۔''

وہ ایک دم بپھر گیا چیخ کر بولا۔ ''میرے سامنے ڈاکٹر کا نام مت لو۔ میں اس سالے کو شوٹ کر دوں گا اور میں نے جو روپیہ تم سے قرض لیا ہے اس کو واپس کر دوں گا۔ مگر تم مجھے اس طرح گالیاں نہیں دے سکتے۔''

اب میں بھی بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ میں نے

تیزی سے کہا۔ ''ابے کمینے' مس ہیلن کی دلالی کرتے کرتے اب تو اپنی بہن کا بھی سودا کرنے لگا اور کہتا ہے مجھے گالیاں نہ دو۔''

وہ لپک کر میرے پاس آ گیا۔ ''اچھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' میں غصے میں کھڑا ہوا اسے چپ چاپ گھور رہا تھا اور وہ زور سے چیخ کر بولا۔ ''میں کہتا ہوں کہ تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ' جاؤ۔'' اس کے اس انداز میں اس کا پورا جاگیردارانہ کردار جھلک رہا تھا۔

میں خود کو سنبھال نہ سکا اور میں نے جھپٹ کر اس کا گریبان دبوچ لیا اور اس کو فرش پر گرا کر میں نے اس کو لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔

اس طرح اس کو مارتے مارتے میں بڑی طرح ہانپنے لگا۔ لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ فرش پر منہ اوندھائے ہوئے خاموش پڑا رہا۔ پھر ذرا دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر مجھ کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اس دفعہ میں نے پھر اس کے ٹھوکر ماری اور ایک بارگی وہ درد سے کراہنے لگا۔

پھر وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''تم نے مجھے اس لیے اتنا مارا ہے کہ میں نے تم سے روپے لیے تھے اور ان روپوں کو مجھ سے زبردستی چھین کر لوگوں نے 'دلیر یو' میں خوب شراب پی ہے اور مجھے بھی پلائی ہے اور اب وہ ان روپوں سے مہہ جبیں کے بالا خانے پر گانا سن رہے ہیں اور میں یہاں مار کھا رہا ہوں گالیاں سن رہا ہوں۔''

اور ایک بارگی مجھے اس کی باتوں پر یقین آ گیا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ اس کے ہر انداز میں کوئی نہ کوئی تھرل ضرور ہوتا ہے اور اسی تھرل کے بل بوتے پر وہ صاحبزادہ دلاور علی خاں بنا پھرتا ہے اور خود کو جاگیردار کا بیٹا کہلواتا ہے اور یہ بھی اس کا ایک تھرل ہی تھا کہ اس نے سو روپے کا نوٹ اپنے دوستوں کو مرعوب کرنے کے لیے نکالا ہوگا اور اس کے دوستوں نے اسے چھین کر اس لیے خرچ کر ڈالا کہ وہ ان سے روز شراب پیتا ہے' سگریٹ پیتا ہے' پکچر دیکھتا ہے۔ وہ ان سے کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ روپیہ وہ اپنے ناموس کا واسطہ دے کر لایا تھا۔ اپنی اس بہن کے لیے جس کی زندگی ڈاکٹر حنیف تباہ کر رہا ہے' لیکن یہ بات وہ کہہ بھی کیسے سکتا تھا۔ اس طرح اس کی زندگی پر جو طمع چڑھا ہے وہ اتر جاتا۔ میں اسی طرح خاموش بیٹھا ہوا سوچتا رہا۔

اور دلاور ایکا ایکی بچے کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ لیکن میں خاموش ہی بیٹھا رہا۔ مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ میں جانتا ہوں کہ دلاور اس لیے رو رہا ہے کہ اس کو نہیں معلوم کہ اس کی اس بربادی کا سبب کیا ہے۔ مگر میں تو رو بھی نہیں سکتا' اس لیے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں' لیکن پھر بھی میں زندگی سے بھاگتا پھر رہا ہوں۔ اس کتے کی طرح جو اپنی دم کو پکڑنے کی کوشش میں بے تحاشا چکر کاٹ رہا ہے اور یہ دم اس کے منہ میں کبھی نہیں آ سکتی۔

اندازِ فکر

☆ جو انسان اپنے خلوص کی قسمیں کھائے اس پر کبھی اعتبار نہ کرو۔

☆ کسی کو اتنا مت آزماؤ کہ وہ تنگ آ کر تمہاری دوستی چھوڑ دے اور تم اچھے دوست سے بھی محروم ہو جاؤ۔

☆ اچھے لوگ، اچھی باتیں، اچھی یادیں اور اچھے خیالات زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

☆ جو ہوش میں ہو وہ کبھی تکبر نہیں کرتا۔

☆ ناکامی کامیابی کی طرف پہلی سیڑھی ہے۔

☆ عقلمند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔

☆ پردہ کرو اس لیے کہ ہمارا خدا بھی پردے میں ہے۔

اردو ادب کا سنگھار......ادب کی خوشبو

مٹی کی مونا لیزا

اے حمید

یہ ہوٹل تو بالکل جنت ہے۔ ایک جوڑا سب سے الگ بیٹھا ہے۔ لڑکی دبلی پتلی سی ہے۔ چست کپڑوں نے اسے اور دبلا بنا دیا ہے۔ بال ماتھے پر ہیں۔ ناخنوں پر ریڈ انڈین گلابی رنگ کا پالش چمک رہا ہے۔ اس شیڈ کی لپ اسٹک کی ہلکی سی تہہ پتلے پتلے ہونٹوں پر ہے۔ چہرے پر نسوانی نزاکت کے ساتھ ساتھ جذبات کا دھیما دھیما ہیجان سا ہے۔

اردو کے ایک نام ور ادیب کے قلم سے ایک فکر انگیز تحریر

مونا لیزا کی مسکراہٹ میں کیا بھید ہے۔

اس کے ہونٹوں پہ یہ شفق کا سونا' سورج کا جشن طلوع ہے یا غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا گہرا ملال۔ ان نیم وا متبسم ہونٹوں کے درمیان یہ باریک سی کالی لکیر کیا ہے۔ یہ طلوع و غروب کے عین بیچ میں اندھیرے کی آبشار کہاں سے گر رہی ہے۔ ہرے ہرے طوطوں کی ایک ٹولی شور مچاتی امرود کے گھنے باغوں کے اوپر سے گزرتی ہے۔ ویران باغ کی جنگلی گھاس میں گلاب کا ایک زرد شگوفہ پھوٹتا ہے۔ آم کے درختوں میں بہنے والی نہر کی پلیا پر سے ایک ننگ دھڑنگ کالا لڑکا ریتلے ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگاتا ہے اور پکے ہوئے گہرے بسنتی آموں کا میٹھا رس مٹی پر گرنے لگتا ہے۔

سینما ہال کے بک اسٹال پر کھڑے میں اس میٹھے رس کی گرم خوشبو سونگھتا ہوں اور ایک آنکھ سے انگریزی رسالے کو دیکھتے ہوئے دوسری آنکھ سے ان عورتوں کو دیکھتا ہوں جنہیں میں نے فلم شروع ہونے سے پہلے سب سے اونچے درجے کی ٹکٹوں والی کھڑکی پر دیکھا تھا۔ اس سے پہلے انہیں سبز رنگ کی لمبی کار میں سے نکلتے دیکھا تھا اور اس سے پہلے بھی شاید انہیں کسی خواب کے ویرانے میں دیکھا تھا۔ ایک عورت' موٹی بھدی' جسم کا ہر خم گوشت میں ڈوبا ہوا' آنکھوں میں کاجل کی موٹی تہہ' ہونٹوں پر لپ اسٹک کا لیپ' کانوں میں سونے کی بالیاں' انگلیوں پر نیل پالش' کلائیوں میں سونے کے کنگن' گلے میں سونے کا ہار' سینے میں سونے کا دل' ڈھلی ہوئی جوانی' ڈھلا ہوا جسم' چال میں زیادہ خوشحالی' اور زیادہ خوش وقتی کی بیزاری' آنکھوں میں پرخوری کا خمار اور پیٹ کے ساتھ لگایا ہوا بھاری زرتار پرس دوسری لڑکی الٹرا ماڈرن' الٹرا اسمارٹ' سادگی بطور زیور اپنائے ہوئے' دبلی پتلی' سبز رنگ کی چست قمیض' کٹے ہوئے سنہری بال' کانوں میں چمکتے ہوئے سبز نگینے' کلائی میں سونے کی زنجیر والی گھڑی اور دوپٹے کی رسی گلے میں' گہرے شیڈ کی پنسل کے ابرو' آنکھوں میں پرکار سرکاری' گردن کھلے گریبان میں سے اوپر اٹھی ہوئی' دائیں جانب کو اس کا ہلکا سا مغرور خم' ڈورس ڈے کٹ کے بالو' بالوں میں یوری عطر کی مہک' دماغ گزری ہوئی

کل کے ملال سے نا آشنا' دل آنے والی کل کے وسوسوں سے بے نیاز' زندگی کی بھرپور خوشبوؤں اور مسرتوں سے لبریز جسم' کچھ رکا رکا سا متحرک سا' کچھ بڑبڑاتا ہوا۔ اس دودھ کی طرح جسے ابال آنے ہی والا ہو۔ سراینگلو پاکستانی' لباس' پنجابی زبان انگریزی اور دل نہ تیرانہ میرا۔

بک اسٹال والا انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کٹھ پتلی کی طرح ان کے آگے پیچھے چکر کھانے لگا۔ اس نے پنکھا تیز کر دیا۔ کیونکہ لڑکی بار بار اپنے ننھے ریشمی رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ موٹی عورت نے مسکرا کر پوچھا۔

''آپ نے 'لک' اور وہ' ٹریوسٹوری' نہیں بھجوائے۔''

اسٹال والا احمقوں کی طرح مسکرانے لگا۔

''وہ جب اب کے ہمارا مال راستے میں رک گیا ہے۔ بس اس ہفتے کے اندر اندر سرتلی بھجوا دوں گا۔''

موٹی عورت نے کہا۔

''پلیز' ضرور بھجوا دیں۔''

لڑکی نے فوٹوگرافی کا رسالہ اٹھا کر کہا۔

''پلیز اسے پیک کر کے گاڑی میں رکھوا دیں۔'' بک اسٹال والا بولا۔

''کیا آپ انٹرول میں ہی جا رہی ہیں۔''

موٹی عورت بولی۔

''یس..... پکچر بڑی بور ہے۔''

انہوں نے ساڑھے تین روپے کے ٹکٹ لیے تھے۔ پکچر پسند نہیں آئی۔ لمبی کار کا دروازہ کھول دیا اور کار دریا کی پرسکون لہر کی طرح سات روپوں کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ سات روپے جن کے اوپر سے لوہاری دروازے کے ایک کنبے کے پورے سات دن گزرتے ہیں۔

اور لوہاری دروازے کے باہر ایک گندہ نالہ بھی ہے۔ اگر آپ کو اس کنبے سے ملنا ہو تو اس گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلے جائیں۔ ایک گلی دائیں ہاتھ کو ملے گی۔ اس گلی میں سورج کبھی نہیں آیا لیکن بدبو بہت آتی ہے۔ یہ بدبو بہت حیرت انگیز ہے۔ اگر آپ یہاں رہ جائیں تو یہ غائب ہو جائے گی۔ یہاں صغرا بی بی رہتی ہے۔ ایک بوسیدہ مکان کی کوٹھڑی مل گئی ہے۔

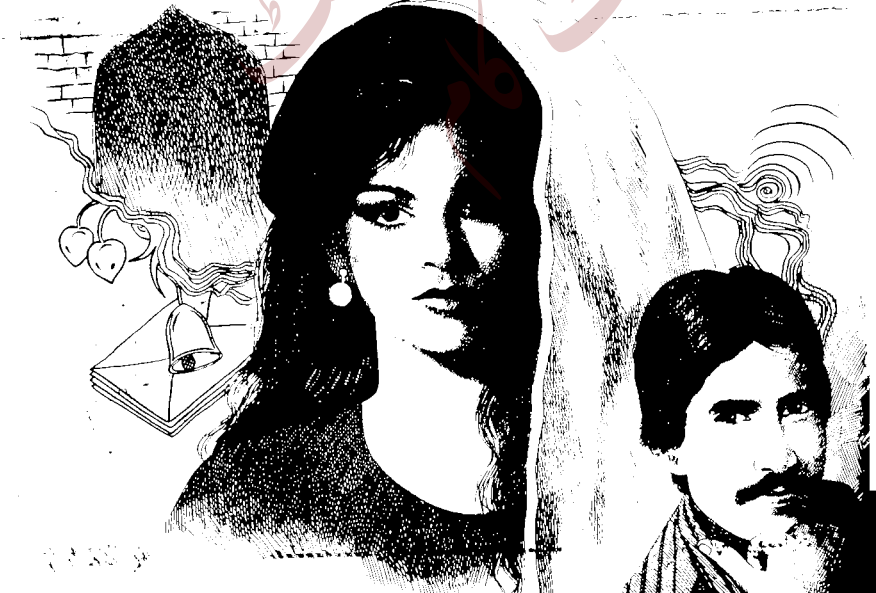

دروازے پر میلا چکٹ بوریا لٹک رہا ہے' پردہ کرنے کے لیے جس طرح نئے ماڈل کی شیور لیٹ کار میں سبز پردے لگے ہوتے ہیں۔ صحن کچا اور نم دار ہے۔ ایک چارپائی پڑی ہے۔ ایک طرف چولھا ہے۔ اپلوں کا ڈھیر ہے۔ دیوار کے ساتھ پکانے والی ہنڈیا مٹی کا لیپ پھیرنے والی ہنڈیا اور دست پناہ لگے پڑے ہیں۔ ایک سیڑھی چڑھ کر کوٹھڑی کا دروازہ ہے۔ کوٹھڑی کا کچا فرش سیلا ہے۔ در و دیوار سے نم دار اندھیرا رس رہا ہے۔ سامنے دو صندوق ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہیں صندوق کے اوپر صغرا بی بی نے پرانا کھیس ڈال رکھا ہے۔ کونے میں ایک ٹوکرا الٹا رکھا ہے جس کے اندر دو مرغیاں بند ہیں۔ دیوار میں دو سلاخیں ٹھونک کر اوپر لکڑی کا تختہ رکھا ہے۔ اس تختے پر صغرا بی بی نے اپنے ہاتھ سے اخبار کے کاغذ کاٹ کر سجائے ہیں اور تین گلاس اور چار تھالیاں ٹکا دی ہیں۔ اندر بھی ایک چارپائی بچھی ہے۔ اس چارپائی پر صغرا بی بی کے دو بچے سو رہے ہیں۔ دو بچے اسکول پڑھنے گئے ہیں۔ صغرا بی بی بڑی گھریلو عورت ہے بالکل آئیڈیل قسم کی مشرقی عورت۔ خاوند مہینے کی آخری تاریخوں میں پٹائی کرتا ہے تو رات کو اس کی مٹھیاں بھرتی ہے۔ وہ لات مارتا ہے تو صغرا بی بی اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے کہیں خاوند کے پاؤں کو چوٹ نہ آجائے۔ کتنی آئیڈیل عورت ہے یہ صغرا بی بی یقیناً ایسی ہی عورتوں کے سر کے اوپر دوزخ اور پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ خاوند ڈاکیہ ہے۔ ساٹھ روپے کی کثیر رقم ہر مہینے کی پہلی کو لاتا ہے۔ پانچ روپے کوٹھڑی کا کرایہ' پانچ روپے دونوں بچوں کے اسکول کی فیس' بیس روپے دودھ والے کے اور تیس روپے مہینے بھر کے راشن پانی کے باقی جو پیسے بچتے ہیں ان میں یہ لوگ بڑے مزے سے گزر بسر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی صغرا بی بی ساڑھے تین روپے والی کلاس میں بیٹھ کر فلم بھی دیکھ آتی ہے اور اگر پکچر بور ہو تو انٹرول میں ہی اٹھ کر لمبی کار میں بیٹھ کر اپنے گھر آجاتی ہے۔ بک اسٹال والا ہر مہینے انگریزی رسالہ 'لک' اور 'لائف' اسے گھر پر ہی پہنچا دیتا ہے۔ وہ کھانے کے بعد میٹھی چیز ضرور کھاتی ہے۔ دودھ کی کریم میں ملے ہوئے انناس کے قتلے صغرا بی بی اور اس کے ڈاکیے خاوند کو بہت پسند ہیں۔ کریم کو محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی کوٹھڑی کے اندر ایک ریفریجریٹر بھی لا کر رکھا ہوا ہے۔ صغرا بی بی کا خیال ہے کہ وہ اگلی تنخواہ پر کوٹھڑی کو ائرکنڈیشنڈ کروالے کیونکہ گرمی حبس اور گندے نالے کی بدبو کی وجہ سے اس کے سارے بچوں کے جسموں پر دانے نکل آتے ہیں اور وہ رات بھر انہیں اٹھ اٹھ کر پنکھا جھلتی رہتی ہے۔ صغرا بی بی نے ایک ریڈیو گرام کا آڈر بھی دے رکھا ہے۔

مائی گاڈ وٹ اے لولی ہوم از دس۔

ہوم! سویٹ ہوم۔

صغرا بی بی کا رنگ ہلدی کی طرح ہے اور ہلدی ٹی بی کے مرض میں بے حد مفید ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں ہیں۔ مہینے کے آخر میں جب اس کا خاوند اسے پیٹتا ہے تو ان میں سے اکثر ٹوٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ اب وہ اس ہر ماہ کے مستقل خرچ سے بچنے کے لیے سونے کے موٹے کنگن بنوا رہی ہے۔ کم از کم وہ ٹوٹ تو نہیں سکیں گے۔ صغرا بی بی کے چاروں بچوں کا رنگ بھی زرد ہے اور ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے انہیں کیلشیم کے ٹیکے لگاؤ۔ ہر روز صبح مکھن' پھل' انڈے' گوشت اور سبزیاں دو۔ شام کو اگر یخنی کا ایک ایک پیالہ مل جائے تو بہت اچھا ہے اور ہاں انہیں جس قدر ممکن ہو گندے کمروں' بدبو دار محلوں اور اندھیرے کوٹھڑیوں سے دور رکھو۔ صغرا بی بی کا خیال ہے کہ وہ اگلی سے اگلی تنخواہ پر گلبرگ یا کینال پارک میں کسی جگہ ان بچوں کے لیے زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا لے کر وہاں ایک چھوٹا سا

تین چار کمروں والا مکان بنوالے گی۔ دو چھوٹے بچے ابھی اسکول نہیں جاتے لیکن انشاء اللہ تعالیٰ وہ بھی ایک دن اسکول جانا شروع کردیں گے اور جو دو بچے مزید پیدا ہوں گے وہ بھی اسکول ضرور جائیں گے۔ اب کی دفعہ وہ انہیں کانونٹ میں داخل کروانے کا ارادہ رکھتی ہے جہاں وہ ہر صبح خدا کے بیٹے کی دعا پڑھیں۔ صغرابی بی کو ممی کہیں' فرفر انگریزی بولیں اور اردو فارسی پڑھ کر تیل بیچنے کی بجائے مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں اور اونچا مرتبہ اور لمبی کار اور چوڑے لان والی کوٹھی پائیں۔

کیلشیم کے ٹیکوں کا پورا سیٹ بیس روپے میں آتا ہے۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ اب کی وہ اپنے خاوند سے کہے گی کہ ڈاک خانے سے پہلی تاریخ کو گھر آتے ہوئے دو سیٹ لیتے آئے۔ اپنی کوٹھڑی والا ریفریجریٹر اس نے لال لال سیبوں' سرخ اناروں' موٹے انگوروں' مکھن کی ٹکیوں' تازہ انڈوں اور گوشت کے قتلوں سے بھر دیا ہے۔ بچے سارا مہینہ مزے سے کھائیں گے اور موج اڑائیں گے۔ لیکن خدا کی دی ہوئی ہر نعمت کے ہوتے ہوئے بھی صغرابی بی کے رخسار کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی ہیں۔ کمر میں مستقل درد رہتا ہے' چہرہ کمزور ہو کر پیلا پڑ گیا ہے' آنکھیں پھٹی پھٹی سی' ویران ویران سی رہتی ہیں۔ ان آنکھوں نے کیا دیکھ لیا ہے۔ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں۔ مگر اس کا جسم ڈھل گیا ہے اندر ہی اندر گھل گیا ہے۔ ہاتھ کی نسیں ابھر آئی ہیں۔ کنگھی کرتے ہوئے ڈھیروں بال جھڑتے ہیں۔ ہاتھ پیر ہر وقت ٹھنڈے رہتے ہیں جس طرح ریفریجریٹر میں کریم پھل اور گوشت ٹھنڈا رہتا ہے۔

صغرابی بی کی شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں اور خاوند نے اسے صرف چار بچے عطا کیے ہیں۔ خدا اسے سلامت رکھے ابھی اور بچے پیدا ہوں گے۔ ہر پہلی تاریخ کو اس کے خاوند کو صغرابی بی سے محبت ہو جاتی ہے۔ جب بیس روپے دودھ والا لے جاتا ہے تو محبت کے اس تاج کا ایک برج گرتا ہے۔ پانچ روپے کرایہ جاتا ہے تو دوسرا برج گرتا ہے۔ پھر بچوں کی فیس' کاپیاں' پنسلیں' کتابیں' راشن' دال' آٹا' نمک' مرچ' ہلدی اوپلے' کپڑا' پریشانی' تفکرات' وسوسے' ملال اور ناامیدیاں اور یہ تاج محل گنبد سمیت زمین کے ساتھ آن لگتا ہے اور خاوند اپنی محبت کی پٹاری میں سے ڈنڈا نکال کر اپنی پہلی تاریخ کی محبوبہ کی پٹائی شروع کر دیتا ہے۔

ونڈر فل ہوم۔

''ڈیڈی! آج آپ کامک نہیں لائے۔''

''او ممی! یہ جیلی گندی ہے اسے پھینک دیں۔''

''کم آن ڈارلنگ صغرابی بی! آج الحمراء میں کلچرل شو دیکھیں۔ ڈانس' میوزک' اووٹ اے تھرل ہنی! بس یہ وائیٹ ساڑھی خوب میچ کرے گی اور اس کے ساتھ بالوں میں سفید موتیے کے پھولوں کا گجرا ہائی بائی! یو آر سویٹ مائی ڈارلنگ صغرابی بی۔''

ندی کنارے یہ کاٹج کس قدر خوب صورت ہے۔ سرسبز لان' ترشی ہوئی گھاس' قطار میں لگے ہوئے پھولوں کے پودے ایک ملازم غسل خانے میں لکس صابن سے کتے کو نہلا رہا ہے۔ اس کے بعد تولیے سے اس کا جسم خشک کیا جائے گا۔ کنگھی پھیری جائے گی۔ گلے میں ایرپن باندھا جائے گا' اور اسے دو آدمیوں کا کھانا کھلایا جائے گا اور پھر فورڈ کار میں بیٹھ کر مال روڈ کی سیر کروائی جائے گی۔ آج اگر گوتم بدھ زندہ ہوتا تو وہ جانوروں کے ساتھ انسانوں کی اتنی شدید محبت کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتا۔ آج اسے انسانی دکھوں اور مصیبتوں کو دیکھ کر محل چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ بلکہ وہ محل ہی میں

اپنی بیوی بچے اور لونڈیوں کے ساتھ رہتا۔ کتوں کی ایک پوری فوج رکھتا' شام کو کلب میں جا کر دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا' سینما دیکھتا اور بچوں کو ساتھ لے کر انہیں کار میں سیر کرواتا۔ اس کے بچے رنگ دار قمیض اور جینز پہن کر گردن اکڑا کر' چھوٹی سی چھاتی پھلا کر' پتلی سی کمر مٹکا کر' کالج والے بس سٹاپوں' اعلیٰ ہوٹلوں اور ناچ گھروں کے چکر لگاتے۔ وہ رات کو ایک بجے سوتے اور صبح منہ اندھیرے گیارہ بجے اٹھتے اور دانت صاف کیے بغیر چائے پیتے اخبار میں فلموں کا پروگرام دیکھتے۔ گرمیاں کبھی مری اور کبھی سوئٹزرلینڈ میں بسر کرتے اور اپنے باپ کا نام روشن کرتے اور اسے کبھی بال منڈوا کر شاہی لبادہ پھینک کر ننگے پاؤں نروان حاصل کرنے کے لیے جنگل کا رخ نہ کرنے دیتے۔

اف! مائی گڈنس! لوہاری دروازے کی اس گندی گلی میں کس قدر حبس ہے۔ یہ لوگ کیسے چارپائی گندی نالیوں پر ڈال کر سو رہے ہیں۔ وٹ اے پٹی! مجھے ان لوگوں سے بڑی گہری ہمدردی ہے۔ میں ان کے تمام مسائل سے واقف ہوں۔ میں ہر ہفتے ان کی پھیکی اور بے رس زندگی پر ایک افسانہ لکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں ان لوگوں کی زندگی پر ایک پرمغز تحقیقی مقالہ لکھ کر سب مٹ کروا دوں۔ بڑا ونڈر فل سبجیکٹ ہے۔ ڈاکٹریٹ تو وہی پڑی ہے۔ جس طرح وہ کھری چارپائی پڑی ہے' جس پر تین پھنسیوں زدہ بچے اور ایک بچہ زدہ ماں سو رہی ہے۔ میں ناک پر رومال رکھے' پرنالوں سے اپنے اجلے کپڑے بچاتا' ان لوگوں کا گہرا مطالعہ کرتا بدبودار گلی میں سے باہر نکل آتا ہوں۔

لاہور میں قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ لیکن اس ہوٹل کی فضا کس قدر خنک ہے' ایئر کنڈیشننگ بھی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ آج ہوٹل میں بڑی رونق ہے۔ سایہ دار دھیمے قمقموں کی ملائم روشنی میں لوگوں کے چہرے کتنے خواب آور دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ کہیں خواب ہی تو نہیں۔ میرا خواب..... صغرابی بی کا خواب اس کے ڈاکیے خاوند کا خواب! ہری اوم! وہ یو ٹیل والی لڑکی کتنی پیاری ہے اور وہ بلیک ٹیشو کی چست قمیض والی دوشیزہ جس کے بالوں میں ریل کے گجرے ہیں' کانوں میں زہریلے رنگ کے نگینے ہیں اور جس کا چہرہ باقاعدہ اور قوت بخش غذاؤں کے اثر سے کھانا کھانے والے چاندی کے چمچ کی طرح چمک رہا ہے اور وہ مرغن چہرے والی موٹی عورت جس کی آدھی آستینوں والی قمیض بازوؤں پر گوشت کے اندر دھنس گئی ہے' اس عورت کا چہرہ سوم کے بت کی طرح ہے۔ بے حس اور ٹھنڈا اس کی گاڑی چودہ گز لمبی ہے اور غسل خانے کا فرش بارہ مربع گز ہے اس نے ریڈیو گرام جرمنی سے منگوایا ہے۔ قالین ایران سے' عطر فرانس سی' کیمرہ امریکہ سے خاوند پاکستان سے حاصل کیا ہے۔ جتنے پیسوں کا صغرابی بی کے ہفتے بھر کا راشن آتا ہے اتنے پیسے یہ بیرے کو ٹپ کر دیتی ہے۔ اس کے بنگلے میں چار کتے اور سات بیرے رہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ چاندی کے کافی سیٹ میں کافی پیتی ہے۔ چاندی کے برتنوں میں بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ایک تو انہیں زنگ نہیں لگتا دوسرے وہ نان پوائزنس ہوتے ہیں۔ ایک سیٹ اپنے گھریلو استعمال کے لیے لوہاری دروازے کی گلی والے ڈاکیے کو بھی خرید لینا چاہیے۔

یہ ہوٹل تو بالکل جنت ہے۔ ایک جوڑا سب سے الگ بیٹھا ہے۔ لڑکی دبلی پتلی سی ہے۔ چست کپڑوں نے اسے اور دبلا بنا دیا ہے۔ بال ماتھے پر ہیں۔ ناخنوں پر ریڈ انڈین گلابی رنگ کا پالش چمک رہا ہے۔ اس شیڈ کی لپ اسٹک کی ہلکی سی تہہ پتلے پتلے ہونٹوں پر ہے۔ چہرے پر نسوانی نزاکت کے ساتھ ساتھ جذبات کا دھیما دھیما ہیجان سا ہے۔ کان اپنے ساتھی کی باتوں پر ہیں اور

چین آنھیں موقع ملنے پر ایک ایک میز کا جائزہ لے رہی ہیں۔ لڑکی کی گردن کالی بو اور بارڈر کالر میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے ان کے سامنے کولڈ کافی کے گلاس ہیں۔

''روشی ڈارلنگ! میں پرومس کرتا ہوں کل سے صنوبی کے ساتھ کوئی کنسرن نہیں رکھوں گا۔''

''شٹ اپ یو بیگ لائر تم مجھ سے فلرٹ کر رہے ہو۔''

''فار گاڈ سیک ڈونٹ تھنک لائیک دیٹ آئی نو یو ڈارلنگ۔''

''لائی..... جھوٹ' بالکل جھوٹ۔''

''میں یو کے سے واپس آتے ہی تم سے شادی کرلوں گا۔''

''تم وہاں شادی کر کے آؤ گے۔''

''نو..... نیور تم خود دیکھ لوگی۔ پھر ہم دونوں یو کے چلے جائیں گے اور وہیں جا کر سیٹل ہو جائیں گے۔ میں اس گندے شہر سے بور ہو گیا ہوں..... بیرا۔''

''یس سر۔''

''ایک کریم پف۔''

''یس سر۔''

''ووڈ یو لائیک مور ڈارلنگ۔''

''نو تھینک یو۔''

میں بھی سوچ رہا ہوں کہ یو کے جا کے سیٹل ہو جاؤں۔ میں بھی اپنی گندی گلیوں سے بور ہو گیا ہوں۔ شاید میں صغرا بی بی اور اس کی گلی میں کھڑی چارپائی پر ماں کے ساتھ سونے والے پھنسی زدہ بچوں کو بھی لیتا جاؤں۔

''بیرا..... تھری سکویش مور۔''

اوپر گیلری کو جانے والی سیڑھیوں کے پاس والی میز پر تین میڈیکل سٹوڈنٹ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ گفتگو برجی باردو کے کولھوں' اگا تھا کرسٹی کے ناولوں اور پکاڈلی کی پراسرار گلیوں سے ہو کر میڈیکل پیشے میں آ کر ٹھہر گئی ہے۔

''یارا! میں تو فائنل سے نکل کر سیدھا لندن چلا جاؤں گا۔ یہاں کوئی فیوچر نہیں ہے۔''

''بالکل..... میں بھی وہیں جا کر پریکٹس کروں گا۔ برادر وہاں پیسہ بھی ہے اور مریض بھی بڑے پالشڈ ہوتے ہیں۔''

''یار میں تو یو کے جا کر کینسر ٹریٹمنٹ اسپیشلائیز کروں گا۔ یہاں کینسر اسپیشلسٹ کے بڑے چانسز ہیں۔ بیس روپے فیس رکھوں گا اور ایک سال بعد اپنا کریم کلر کی فقٹی ایٹ ماڈل شو ہو گی اور گلبرگ میں ایک کوٹھی۔''

''بھئی یار تم نے ہل مین بیچ کیوں دی۔''

''چھکڑا ہو گئی تھی۔ آئل بڑا کھانے لگی تھی۔''

''شی.....! مس قریشی آ رہی ہے۔''

''صدیقی! تم نے اس کی بڑی بہن مسز ارشاد کو پرسوں گرفن میں دیکھا تھا۔ ارے بھئی۔ تم ساتھ ہی تو تھے۔ کیا کلاس ون عورت ہے۔''

''نو ڈاؤٹ..... بالکل لولو بریجڈا۔''

سب لوگ پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ کوئی برجی باردوت کے پاس' کوئی لولو بریجیڈ! کے پاس' کسی کو بیوی لیے جا رہی ہے کوئی بیوی کو لے جا رہا ہے۔ کسی کو پیسہ کھینچ رہا ہے اور کسی کو پالشڈ قسم کے مریض۔ ہم لوگ کہاں جائیں گے۔ میرا بھائی ڈاکیہ کہاں جائے گا۔ صغرا بی بی کہاں جائے گی۔ اس کے بیمار بچوں کا علاج کون کرے گا۔ مثانے کی بیماری میں نیم حکیم سے گردے کی درد کی دوا کھا جانے والے دیہاتی کہاں جائیں گے۔ ان لوگوں کا علاج پاکستان میں کون کرے گا۔

کونے والی میز پر ایک پاکستانی آدمی امریکیوں کی طرح کندھے اچکا کر اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

''بڑی پرابلم بن گئی ہے۔''

''کیسی پرابلم۔''

''بے بی نے تین سال لوئر کے جی میں لگائے ہیں۔ کراچی سے یہاں تبدیل وہ کر آ گیا ہوں۔ یہاں کسی انگریزی اسکول میں داخلہ نہیں مل رہا۔ کارپوریشن کے اسکول والے بے بی کو پھر سے دوسری جماعت میں لے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں بچے کو اردو نہیں آتی بھئی وہ تو سوائے انگریزی کے اور کچھ بولتا ہی نہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔''

''اردو کو گولی مارو..... اب اسے فرانسیسی پڑھاؤ گھر پر۔''

ہوٹل میں بڑی رونق ہو گئی ہے۔ یہ بڑی رومانٹک جگہ ہے اور گیلری تو بڑی پرسکون جگہ ہے۔ میں انشاء اللہ پرسوں اس گیلری میں بیٹھ کر لوہاری دروازے کی بوسیدہ گلی والی بیمار صغرا بی بی پر ایک کہانی ضرور لکھوں گا۔ پارکر کا قلم' کروکسلے کا پیڈ' کولڈ کافی کا گلاس' تھری کاسل کا سگریٹ' کاؤنٹر کے گلدان میں لگی یوکلپٹس کی پتیوں اور ہوٹل میں بیٹھی خوب صورت نازک عورتوں کے کپڑوں کی یورپی مہک اور صغرا بی بی کا ونڈرفل سبجیکٹ! ایسا افسانہ تو بس اسی جگہ بیٹھ کر لکھا جا سکتا ہے۔

میں گیلری میں بیٹھا جھانک کر نیچے دیکھتا ہوں۔ تین ہم شکل' ہم لباس لڑکیاں گردنیں اٹھائے سینہ تانے' آنکھوں میں مغرور چمک لیے داخل ہو رہی ہیں۔ گردنیں موڑے بغیر آنکھیں اٹھائے بغیر ہر شخص کا جائزہ لینے لگا ہے' یہ دور شجاعت کے انگریزی ناولوں کی ہیروئنیں معلوم ہو رہی ہیں' جو کبھی پھولدار بیلوں سے نصف ڈھکی ہوئی بالکونیوں میں کھڑے ہو کر چاندنی راتوں میں اپنے محبوب کا انتظار کیا کرتی تھیں اور نوکیلی رنگین چونچوں والے پرندوں کے پروں میں انتہائی جذبات' محبت نامے باندھ کر انہیں چوم کر فضا میں چھوڑ دیا کرتی تھیں۔ جو اپنے محبوب کی بے وفائی کا حال سن کر زہر کھا لیا کرتی تھیں لیکن اس ایٹمی دور میں عشق' فورڈ کار کی چابی گھمانے سے اسٹارٹ ہوتا ہے اور محبت نامے بنک کی چیک بک پر لکھتے جاتے ہیں۔ اب یہ لڑکیاں محبوب کی بے وفائی کا سن کر زہر کھانے کی بجائے چکن سینڈوچز کھا کر رومال سے منہ پونچھتی ہیں اور دوسرے محبوب کی تلاش میں' دوسری کار کی تلاش میں' دوسرے کیریئر کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔ محبت کے جذبات آج کل اسپرو کی ایک ٹکیہ کھا کر غائب ہو جاتے ہیں اور عشق کا ہیجان فروٹ سالٹ کے ایک ہی چمچ سے بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ شادی زندگی کے کاؤنٹر پر مستقل سودا ہے اور محبت شادی کی گاڑی کے پیچھے لٹکتا ہوا جوتا ہے۔

فضا میں ایئر کنڈیشنگ پلانٹ کی سوندھی مہک کے ساتھ' باریک ریشمی کپڑوں کی لطیف سرسراہٹ' بجلی کی دھیمی روشنی میں روغنی چہروں کی جھلملاہٹ' چاندی کے سرپوش والی چٹنی مربہ کی شیشیوں کی چمک دمک اور مختلف قسم کے کھانوں کی خوشبوئیں گھل مل رہی ہیں۔ دھیمی دھیمی باتوں کی بھنبھناہٹ ہے۔ مسرت اندوزی کے منصوبے ہیں۔ خود اطمینانی کی ہلکی ہلکی ہنسی ہے' خود پرستی کی ادائیں ہیں۔ گہرے اسرار و رموز والی پراسرار نگاہیں ہیں اور خواب ہیں' صحت مند دھلے دھلائے چہرے ہیں۔ رگڑ رگڑ کر داڑھی مونڈھے گال ہیں۔ گردن' کندھے' اور نظروں کے غیر ملکی ٹکسال میں ڈھلے ڈھلائے اشارے ہیں۔ پھنسی پھنسائی گردنیں ہیں۔ گھٹی گھٹی باتیں ہیں۔ برمی باردوت کے ہونٹ ہیں' لولو بریجیڈا کے بازو ہیں' ڈورس ڈے کے بال ہیں' امریکی ٹائیاں ہیں۔ فرانسیسی عطر ہیں۔ انگریزی جوتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ' جرمنی' سیلون اور سنگاپور کی باتیں ہیں۔ کہیں چک

2

کی دوپہر میں ہل چلاتا کا شتکار نہیں۔ کہیں ملوالی

کی دمان کے پھٹے پر بیٹھ کر پیا جانے والا لی کا گلاس نہیں، کہیں دور افتادہ گاؤں میں غوثیہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے والا ڈاکٹر فرید نہیں، کہیں تاریک افریقہ کے جنگلوں میں انسانوں کی بھلائی کے لیے زندگی وقف کر دینے والا البرٹ شوئیٹزر نہیں۔ کہیں صغرا بی بی کے زرد گالوں اور کمر کی مستقل درد کے لیے کیلشیم نہیں۔ کہیں مشرقی پاکستان کے دریاؤں کے سیلاب سے برسرِ پیکار رہنے والے ماہی گیر نہیں۔ وہ اداس آنکھیں نہیں، وہ ناریل کے تیل لگے گہرے سیاہ بال نہیں، کہیں وہ پہلی کی پہلی بیوی سے محبت کرنے والا اور مہینے کے آخیر میں اس کی پٹائی کرنے والا مفلوک الحال ڈاکیہ نہیں، کوئی سیل زدہ دیوار نہیں جس پر صرف تانبے کے چار گلاس اور تین تھالیاں لگی ہوں۔ کھیتوں کی کڑکتی دھوپ میں اپنی ہیر کی راہ دیکھنے والا کوئی رانجھا نہیں۔ سب ڈرائینگ روم لورز ہیں، ٹھنڈی نشست گاہوں میں انناس کے قتلے اور کولڈ کافی کا گلاس سامنے رکھ کر محبت کی سرد آہیں بھرنے والے عاشق ہیں۔ یوکلپٹس کی پتیوں کو فریج عطر کانوں پر لگا کر کہانیاں لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ قوم، مذہب، ملت اور سیاست کے نام پر اپنی گاڑیوں میں پٹرول ڈلوانے والے اور اپنی کوٹھیوں میں نئے کمرے بنوانے والے دردمند قوم ہیں۔ عشرت انگیزی ہے، تصنع آمیزی ہے، زر پرستی ہے، خود پسندی ہے، جعلی سکے ہیں کہ ایک کے بعد بنتے چلے جا رہے ہیں۔

روشنی کے داغ ہیں کہ ایک کے بعد ایک بھرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں صغرا بی بی کے بچوں کی پھنسیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ انہیں اس کے ڈاکیے خاوند کے تاج محل کی بربادی کا کوئی علم نہیں۔ دھان زمین میں اگتا ہے یا درختوں پر لگتا ہے انہیں کوئی خبر نہیں۔ یہ اپنے ملک میں اجنبی ہیں۔ یہ اپنے گھر میں مسافر ہیں۔ یہ اپنوں میں بیگانے ہیں۔ چیک بک، پاسپورٹ، کار کی چابی، کوٹھی اور لائسنس ..... یہی ان کی منزل ہے، یہی ان کا محور ہے، یہی ان کا مرکز ہے، یہی ان کا مذہب ہے اور یہی ان کا پاکستان ہے۔ یہ وہ بازی کھانے ہیں جن کی تازگی ریفریجریٹر بھی برقرار نہ رکھ سکا۔ یہ دو سورجوں کے درمیان کا پردہ ہیں۔ یہ کھلے ہوئے متبسم لبوں کے درمیان کی تاریک لکیر ہیں یہ اس غار کے منہ پر تنا ہوا جالا ہیں جہاں چاند طلوع ہو رہا ہے۔

اب رات آسمان کی راکھ میں سے تاروں کے انگارے کریدنے لگی ہے۔ لوہاری دروازے کی تنگ و تاریک گلی میں حبس ہے بدبو ہے، گرمی ہے، مچھر ہیں، پسینہ ہے ٹوٹی پھوٹی کھری چارپائیوں کی بینگی ٹیڑھی قطاریں ہیں، نالیوں میں بجی ہوئی گندگی ہے۔ چارپائیوں سے نیچے لٹکتی ہوئی گلی کے فرش پر لگی ہوئی ٹانگیں ہیں۔ کمزور باسی چہرے ہیں پھٹے پھٹے ہونٹ ہیں۔ صغرا بی اپنے چاروں بچوں کو پنکھا جھل رہی ہے۔ کوٹھڑی میں حبس کے مارے دم گھٹا جا رہا ہے۔ گندے نالے والی کھڑکی میں گرم ایشیائی رات کے سبز چاند کی جگہ اوپلوں کا ڈھیر پڑا سلگ رہا ہے۔ اس کا ڈاکیہ خاوند پاس ہی پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ پنکھا جھلتے جھلتے اب صغرا بی بھی اونگھنے لگی ہے۔ اب پنکھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا ہے۔ اب کمرے میں اندھیرا ہے، خاموشی ہے۔ چار بچوں کے درمیان سوئی ہوئی مٹی کی مونا لیزا کے ہونٹ نیم وا ہیں۔ چہرہ کھنچ کر بھیانک ہو گیا ہے۔ آنکھوں کے حلقے گہرے ہو گئے ہیں اور رخساروں پر موت کی زردی چھا گئی ہے۔ اس پر کسی ایسے بوسیدہ مقبرے کا گمان ہو رہا ہے، جس کے گنبد میں دراڑیں پڑ گئی ہوں، جس کے تعویذ پر اگر کوئی بتی نہ سلگتی ہو اور جس کے صحن میں کوئی پھول نہ کھلتا ہو۔

اردو ادب کا سنگھار......ادب کی خوشبو

صاحباں نے الف لیلہ مرزا کو نشانی کے طور پر دی تھی۔ جب کبھی مرزا اس کی کہانی پڑھتا اسے محسوس ہوتا کہ وہ شہزادہ بن گیا ہے اور اس کا جی چاہتا کہ وہ بکی پر سوار ہو کر اپنی شہزادی...... صاحباں کو ڈھونڈنے نکل جائے۔ کئی بار اس کی خواہش ہوئی کہ وہ سیالوں کے گاؤں جائے لیکن اس کے اساتذہ اسے چھٹی نہ دیتے لیکن......!!

صاحباں مرزا

علی حیدر ملک

اردو کے ایک نامور ادیب کے قلم سے ایک فکر انگیز تحریر

سہانا موسم، صبح کا وقت، جھنگ سیالوں کے گاؤں میں مرد ابھی کھیتوں میں گئے ہوئے تھے، عورتیں گھریلو کام میں لگی ہوئی تھیں۔ گلیوں میں کوئی اکا دکا آدمی ہی گزرتا دکھائی دیتا تھا یا پھر کوئی بچہ بغل میں بستہ دبائے کسی گھر سے نکلتا ہوا نظر آ جاتا تھا۔

مٹکتی بل کھاتی ایک لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر آواز دیتی ہے۔ اندر سے اس کی عمر کا ایک لڑکا جلدی سے نکلتا ہے جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہا ہو۔ وہ لڑکی کے منع کرنے پر بھی اس سے بستہ لے کر اپنے بستے کے ساتھ اٹھا لیتا ہے پھر دونوں چل پڑتے ہیں۔

''مرزا! میرا بستہ تو مجھے کیوں نہیں اٹھانے دیتا۔'' لڑکی نے اس سے پوچھا۔

''تیرا بستہ اٹھا کر مجھے پڑھنے کے لیے مسجد جانے کو جی چاہتا ہے ویسے پڑھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا۔

''مگر تجھے پڑھنا چاہیے۔ مجھے تو پڑھنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ آج کل میں ایک بہت مزیدار کتاب پڑھ رہی ہوں۔'' لڑکی نے اپنے ساتھی کی کمر میں اپنی باہیں حمائل کر دیں۔

''اچھا صاحباں! تو کہتی ہے تو میں پڑھا کروں گا لیکن مولوی جو کچھ پڑھاتا ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' اس وقت وہ اپنی عمر کے ساتھ لگے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں دل ہی دل میں گن رہا تھا۔

مسجد کے دروازے پر پہنچتے ہی صاحباں نے مرزا سے اپنے بستہ لے لیا۔ انہوں نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ دو اور لڑکے صاحباں کے پاس آ کر اس کا بستہ اٹھانے لگے۔

''آج میری باری ہے نا صاحباں۔ یہ پرسوں تمہارے ساتھ بیٹھا تھا۔''

''میں کہاں پرسوں بیٹھا تھا۔ صاحبان! یہ جھوٹ بولتا ہے۔''

صاحباں نے دونوں سی اپنا بستہ چھڑایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں پھر میری وہ بات بھول گئے نا۔''

''کون سی۔'' دونوں لڑکے سوچنے لگے۔

''وہی کہ جھگڑا کرنے والے لڑکے کے

ساتھ میں نہیں بیٹھوں گی۔'' دونوں لڑکے شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

''اچھا کہنے! تیرے ساتھ میں کل بیٹھوں گی اور حمیدے! پرسوں تیرے ساتھ۔''

''اور آج۔'' دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''آج میں مرزے کے ساتھ بیٹھوں گی۔ یہ کبھی کہتا ہی نہیں مجھے ساتھ بیٹھنے کے لیے۔''

''کیوں صاحباں! یہ لوگ تیرا کہنا نہیں مانتے کیا۔'' مولوی نے اپنی چھڑی تھامتے ہوئے کہا۔

''نہیں جی! یہ میرا کہنا کبھی ٹالتے ہی نہیں۔ ہاں کبھی کبھی میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے جھگڑ بیٹھتے ہیں۔''

مولوی صاحب چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کھدر کا سفید کرتا پہن رکھا تھا اور نیلے رنگ کی تہمد باندھی ہوئی تھی۔ ان کی سفید پگڑے میں سے کالے بال پیچھے کی طرف لٹکتے دکھائی دیتے تھے جنہیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انگلیوں سے سنوارتے تھے۔ ان کی داڑھی گھنی مگر گھٹی تھی۔ جسم گھٹا ہوا اور پیشانی پر سجدوں کا نشان۔

''کھولو بستے اور کل جو پڑھا تھا' وہ باری باری سناؤ۔''

صاحباں نے بستہ کھولا۔ ایک موٹی سی کتاب نکال کر ایک طرف رکھ لی اور دوسری کتاب کھول کر پڑھنے ہی لگی تھی کہ مولوی صاحب کی نظر اس موٹی کتاب پر پڑ گئی۔

''دکھا تو صاحباں' یہ کون سی کتاب پڑھ رہی ہے۔''

''الف لیلہ بوا بی بی نے دی ہے مجھے۔ اتنی مزیدار ہے کہ اپنے بستے میں یہاں بھی لے آئی ہوں۔ کبھی کبھی آپ آتے نہیں' سوچا کہ ایسے وقت میں پڑھ لیا کروں گی۔''

مولوی صاحب نے کتاب کھول کر دیکھی پھر ایک جگہ سے پڑھا اور حیرانی سے پوچھا۔ ''تو اسے سمجھ لیتی ہے' صاحباں۔''

''کئی لفظ میری سمجھ میں نہیں آتے لیکن کہانی

پوری سمجھ لیتی ہوں۔''

کتاب صاحباں کو واپس دیتے ہوئے مولوی صاحب نے مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ صاحباں کی دائیں جانب سست سا بیٹھا ہوا تھا۔

''صاحباں! اپنے اس ساتھی کو بھی ذرا پڑھنے کا شوق دلا۔ دیکھ کس طرح کھویا کھویا سا بیٹھا ہے۔ مسجد کے باہر تو بڑا چست نظر آتا ہے۔''

''جی! آج میں نے سمجھایا تھا۔ کہتا تھا کہ اب پڑھا کروں گا۔''

''سن مرزے! اگر کل بھی تو اسی طرح پتھر بن کر بیٹھا نظر آیا تو تیرے باپ کو کہلا بھیجوں گا کہ تجھے دان آباد لے جاوے۔ یہاں فضول میں تو اپنا اور میرا وقت خراب کر رہا ہے۔''

''بس ایک ہفتہ اور دیکھ لیجئے مولوی صاحب۔'' صاحباں نے کہا۔ ''میں بوابی بی کے گھر جا کر اسے پڑھایا کروں گی۔'' صاحباں نے مرزا کی طرف دیکھا۔ مرزا نے بھی اس کی طرف نگاہیں اٹھائیں مگر مولوی کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر فوراً نگاہیں نیچی کر لیں۔

''اچھا! کچھ روز اور دیکھ لیتا ہوں۔''

مسجد سے چھٹی ہونے کے بعد صاحباں مرزا کے ساتھ بوابی بی کے گھر گئی اور اسے مولوی صاحب کی بات سنائی پڑھنے کے لیے پہلے بھی کئی بار بی بی نے مرزا سے کہا تھا مگر آج اس کی بات کا مرزا پر بہت گہرا اثر ہوا۔

''بیٹا! اگر مولوی نے چودھری کو لکھ دیا تو وہ کہیں گے کہ میں نے تیرا خیال نہیں رکھا اور پھر وہ یہاں آ کر تجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور میں ساری عمر ان کے سامنے شرمندہ رہوں گی۔''

بی بی نے کوئی اولاد نہ ہونے کے سبب بہن سے مرزا کو مانگ لیا تھا۔ پھر سیالوں کے مولوی کی بھی اچھی شہرت تھی۔ صاحباں مرزا کے ماموں کی بیٹی تھی۔

''بوا! اس طرح میری پڑھائی بھی خراب ہو جائے گی۔''

صاحباں نے کہا۔ ''ماں پہلے ہی کہتی ہے کہ اب تو سیانی ہو گئی ہے۔ اس لیے مسجد میں نہ جایا کر۔ میں کہتی ہوں مرزا میرے ساتھ ہوتا ہے جس سے ماں راضی ہو جاتی ہے۔ مرزا چلا گیا تو میری پڑھائی بھی ختم ہو جائے گی۔''

مرزا اس وقت گہرے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''بیٹا۔'' خالہ نے بڑے پیار سے کہا۔ ''تیری وجہ سے میرے سونے گھر میں رونق ہے ایک سال میری خاطر ہی دل لگا کر پڑھ لے تاکہ پہن کے سامنے مجھے جھوٹی نہ ہونا پڑے۔''

مرزا خالہ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا خالہ! صاحباں بھی کہتی تھی کہ وہ میری مدد کیا کرے گی۔ تم بھی تھوڑا بہت خیال رکھنا۔ میں پڑھوں گا۔ پوری دل جمعی سے پڑھوں گا۔''

مرزا نے اپنا وعدہ اس طرح پورا کیا کہ خالہ اور صاحباں ہی نہیں، مولوی صاحب بھی حیران رہ گئے۔ سال بھر کی کمی اس نے ایک مہینے میں پوری کر لی۔ مولوی صاحب نے کئی موقعوں پر مرزا کو شاباش دی اور پیٹھ تھپتھپائی۔

پہلے اسے دن بھر میں ایک ہی چیز اچھی لگتی تھی۔ صاحباں کے ساتھ مسجد جانا اور واپس آنا۔ اب اسے کچھ اور چیزیں بھی اچھی معلوم ہونے لگی تھیں۔ خالہ بھی خوش تھیں۔ مولوی صاحب بھی خوش تھے اور صاحباں بھی۔ وہ ہر روز اس کے گھر آتی۔ مرزا اس کا دیا ہوا سبق یاد کرتا۔ سبق یاد کرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ صاحباں اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔

اب وہ بارھواں سال ختم کر چکا تھا۔

صاحباں کی پازیب بجتی تو مرزا کی آنکھیں دروازے کی سمت اٹھتیں۔ صاحباں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی تو مرزا کے ہونٹوں پر یاد کیا ہوا سبق جیسے چھلک اٹھتا۔ اب وہ کچھ اور خواب

دیکھنے لگا تھا۔ صاحباں اسے پڑھا رہی ہے۔ کتابیں ختم ہوتی جاتی ہیں۔ آخری کتاب رکھ کر صاحباں اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکتی ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے۔ ''اور میں تجھے کیا پڑھاؤں۔ تو نے تو مجھے پوری طرح پڑھ لیا ہے۔'' اور پھر اس کی آنکھیں جھک جاتیں مگر کچھ ہی دیر میں وہ پھر آنکھیں بند کر لیتا کیونکہ وہ خواب اسے بہت پسند تھا۔

''کیوں مرزے! پڑھ پڑھ کر ابھی تک تیرا دل نہیں بھرا ہے۔ تو پھر آ گیا۔''

صاحباں اسے ہنستی ہوئی دکھائی دیتی اور وہ کہتا۔ ''میں پڑھنے کے لیے نہیں آیا۔ دل چاہتا ہے کہ تیرے ساتھ گھوڑی پر چڑھ کر اڑوں۔ گھوڑی لے کر آیا ہوں صاحباں! بیٹھ جا میرے پیچھے۔'' اور وہ آسمان میں اڑنے لگتا۔

☆☆

یہ سال مرزا اور صاحباں کی عمر کا بہت میٹھا سال تھا۔ دن کے وقت کی آرزوئیں رات کے وقت تارے بن کر خوابوں میں ٹمٹماتی تھیں۔ زمین اور آسمان رنگ میں ڈوب گئے تھے۔

مرزا کے باپ کو خبر ملی کہ اس کا لڑکا پڑھنے لکھنے میں کافی دلچسپی لے رہا ہے تو ایک دن وہ اسے دیکھنے آ گیا۔

''خوب صورت جوان نکلے گا میرا مرزا۔'' اس نے بیٹے کو دیکھ کر سوچا۔ ''اسے جوانوں کے ہنر سکھاؤں۔ تیر اندازی اور گھوڑ سواری میں اس کا ثانی کوئی نہ ہو۔ اکیلا ہی دس دس آدمیوں کا مقابلہ کر سکے۔''

اس نے اس سلسلے میں بی بی سے بات کی۔ بی بی نے کم سے کم ایک سال اور پڑھائی جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

''نہیں بی بی! اسے ہمیں کون سا عالم فاضل بنانا ہے۔ بہت پڑھ لیا ہے۔ جن کی زمینیں ہوتی ہیں، ان کے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ اس پر مجھے ایسی چڑھی ہوئی جوانی دکھائی دے رہی ہے کہ ایک دن اس کی دھوم مچ جائے گی۔ اسے میں تیغ زنی اور تیر اندازی سکھاؤں گا۔ شہسوار بناؤں گا۔''

مرزا کے دان آباد چلے جانے کی بات پکی ہو گئی لیکن صاحباں نے مرزا کو دو دن اپنے گھر ٹھہرانے پر اس کے باپ کو آمادہ کر لیا۔ دو دن میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے۔

''صاحباں! اپنی کتاب میں سے وہ کہانیاں سنا جو تجھے اچھی لگتی ہیں۔'' مرزا نے کہا۔

صاحباں کتاب لے آئی۔ اس نے اسی میں سے ایک کہانی سنائی۔ محبت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی کسی شہزادی کی کہانی۔

''صاحباں! تو تو اسی طرح پڑھتی ہے جیسے تیری اپنی کہانی ہو۔''

''مرزا کہیں کا۔'' صاحباں نے اس کی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر ایسے انداز میں کہا جیسے وہ یکا یک چھوٹی سی لڑکی سے بڑی ہو کر جوان ہو گئی ہو۔

''صاحباں اور سنا۔'' مرزا نے کہا۔

ایک دو نہیں پوری چار کہانیاں صاحباں نے اسے سنائیں۔ کہانی سناتے سناتے اچانک اس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے کتاب بند کر دی اور مرزا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''مرزا! تو کبھی صاحباں کو یاد بھی کرے گا۔''

بند کمرے کی کھڑکی کھل جانے سے روشنی کا سیلاب جس طرح آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے کچھ یہی کیفیت مرزا کی بھی ہوئی۔ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کوئی جواب نہ نکلا۔

''تو مجھے بالکل ہی بھول جائے گا تو۔''

''تیری کون سی بات میں بھول جاؤں گا صاحباں۔'' آخر مرزا کے لب کھل ہی گئے۔ صاحباں نے اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ جو

لرز رہے تھے پھر اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو بھیگی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

''ذرا بتا تو سہی میری کون سی چیز تجھے سب سے زیادہ یاد رہے گی۔'' صاحباں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''اپنی کمر کے گرد تیرا ہاتھ..... نہیں نہیں تیرا پڑھانا..... نہیں یہ بھی نہیں۔ تیرا مجھ سے یہ پوچھنا کہ رات میں نے کون سا خواب دیکھا تھا..... نہیں صاحباں نہیں..... سچ بتاؤں۔ میں یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ تیری کون کون سی چیز یاد کروں گا۔ میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تجھے کبھی بھولوں گا نہیں۔''

دوسرے دن صبح سویرے نخیل کھرل اپنی گھوڑی پر سوار ہوا۔ مرزا اپنی خالہ سے گلے ملا پھر اس نے نشانی کے طور پر اپنا چاقو جیب سے نکال کر صاحباں کو دیا۔ اس کے بعد وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے باپ کی طرف گیا اور گھوڑی پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ نخیل نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ مرزا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور تب تک دیکھتا رہا جب تک اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں سے نہیں ٹکرائی۔

''ذرا ٹھیک سے بیٹھ مرزے۔''

☆☆

دان آباد پہنچتے ہی نخیل نے مرزا کو استادوں کے حوالے کر دیا۔ استادوں کو مختلف قسم کا لالچ دے کر اس نے کہا۔ ''اس سارے علاقے میں مرزے جیسا نہ کوئی تیر انداز ہے اور نہ گھوڑ سوار۔ تب ہی میں تم لوگوں کی استادی تسلیم کروں گا۔ سمجھے۔''

''انشاء اللہ۔'' استادوں نے مرزا کا جسم اور اس کی صحت کو نظروں سے پرکھتے ہوئے کہا۔

مرزا کے لیے ایک خاص گھوڑی کا انتخاب کیا گیا جس کا نام تو عربی شہزادی تھا لیکن چونکہ مرزا کی چھوٹی بہن اپنی توتلی زبان میں اسے بکی کہا کرتی تھی۔ اس لیے اس کا نام بکی ہی پڑ گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ مرزا کی بکی کہلانے لگی صرف نخیل ہی اسے عربی شہزادی کہتا تھا۔

کئی سال گزر گئے۔ مرزا اور اس کی بکی کی آس پاس کے علاقے میں شہرت ہونے لگی۔ چرخا کاتنے والی جوان لڑکیاں اس کے گیت گانے لگیں۔

صاحباں نے الف لیلہ مرزا کو نشانی کے طور پر دی تھی۔ جب بھی مرزا اس کی کہانی پڑھتا اسے محسوس ہوتا کہ وہ شہزادہ بن گیا ہے اور اس کا جی چاہتا کہ وہ بکی پر سوار ہو کر اپنی شہزادی..... صاحباں کو ڈھونڈنے نکل جائے۔ کئی بار اس کی خواہش ہوئی کہ وہ سیالوں کے گاؤں جائے لیکن اس کے اساتذہ اسے چھٹی نہ دیتے لیکن کسی نہ کسی ذریعے سے سیالوں کے گاؤں کی خبریں مرزا تک پہنچتی رہتی تھیں۔ صاحباں اب جوان ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تارے چمکنے لگے تھے اور ہونٹوں میں رس بھر گیا تھا۔ اس کی سیاہ گھنیری زلفوں پر بادلوں کا گمان ہوتا تھا..... صاحباں کو جو بھی ایک نظر دیکھتا اس کے جذبات میں ہل چل سی مچ جاتی۔

صاحباں' بوا بی بی کے گھر ہر روز جاتی۔ بی بی کئی بار دان آباد سے ہو آئی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی۔ ''کیسا خوب صورت جوان ہو گیا ہے۔ مرزے۔'' صاحباں کا دل یہ سن کر جیسے تشے میں ڈولنے لگتا۔

''بوا تم نے کہا نہیں اسے کہ کبھی کچھ دیر ہی کے لیے سہی ادھر کا چکر لگا جائے۔''

''وہ تو آنے کے لیے تر ستا رہتا ہے مگر اس کے باپ کے سر پر خبط سوار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مرزا جیسا نہ کوئی شہسوار ہو نہ کوئی تیر انداز..... سو مرزے کو اپنے استادوں سے چھٹی نہیں ملتی۔''

''کیا اسے یہ بات یاد ہے کہ کبھی میں اس کی استاد تھی۔''

''یاد کی بات کیا پوچھتی ہو۔ وہ تمہاری کتاب اٹھا کر میرے پاس لے آیا اور کہنے لگا۔ جب بھی وقت ملتا ہے اس میں سے کوئی کہانی پڑھنے لگتا ہوں۔ صاحباں کو یہ ضرور بتا دینا۔''

پھر کافی رات گئے تک صاحباں سو نہ پاتی۔ وہ سوچتی رہتی کہ مرزا اب کیسا لگتا ہوگا۔ اگر کبھی وہ یہاں آجائے تو کیا وہ پہلے کی طرح اس کی کمر میں بانہیں ڈال سکے گی۔.....اور.....اور اگر مرزا اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دے تو۔ اس کے جسم میں گدگدی سی ہونے لگتی اور بے اختیار اس کے ہونٹوں سے نکلتا۔

''مرزے! ایک بار صرف ایک بار آجاؤ۔''

پھر اسے نیند آجاتی۔ مرزا آتا اور اسے اپنی بکی پر بٹھا کر آسمانوں میں اڑان بھرنے لگتا۔

☆☆

صاحباں کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ ایک بار بی بی نے اپنی ماں سے کہا کہ مرزے جیسا لڑکا ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ ماں کے دل کو بھی یہ بات لگی تھی اور اس نے صاحباں کے دادا کھیوا خان کی رائے معلوم کی تھی۔ کھیوا خان بہت گہرا آدمی تھا۔

''بھولی ملکی! ایک ہی تو ہماری بیٹی ہے اس کے ذریعے کوئی اور بڑا گھر کیوں نہ حاصل کریں۔ نخیل کا گھر تو ہمارا اپنا ہے۔''

''تو پھر اسکا رشتہ کہاں کریں گے۔''

''چندڑ کا بیٹا طاہر جوان ہے۔ اگر ان کے ہاں رشتہ ہو جائے تو سمجھو سارا علاقہ اپنا ہو گیا۔''

صاحباں کو جب اس بات کا علم ہوتو وہ بہت افسردہ ہوئی اور بی بی کے گھر جا کر خوب روئی۔ بی بی نے اسے دلاسا دیا۔

''بوا! تم مرزے کو جا کر کہو کہ وہ اپنے ماں باپ سے کہہ کر کچھ کرے۔'' صاحباں نے کہا۔

''کسی طرح ان کی طرف سے زور دلوائے یہاں تم اور پھوپھا اصرار کریں گے تو دادا مان جائیں گے۔''

بی بی دان آباد گئی۔ اس نے اپنے بہن اور بہنوئی سے مشورہ کیا لیکن بہن اپنے باپ کو اچھی طرح جانتی تھی اور اس کا بہنوئی بہت مغرور آدمی تھا۔

''کھیوا خان چندڑوں کا مرزا بھی دیکھ لے۔'' نخیل نے کہا۔

''میں خود رشتے کے لیے وہاں جانے کو تیار نہیں ہوں۔''

آخر بی بی نے مرزا کو سمجھایا کہ وہ خود وہاں جا کر یہ کہے کہ صاحباں پر سب سے پہلے میرا حق ہے۔ ''اس میں ذرا سی بھی دیر نہ کرنا۔ حجام چندڑوں کے گاؤں جانے والا ہے اور صاحباں کھانا پینا سب کچھ چھوڑ بیٹھی ہے۔''

مرزا اپنی خالہ کے پیچھے پیچھے سیالوں کے گاؤں پہنچ گیا۔ وہاں وہ سب سے پہلے مولوی صاحب کے پاس گیا۔ ''میں ہوں آپ کا نالائق شاگرد مرزا..... پہچانا آپ نے۔''

''اللہ اللہ سبحان اللہ۔'' مولوی صاحب نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

مرزا جب صاحباں کے سامنے آیا تو صاحباں بت بنی کھڑی رہی۔ مرزا نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے ہاتھ صاحباں کے شانے پر رکھ دے لیکن ''..... صاحباں'' اس کے منہ سے صرف صاحباں کا نام ہی ادا ہو سکا۔

''مرزا'' میں صاحباں کے ہونٹوں سے بھی ایک ہی لفظ نکلا۔

پھر موقع غنیمت جان کر مرزا نے اپنے نانا سے کہا۔

''نانا جی! نواسا تو آپ کا ہوں' آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیجیے۔ صاحباں کے ساتھ میں بچپن سے کھیلا ہوں۔ اس کے ساتھ پڑھا ہے۔ اگر وہ کسی

اور گھر چلی گئی تو میں یہ سمجھوں گا کہ میرا حق مارا گیا۔''

کھیوا خان اس کی صاف گوئی اور بے باکی سے بہت خوش ہوا مگر وہ چندڑوں کے ہاں حجام بھیج چکا تھا۔

''بیٹا مرزے! تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ صاحباں کی کوئی اور بہن ہوتی تو میں تمہاری بات ضرور مان لیتا۔ میں چاہتا ہوں کہ چندڑوں کے ساتھ رشتہ جوڑ کر بے فکر ہو جاؤں۔ پھر ہمیں کسی کا خطرہ نہیں رہے گا۔ تم لوگ تو اپنے ہی ہو۔''

مرزا نے کہا کہ اب بھی آپ کو کسی کا خطرہ نہیں ہے۔ کسی میں ہمت نہیں کہ آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ نانا اس کی یہ بات سن کر خوش ہوا لیکن وہ یہ بات بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ چندڑوں کے شیروں جیسے سات جوان بیٹے ہیں۔

''تمہارا دل توڑنے کا مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور ہوں کیونکہ حجام کو بھیج چکا ہوں۔'' نانا نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

مرزا اٹھ کر اپنی خالہ کے یہاں گیا اور اس سے کہا کہ وہ اس کی ملاقات صاحباں سے کرادے۔ خالہ کے گھر میں مرزا کئی سال تک صاحباں کا انتظار کرتا رہا تھا جب وہ مسجد میں پڑھنے کے لیے اسے اپنے ساتھ لے کر جایا کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دروازے کی اوٹ میں چھپ جایا کرتا تھا تاکہ صاحباں اسے آواز دے کر بلائے۔ کئی سال کے بعد آج پھر وہ اسی گھر میں صاحباں کا انتظار کر رہا تھا۔

آخر صاحباں آ گئی۔ آج اس کے پاؤں میں پازیب نہیں تھی مگر اس کی چال میں مرزا کو گھنگھرو بجتے سنائی دیے۔ اسے دیکھتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''مرزے! اب تم کیا کرو گے۔'' صاحباں نے پوچھا۔

''اب کوئی مشکل نہیں رہی۔'' مرزا نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''وہ کیسے۔''

''تم میری ہو۔ اب کوئی تمہیں مجھ سے الگ نہیں کر سکتا۔''

''مگر سنتی ہوں کہ چندڑوں کے گھر میں بیٹوں کی فوج ہے۔''

''میرے بازوؤں میں پوری فوج کو زیر کرنے کی طاقت ہے۔'' مرزا نے صاحباں کے شانے پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

''لیکن مرزے! کہیں تمہیں میرے بھائیوں سے اس کے لیے لڑنا نہ پڑے۔''

''نہیں صاحباں! وہ میرے بھی بھائی ہیں۔ یقین جانو میرے تیروں اور میری بکی کے ہوتے ہوئے مجھے کسی سے لڑنا نہیں پڑے گا۔ کوئی حوصلہ ہی نہیں کر سکتا مجھ سے لڑنے کا۔ ہاں! اگر ماں باپ کی بدنامی کا تمہیں خوف ہے تو مجھے بتا دو۔'' مرزا نے اس کے شانے سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔

''بدنامی تو وہ خود مول لے رہے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے انہیں کوئی دکھ نہ پہنچے۔''

''تم بے فکر رہو۔ میں خبر ملتے ہی پہنچ جاؤں گا۔''

بی بی ان کے پاس آئی تو صاحباں اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی۔

''صاحباں بیٹی میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' بی بی نے کہا۔

''خالہ! اب ٹھیک وقت پر خبر پہنچنا تمہارا کام ہوگا۔ صاحباں جس کی ہے اسی کی ہو جائے گی۔''

مرزا کے پر اعتماد لہجے نے دونوں عورتوں کے دل میں خوشی کے کنول کھلا دیے۔

اس کے بعد مرزا بکی پر سوار ہو کر چلا گیا۔

صاحباں کی زندگی کا رخ اب تبدیل ہو گیا تھا۔ رات کے وقت ہیر اس کے خوابوں میں ڈر

آتی۔ سیالوں نے ایک دوشیزہ کی زندگی پہلے بھی تباہ کی تھی۔ اس کی قبر گاؤں کے باہر بنی ہوئی تھی۔ صرف سیال اس قبر پر نہیں جاتے تھے۔ بقیہ سب لوگ ہیر کی قبر پر مرادیں مانگنے جاتے تھے۔

ابھی صبح کا دھندلکا چھٹا نہیں تھا کہ صاحباں کی ہیر کی قبر پر جا کر اسے خراج عقیدت پیش کیا اور عشق کی ملکہ کے سامنے خدا سے دعا کی کہ وہ مرزا کی حفاظت کرے۔ دن بھر اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے ہیر نے اسے اپنی گود میں لے رکھا ہے لیکن جب اس نے یہ سنا کہ حجام اس کا رشتہ چنڈوں کے ہاں کر آیا ہے تو اس کا دل جیسے بجھنے لگا۔ حجام نے بتایا کہ چنڈ اس رشتے سے بہت خوش تھے اور کہتے تھے کہ ایسے سج دھج کر آئیں گے کہ دنیا دیکھے گی۔ اس کے اپنے یہاں بھی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے صاحباں کا دل بھی بجھتا گیا۔ پندرہ دن..... چودہ دن..... ایک ہفتہ اور اب کل بارات آنے والی تھی۔

مرزا کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی حالانکہ بی بی خود جا کر اسے سب کچھ بتا آئی تھی۔ مرزا نے کہا تھا۔ ''صاحباں ذرا بھی فکر نہ کرے۔''

بالآخر برات آ پہنچی۔ سارا گاؤں راگ رنگ میں ڈوب گیا۔ صاحباں اور بی بی کا دل مرزا کے انتظار میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ شام کے وقت کوئی چادر میں اپنا چہرہ اور سر لپیٹے ہوئے آیا اور اصطبل میں اپنی گھوڑی باندھ دی۔ بی بی نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ مرزا ہی تھا۔ بی بی مرزا کو اپنے گھر میں لے جا کر پوچھنے لگی کہ اب تم کیا چاہتے ہو۔

''بس خالہ! صاحباں سے کہو کہ وہ تیار رہے۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ میں اور بکی اس کے دروازے پر ہوں گے۔''

صاحباں کے لیے ایک ایک پل ایک ایک صدی سے زیادہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔

''اگر مرزا نہ آیا تو میں کل موت کی ڈولی پر سوار ہو کر دور دراز کے سفر پر روانہ ہو جاؤں گی۔''

''اگر مرزا نہ آیا تو میں کسی کے لیے زندہ رہوں گی آخر۔'' شہنائیوں کی آواز گونجی تو صاحباں نے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

چاندنی رات تھی۔ لوگ مجرا سن کر اپنے اپنے گھروں میں جا کر سو گئے۔ دن بھر کے شور شرابے کے بعد گاؤں میں گہری خاموشی چھا گئی۔ صاحباں اس بھید بھری خاموشی میں کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ گھوڑی کے قدموں کی آواز سن کر وہ اٹھی اور چاروں طرف دیکھا۔ سب سوئے ہوئے تھے وہ ہولے ہولے قدموں سے آنگن پار کر کے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گھوڑی اس کے پاس آ کر رکی۔ سوار نے رکاب سے پاؤں نکالا۔ صاحباں نے اس میں اپنا پاؤں رکھا پھر سوار کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر وہ اچھلی اور اچھل کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ گاؤں سے باہر نکل کر بکی جیسے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ کچھ دور جا کر مرزا کو وہ وعدہ یاد آیا جو اس نے صاحباں سے کیا تھا کہ اس کے ہاتھ سے اس کے بھائیوں کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن اگر انہوں نے تعاقب کیا تو مقابلہ کرنا ضروری ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر مرزا نے دان آباد کا راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے راستے پر ہو لیا۔

''صاحباں! دن چڑھنے پر دان آباد دور ہو جائے گا اور ہم ایک بہت خوب صورت باغ میں پہنچ جائیں گے۔''

''وہاں کچھ دیر رک کر میں تمہاری آنکھوں میں اپنی نئی تقدیر پڑھنا چاہتا ہوں۔''

''مگر اس کا رکھوالا ڈوگر فیروز بہت بڑا آدمی ہے۔'' صاحباں نے فکر مند ہو کر کہا۔

''ڈوگر کی میں کیا پروا کرتا ہوں۔''

جب وہ اس باغ کے قریب پہنچے تو انہیں سامنے ڈوگر فیروز نظر آیا۔ فیروز انہیں دیکھتے ہی

اول فول بکنے لگا۔ مرزا نے کہا۔ ''چپ رہو ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' مگر ڈوگر چپ نہیں ہوا۔ مرزا کو غصہ آ گیا اور اس نے اپنی تلوار کھینچ لی۔ اگر صاحباں نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا تو ڈوگر کا سر قلم ہو گیا ہوتا۔

''نہیں مرزے! ہمیں اپنے پہلے ملاپ کو خون سے نہیں رنگنا چاہیے۔'' صاحباں نے کہا۔

''صاحباں! اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ابھی تمہارے گھر جا کر لوگوں کو ہمارا پتہ دے دے گا اور تمہارے بھائی دان آباد جانے کی بجائے ادھر آ جائیں گے۔ پھر سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔''

''اس کے وہاں پہنچنے سے قبل ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوں گے۔''

''چل دفع ہو جا یہاں سے۔'' مرزا نے ڈوگر سے کہا اور بکی کو ایڑ لگائی۔ کچھ ہی دیر میں وہ باغ کے اندر پہنچ گئے۔ مرزا نے درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس بکی کو کھڑا کیا اور اس پر سے اتر کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ صاحباں نے مرزا کے کندھے پر سے کمان اتار کر پکڑ لی اور مرزا نے اس میں ایک تیر لگا دیا۔

وہ باغ کے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ درخت پر کوئی چڑیا چہچہا رہی تھی۔

''صاحباں! وہ ہمیں مبارک باد دے رہی ہے۔''

مگر صاحباں فکرمند تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈوگر اس کے گھر جا کر ساری بات بتا دے گا اور اس کے بھائی اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔

''مرزے! یہاں کیوں رک گئے ہو۔ چلو یہاں سے چلیں۔''

''نہیں صاحباں! پتہ نہیں وہاں کیا حالت ہو۔ گھر جانے سے پہلے میں تمہاری زلفوں کی رات میں اپنی امید اور آرزو کے چمکتے ہوئے ستارے تو دیکھ لوں۔ کچھ دیر کے لیے تم ساری دنیا کو بھول جاؤ اور میرے دل کے درد کو دور کر دو۔''

صاحباں اس دنیا سے جیسے کسی اور دنیا میں پہنچ گئی۔ اس نے سرشاری کے عالم میں مرزا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

مرزا گزشتہ دو راتوں سے سو نہیں سکا تھا۔ اس کا عضو عضو ایک تناؤ میں مبتلا تھا لیکن صاحباں کی قربت نے اسے ہر فکر اور ہر غم سے آزاد کر دیا تھا۔

''صاحباں! میں اس ایک لمحے کے بدلے اپنی پوری زندگی دینے کو تیار ہوں۔ آگے کیا ہو گا مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم میرے قریب آ جاؤ' اور قریب۔''

مرزا اپنے دونوں بازو صاحباں کے گرد پھیلا دیئے' کبھی صاحباں اس پر اپنا چہرہ جھکاتی کبھی مرزا اسے پکڑ کر جھکا لیتا۔

پیار کی پھوار تھکے ہوئے جسموں کو راحت پہنچانے لگی۔ آنکھیں مند گئیں۔ صاحباں نے دیکھا کہ ترکش اور کمان اسے چبھ رہے ہیں۔ سو انہیں الگ کر کے اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ مرزا سویا ہوا تھا اور صاحباں ٹکٹکی باندھ کر اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک بار مرزا کے ہونٹ مسکرائے تو صاحباں نے انہیں جھک کر آہستہ سے چوم لیا۔

''اگر ڈوگر کے بتانے پر وہ لوگ ہمارے تعاقب میں یہاں پہنچ جائیں تو۔'' اسے پھر خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے ترکش کے تیر گنے۔ بارہ سے زیادہ تھے۔ پھر اس نے کمان پر ہاتھ پھیرا۔ بہت ظالم کمان تھی وہ۔ صاحباں کو اپنے بھائیوں کا خیال آیا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی سوچا کہ مرزا کا نشانہ کبھی چوکتا نہیں۔ اس کا دل یہ سوچ کر کانپ اٹھا۔

''لیکن مرزا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔'' اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''پھر بھی اگر وہ ادھر آ گئے تو مرزا اپنا وعدہ کیسے

پورا کرے گا۔ وہ بہت سارے ہوں گے مگر مرزا تو اپنے تیروں سے فوج کو بھی روک سکتا ہے۔''

صاحباں نے مرزے کو جگایا۔ ''اٹھو اب چلیں۔''

مرزا کوئی بہت سہانا خواب دیکھ رہا تھا۔

''کیا کوئی آ گیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

وہ یہ سن کر پھر سو گیا۔

''میرے بھائی ضرور آ جائیں گے۔''

صاحباں کے خوف میں اضافہ ہوتا گیا۔ ''سب کے سب مارے جائیں گے۔'' پھر اس نے ترکش اٹھایا اور ایک درخت پر جا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد پھر وہ مرزا کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھ گئی۔

''اور اگر انہوں نے مرزا کو مار ڈالا تو۔'' اس کا دل دہل اٹھا۔ ''میں بیچ میں کھڑی ہو جاؤں گی۔ میرے بھائی میرے جسم کو روند کر ہی مرزا کو ہاتھ لگا سکیں گے۔''

چند ہی لمحوں بعد اس کے کانوں میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز پڑی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سب سے آگے اس کا چھوٹا بھائی آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مرزا کو جگایا۔

''اٹھو! بکی پر سوار ہو کر یہاں سے بھاگ چلیں۔''

''میرا ترکش کہاں گیا۔ وہ میرے تیر کی جھلک دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔ کہاں ہے میرا ترکش۔''

''مرزے! مجھے معاف کرنا۔ میں نے اپنے بھائیوں کی جان کے ڈر سے ترکش تمہارے ہاتھ سے دور کر دیا ہے۔ اب اسے حاصل کرنے سے پہلے ہی وہ ہمیں آ لیں گے۔ بکی پر سوار ہو کر بھاگ چلو۔''

''نہیں صاحباں یہ ممکن نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی تلوار اٹھالی۔ ''صاحباں! اب اگر تمہارے کسی بھائی کو چوٹ آ جائے تو مجھے معاف کر دینا۔''

اسی وقت سات آدمی گھوڑوں سے نیچے اترے۔ ان کی تلواریں چمکنے لگیں۔ صاحباں آگے بڑھ کر ان کے اور مرزا کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ ''بھائیو! اب نہ میں کہیں بھاگ سکتی ہوں نہ مرزا۔ جلد بازی نہ کرو۔''

''ہم کسی کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔'' یہ بات کہنے والا اس کا بھائی نہیں تھا۔ جس نے یہ کہا اسے وہ پہچانتی نہیں تھی۔ اگر وہ کل رات فرار نہ ہوتی تو یہ شخص اس کا شوہر بن چکا ہوتا۔

''بھائیو! میں تم سے کہتی ہوں۔ میں تم سے مخاطب ہوں جن کی محبت میں میں نے مرزا کے ساتھ اپنی وفا کو داغدار کر لیا ہے۔''

''اچھی محبت کی ہے تم نے میرے ساتھ۔'' چھوٹے بھائی نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

''صرف ایک بار میں نے اپنے دل کا کہا مانا ہے۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ دوسروں کی بات مانتی رہی ہوں۔ خیر چھوڑو یہ باتیں اگر اس وقت میں نے مرزا کے تیر نہ چھپا دیے ہوتے' تم شاید یہاں کھڑے ہو کر باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ میری اس وفاداری کے عوض ہی میری بات سن لو۔''

''ہم کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔'' اس کے نہ ہو سکنے والے شوہر نے پھر کہا۔

''میں تم سے نہیں اپنے بھائیوں سے التجا کر رہی ہوں۔''

''تم کیا چاہتی ہو۔'' بڑے بھائی نے پوچھا۔

''ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ مجرم ہے۔'' طاہر نے کہا اور اسی لمحے تلوار اٹھا کر مرزا پر وار کر دیا۔ وار خالی گیا مگر مرزا طیش میں آ گیا اور وہ شیر کی مانند اس پر جھپٹا۔

''صاحباں! اس شخص کے بارے میں میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔'' مرزا نے کہا اور دوسرے ہی لمحے طاہر کو مار گرایا۔ یہ دیکھ کر

صاحباں کے بھائی اس پر ٹوٹ پڑے۔ تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگیں۔ مرزا تلوار کا دھنی تھا۔ وہ سب کے وار روکتا رہا۔ صاحباں بھائیوں سے منتیں کرتی رہی ان کے پاؤں پکڑتی رہی۔ ''نہ مارو خدا کے واسطے۔ اسے نہ مارو۔ تمہاری گناہ گار میں ہوں۔ مرزا کو میں نے بلایا ہے میری خاطر اپنی ماں جائی کی خاطر۔''

مگر کسی کی تلوار نہیں رکی اور مرزا کے بازو وار روکتے روکتے شل ہونے لگے۔ پھر وہ بے انتہا نڈھال ہو کر زخم پہ زخم کھانے لگا۔ اس کا سینہ بھی زخموں سے بھر گیا۔

صاحباں بار بار ان کے درمیان آ جاتی۔

''اسے پکڑ کر رکھو۔ ایک بھائی نے صاحباں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

مرزا کو لگنے والے ہر زخم پر صاحباں کے اندر سے ایک چیخ نکلتی۔ آخر ایک گہرا وار مرزا کے سینے پر لگا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

یکا یک صاحباں ایک جھٹکے کے ساتھ بھائی کے بازوؤں سے نکل کر مرزا کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اس نے مرزا کی تلوار اٹھالی۔

''اب میرے نزدیک نہ آنا۔ میں اب صاحباں نہیں۔ ایک پاگل لڑکی ہوں۔ تم نے مرزا کو مارڈالا۔ وہ اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔ میں نے اس کے ساتھ جو غداری کی ہے اس کی معافی مجھے مانگ لینے دو۔''

سب لوگ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

صاحباں نے مرزا کے خون میں تربتر بال اس کی پیشانی پر سے ہٹائے' اپنے دوپٹے سے اسے صاف کیا اور پھر اسے چوم لیا۔

''مرزے۔''

''ہاں صاحباں۔''

''مجھے معاف کر دو گے۔''

''معافی کیسی۔ میں نے اپنی زندگی کی پوری قیمت وصول کر لی ہے۔''

''میں تو تمہیں کچھ نہ دے سکی سوائے موت کے۔''

''نہیں پگلی! تم نے تو مجھے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔''

''کیا چند لمحے اور اپنی آنکھیں کھلی رکھ سکتے ہو۔''

''یہ اب بند ہوئی جا رہی ہیں مگر تم چاہتی ہو تو یہ کھلی رہیں گی ذرا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لو۔''

صاحباں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

''مرزے! تم دیکھ لو کہ میں نے تمہارے ساتھ نہیں اپنی تقدیر کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ تقدیر تمہاری نہیں ڈوگر فیروز کی موت لے کر آئی تھی مگر میں نے اسے بچا لیا اور اپنے بے مثال عشق کی کہانی اپنے ہاتھوں ختم کر لی۔ یہ نہ سمجھنا کہ میرے بھائی مجھے تم سے زیادہ پیارے تھے۔ دراصل اپنی خوشی سے زیادہ دوسروں کی خوشی کو عزیز رکھنے والی میری فطرت تمہاری قاتل بن گئی۔ میں ہر حال میں تمہاری ہوں۔ تم سے مجھے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔'' وہ اٹھ کر مرزا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں میں مرزا کی تلوار تھی۔ اس کے دستے کو چوم کر اس نے اسے اپنے پیٹ میں گھونپ لیا اور لڑکھڑا کر مرزا کے قریب گر گئی۔

''جب میں چھوٹی تھی تو تمہاری کمر کے گرد اپنی بانہیں حمائل کر دیا کرتی تھی۔ اس آخری وقت میں میں تمہارے زخمی سینے کے گرد اپنی بانہیں۔''

مرزا کی آنکھیں بند ہو گئیں مگر ہونٹ اب بھی لرز رہے تھے۔

''صا.....حبا.....ں۔''

''ہاں! مر.....ز.....ئے۔''

ہمارے معاشرے کی عکاس......ایک دلگداز...... سچی کہانی

قبر کا بچھو

نوازتو شاھد کی عادت سے واقف تھا اس لیے اس کی باتوں پر خاموش کھڑا مسکراتا رہا لیکن جن دوستوں نے نواز کا کمرا سجایا تھا ان کے چھروں کی رنگت بدل گئی اور کچھ کھے بنا وھاں سے چل دیے۔ کبھی اس کی زندگی جولانیوں کی آماج گاہ تھی۔ دل میں شورہ پشتی تھی لیکن جب اس نے قبر کا تعویذ ھٹایا تو......!

نازش شاہین

اس شمارے کے لیے ایک حساس وجذباتی ودل گداز سچی کہانی

شاھد میرا بچپن کا دوست تھا۔ وہ میرے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے علاوہ اکرام اور نواز بھی میرے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ ہم چاروں دوست گاؤں کے پرائمری اسکول سے لے کر جہلم کے گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کرنے تک ایک ساتھ رہے۔ اس لیے سبھی ایک دوسرے کی عادتوں اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ کالج ایجوکیشن ختم ہونے کے بعد ہم چاروں کے راستے الگ الگ ہوگئے۔ شاہد آرمی میں چلا گیا۔ نواز نے گاؤں میں ہی زمینوں کا کام سنبھال لیا۔ اس کے باپ کی بہت بڑی زمین داری تھی۔ اکرام نے ایم بی اے

کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ فرم جوائن کر لی تھی جبکہ میں درس تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہوگیا۔ گو کہ ہم سب مختلف علاقوں میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان مسلسل رابطہ تھا اور ہم ایک دوسرے کے حالات سے ہمہ وقت باخبر رہتے تھے۔

شاہد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی انتہائی خودسر بدمزاج اور تندخو واقع ہوا تھا۔ بچپن میں اس کی حرکتوں کو معصوم شرارتیں سمجھ کر نظرانداز کیا جاتا رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ عادتیں پختہ ہوتی چلی گئیں۔ ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا' دوسروں کی چیزوں کو نقصان پہنچانا' ہر بات میں اپنی مرضی چلانا اور کمزوروں کو تنگ کرنا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ اسے اپنے والدین سے کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی اس لیے وہ من مانی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اگر کبھی اس کے گھر والوں سے شکایت کی جاتی تو وہ بھی الٹا شکایت کرنے والے سے ہی الجھ جاتی' رفتہ رفتہ سبھی لوگ اس سے کترانے لگے۔ اس کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور موقع ملنے پر کسی نہ کسی کے ساتھ چھیڑ خانی ضرور کرتا۔ میں' اکرام اور نواز اسے موقع بہ موقع سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن وہ ہماری باتوں کو بھی مذاق میں ٹال دیتا۔ رفتہ رفتہ ہم لوگ بھی تھک ہار کر خاموش ہوگئے۔

کیپٹن شاہد اپنی بدمزاجی اور نظم وضبط کی خلاف ورزی کے سبب آرمی کی ملازمت جاری نہ رکھ سکا۔ ہم لوگوں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے وہ کبھی بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا ہے اور چونکہ یہ ملازمت اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتی اس لیے اسے جلد از جلد یہ جاب چھوڑ دینی چاہیے۔ غالباً شاہد بھی فوجی ڈسپلن کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا اس لیے تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے یہ ملازمت چھوڑ دی۔ کچھ عرصہ بعد ہی اسے ایک سیکوریٹی ایجنسی میں جاب مل گئی۔ ان دنوں اس کی پوسٹنگ راولپنڈی میں تھی۔ اتفاق سے اکرام بھی اسی شہر میں تھا جبکہ میں ان دنوں لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

نواز کی شادی کا دعوت نامہ ملا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ لاہور کی بوجھل فضا سے نکل کر گاؤں کے کھلے اور صاف ستھرے ماحول میں جانے کا تصور ہی بے حد خوش آئند تھا۔ نواز نے ٹیلی فون کر کے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں اس کی شادی میں ضرور شرکت کروں اور برات سے کم از کم دو تین دن پہلے سب دوست گاؤں پہنچ جائیں تاکہ شادی کی تقریب کو بھرپور طریقہ سے انجوائے کیا جائے۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہی چھٹی کی درخواست دے دی۔ اسی روز راولپنڈی سے اکرام کا فون آ گیا۔ میں نے اس کا پروگرام پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''یار! میرا کیا پروگرام ہوگا۔ میں تو' قصائی کے رحم وکرم پر ہوں۔''

ہم لوگ شاہد کو' قصائی' کہتے تھے اور اس کی عادتوں اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ ٹائٹل اس پر سوٹ بھی کرتا تھا۔ میں سمجھا کہ شاہد نے کوئی گڑبڑ کر دی ہے۔ اس لیے گھبرا کر پوچھا۔ ''یار! اسے کیا مسئلہ ہے۔ کیا وہ شادی میں نہیں جانا چاہتا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو شادی میں جانے کے لیے بے چین ہے لیکن اسے چھٹی نہیں مل رہی۔''

''چھٹی نہ ملنے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔''

''یار۔ وہ بضد ہے کہ اسے کم از کم ایک ہفتہ کی چھٹی چاہیے جبکہ اس کا افسر دو دن سے زیادہ پر راضی نہیں ہے۔''

''پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔'' میں نے پرتجسس انداز میں پوچھا۔

''تم تو شاہد کی فطرت سے واقف ہی ہو۔''

اکرام نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہے۔ ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر ہی رہے گا۔''

''ٹھیک ہے اپنی روانگی کے پروگرام سے مجھے مطلع کر دینا۔ ویسے میرا ارادہ 23 تک جانے کا ہے۔''

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ مجھے 23 تاریخ کو نواز کی شادی میں شرکت کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن صرف ایک دن پہلے میرے ایک قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا اور مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔ میں نے اکرام کو فون کر کے اپنی مجبوری بتا دی۔ اسے میرے پروگرام کے کینسل ہو جانے کا بہت افسوس ہوا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ شاہد اپنے پروگرام کے مطابق چھٹی لینے میں کامیاب ہو گیا ہے اور دونوں دوسرے دن جہلم کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔

کراچی میں مجھے آٹھ دس لگ گئے۔ واپسی پر ایک اندوہناک خبر میری منتظر تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر راولپنڈی جانے والی بس پکڑی اور اکرام کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میں اپنی زبان میں آپ کو سنا رہا ہوں۔

☆☆

پروگرام کے مطابق شاہد اور اکرام جہلم کے لیے روانہ ہو گئے۔ نواز کے گھر جانے کے لیے ایک دریا عبور کرنا تھا۔ کشتی کی مدد سے وہ با آسانی اس پار پہنچ گئے۔ نواز ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ البتہ اس نے میری غیر موجودگی کو بہت بری طرح محسوس کیا۔ نواز نے ان دونوں کے لیے حویلی کا ایک حصہ مخصوص کر دیا اور دو نوکر بھی ان کی خدمت پر مامور کر دیے۔ کچھ دیر ستانے اور فریش ہونے کے بعد یہ دونوں دوست گاؤں کی سیر کے لیے نکلے۔ شاہد اپنی عادت کے مطابق ہر چیز پر تنقید کرتا اور اس کا مذاق اڑاتا جا رہا تھا۔

جبکہ اکرام کئی برسوں بعد گاؤں آیا تھا اس لیے گاؤں کا فطری حسن اسے مسحور کیے دے رہا تھا۔ وہ فطرت کے حسین نظاروں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اسی لیے شاہد کی بے جا تنقید اسے ناگوار گزر رہی تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ شاہد کو باز رکھنے کی کوشش کی لیکن شاہد اپنی ترنگ میں بولتا رہا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ خود بھی اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔

شام کو مہندی کی تقریب ہوئی۔ نواز نے بہت بڑے پیمانے پر کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ کھانے کے بعد بھنگڑہ ڈالا گیا اور خوب ہلا گلا مچا۔ نواز نے شہر سے ناچنے والیاں بلائی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور اپنے فن میں ماہر' شاہد یہاں بھی اپنی بدتمیزی سے باز نہ آیا۔ وہ ان رقاصاؤں کے لباس' شکل وصورت' میک اپ اور ڈانس پر تنقید کرتا رہا۔ کچھ مہمانوں کو اس کے یہ ریمارکس پسند نہ آئے اور عین ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی ایک شاہد سے الجھ جاتا۔ اکرام نے بڑی مشکل سے شاہد کو خاموش کیا ورنہ کوئی نہ کوئی بدمزگی ہو سکتی تھی۔

برات سے ایک دن پہلے نواز بڑے شوق سے اکرام اور شاہد کو وہ کمرا دکھانے لے گیا جو حجلہ عروسی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ وہ کمرا بیش قیمت سامان سے مزین تھا اور نواز کے دوستوں نے اسے بڑی خوب صورتی اور نفاست سے سجایا تھا۔ شاہد نے اپنی عادت کے مطابق اس میں بھی کیڑے نکالنے شروع کر دیے۔ یہ گل دان یہاں کوئی رکھا ہے' اس تصویر کو سامنے والی دیوار پر لگاؤ۔ اس ٹیبل لیمپ کو دوسری سائیڈ پر رکھو وغیرہ وغیرہ۔

نواز تو شاہد کی عادت سے واقف تھا اس لیے اس کی باتوں پر خاموش کھڑا مسکراتا رہا لیکن جن دوستوں نے نواز کا کمرا سجایا تھا ان کے چہروں کی رنگت بدل گئی اور کچھ کہے بنا وہاں سے

چل دیے۔

برات اور ولیمہ میں بھی شاہد کی بکواس جاری رہی۔ اسے لوگوں کا دل توڑنے اور دکھانے میں مزہ آتا تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فطری طور پر اذیت پسند واقعہ ہوا تھا۔ اسے لوگوں کو اذیت پہنچا کر تسکین ملتی تھی۔ اکرام صبح سے شام تک اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا اور اس کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ شاہد کو الٹی سیدھی باتیں کرنے سے باز رکھے۔ شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو نواز نے اصرار کر کے ان دونوں کو چند روز کے لیے مزید روک لیا۔ دو دن تک تو یہ تینوں دوست پورے علاقہ کی سیر کرتے رہے۔ اب شاہد کو اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے واپسی کا پروگرام بنایا اور نواز سے کہنے لگا۔ ''بھئی نواز تمہاری شادی بڑی شاندار رہی بہت مزہ آیا۔ اب تم پنڈی آنے کا پروگرام بناؤ۔ بھابھی کو بھی ساتھ لانا۔ پھر ہم تمہیں وہاں کی سیر کروائیں گے۔''

دونوں دوست واپسی میں دریا کی طرف چل دیے۔ ان کا گزر ایک قبرستان سے ہوا۔ اچانک ایک قبر کے اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی ہتھوڑے سے کسی کے جسم پر ضربیں لگا رہا ہو۔ وہ دونوں ٹھٹھک کر وہیں رک گئے۔ شاہد نے اکرام سے پوچھا۔ ''یار اس قبر کے اندر سے یہ کیسی آواز آ رہی ہے۔''

اکرام نے شاہد کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''آواز کو گولی مارو اور یہاں سے نکلنے کی کرو۔''

''نہیں یار۔ اس آواز کا کھوج لگائے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' شاہد نے پرعزم لہجہ میں کہا اور گورکن کی کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔ اکرام بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ گورکن تو نہیں ملا لیکن شاہد اس کی کوٹھڑی سے کدال اور بیلچہ ضرور لے آیا۔ شاید اس کا ارادہ خود ہی قبر کھودنے کا تھا۔ اکرام نے ایک بار پھر اسے سمجھایا۔ ''شاہد باز آ جاؤ۔ کیوں بلاوجہ کی مصیبت کو گلے لگانا چاہتے ہو۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ قبر کا کھودنا جرم ہے۔''

''مجھے سب معلوم ہے لیکن جب میں کسی کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو اسے ضرور پورا کرتا ہوں۔'' شاہد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر اس نے خود ہی قبر کھودنا شروع کر دی۔ اکرام اس کے ساتھ ہی کھڑا رہا۔ جب قبر کھودی گئی تو ان کے سامنے ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔ ایک بچھو کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی پیشانی پر ڈنگ مار رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر شاہد اور اکرام دونوں کے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی اور انہیں ٹھنڈے پسینے آنے شروع ہو گئے۔ شاہد کی ساری بہادری رخصت ہو گئی اور وہ چلایا۔ ''بھاگو۔ اکرام۔ جلدی کرو۔ بھاگو۔''

اس کے ساتھ ہی دونوں دوستوں نے دوڑ لگا دی۔ وہ عجیب الخلقت بچھو بھی اچھل کر باہر آ گیا اور اس نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اچانک سامنے دریا کا کنارہ آ گیا تو دونوں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اکرام آگے تھا اور شاہد اس کے پیچھے۔ شاہد نے جونہی پانی میں چھلانگ لگانا چاہی اس کی چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ بچھو نے اچھل کر اس کی ٹانگ پر ڈنک مارا تھا اور تیزی سے واپس قبرستان کی طرف چل دیا تھا۔

شاہد کی چیخ سن کر اکرام پلٹا اور شاہد کا بازو اپنی گردن میں ڈال کر اسے بمشکل دریا پار کروایا۔ شاہد کی دونوں ٹانگیں سن ہو گئی تھیں۔ اکرام نے جیب سے رومال نکال کر اس کی ٹانگ پر باندھا تاکہ زہر پورے جسم میں پھیلنے نہ پائے۔ پھر اس نے سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روکی اور شاہد کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔

ڈاکٹروں نے شاہد کا معائنہ کرنے کے بعد واضح طور پر کہہ دیا کہ زہر پوری طرح ٹانگوں میں سرایت کر چکا ہے اس لیے فوری طور پر وہ ٹانگ

کاٹنا پڑے گی جس پر بچھو نے ڈنک مارا تھا اور اگر آپریشن میں تاخیر کی گئی تو دوسری ٹانگ بھی کاٹنا ہوگی۔

شاہد کو جب ہسپتال سے فارغ کیا گیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو چکا تھا۔ سیکورٹی ایجنسی والوں نے اسے ملازمت سے جواب دے دیا۔ اس کے لیے مصنوعی ٹانگ بنوائی گئی لیکن یہ اس کی معذوری کا نعم البدل ثابت نہ ہو سکی۔ شاہد کا سارا طنطنہ' غرور' بدمزاجی' سنگدلی' بے حسی' ظلم سب کچھ اس حادثہ کی نذر ہو گیا۔ شاہد کو اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی اور اب وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔

اکرام کی زبانی یہ واقعہ سننے کے بعد میں مسلسل یہی سوچتا رہا کہ اگر وہ اپنی عادت کے برخلاف اس قبرستان سے آنے والی آواز کو نظر انداز کر دیتا تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ دوسری بات یہ کہ اس عجیب الخلقت بچھو کا راز بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جو نہ صرف یہ کہ قبر سے چھلانگ لگا کر باہر آ گیا بلکہ اس نے شاہد کا تعاقب کرتے ہوئے دریا تک دوڑ بھی لگا دی۔ سچ بتائیے کیا آپ نے کبھی ایسا بچھو دیکھا ہے۔

اندازِ فکر

☆ اگر دنیا میں عزت اور مرتبہ چاہتے ہو تو اپنے سلام میں ہمیشہ پہل کرنی چاہیے۔

☆ دعا عبادت کی جان ہے۔ ☆ خاموشی گفتگو کا حسن ہے۔

☆ اولاد کے لئے ماں باپ کا سب سے اچھا تحفہ ان کی بہتر تعلیم و تربیت ہے۔

☆ تم میں سب سے اچھا انسان وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔

☆ مسکراہٹ زندگی کا انمول تحفہ ہے۔ ☆ عاجزی انسان کے وقار میں اضافہ کرتی ہے۔

☆ امانت میں خیانت سخت گناہ ہے۔ ☆ لوگوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

☆ ماں کے بغیر گھر ایک قبرستان ہے۔ ☆ علم مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں ملے لے لو۔

☆ وہ علم ضائع ہو گیا جس پر عمل نہ کیا جائے۔ ☆ آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔

☆ غرور سے آدمی کا دین ضائع ہوتا ہے۔ ☆ توبہ کرنا آسان اور گناہ چھوڑنا مشکل ہے۔

☆ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ گناہ کرتے وقت مخلوق سے تو پردہ کرے اور خالق کا خوف نہ کھائے۔

☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔ ☆ علم وہ خزانہ ہے جس کا ذخیرہ بڑھتا رہتا ہے۔

☆ کسی کی اچھی باتوں پر مسکرانا بھی ایک قربانی ہے۔ ☆ وہ راز کبھی پوشیدہ نہیں رہتا جس کی خبر کسی عورت کو ہو۔

☆ دوستی سے پہلے صورت کو نہیں' سیرت کو دیکھو۔ ☆ سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو کرنے والے کی نظر میں چھوٹا ہو۔

☆ تمہیں اس دن رونا چاہیے جس دن تم نے بغیر نیکی کے گزار دیا۔

☆ یہ بھی بے پردگی ہے کہ تم لوگوں کے عیب تاکتے پھرو۔

☆ جو چیز پردے میں ہو گئی اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔

☆ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے' اللہ اس کے لیے آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ بھی سنے' بیان کرے۔

☆ اپنے اخلاق کو اس قدر خوبصورت اور لہجے کو اس قدر دھیما رکھو کہ کسی کو تم سے شکایت نہ ہو۔

☆ اپنی نیکی اور دوسروں کی برائی کو بھول جاؤ۔ ☆ خوش مزاج شخص وہ ہے' جو دوسروں کو خوش مزاجی دے۔

ہمارے معاشرے کی عکاس...... ایک دلگداز...... سچی کہانی

مجھے غروب ہو جاؤ

ہما شاہین

حاجی نور دین ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کی بیوی رحیمہ بھی ایک نہایت سادہ اور رحم دل خاتون تھیں۔ حاجی صاحب کی صحبت نے ان کے ایمان کو اور بھی بہت پختہ کردیا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اجازت دے دی۔ صرف منی ایسی تھی جو اپنے کمرے میں گھٹی گھٹی آہیں بھر رہی تھی۔

اس شمارے کے لیے ایک حساس وجذباتی ودل گداز سچی کہانی

رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ حاجی نور دین کے گھر میں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے۔ ان کی حویلی کے درودیوار رنگ برنگ قمقموں سے جگمگا رہے تھے جو کبھی فوارے اور کبھی پر پھیلائے مور کی شکل اختیار کررہے تھے جسے اس چھوٹے سے قصبے کے لوگ بڑی دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک جشن کا سا سماں تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

حاجی نور دین کی اور ان کے گھر والوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ آج ان کے دلوں کی مرادیں پوری ہونے کا دن تھا۔ ہر طرف سے لوگ انہیں ان کے بیٹے کی شادی کی مبارک باد دے رہے تھے۔ جس چہرے پر نظر پڑتی تھی' وہی خوشیوں سے دمکتا نظر آرہا تھا۔

حاجی نور دین علاقے کے ایک بہت بڑے زمیندار تھے جن کی عزت وتکریم کا ہر شخص قائل تھا۔ ان کی پوری زندگی گاؤں کے لوگوں کی خدمت کرتے گزری تھی۔ وہ لوگوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد خیال کرتے۔ گاؤں کے بیشتر فلاحی کام انہوں نے اپنے ذاتی خرچ پر انجام دیے تھے جن میں ہائی اسکول کی بلڈنگ اور ڈسپنسری سرفہرست تھی اور گاؤں میں ٹیلی فون لگانے کا سہرا بھی ان کی ہی انتھک محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج ان کے بیٹے کی شادی میں پورا گاؤں شریک تھا۔

کیپٹن شعیب جس کی آج شادی تھی یہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بڑا خوبرو جوان تھا۔ اس کی بھی ساری عادتیں اپنے باپ جیسی تھیں۔ ہر چھوٹے بڑے سے بڑی شفقت اور محبت کرتے تھے۔ اس کی شادی عالیہ سے ہورہی تھی جو اس کی سگی خالہ زاد تھی۔ دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔

کیپٹن شعیب کو اس کے دوستوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس سے شادی کے حوالے سے ہلکے پھلکے مذاق کررہے تھے۔ بے شک وہ ان کے درمیان بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور ہی تھا' وہ رات کے گہرے ہونے کا بڑی بے تابی سے انتظار کررہا تھا۔ عالیہ کو دلہن کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مدتوں سے اس کے دل میں پل رہی تھی مگر وقت تھا کہ جیسے ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ ایک ایک لمحہ اسے صدیوں پر محیط دکھائی دے رہا تھا۔

رات ہوگئی۔ گہری اور خاموش رات!

ہنگامہ ختم ہوگیا۔ مہمان اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ کیپٹن شعیب تجلے میں داخل ہوا۔ اندر عالیہ اپنے معصوم اور بے مثال حسن کے ساتھ سمٹی سمٹائی سی بیٹھی تھی۔ کمرے میں تازہ گلاب کے پھولوں کی مہک رچی بسی تھی۔ اس نے کھڑے کھڑے اس پیاری سی لڑکی پر ایک بھرپور نظر ڈالی جو دلہن کے روپ میں اس کے سامنے تھی۔ پھر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور دھیرے سے اس نے گھونگٹ اٹھایا۔ عالیہ نے مارے شرم کے آنکھیں بند کرلیں۔

شعیب نے عالیہ کے نرم و نازک حنائی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ''کاش وقت کی گردش تھم جائے اور میں تم کو یونہی دیکھتا رہوں۔ زندگی کتنی خوبصورت ہے اس کا احساس مجھے آج ہو رہا ہے۔''

اس کے اظہار محبت سے عالیہ کے انگ انگ میں خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ پھر دونوں محبتوں کو دوام بخشنے لگے۔ انہیں ابھی اس نئی دنیا کی سیر کرتے ہوئے بمشکل تین گھنٹے گزرے ہوں گے کہ تقدیر نے ان کے ساتھ ایک عجیب مذاق کیا۔

توپوں کے گولے اور بموں کے دھماکوں کی آوازیں کانوں کے پردے ہلانے لگیں۔ جنگی جہازوں کی چیختی چنگھاڑتی آوازوں نے ان کے دلوں کو دہلا دیا۔ وارث پور کے تھکے ہارے کسان ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ بچے خوف و دہشت سے ماؤں کی آغوشوں میں سمٹ گئے۔ ایک لمحے کو تو سب کے حواس کھو گئے۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد ان کے حواس بحال ہوئے تو انہیں سب سمجھ میں آنے لگا' وہ جانتے تھے کہ ان کا گاؤں پاکستان اور آزاد کشمیر کی سرحد پر واقع ہے اور شاید بھارت نے پاکستان پر حملہ کردیا۔ عالیہ بے حد خوف زدہ ہو رہی تھی۔ کیپٹن شعیب نے اسے تسلی دی اور کمرے سے باہر صحن میں آ گیا۔ جہاں تقریباً سبھی لوگ اکٹھے ہوگئے تھے۔

حاجی نور دین کا گھر جہاں ابھی چند گھنٹے پہلے مسرتیں تھیں بہاریں تھیں وہاں اب غم کے بادل چھا گئے۔ ہر چہرہ پژمردہ اور بجھا بجھا سا دکھائی دینے لگا۔ کیپٹن شعیب اور حاجی صاحب

سب لوگوں کو تسلیاں دے رہے تھے۔ خواتین تو تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ کیپٹن کی دونوں چھوٹی بہنیں سب سے زیادہ پریشان تھیں۔ وہ ان کو دلاسے دے رہا تھا کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے تم بالکل فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ دشمن کو منہ کی کھانی پڑے گی۔ عالیہ اپنی مسہری پر بیٹھی آہیں بھر رہی تھی۔ اسے بھی سب کچھ معلوم ہوگیا تھا۔ وہ بھی اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ یا اللہ میری خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے لیکن بظاہر تو ایسا ہی لگتا تھا کہ اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ چکی تھی۔

کیپٹن شعیب نے گھر کی تمام لائٹس آف کردیں اور مہمانوں کو اپنے اپنے کمروں میں بھیج کر خود بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ ایک بہادر فوجی جوان تھا۔ بچپن ہی سے اسے فوج میں جانے کا بہت شوق تھا' وطن کی محبت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دو ماہ کی چھٹیوں پر آیا ہوا تھا لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ہنگامی حالات میں فوجی کی چھٹی منسوخ کردی جاتی ہے اور وہ خود بھی اس مشکل وقت میں اپنے ملک کے کام آنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسی دوران میں اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

کیپٹن شعیب نے دروازہ کھولا تو باہر اس کی سب سے چھوٹی بہن منی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ منی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ سخت پریشان ہوگیا۔ وہ جان گیا کہ ان آنسوؤں کا سبب کیا ہے' وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ خود بھی اسے بے حد چاہتی تھی۔ شادی کی تقریب میں وہ اتنی پرجوش تھی کہ لگتا ساری دنیا سے زیادہ کیپٹن شعیب کی شادی کی خوشی اسی کو ہوئی ہے اور یقیناً اس آنے والے طوفان نے اس کی معصوم خوشیوں کو نگل لیا تھا۔

''منی کیا بات ہے۔'' کیپٹن شعیب نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بھیا آپ کا فون ہے۔'' وہ شکستہ سی آواز میں بولی۔

''فون!'' اس نے چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔

پھر اس کے پیچھے پیچھے فون والے کمرے میں پہنچ گیا۔ ''ہیلو۔'' اس نے کہا۔

''کرنل طارق اسپیکنگ!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''تم تک اطلاع پہنچ گئی ہوگی کہ مکار دشمن نے پھر اپنی کارروائی تیز کردی ہے۔''

''یس سر!'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' کرنل صاحب نے کہا۔ ''میں تمہاری شادی میں شرکت کرنے کی بجائے چھٹی منسوخ کر رہا ہوں۔ آج تمہاری شادی ہے' تمہارے لیے ڈیوٹی پر حاضر ہونا کافی کٹھن ہوگا مگر ہمارے وطن پر مشکل وقت آن پڑا ہے۔ ہماری یونٹ کو محاذ پر پہنچنے کا حکم ملا ہے کیونکہ وطن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور مجھے تم جیسے محب وطن جوانوں پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔''

''میں حاضر ہو رہا ہوں سر! انشاء اللہ آپ مجھے اپنی توقعات پر پورا اترتے دیکھیں گے۔''

''ویری گڈ جنٹل مین۔'' کرنل صاحب خوش ہوکر بولے۔ ''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور اچھا خدا حافظ۔''

اس وقت شعیب کا چہرہ کسی بھی قسم کے خوف سے قطعی بے نیاز تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''اے مادر وطن میں تجھ پر ہزار بار قربان۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر اٹھ کر واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اپنے ماں باپ کے حوصلوں کا تو علم تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ اسے کبھی نہیں روکیں گے لیکن عالیہ کا خیال آتے ہی وہ تھوڑا سا پریشان ہوگیا۔

کمرے میں جا کر وہ پیکنگ کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ عالیہ سے کس انداز میں بات کی

جائے۔ اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس کی یہ مشکل عالیہ نے خود ہی آسان کردی۔

''کس کا فون تھا۔'' عالیہ نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

''میری یونٹ کے سی او صاحب کا۔''

''کیا کہا ہے انہوں نے۔'' عالیہ کی آواز سے پریشانی ظاہر تھی۔

''مجھے بلایا گیا ہے۔'' کیپٹن شعیب نے پرسکون لہجے میں جواب دیا اور پھر تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد بولا۔ ''عالیہ! قدرت مجھ سے بلکہ ہم سے امتحان لینا چاہتی ہے اور میں اس امتحان میں کامیاب و کامران ہونا چاہتا ہوں۔ اگر تم ایک مجاہد کی بیوی کا کردار ادا کر کے اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہر کو میدان جنگ میں بھیجو تو میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کروں گا۔''

''میں آپ کو کیسے روکوں گی۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔ شعیب اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''میں ایک شہید یا غازی کی بیوی کہلانے پر ہمیشہ فخر کروں گی۔ میرے لیے اس سے بڑا اور کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا۔''

عالیہ کا جواب سن کر کیپٹن شعیب ایک دم جذباتی ہوگیا۔ اس نے خوشی سے سرشار ہوکر کہا۔ ''شکریہ میری پیاری بہادر دلہن بہت بہت شکریہ۔''

اتنا کہنے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ساری صورت حال گھر والوں کے سامنے رکھی۔ نہ جانے کس طرح اتنی ہی دیر میں یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ کیپٹن شعیب کو ڈیوٹی پر واپس بلالیا گیا ہے۔ پھر ایک ہجوم حاجی نور دین کی حویلی کے سامنے اکٹھا ہوگیا۔ اتنے میں ایک گولہ ملک فخر الدین احمد کے چوبارے پر آکر لگا۔ پورے گاؤں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تو خدا کا شکر تھا کہ چوبارے میں اس وقت کوئی نہیں تھا' ورنہ اس کی موت یقینی تھی۔ جہاز اپنی خوفناک آواز کے ساتھ گاؤں پر سے گزر رہے تھے۔ ان کی گرج سے بڑے بڑے مضبوط دل بھی ہل جاتے تھے۔

حاجی نور دین ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کی بیوی رحیمہ بھی ایک نہایت سادہ اور رحم دل خاتون تھیں۔ حاجی صاحب کی صحبت نے ان کے ایمان کو اور بھی بہت پختہ کردیا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اجازت دے دی۔ صرف منی ایسی تھی جو اپنے کمرے میں گھٹی گھٹی آہیں بھر رہی تھی۔ کیپٹن شعیب اس کے کمرے میں گیا اور اسے یوں روتا دیکھ کر محبت سے اس کا سر چوما اور بولا۔

''منی اچھے بچے نہیں روتے!'' اس نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''بھیا!'' وہ پھر اپنے بھائی سے لپٹ گئی اور بری طرح سسکنے لگی۔

''روتے نہیں ہیں گڑیا! مجھے ہنس کر رخصت کرو۔'' شعیب نے کہا۔

''آپ کب واپس آئیں گے بھیا۔'' اس نے روتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

''بہادر لوگ جب میدان جنگ میں جاتے ہیں تو واپسی کے بارے میں نہیں سوچتے منی! اور تمہارے بھائی کو بھی اللہ نے بہت بڑا دل دیا ہے۔'' اس نے منی کی پیشانی کو چوما اور باہر نکل گیا۔

گل بانو کی کمر خمیدہ ہوکر کمان ہوچکی تھی۔ آنکھوں کی چمک' اس طرح ماند پڑ گئی تھی کہ اب موٹے عدسے کے عینک سے بھی اسے دھندلی شکل دکھائی دیتی تھی۔ وہ لاٹھی ٹیک کر اپنے جسم کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی چلتی تھی۔ وہ دھوپ سینکنے اپنے کمرے سے باہر آئی تھی۔ اسے بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس کی پوتی عرفانہ دوڑتی ہوئی

آئی۔ ''دادی! امی کہہ رہی ہیں فوراً تیار ہو جایئے۔''

''کیوں۔'' گل بانو نے آنکھوں پر الٹی ہتھیلی سے چھجا بنا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں تیار ہو جاؤں مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔''

''نہیں دادی! ضد نہ کریں۔ پورا گاؤں خالی ہو رہا ہے سب آزاد کشمیر جا رہے ہیں سامان باندھا جا چکا ہے۔''

''میں نہیں جاؤں گی! تمہیں جانا ہے تو چلی جاؤ۔ میں نے یہیں جنم لیا' پلی بڑھی اور یہیں میری قبر بنے گی۔ میں کافروں کے ڈر سے کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''دادی اماں وہ فوجی ہیں' ذرا سی توانائی آتے ہی پیچھے چلے آئیں گے یا پھر پیچھے سے پاک فوج حفاظت کرے گی'۔ ظہیر نے دیکھا ہے بھارتی فوجوں کا ایک بڑا کارواں راہ میں آنے والے تمام گاؤں لوٹتا بڑھا آ رہا ہے۔ ابھی وہ لوگ نیچے ہیں دوپہر تک اوپر آ جائیں گے۔''

''آ جانے دو میں ان سے نہیں ڈرتی۔'' گل بانو نے حتمی انداز میں کہا۔ جب تک میری ہڈیوں میں درد نہیں اٹھے گا میں یہاں سے نہ اٹھوں گی اپنے ان بہادر بیٹوں کی حفاظت کرتی رہوں گی کاش یہ درد کبھی نہ اٹھے۔''

''اگر بھارتیوں کو ان کی خبر ہو گئی تو کیا ہو گا۔''

''تم بے فکر رہو' انہیں ذرا بھی خبر نہیں ہو گی۔ مجھ ایسی بڑھیا پر بھلا بھارتی کیسے شک کریں گے۔ میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہوں گی کبھی جھونپڑی کے پاس کبھی باغ کے درختوں کے پاس۔''

اسی وقت کسی نے عرفانہ کا نام لے کر پکارا اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد گل بانو نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''چلو یہ لوگ تو گئے۔ اب پورے گاؤں کی واحد مالک میں ہوں۔'' اور پھر وہ دونوں ہاتھ سے لاٹھی پر پورا وزن ڈالتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اب اس نے دائیں ہاتھ میں لاٹھی پکڑ رکھی تھی اور بائیں ہاتھ سے کمر کو اور آہستہ آہستہ خود کو گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ کھیتوں کے درمیان رکھوالی کے لیے بنی ہوئی جھونپڑی کے نزدیک پہنچ گئی۔ ذرا سی مسافت نے اس کے سانسوں کے زیر و بم میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ایک جانب بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ کافی دیر کے بعد جب اس نے سانسوں پر قابو پا لیا تو وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔ جھونپڑی میں ہر طرف کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ وہ اس پر سے گزرتی ہوئی پچھلی جانب پہنچ گئی۔

وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس پر دو فوجی بے سدھ پڑے تھے۔ ان میں سے ایک جوان تھا اور دوسرا درمیانی عمر کا! دونوں بری طرح زخمی تھے۔ گل بانو ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ سرہانے رکھے ہوئے جگ سے اس نے چلو میں پانی لیا اور پھر جوان آدمی کے چہرے پر چھینٹے مارتے ہوئے بولی۔ ''اب اٹھ جا میرے لعل۔''

جوان نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں لیکن بڑی بی پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی گھبراہٹ ختم ہو گئی۔

''بیٹے تم نے ابھی تک کچھ کھایا نہیں اور میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔ میں بھیڑوں کو ہانک لاتی ہوں تم ان کا دودھ نکال لینا.....'' پھر اس نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ ''ہاں اب تمہارے پیروں کا کیا حال ہے۔''

''اماں! پیروں کو تو ہم نے وطن پر قربان کر دیا ہے میرے پیر تو دس کروڑ عوام ہیں ان کی رفتار کہیں کم نہ ہو جائے اسی لیے ہم نے اپنے پیر انہیں دے دیے ہیں۔''

''مولا تمہیں سلامت رکھے میرے لعل! خدا تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔'' گل بانو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی' پورا گاؤں خالی ہوگیا ہے بھارتی فوجی بہت تیزی سے ادھر آرہے ہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں وہ تمہیں تلاش نہ کرلیں۔''

''جس نے ہمیں اتنے بڑے حادثے سے بچالیا' وہ یقیناً ہماری حفاظت بھی کرے گا۔'' نوجوان نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''یہ..... یہ..... کیسے ہوا۔'' گل بانو نے ہچکچاتے ہوئے زخمی پیر کے بارے میں پوچھا۔

''اماں میرا نام شعیب ہے اور میں فوج میں افسر ہوں۔ آپ جانتی ہیں کہ جنگ یہاں سے مشرق کی سمت کئی میل دور ہورہی ہے ہم وہیں جانا چاہتے تھے کہ راستہ بھٹک گئے اور دشمنوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ انہوں نے مجھے گرفتار کرنا چاہا لیکن ہم ڈٹ گئے اور انہیں جہنم واصل کردیا۔ مرتے مرتے بھی ان کے گرنیڈ نے ہمارے پیر چھین لیے۔''

اچانک دور سے گاڑیوں کی انجن کی آواز سنائی دی۔ آواز سنتے ہی گل بانو نے ان پر کمبل ڈال دیا اور باہر نکل آئی پھر اس نے کنڈی میں لٹکتے ہوئے تالے کو بند کیا اور لاٹھی ٹیکتی ہوئی اپنے گھر میں چلی آئی۔

ابھی اسے دروازے پر بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک بھاری آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''یہ تمہارا گھر ہے۔''

بوڑھی گل بانو نے دھوپ کی وجہ سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے اس آدمی کو دیکھنے لگی جو اس سے سوال کررہا تھا۔ سوال کرنے کا مقصد وہ سمجھ گئی تھی مگر جواب میں کچھ بولنے کی خواہش اسے نہیں تھی کیونکہ وہ بھارتی فوجی تھا۔

''تم بولتی کیوں نہیں! میں پوچھ رہا ہوں کیا یہ مکان تمہارا ہے۔'' بھارتی فوجی نے سخت لہجے میں کہا۔

جواب میں بوڑھی گل بانو کی ناک سے گھر گھر کی آواز نکلی مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

''اندر چلو۔'' بھارتی فوجی نے گرج کر کہا۔

گل بانو لاٹھی ٹیکتی ہوئی کمرے کے اندر جانے لگی۔ اس کے پیچھے بھارتی افسر بھی داخل ہوا پھر اس کے دوسرے ساتھی بھی اندر آگئے۔

''سب گاؤں والے کہاں چلے گئے ہیں۔'' بھارتی افسر نے اندر آکر پوچھا۔

بوڑھی گل بانو بدستور اپنی لاٹھی کے سہارے کھڑی رہی اور ٹک ٹک اسے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ ''وہ کہاں گئے! مجھے اس

اندازِ فکر

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ بھی سنے' بیان کرے۔

☆ جو اپنی ضرورتیں بڑھالیتا ہے' وہ اکثر محرومی کا شکار رہتا ہے۔

☆ بدترین جھوٹ وہ ہے' جس میں کچھ سچ بھی شامل ہو۔

☆ غصے پر قابو پانا ہی دانش مندی ہے۔

☆ اپنی نیکی اور دوسروں کی برائی کو بھول جاؤ۔

☆ ہر آدمی کی رائے اس کے ذاتی تجربے کے مطابق ہوتی ہے۔

☆ دنیا کے بازار میں زندگی کا سب سے قیمتی سکہ حوصلہ ہے۔

☆ مصیبت کی شکایت نہ کرو، اس سے خدا ناراض، دوست غمگین اور دشمن خوش ہوتا ہے۔

☆ جس سے تمہیں نفرت ہے اس سے ڈرتے رہو۔

☆ دولت سراونچا کیے بغیر نہیں رہتی۔

☆ جو شخص برائی سے بالکل واقف نہیں وہ برائی میں مبتلا ہوگا۔

کی خبر نہیں میں تو اس بڑھاپے میں گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔''

''تو تم یہاں اکیلی رہتی ہو۔'' بھارتی افسر نے دریافت کیا۔

''ہاں بالکل اکیلی! دس سال ہوگئے ہیں میں بالکل اکیلی ہوں۔''

بھارتی فوجیوں نے گل بانو سے کہا کہ اسے ہر وقت گھر کے اندر رہنا چاہیے۔ باہر نکلی تو بہت برا ہوگا۔

بوڑھی گل بانو نے یہ سن کر اپنی گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

بھارتی فوجی اسی کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ فرش پر ایک نقشہ پھیلا کر آپس میں باتیں کررہے تھے اور ہلکی ہلکی سیٹیاں بجارہے تھے۔ دو تین فوجی ٹہل رہے تھے۔ جن کے بھاری بوٹوں سے فرش پر ناگوار ٹھک ٹھک کی آواز گونج رہی تھی لیکن بوڑھی گل بانو کو جیسے ہوش ہی نہ تھا۔ وہ ہر جانب سے بے پروا کمرے کے واحد بستر پر لیٹی تھی۔ شام کا سایہ گہرا ہوتا جارہا تھا اسے رہ رہ کر ان دو فوجیوں کی فکر ستارہی تھی۔ صبح سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ انہیں پانی دینا بھول گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بے چارے پیاسے ہوں گے۔

سوچتے سوچتے جب ذہن تھک گیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی دروازے پر کھڑے سنتری نے اسے ٹوکا۔ ''اے بڑی بی! کہاں جارہی ہو۔''

''بیٹا! میں بھی انسان ہوں۔ دن میں دو چار بار باہر تو جانا ہی پڑے گا۔'' گل بانو نے کہا' سنتری راستے سے ہٹ گیا۔ وہ باہر نکلی اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے وہ رک گئی اور مڑ کر بولی۔ ''بیٹا! میں ایک ضعیف و ناتواں عورت تمہارا کیا بگاڑ لوں گی۔'' پھر وہ وہیں کھیتوں کے درمیان بیٹھ گئی۔ اس کے پیچھے آنے والا فوجی واپس چلا گیا۔

وہاں سے آکر وہ پھر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اس وقت بھی اسے وہ دونوں بہادر فوجی یاد آرہے تھے ان زخمیوں کے لیے اس کا دل رو رہا تھا۔ انہیں کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

وہ بے خبر سو رہی تھی کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے فوجیوں کے سامنے کھڑی ہے۔ اور وہ وہ دونوں پیاس کی شدت سے تڑپ رہے ہیں اور بار بار پانی مانگ رہے ہیں۔ یکا یک اس کی آنکھ کھل گئی' جسے وہ خواب سمجھ رہی تھی وہ حقیقت تھا۔ واقعی وہ دونوں پانی مانگ رہے تھے اور بھارتی فوجی ان پر تشدد کررہے تھے۔

گل بانو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ان دونوں کی یہ حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے اس نے مٹھیاں بھینچ لی۔ بھارتی فوجیوں کے درمیان ان کا افسر ایک مونڈھے پر بیٹھا دونوں پاکستانی فوجیوں کو گھور رہا تھا۔ لالٹین کی زرد روشنی اس کے چہرے کو اور بھی خوفناک بنارہی تھی۔

''تم دونوں کس یونٹ سے تعلق رکھتے ہو۔'' بھارتی افسر کا یہ سوال گل بانو نے صاف سنا تھا۔ اس کا تین چار سال پرانا بہرا پن اچانک نہ جانے کیسے ختم ہوگیا اور اب جواب سننے کی متمنی تھی لیکن شعیب اور اس کا ساتھی بالکل خاموش تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے زبان نہ ہلانے کی قسم کھالی ہے۔

''کیا تم بہرے ہو' سنا نہیں میں نے کیا پوچھا۔ جلدی بولو کس یونٹ کے ہو۔'' اس افسر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا مگر ان دونوں نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ بھارتی افسر غصے میں تلملاتا ہوا اٹھ کر ان کے پاس آیا اور پھر پوری قوت سے اس نے شعیب کے زخمی پیر پر ٹھوکر ماری۔ شعیب کا وہ پیر پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ اس

ٹھوکر نے اس کی چیخ نکال دی۔ کرب سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا پھر بھی اس نے زبان نہ کھولی۔

شعیب کو خاموش دیکھ کر بھارتی افسر اس کے ساتھی کی جانب مڑا۔ اس کے پیر بھی شعیب کی طرح جھول رہے تھے۔ لگتا تھا دشمن کے گرنیڈ ان کے پیروں کے پاس پھٹے تھے تبھی تو وہ دونوں اس بری طرح زخمی تھے جنگی قوانین کے تحت زخمیوں کو طبی امداد دی جانی چاہیے مگر ایسا تو اس وقت ہوتا ہے جب دشمنوں میں ہلکی سی بھی انسانیت باقی ہو مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ سامنے وہ لوگ تھے جو اہنسا کا نعرہ لگا کر اہنسا کو نصب العین بنائے ہوئے تھے۔ کمزور پر بہادری دکھانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پاک وطن کو بھی کمزور سمجھ کر رات کے اندھیرے میں چڑھ دوڑے تھے اور جب چار چوٹ کی مار پڑنا شروع ہوئی تو دم دبا کر بھاگنے لگتے تھے اور اب ..... 'جوڑیاں' اکھنور کا غصہ ان زخمیوں پر اتار رہے تھے۔ شعیب کے ساتھی کا دہنا پیر زخمی تھا۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی بھارتی افسر نے اسی پیر کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''بول او بدذات' کس یونٹ کا ہے تو۔''

شعیب کے ساتھی نے بھی جواب نہیں دیا۔ درد کی شدت سے اس نے ہونٹوں کو دانتوں سے زور سے دبایا تھا کہ ہونٹوں سے خون نکل پڑا۔ فرش تو پہلے ہی پیروں کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ اب اس میں ہونٹوں سے ٹپکنے والے قطرے بھی شامل ہو گئے۔

''تو نہیں بتائے گا۔'' بھارتی افسر نے پھر جھٹکا دیا۔ یہ جھٹکا آخری ثابت ہوا' وہ دو دن سے زخموں کی ٹیس برداشت کر رہا تھا یہ نیا درد اس سے برداشت نہ ہو سکا اور حرکت قلب بند ہو گئی۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔ وطن کے نام پر وہ قربان ہو گیا۔

بھارتی افسر نے اسے ہلا کر دیکھا حرکت قلب کو محسوس کرنے کی کوشش کی اور پھر سر اٹھا کر ایک سپاہی سے بولا۔ ''اسے لے جا کر پہاڑی سے نیچے پھینک دو۔''

سپاہی نے اس بہادر جوان کی لاش کو اٹھایا اور باہر کی جانب بڑھنے لگا۔

بھارتی افسر نے ایک دوسرے سپاہی سے کہا۔ ''فرش کو پانی سے صاف کر دو' پورے گاؤں میں یہی ایک پختہ مکان ہے ورنہ میں کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو جاتا اور اس زخمی کو بھی برابر والے کمرے میں بند کر دو اس سے صبح بات ہو گی۔'' پھر اس نے گل بانو سے کہا۔ ''بڑھیا تو بھی کسی اور کمرے میں ٹھکانا بنا' مجھے سونا ہے۔

اندازِ فکر

☆ نفرت، نفرت سے نہیں محبت سے مٹتی ہے۔
☆ دوستی ہزاروں سے محبت ایک سے ہوتی ہے۔
☆ محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔
☆ محبت میں ادب اور بے ادبی کا فرق نہیں۔
☆ بڑوں کے آگے نہیں پیچھے چلو ورنہ اپنی منزل کھو بیٹھو گے۔
☆ بخیل اللہ کا دشمن ہے۔ چاہے زاہد ہو۔
☆ کتاب جیب میں رکھا ہوا ایک گلستان ہے۔
☆ اگر تم بڑا بننا چاہتے ہو تو پہلے چھوٹا بننے کی کوشش کرو۔
☆ اخلاق ایسا ہیرا ہے جو پتھروں کو کاٹ دیتا ہے۔
☆ جن لوگوں کے خیالات اچھے ہوں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔
☆ کسی کو اپنا بنانے سے خود کسی کا بن جانا بہتر ہے۔
☆ نفرت میں بتائے ہزاروں سال محبت میں ایک لمحہ بتانا بہتر ہے۔
☆ کسی کی خوشی کو چھوڑ کر کسی کا غم بانٹنے جانا بہتر ہے۔
☆ دوستی کا اصل مقصد دو ہاتھ ہیں۔
☆ اچھا دوست زمین کا نمک ہے۔
☆ وہ آدمی زندگی میں کبھی تنہا نہیں ہو سکتا جسے ایک پرخلوص دوست میسر ہو۔

چار دن سے جاگ رہا ہوں۔''

گل بانو بستر سے اتر گئی اور لاٹھی ٹیکتی ہوئی برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت وہ ایک ہی دعا کر رہی تھی کہ پاک فوج پہنچ جائے' دور سے گولوں کے پھٹنے کی آواز آ رہی ہے وہ نزدیک آ جائے۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گئی مگر اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی وہ غصے میں تلملاتی ہوئی کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔ یونہی کئی گھنٹے گزر گئے۔ اب مشرقی افق پر ہلکی ہلکی سپیدی نظر آنے لگی تھی۔

تبھی اس کے ذہن میں بجلی کا جھماکا سا ہوا اور وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے لاٹھی بھی نہیں لی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جوش نے اس کے اندر نئی توانائی بھر دی ہے۔ وہ جھکی جھکی آگے بڑھنے لگی۔ اس کے قدم اس کمرے کی جانب اٹھ رہے تھے جہاں وہ بھارتی افسر سو رہا تھا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ فرش پر یہاں سے وہاں تک بھارتی سپاہی سو رہے تھے۔ ان کا افسر اکلوتے بستر پر محوِ خواب تھا۔ شاید کئی دنوں کی شب بیداری نے انہیں بے سدھ کر دیا تھا۔

کھڑکی سے ہٹ کر وہ اس کمرے کی جانب بڑھی جس میں شعیب بند تھا۔ اس نے بمشکل کنڈی کھولی اور اندر داخل ہوگئی۔ شعیب بھی جاگ رہا تھا۔ شاید اسے درد کی شدت نے سونے نہیں دیا تھا۔ گل بانو دھیرے دھیرے اس کے قریب پہنچی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''میرے بہادر بیٹے کسی بھی طرح باہر نکلنے کی کوشش کرو' ورنہ یہ ظالم تمہیں بھی ختم کر دیں گے۔ میں دیکھ کر آئی ہوں وہ درندے بے خبر سو رہے ہیں۔ اس کمرے میں شراب کی بوتلیں بھی لڑھکی ہوئی ہیں۔ شاید ان پر نشہ طاری ہے' دراصل ان کی حکومت فوجیوں کو خاص طور پر شراب مہیا کرتی ہے۔'' شعیب نے کہا اور کرولنگ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ دونوں باہر آئے۔

''بیٹے تم آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اترو' اور اپنے علاقے کی طرف بڑھتے چلے جاؤ۔''

''اماں! وہ لوگ تھکے ہوئے ضرور ہیں مگر حالت جنگ میں ہیں' جنگ کا میدان دور سہی مگر اتنے بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔ جتنی جلدی ممکن ہو آپ بھی بھاگ چلیں۔''

''نہیں بیٹے! تم جاؤ مجھے کچھ کام ہے۔'' یہ کہتے ہوئے گل بانو مڑ گئی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے کمرے کی جانب دیکھا جس میں بھارتی سپاہی تھے۔ اس کمرے کی کنڈی اس نے پہلے ہی باہر سے لگا دی تھی۔ وہ باورچی خانے کی سمت بڑھی۔ مٹی کے تیل کے دونوں کنستر بھرے ہوئے تھے۔ مٹی کے تیل کا اسٹو بھی لبریز تھا' اس نے اس کو اٹھایا اور اسے کھڑکیوں پر خالی کر دیا پھر کنستر کے تیل کو پتیلیوں میں نکال کر اس نے کچھ دیر آرام کیا پھر وہ باری باری پتیلیوں کو لے کر باہر نکلی اور تمام دروازے کھڑکیوں پر تیل چھڑکتی چلی گئی۔ اس کام سے فرصت پا کر وہ باہر نکلی اور کھڑکی سے ماچس کی تیلی جلا کر اندر پھینک دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا گھر شعلوں کا جہنم بن گیا۔ اندر سے بھارتی فوجیوں کی چیخیں ابھر رہی تھی۔

جنگ ختم ہوگئی۔ شعیب بھی گھر لوٹ آیا۔ وہ پیروں سے معذور ہو چکا تھا مگر اس کا سینہ فخر سے بلند تھا۔ اس کے سینے پر تمغہ سجا ہوا تھا' رات گئے جب حاجی نور دین کے چوپال پر لوگ جمع ہوتے' اس سے جنگ کے بارے میں سوالات کرتے تو اس کی آنکھیں بھر آتیں اور آنکھوں میں گل بانو کا چہرہ تیرنے لگتا۔

ہمارے معاشرے کی عکاس.....ایک دلگداز..... سچی کہانی

میں کلف لگا کر کپڑے باہر پھیلانے گئی تو وہ ابھی بھی اسی طرح کھڑا تھا۔ میں جلدی جلدی کام ختم کر کے اندر آگئی۔ چائے کے برتن دھو کر سنک پر رکھے اور صبح کے لیے آٹا گوندھنے لگی۔ گھٹن محسوس کر کے میں نے کچن کی کھڑکی کھول دی جو عموماً بند ہی رہتی ہے۔ اس پر جالی لگی ہے تاکہ کیڑے وغیرہ اندر نہ آسکیں اس لیے رات کو میں اسے کھول دیتی ہو۔

وہ ادھ کھلا چہرہ

صائمہ کاردار

اس شمارے کے لیے ایک حساس و جذباتی و دل گداز سچی کہانی

ہم کچھ ہی دنوں پہلے گلشن معمار کے اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ خاصا خوب صورت اور بڑا گھر تھا۔ کچھ یہاں کا موسم بھی اس قدر خوب صورت لگتا تھا کہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کراچی کے کسی علاقے میں رہتے ہیں۔ سڑکوں پر دو رویہ اونچے اونچے درخت اسلام آباد کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ میں خوب صورتی کی دیوانی یہاں آ کر بے تحاشا خوش تھی۔ ایک ہفتہ تو گھر کی سیٹنگ کی نذر ہوگیا۔ بابا ایک پرائیویٹ ادارے سے منسلک تھے۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ میں' بڑے بھائی فاران بھائی شاید گھر کی تمام ذمے داریوں سے بری الذمہ ہوگئے تھے سو یہی سوچ کر الگ ہوگئے تھے۔ سلمان بھائی ایم ایس سی کر رہے تھے اس لیے یا تو وہ یونیورسٹی میں ہوتے یا پھر کمپیوٹر کے سامنے

اس کے علاوہ انہیں کوئی کام نہ تھا۔ امی کو کچن اور دوسرے کاموں سے فرصت نہیں ملتی تھی اگر کبھی مل بھی جاتی تو وہ کچھ نہ کچھ کام نکال ہی لیا کرتی تھیں۔ بابا صبح کے گئے شام کو آفس سے آتے۔ اس کے بعد وہ ہوتے اور اخبار یا پھر سامنے والے کرنل صاحب اور صدیقی صاحب کے ساتھ سیاست پر زبردست بحث چل رہی ہوتی۔ میں پورا دن گھر میں بور ہوتی رہتی۔ امی سے کچھ کہنا ہی فضول تھا۔ وہ فوراً مشورہ دیتیں' صفائی میں دل لگاؤ' کھانا وغیرہ پکالیا کرو۔ اب ان سے کون کہتا کہ چار افراد کا کام ہوتا ہے کتنا ہے۔

اس دن بھی میں لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ امی حسب عادت سلائی مشین لیے نہ جانے کیا سی رہی تھیں۔ بابا کیبل سسٹم کے سخت خلاف تھے' اس لیے پی ٹی وی پر ہی گزارا کررہی تھی۔ ڈور بیل کی آواز پر میری خوشی دیدنی تھی کیونکہ آج صبح ہی چھوٹی خالہ کا فون آیا تھا کہ شاید آج وہ لوگ آئیں۔ جلدی سے دروازہ کھولا تو وہاں ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر میں قدرے سٹپٹائی۔

میرے اس طرح گھبرا جانے پر اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ابھی میں نے کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بولی۔ ''میں آپ کے برابر والے گھر میں رہتی ہوں۔ یہ کھیر امی نے آپ کے لیے بھجوائی ہے۔'' اس نے ہاتھ میں تھامی پلیٹ میری جانب بڑھائی۔

''ارے آپ اندر آیئے ناں' دراصل ابھی گھر کی سیٹنگ مکمل کی ہے اس لیے کہیں آنے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ چلیں' ہم نے نہ سہی' آپ نے ابتدا تو کی۔''

میں اسے لے کر لاؤنج میں ہی آ گئی تھی۔ اس وقت تو وہ مجھے کسی نعمت سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ امی کو سلام کر کے وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی۔

پہلی ہی ملاقات میں میری اور شائلہ کی بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ ویسے بھی وہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے' جس سے بھی ذرا بے تکلفی سے ملے بس دوستی ہوگئی۔ کچھ ہی دنوں میں شائلہ کے ساتھ اس کی دوستوں سے بھی میری اچھی خاصی فرینڈ شپ ہوگئی تھی جن میں فرح' سعدیہ اور عالیہ بھی شامل تھیں۔ اب دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ ہم چاروں صبح جلدی جلدی کام نمٹا کر ایک دوسرے کے گھر بھاگتے تھے۔ میں اور شائلہ تو گریجویشن کے بعد فارغ تھے البتہ فرح اور سعدیہ تھرڈ ایئر اور فورتھ ایئر میں تھیں۔ ہم سب کی پسندیدہ جگہ ہمارے گھر کے سامنے والا برگد کا گھنا درخت تھا۔ رات کو ہم چاروں وہاں جمع ہوتے تھے۔ محلے کی چند لڑکیاں بھی ہمارے ساتھ مل کر بیڈمنٹن کھیلا کرتی تھیں۔

اس دن میں فرح کے ساتھ بیٹھی عالیہ کو کھیلتا دیکھ رہی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہمیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں نے بغور دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اسے اپنا وہم سمجھی لیکن تھوڑی دیر بعد پھر وہی محسوس ہوا۔ میں نے اچھی طرح درخت کے آس پاس کا جائزہ لیا لیکن کوئی نہیں تھا۔

میں خاموش ہو کر بیٹھ گئی لیکن ایک الجھن سی مجھ پر سوار ہو چکی تھی۔ بار بار یہی محسوس ہوتا کہ کوئی ہے جو مجھے دیکھ رہا ہے۔ شائلہ کو بتانے کا مطلب اپنا مذاق بنوانا تھا۔

کئی بار میں اٹھ کر دیکھ چکی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ تنگ آ کر میں گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شائلہ کو سر درد کا بہانہ کر کے بہلایا' تب اس نے مجھے آنے دیا۔

ابھی میں تھوڑی دور ہی چلی تھی کہ محسوس ہوا جیسے کوئی میرے ساتھ چل رہا ہے۔ میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ چاروں طرف اچھی طرح دیکھ لیا لیکن کوئی بھی نہیں تھا۔ سامنے ہی شائلہ' فرح کھیل رہی تھیں۔ میں نے ابھی قدم اٹھایا ہی تھا کہ یوں لگا جیسے کسی کا بھاری بھرکم ہاتھ میرے کاندھے پر جم

سا گیا ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈر کے مارے میری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ ایک قدم بھی اٹھانا محال تھا' نہ ہی میں آگے بڑھ پا رہی تھی نہ ہی پیچھے ہو رہی تھی۔ سوئے اتفاق اسی وقت شائلہ پلٹی تو اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا مگر جب میں نے کوئی رسپانس نہیں دیا اور یوں ہی بت بنی کھڑی رہی تو وہ گھبرا کر میرے پاس آ گئی۔

اس کے آتے ہی وہ بوجھ میرے کاندھے سے اتر گیا لیکن خوف کی وجہ سے میں ابھی تک بول نہیں پا رہی تھی۔ شائلہ مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔ میں چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہوا۔ خیریت تو ہے۔ میں اس وقت بھی یہی دیکھ رہی تھی کہ تم بار بار درخت کے پاس جا کر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے' کیا کچھ گم ہو گیا ہے۔ کیوں اس قدر ہونق ہوئی ہو۔'' اس نے میرا ہاتھ تھاما۔

میں نے بہ مشکل اپنے حواس بحال کیے۔ ''کچھ نہیں یار۔ بس یونہی ذرا چکر سا آ گیا ہے۔'' میں نے انگلیوں کی پوروں سے سر دباتے ہوئے کہا۔ ابھی تک میں اندر سے لرز رہی تھی۔

''بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔ اچھا چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آتی ہوں۔'' وہ مجھے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

امی ابھی نماز سے فارغ ہو کر پنج سورۃ پڑھ رہی تھیں۔ یہ ہمیشہ سے ان کی عادت رہی ہے کہ وہ ہر نماز کے بعد کچھ نہ کچھ پڑھتی ہیں اور آخر میں آیت الکرسی پڑھ کر دم ضرور کرتی ہیں۔

گھر میں آتے ہی میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا پھر سر جھٹک کر کچن کی طرف گئی۔ بابا عشاء کی نماز کے بعد فوراً کھانا کھا لیتے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے کچن صاف کیا اور چائے لے کر لاؤنج میں آ گئی۔ لاؤنج کے دروازے سے مین گیٹ صاف نظر آتا ہے۔ میں وہیں بیٹھ کر سلمان بھائی کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ آج تھوڑے لیٹ ہو گئے تھے۔

میں فلور کشن پر بیٹھی 'سنڈے میگزین' دیکھ رہی تھی کہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں سمجھی شاید سلمان بھائی آئے ہیں۔ یونہی سر اٹھا کر دیکھا تو یوں لگا جیسے کوئی تیزی سے اندھیرے کی طرف بھاگا ہو۔ میں اسے اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ میگزین دیکھنے لگی لیکن پھر وہی خوف محسوس ہوا۔ بے ساختہ ہی میرا ہاتھ کندھے پر اور نظریں گیٹ کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک پرچھائیں سی نظر آ رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا' تھوڑا آگے بڑھا تو برآمدے میں لگی ٹیوب لائٹ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ چہرے سے تو بہت ہی مہذب گھرانے کا فرد لگ رہا تھا۔ وہ جس رخ سے کھڑا تھا' اس کا آدھا چہرہ ہی مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے غصے میں آگے بڑھ کر لاؤنج کا دروازہ بند کر دیا اور دل ہی دل میں اسے کوستی ہوئی امی کے کمرے میں آ گئی جو اپنے کاٹن کے دوپٹے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

''مریم بیٹا' کچن سمیٹ لیا ہے تو اب ذرا ان دوپٹوں پر کلف لگا دو۔ ململ کے دوپٹے بغیر کلف کے عجیب سے لگتے ہیں اور ہاں یہ میرے دو سوٹ بھی ہیں ان پر بھی کلف لگا دینا۔ جب سوکھ جائیں گے تو ہم دونوں مل کر استری کر لیں گے۔''

میں کپڑے اٹھا کر جانے لگی تو وہ کہنے لگیں۔ ''ارے ہاں' پہلے کلف کو اچھی طرح گھول لینا ورنہ پھر گٹھلیاں بن جائیں گی۔''

میں کلف لگا کر کپڑے باہر پھیلانے گئی تو وہ ابھی بھی اسی طرح کھڑا تھا۔ میں جلدی جلدی کام ختم کر کے اندر آ گئی۔ چائے کے برتن دھو کر سنک پر رکھے اور صبح کے لیے آٹا گوندھنے لگی۔ گھٹن محسوس کر کے میں نے کچن کی کھڑکی کھول

دی جو عموماً بند ہی رہتی ہے۔ اس پر جالی لگی ہے تاکہ کیڑے وغیرہ اندر نہ آسکیں اس لیے رات کو میں اسے کھول دیتی ہو۔ آٹا گوندھ کر میں نے فریج میں رکھا اور ہاتھ دھوتے ہوئے یونہی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی وہ ابھی بھی وہاں کھڑا تھا۔

میں غصے میں کھڑکی بند کرنے آگے بڑھی ہی تھی کہ سڑک پر گزرتی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ اس کے چہرے پر پڑی۔

خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اس کا آدھا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا اور اس پراسرار ماحول میں اور بھی ہیبت ناک لگ رہا تھا۔

میں چیختی ہوئی لاؤنج کی طرف بھاگی۔ بابا ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا ہوا۔ ارے ہوا کیا۔'' وہ میری جانب بڑھتے ہوئے بولے۔

''بابا! ..... وہ ..... وہ ..... وہاں۔'' میں کچن کی طرف اشارہ کر کے بری طرح رو رہی تھی پھر وہ اندر گئے۔ تھوڑی دیر بعد آئے تو میں امی سے لگی کھڑی تھی۔

انہیں باہر آتا دیکھ کر امی نے پوچھا۔ ''کیا تھا اندر۔''

''ارے بھئی' کچھ نہیں تھا۔ آپ کی بہادر بیٹی چھپکلی سے ڈر گئی تھیں۔'' بابا ہنستے ہوئے بولے۔

''ارے ننھا سا دل ہے تمہارا' چھپکلی سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔ بیٹا چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اپنے اندر ہمت و حوصلہ پیدا کرو ورنہ زمانے سے جیت نہیں پاؤ گی۔'' بابا میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔ ''چھوٹی چھوٹی سی چیزوں سے ڈرنا کہاں کی عقلمندی ہے' انسان کو اتنا حوصلہ مند ہونا چاہیے کہ وہ ہر مشکل کو بہ آسانی فیس کر لے۔''

وہ پیار سے مجھے سمجھا رہے تھے اور میرے اندر سکون اترتا جا رہا تھا۔ بابا ہیں ہی ایسے' بے حد نرم خو' پیار کرنے والے اور بقول امی' مجھے بگاڑنے والے بھی ..... اس وقت تو میں بہل گئی لیکن پھر بھی وہ چہرہ میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔

☆☆

''مریم بیٹا' کبھی تو بغیر کہے نماز پڑھ لیا کرو۔ ہر وقت ٹی وی ہوتا ہے یا پھر رسالہ' اٹھو چلو جا کر وضو کرو۔''

مجھے ٹی وی کے آگے جمے دیکھ کر شاید امی کو غصہ آ گیا تھا۔ میں خاموشی سے وضو کرنے واش روم چلی گئی کیونکہ اس وقت کچھ کہنا امی کے غصے کو دعوت دینا تھا۔ بلا ارادہ ہی میری نظر روشن دان کی طرف اٹھی۔ وہی آدھا جھلسا ہوا چہرہ وہاں سے جھانک رہا تھا۔ دن کی روشنی میں بھی وہ چہرہ حد درجہ کراہیت آمیز اور خوفناک لگ رہا تھا۔ میرے روم روم سے پسینا پھوٹنے لگا۔ آواز حلق کے اندر ہی مسٹ کر رہ گئی۔ میں جلدی سے باہر آ گئی۔ کمرے میں کھڑے ہو کر اپنی حالت کو کنٹرول کیا اور ڈرتے ڈرتے باہر واش بیسن پر جا کر وضو کرنے لگی ابھی میں نے کلی کرنے کے لیے منہ میں پانی بھرا ہی تھا کہ شیشے میں پھر وہی جھلسا ہوا چہرہ ابھر آیا۔ میں گھبرا کر جو پلٹی تو سامنے مین گیٹ پر بھی وہی چہرہ نظر آ رہا تھا۔ میرے قدم جم سے گئے۔ اب حالت یہ تھی کہ میں نہ اندر جا پا رہی تھی نہ ہی یہاں کھڑے رہنا چاہتی تھی۔ کوئی قوت تھی جو مجھے آگے بڑھنے نہیں دے رہی تھی پھر خود بخود ہی میرے منہ سے آیت الکرسی کے الفاظ ادا ہونے لگے اور ساتھ ساتھ میں نارمل ہوتی چلی گئی۔

اس کے بعد میں وہاں نہیں رکی۔ اندر کمرے میں پہنچ کر سکون کا سانس لیا اور یہ سوچ کر کہ آج میں امی کو سب کچھ بتا دوں گی' وضو

کرنے چلی گئی۔

نماز پڑھ کر میرا خوف ختم ہوگیا اور میں بالکل پرسکون ہوگئی۔ ابھی میں امی کے پاس جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ خود ہی آگئیں اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

''آج کل تم کچھ پریشان سی ہو' کوئی بات ہوگئی ہے۔ یا فارغ بیٹھنے سے تنگ آگئی ہو۔ ایک تو تمہارے بابا کو بھی یہی جگہ ملی تھی گھر لینے کے لیے' پوری دنیا سے کٹے بیٹھے ہیں۔ بس یہ سوچ کر کہ اس زمانے میں اللہ نے اپنی چھت تو دی ہے' اس کا جتنا بھی شکر کروں' کم ہے۔ تم یوں کرو کہ شمائلہ کے ساتھ کسی انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لے لو۔ کچھ ذہن بٹ جائے گا اور وقت بھی کٹ جائے گا۔'' انہوں نے جیسے میری پریشانی کی وجہ ڈھونڈ لی۔

''نہیں امی' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بہت مطمئن تھی یہاں بلکہ مزے میں تھی لیکن پتا نہیں کیوں کچھ دنوں سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھے دیکھتا ہے۔ اب تو اس کا چہرہ بھی واضح نظر آنے لگا ہے۔ امی مجھے بڑا خوف آتا ہے اسے دیکھ کر۔ پتا ہے اس کا آدھا چہرہ جھلسا ہوا ہے۔ وہ کچھ کہتا نہیں ہے' صرف دیکھتا ہے لیکن مجھے اس قدر ڈر لگتا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔''

سب کچھ بتاتے ہوئے شاید میرے چہرے پر خوف کے بڑے گہرے سائے سے لہرائے تھے جسے محسوس کرکے امی پریشان سی ہوگئی تھیں۔

☆☆

میں جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ بس ایک جھٹکے سے اسٹاپ پر رکی تو میں جیسے چونک سی گئی۔ آج میں امی کے ساتھ بازار گئی تھی۔ واپس آتے آتے ہمیں شام ہوگئی تھی۔ اسٹاپ سے ہمارا گھر دور نہیں تھا۔ سڑک کراس کرکے ہم نے اپنے بلاک کی طرف چلنا شروع کردیا۔ ریسٹ ہاؤس

اندازِ فکر

☆ اگر تم سیکھنا چاہتے ہو تو تمہاری ہر غلطی تمہیں سبق دے سکتی ہے۔

☆ پہاڑ سے گرنا لوگوں کی نظروں میں گرنے سے بہتر ہے۔

☆ اگر تو کہتا ہے کہ تیرے میں کوئی خامی نہیں تو یہ تیری بڑی خامی ہے۔

☆ اگر تم آکاش میں بھی مشہور ہونا چاہتے ہو تو اپنے وعدے کی پاس داری کرو۔

☆ علم کے بغیر عمل کے نتیجے اچھے نہیں نکلتے۔

☆ دیکھے بغیر کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو۔

☆ کتاب ایک استاد ہے جو فیس نہیں لیتا۔

☆ طنز نظر کی ایسی عینک ہے جس میں اپنے سوا سب نظر آتے ہیں۔

☆ اپنے دوست کو سب کچھ دے دو مگر اپنا راز کبھی نہ دو۔

☆ اللہ تعالیٰ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

☆ دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

☆ ایک اچھا مسلمان وہی ہے جو حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہے۔

☆ دنیا کو آزماؤ کیونکہ یہ دنیا تمہارے لئے ہے تم دنیا کے لئے نہیں۔

☆ کسی کو بھی ہمراز نہ بناؤ کیونکہ اپنے راز اپنوں کے دلوں سے کھل جاتے ہیں۔

☆ کسی چیز پر اپنا زور نہ جتاؤ کیونکہ اگر وہ چیز تمہارے نصیب میں ہے تو ضرور ملے گی۔

☆ دل کا حسن چہرے کو بھی خوبصورت بنا دیتا ہے۔

☆ دنیا میں تمام چیزوں کی حد ہے۔ سوائے علم کے۔

☆ زیادہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔

سے سیدھی طرف مڑے ہی تھے کہ مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا' ایک پررونق شام ہوتے ہوئے بھی مجھے ایک نامانوس سے سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ خود بخود ہی میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ چونکی میں اس وقت جب امی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے روکا۔

''ادھر کہاں جا رہی ہو۔'' ان کے انداز میں حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی تھی۔ تب میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ میں اپنی گھر کی مخالف سمت جانے والی سڑک پر چل رہی تھی۔

''پپ..... پتا نہیں۔'' میں حواس باختہ سی ہو گئی۔

امی نے غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا اور مڑ کر گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

''صرف ہاتھ نہ پکڑ' کچھ اور بھی کر' ورنہ یہ نہیں رکے گی۔''

یہ واضح اور تیز آواز سن کر ہم دونوں ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ نہ صرف میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا بلکہ امی بھی سراسیمہ نظر آ رہی تھیں۔ آواز بالکل واضح تھی اور قریب ہی سے آئی تھی۔

میرے ہاتھ پر امی کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ پھر کیا کیا ہوتا رہا' مجھے کچھ خبر نہیں۔ امی اور بابا میرے لیے کتنا خوار ہوتے رہے' مجھے اس کا بھی علم نہیں۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ اس دن گھر آ کر امی نے جب بابا کو تمام حالات بتائے تھے تو وہ بھی پریشان ہو گئے تھے پھر وہ اپنے طور پر کسی عامل کامل کو ڈھونڈنے لگے تھے کیونکہ امی کا کہنا تھا کہ ایسی باتیں اگر گھر سے باہر نکل جائیں تو سارے زمانے میں پھیل جاتی ہیں۔

☆☆

کیا کریں بھئی' ہمارے معاشرے کا چلن ہی ایسا ہے لڑکی ٹھیک ہو بھی تو ساری زندگی لوگ شک کی نظر سے دیکھتے رہتے ہیں۔ آخر میری بیٹی کا معاملہ تھا' سو میں نے محلے پڑوس میں یہ بات کسی کو نہ بتائی۔ بس اتنا کیا کہ مریم کا تنہا باہر نکلنا بند کر دیا۔ خصوصاً شام کے وقت تو میں اسے ہرگز بھی نہ نکلنے دیتی یہ صبح شام اس پر آیت الکرسی اور مختلف آیات کا دم کرتی رہتی۔

ان کوششوں سے مریم کی حالت قدرے بہتر لگنے لگی تھی۔ ایک دو بار تو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ مریم کا وہم تو نہیں ہے کیونکہ آس پاس کے گھروں کی سب ہی لڑکیاں شام کو باہر کھیلتی اور گھومتی نظر آتی ہیں جن میں سے کئی ایک تو بلاشبہ مریم سے زیادہ خوب صورت بھی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر جس دن مجھے یہ خیال آیا' اسی دن مجھے اس کا جواب بھی مل گیا۔

اس دن صبح دس بجے کے قریب میں گھر کے باہر لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ مریم اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اب کی کیاری میں پانی ڈالتے ہوئے میں کچھ چونک سی پڑی۔ کیاری کے بالکل آخری سرے پر ایک سرسبز اور گھنا پودا نظر آ رہا تھا۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ پودا میرے لیے بالکل اجنبی تھا جبکہ میرے ہاں تمام پودے میرے ہاتھ کے لگے ہوئے تھے۔ گھر میں کوئی اور تو پودوں کی طرف پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ یہ پودا گلاب کا نہیں تھا۔ اس کے نوکیلے پتے اور لچک دار شاخیں میرے لیے بالکل نامانوس تھیں۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی خود رو پودا ہو لیکن مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ کل تک یہ پودا کیاری میں نہیں تھا۔ میں تو روزانہ ہی اپنے پودوں کی دیکھ بھال کرتی ہوں اور کیاری کا ہر ہر پودا میری نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔

میں نے حیرت کے عالم میں جونہی پودے کی ایک شاخ کو پکڑنا چاہا' مجھے یوں لگا جیسے کوئی درد سے کراہا ہو۔ گھبرا کر میں نے شاخ چھوڑ دی اور ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کچھ بھی ایسا نہ تھا کہ میں ڈرتی۔ میں نے یوں لڑکیوں کی طرح

ڈرنے پر خود کو سرزنش کی اور پودے کا بغور جائزہ لینے کے لیے جھکی تو حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔

میری نظر کیاری سے ہٹ کر سڑک پر پڑے ہوئے پانی پر جا اٹکی جو ان چند لمحوں میں پائپ سے مسلسل بہہ کر جمع ہو گیا تھا۔

پانی کی سطح پر ایک چہرہ ہلکورے لے رہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر بغور دیکھا۔ وہ ایک نوجوان کا چہرہ تھا جو ایک طرف سے بری طرح سے جھلسا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے' میں نے دم سادھ کر دیکھا تو مجھے اس کی آواز بھی سنائی دی۔ ''مریم کو بھیج دو' مریم کو بھیج دو۔''

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں گھبرا کر پلٹی اور اندر گھس کر گیٹ بند کر دیا۔ ابھی میں نے بولٹ لگایا ہی تھا کہ اندر سے مریم کے چیخ سن کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ میں دیوانہ وار اس کے کمرے کی طرف دوڑی۔ وہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ میں نے واش روم کا دروازہ دھڑ دھڑایا تو اندر سے آتی مریم کی چیخیں یک لخت تھم گئیں۔ فضا میں سناٹا چھا گیا۔

''مریم' مریم بیٹا! دروازہ کھولو' کیا ہوا تمہیں۔'' میں نے گھبرا کر اسے آوازیں دیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور وحشت سے آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرا سہارا پاتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

پھر کتنے ہی دن ہم پریشان رہے۔ مریم بالکل بستر سے لگ گئی تھی۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ آنکھیں موندے پڑی رہتی۔ میرے اصرار پر بہ مشکل آنکھیں کھولتی اور چند نوالے کھاتی۔ کسی کھڑکی یا روشن دان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کرتی۔ دروازے تک جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ وہی جھلسا ہوا خوفناک چہرہ اسے ہر کھڑکی' ہر

اندازِ فکر

☆ بدترین شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

☆ دنیا کے بازار میں زندگی کا سب سے قیمتی سکہ حوصلہ ہے۔

☆ محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

☆ جو تم سے چھینے اسے عطا کرو۔

☆ جو تم سے تعلق توڑے۔ اس سے تعلق جوڑو۔

☆ رشتوں اور انسانوں سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں ہوتا بشرطیکہ وہ ہمارے ساتھ مخلص اور پرخلوص ہوں۔

☆ سچائی اللہ کی زمین میں اس کی تلوار ہے کہ جس چیز پر لگتی ہے اس کو کٹ کر رکھ دیتی ہے۔

☆ نیکیاں کر کے بھول جاؤ اور اگر گناہ سرزد ہو جائے تو اسے یاد رکھو۔

☆ جس چیز کا علم نہیں اسے مت کہو، جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جستجو نہ کرو اور جو راستہ معلوم نہیں اس پر سفر نہ کرو۔

☆ بخیل کی دولت اس وقت اوپر آتی ہے۔ جب وہ خود زمین کے اندر چلا جاتا ہے۔

☆ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔

☆ احسان ہر جگہ بہتر ہے لیکن ہمسائے کے ساتھ بہترین ہے۔

☆ دانا بولنے سے پہلے سوچتا ہے، بے وقوف بولنے کے بعد۔

☆ جوتا خواہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو پیروں میں ہی اچھا لگتا ہے۔

☆ ماں کی گود انسان کی پہلی درسگاہ ہے۔

☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔

☆ علم دل کو اس طرح زندہ رکھتا ہے جیسے پانی زمین کو۔

☆ اچھی صورت کے مقابلے میں اچھی سیرت کا مقام بلند ہوتا ہے۔

روشن دان سے نظر آتا اور اپنے پاس بلاتا۔ چند ہی دنوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ اس کے بابا اور سلیمان بھی پریشان تھے۔ اس کی سہیلیاں حیران تھیں کہ آخر اسے کیا ہوا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا خوف اور پریشانی سے میرا خود برا حال تھا۔ ادھر کیاری میں وہ پودا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ان چند دنوں میں وہ دو ڈھائی فٹ کا ہوگیا تھا۔ میں جب جب اسے دیکھتی' میرے اندر خوف کی سرد لہر دوڑ جاتی تھی جیسے یہ پودا نہ ہو' کچھ اور ہی شے ہو۔

ایک دن میں انہی سوچوں میں الجھی بیٹھی تھی کہ باہر سے آتی آوازیں سن کر چونک پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کو اذیت دی جارہی ہو اور وہ درد سے تڑپ رہا ہو۔ چند لمحے تو میں سنتی رہی مگر جب برداشت نہ ہوا تو اٹھ کر باہر آگئی۔ کیاری پر نظر پڑتے ہی میں حیران رہ گئی۔

خاکستری بالوں اور ابھی داڑھی والا ایک مجہول سا بوڑھا اس پراسرار پودے کو ہلا جلا کر دیکھ رہا تھا۔ بے ساختہ ہی میری ہلکی سی چیخ نکل گئی جسے سن کر وہ بوڑھا میری طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے مجھے وحشت ہونے لگی۔ اس نے پودے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کچھ پوچھا۔

میں نے اس کی بات پر غور ہی نہیں کیا۔ مجھے تو اس کی آواز نے چونکا دیا تھا۔ بلاشبہ یہ وہی آواز تھی جو اس دن بازار سے واپسی پر سنائی دی تھی کہ 'صرف ہاتھ نہ پکڑ' کچھ اور بھی کر' ورنہ یہ نہیں رکے گی۔

''یہ پودا کس نے یہاں لگایا۔'' تیز چیختی ہوئی آواز پر میں چونک پڑی۔ شاید میری حیرت پر اس بوڑھے نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا تھا۔

''پپ..... پتا نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں تو خود اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نیم وا گیٹ اچانک دھڑ سے پورا کھل گیا جیسے کسی نے ٹھوکر مار کر کھول دیا ہو۔ چونکہ میں گیٹ کا پٹ تھامے کھڑی تھی اس لیے ایک دھکے سے نیچے جا گری۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اس بوڑھے نے ایک لمبی جست لگائی اور مجھ پر سے چھلانگ لگا کر اندر داخل ہوگیا۔

منڈیر پر سر لگنے سے چند لمحوں کے لیے میرا ذہن ماؤف ہوگیا تھا مگر میں نے بڑی ہمت سے خود کو سنبھالا۔ مجھے اپنے گھر سے زیادہ مریم کی فکر تھی سو میں تیزی سے اٹھ کر اندر کی طرف بھاگی۔

مریم کے کمرے میں آوازوں اور چیخوں کا ایک طوفان بپا تھا۔ مریم اپنے بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی اور وہ بوڑھا بیڈ کے پاس ہی کسی سے نبرد آزما تھا۔ یقیناً وہ بوڑھا وہاں اکیلا تھا مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی نادیدہ وجود سے ہاتھا پائی میں مصروف ہے۔ اس وقت اس بوڑھے پر وحشت سوار تھی بلکہ اس کے اندر سے دیوانگی جھلک رہی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا بھی جا رہا تھا۔ اس کے مقابل جو کوئی بھی تھا' اس کی آوازوں سے اذیت اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔ میں دم سادھے کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایسا لگا جیسے بوڑھے نے اپنے مدمقابل کو زیر کرلیا ہو۔ چند لمحوں تک وہ اس نادیدہ وجود کو گھورتا رہا' پھر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

کمرے میں اب سکوت طاری تھا۔ میں خوف سے کانپتے ہوئے اس بوڑھے کو دیکھ رہی تھی جو اپنے بوسیدہ لباس کی جیب میں کچھ ٹٹول رہا تھا پھر اس نے مٹھی بھر کر کوئی چیز نکالی اور زیرلب کچھ پڑھتے ہوئے اس نادیدہ وجود کی طرف اچھال دی۔ ہلکا سا دھواں اٹھا جس کے تحلیل ہوتے ہوتے اس وجود کے خدوخال نظر آنے لگے۔ یہ ایک نوجوان تھا جس کا آدھا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ یہ وہی چہرہ تھا جو مجھے پانی میں نظر آیا تھا اور یقیناً مریم کو بھی یہی چہرہ نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ نوجوان بے سدھ پڑا ہوا تھا پھر میرے دیکھتے ہی

دیکھتے وہ ہڈیوں کا پنجر بن گیا۔ اب میرے سامنے بوسیدہ اور جلی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں۔ یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں جیسے ٹرانس میں کھڑی ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی کہ بوڑھے کی آواز آئی۔

''چار آدمی بلا کر اس کی نماز جنازہ پڑھوا دینا اور دفنا دینا۔ پھر یہ کبھی نہیں آئے گا۔''

''مگر یہ ہے کون۔'' میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر جلدی سے پوچھا کیونکہ اس بوڑھے نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ میری آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''چھوڑ اسے' تیری بیٹی اب ٹھیک ہے' پھر کیا کرنا۔''

''نہیں بابا' تمہیں اللہ کا واسطہ' میری الجھن دور کرتے جاؤ۔''

یہ جملہ میرے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا اور میرے اس انداز پر وہ جھلا گیا تھا۔

''خوانخواہ کی ہٹ ! اب یہ واسطہ دے دیا۔'' وہ بڑبڑا کر پہلے تو خاموش ہوگیا پھر ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

''یہ بہت پہلے کی بات ہے جب یہاں نئی نئی آبادی ہوئی تھی۔ یہ لڑکا شام کو روزانہ اپنی منگیتر کو لیے گھومنے نکلتا تھا۔ بڑا بانکا سجیلا تھا اور اس کی منگیتر' وہ۔''

بوڑھے نے مریم کی طرف اشارہ کیا۔

''بالکل اسی کی ہم شکل تھی۔ وہ رہتی بھی اسی گھر میں تھی اور اس کا نام بھی مریم تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ بڑے سجتے تھے پھر کسی نے جائداد کی دشمنی میں آکر برگد کے نیچے اس لڑکے پر حملہ کروا دیا۔ وہ جل کر مر گیا۔ وہ اپنی منگیتر کو مدد کے لیے پکارتا رہا مگر وہ اس دن گھر پر نہ تھی۔ دشمنوں نے اس کی لاش گھر کے سامنے ہی دبا کر زمین برابر کر دی تھی۔ اس لڑکی کا انتظار کر کر کے تھک گئی تو وہ لڑکی بھی یہ گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اس گھر میں بہت سے لوگ رہے مگر اس نے کسی کو تنگ نہیں کیا تھا لیکن تمہاری بیٹی اس کی منگیتر کی اتنی ہم شکل ہے کہ وہ یقیناً پاگل ہوگیا ہوگا۔ اب میں چلتا ہوں۔ جو میں نے کہا تھا' ضرور کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ بوڑھا باہر نکل گیا۔

ہم نے اسی دن ان بوسیدہ اور سوختہ ہڈیوں کو پوری عزت و تکریم کے ساتھ کفن میں لپیٹ کر قبرستان میں دفن کروا دیا اور اس کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پاک ختم کروایا۔

شام تک مریم کی حالت بھی سنبھل گئی تھی۔ اب وہ بہت بہتر نظر آرہی تھی۔ شام ڈھلے جب ہم سب گھر والے جمع تھے اور میں اسے پوری روداد سنا رہی تھی تو اچانک مجھے اس پودے کا خیال آیا۔ میں اٹھ کر باہر گئی تو کیاری کے اس کونے پر چند سوکھی شاخوں اور پتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

اب تو اس قصے کو بھی کئی سال بیت چکے تھے۔ مریم کی شادی ہوچکی ہے۔ اتفاق سے اس کی سسرال بھی یہیں ہے۔ اس کا نٹ کھٹ بیٹا داؤد' کئی بار میری کیاری اجاڑ چکا ہے مگر اب مجھے کسی چیز کا ڈر خوف نہیں ہے۔

اندازِ فکر

☆ اگر موتی کیچڑ میں گر جائے تو موتی ہی رہتا ہے۔

☆ اگر چڑیاں متحد ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔

☆ اپنی ہار پر مایوس نہ ہو کیونکہ تیری ہار میں کسی کی جیت ہے۔

☆ سونے پر سونے کا غلاف چڑھانا اور گلاب کے پھول پر خوشبو چھڑکنا بالکل بے کار ہے۔

☆ اصلیت کسی چیز کی محتاج نہیں۔

انڈر اسٹینڈنگ

عطیہ زاہرہ

میں دنگ رہ گیا' کیا فلسفیانہ بات تھی جو دلاور جیسے کم گو شخص کی زبان سے نکلی تھی لیکن ایک ٹھوس حقیقت تھی بہرحال اب یہ حالات زندگی بن چکے تھے دفتر اور پھر گھر کے کام کاج دلاور آتا رہتا تھا روشن آرا ابھی آرام سے زندگی گزار رہی تھی خدا کا شکر تھا کہ اس کی وجہ سے ابھی تک کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی بلکہ اب وہ کسی حد تک بردبار نظر آنے لگی تھی اسے لکھنے پڑھنے سے بہت دلچسپی تھی اس کی فرمائش پر میں نے اخبار لایا تھا اور کچھ رسالے بھی وہ زیادہ تر لکھنے پڑھنے میں لگی رہتی تھی کھانا وغیرہ میں ہی پکاتا تھا اس نے کبھی اس معاملات میں دلچسپی نہیں لی تھی کبھی کبھی اس کا انداز بہت نرم ہوجاتا تھا ایک دن موسم ابر آلود تھا۔ وہ کچھ اداس سی بیٹھی تھی ایک بار میری نظریں اس کی طرف اٹھیں تو وہ مجھے دیکھ رہی تھی غیر ارادی طور پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ایک معاشرتی کہانی' عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

پتہ نہیں رشتے کیا ہوتے ہیں۔ ان سے بہت سی کہانیاں منسوب ہیں۔ ماں۔ بہت کچھ' باپ' ایک مضبوط دیوار' بہن' بھائی۔ سارے دنیاوی کھیل پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا' لیکن اس وقت دنگ رہ گیا جب ابو نے کہا۔

''تمہیں میری بات بہت بری لگے گی۔ لیکن وقت اور حالات دیکھو۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کررہی ہے۔ مایا تہذیب کے مطابق 21 دسمبر کو دنیا ختم ہونے والی تھی۔ قیامت آنے والی تھی۔ خیر وہ فضول بات تھی لیکن قیامت تو مسلسل آئی ہوئی ہے۔ انسان قیامت سے ہی گزر رہا ہے۔ یہ قیامت مختلف شکل میں اس پر ٹوٹی ہوئی ہے۔ گیس غائب' پانی غائب' بجلی غائب' نوکری غائب' ضروریات زندگی غائب۔ پھر جینے کے لیے کیا ہے۔''

''جی ابو.....'' میں نے مجرمانہ انداز میں کہا۔ جیسے یہ سب کچھ میری وجہ سے غائب ہوا ہو۔

''ہم دن رات تمہاری نوکری کا انتظار کررہے ہیں۔ اور اب بیزار ہوگئے ہیں۔ بتاؤ کیا کریں۔''

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے ابو۔''

''ہاں۔ بتاؤ۔''

''میں کراچی چلا جاتا ہوں۔ وہاں نوکری تلاش کروں گا۔''

''ہوں۔ اچھا خیال ہے۔ جاؤ قسمت آزمائی کرو۔''

اور میں قسمت آزمائی کے لیے تیار ہوگیا۔ صاف پتہ چل گیا تھا کہ ماں' باپ اب مجھ جیسے نکھٹو سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ اپنی جگہ ٹھیک بھی تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر نہ جانے کیا کیا۔ جتن کر کے مجھے تعلیم دلائی تھی اور میں نے نوکری کے لیے کیا کیا جتن نہ کئے تھے لیکن.....اب کیا ہوگا۔

خیر۔ کراچی آ گیا..... کھوٹہ سکہ بہت آزمایا۔ کھوٹا سکہ بہت آزمایا۔ یعنی دلاور.....وہ شناسا جسے ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ کیونکہ ذرا آوارہ مزاج تھا۔ لیکن کراچی میں وہی کام آیا۔ اس نے نہ صرف رہنے کے لیے عارضی ٹھکانہ دیا۔ بلکہ ایک نوکری بھی دلادی' البتہ رہنے کی جو جگہ تھی وہاں دلاور کو بھی میری وجہ سے بہت تکلیف تھی۔

چنانچہ نوکری کے بعد گھر کی تلاش شروع ہوگئی۔ گھروں کی کمی نہیں تھی لیکن سب سے اہم سوال یہ تھا کہ لوگ ایک چھڑے چھانٹ' جوان اور خوبصورت شخص کو گھر دینے پر آمادہ نہیں تھے۔

''کبھی نہیں ملے گا گھر.....دلاور۔''

''کیوں۔''

''جب تک تم خود کو شادی شدہ نہیں بتاؤ گے۔''

''اب۔ جھوٹ بولوں گا۔''

''ہاں۔''

''او یار.....مگر بیوی کہاں سے لاؤں گا۔''

''یہ کراچی ہے۔''

''تو پھر۔''

''کونسی چیز تمہیں مل جاتی یہاں۔''

''گویا کرائے کا گھر حاصل کرنے کے لیے پہلے شادی کروں۔''

''نہیں۔''

''یار صاف صاف بتاؤ پلیز۔''

''عارضی بیوی حاصل کی جاسکتی ہے۔''

''کون کرے گا۔''

''میں..... ڈھونڈو کیا۔ دوسرا میں واحد مددگار تمہارا۔'' میں نے یہ بھی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور جب مکان مالک نے میرا انٹرویو کیا تو میں نے کہا۔

''جی۔ شادی شدہ ہوں۔''

''ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں۔ دیکھیے ہم بڑی

فیملی کو گھر نہیں دیتے۔''

''میرے بچے نہیں ہیں۔''

''سبحان اللہ۔ تو پھر اہلیہ سے میری اہلیہ کی ملاقات کرادیں۔ انڈر اسٹینڈنگ ہوجائے گی۔''

''وہ ابھی گاؤں میں ہیں۔ گھر ملنے پر آجائیں گی۔''

''تو سمجھیں گھر مل گیا۔ تین ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کردیں' اور جیسے ہی اہلیہ آئیں چابی لے لیجئے۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

دوسرے سے بات کی تو اس نے کہا۔

''کوئی مشکل ہی نہیں رہی کرایہ ادا کردو۔''

''اور..... وہ۔''

''یار۔ میں نے وعدہ کیا ہے پورا کردوں گا۔''

کرایہ ادا کرتے ہوئے دل کانپ رہا تھا خدا خیر کرے پتہ نہیں کیا ہوگا کہیں پیسے نہ ڈوب جائیں لیکن دلاور کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ ہرفن مولا ہے اور سب کچھ کرسکتا ہے میرا خیال بالکل ٹھیک نکلا' تیسرے دن اس نے ایک برقعہ پوش خاتون کو میرے سامنے کھڑا کرکے کہا۔

''ان سے ملو یہ تمہاری بیگم ہیں۔''

میں نے بوکھلا کر اس برقعہ پوش کو دیکھا اور اس نے مسکراتے ہوئے نقاب الٹ دیا' میری نظریں جھک گئیں وہ کوئی انتہائی بے جھجک اور تیز طرار لڑکی تھی۔ نسوانیت کا کوئی نشان اس کی شخصیت میں نہیں تھا۔ وہ مجھے شرارت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ان کا نام روشن آرا ہے۔ بازار حسن سے تعلق رکھتی ہیں ایک بدمعاش سے ان کی دشمنی ہوئی ہے۔ ان سے بات کرلی ہے یہ کچھ وقت ماری بیوی کی حیثیت سے گزاریں گی انہیں بھی پناہ گاہ مل جائے گی اور تمہارا کام بھی بن جائے گا۔''

روشن آراء بیٹھ گئی اس نے سگریٹ جلایا اور اس کے کش لینے لگی' اس وقت ہم ایک ہوٹل کے کمرے میں تھے تھوڑی دیر تک میں دلاور کے ساتھ وہاں رکا پھر اسے وہیں چھوڑ کر پھر باہر آگئے دلاور چلا گیا اور میں شمس الدین شیخ سے گھر کی چابی لینے چل پڑا چابی حاصل ہوگئی اور یہ بے ہودہ عورت میرے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوگئی لیکن میں رواں رواں کانپ رہا تھا میں اس عورت کے ساتھ تنہا اس گھر میں وقت کیسے گزار سکوں گا پاس پڑوس کے لوگوں نے اسے دیکھا تو کیا سوچیں گے۔

گھر چھوٹا سا تھا گنجان علاقے میں تھا لوگ ایک دوسرے سے قریب رہتے تھے ویسے تو بات سنبھالی جاسکتی تھی لیکن روشن آراء کے طور طریق' سگریٹ نوشی اور گفتگو کا انداز خطرناک تھا۔

پہلے ہی دن تازیانہ لگا تھا' میں نے کہا۔

''میں بازار سے کھانا لینے جارہا ہوں کل سے گھر پر کھانا پکانے کا انتظام کرنا ہوگا۔''

''ہاں جی۔ بازار سے چھ آٹھ پان اور سگریٹ کے دو پاکٹ بھی ماچس کی ڈبی کے ساتھ۔''

''جی۔'' میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔

چھوٹا سا گھر تھا ایک کمرہ' صحن باورچی خانہ وغیرہ۔ روشن بی بی کمرے میں سوئیں' میں نے صحن میں بستر لگالیا تھا۔

رات بھر کروٹیں بدلتا رہا تھا روشن آراء ایک منجھی ہوئی طوائف اس کے ساتھ شوہر کی حیثیت سے رہنا کتنی اذیت کا باعث تھا میرا دل ہی مانتا تھا لوگ اسے دیکھیں گے تو میرے بارے میں کیا سوچیں گے ایک اور خوفناک خیال دل میں آیا لگتا ہے کوئی اس کا شناسا بھی مل جائے یہ سب سے خوفناک خیال تھا اس کے علاوہ ایک طوائف کے اخراجات کیا ہیں برداشت کرسکوں

گا ممکن ہے محترمہ شراب سے بھی شوق رکھتی ہوں۔

جان نکل رہی تھی اور پھر اچانک دلاور پر شدید غصہ آ گیا بد بخت نے کیا مصیبت میرے گلے لگا دی اگر کسی عورت ہی کی ضرورت تھی تو کسی بوڑھی عورت کو میری ماں بنا کر لایا جا سکتا تھا روسن آراء کی چال ڈھال سے لے کر مسکراہٹ اور بات چیت سے بھی بازاری پن ٹپکتا تھا اس کے سراپے پر غور کیا تو اچانک ایک انکشاف ہوا اس کا جسم بہت خوبصورت تھا بڑا اولا ویز اور..... پھر اور بھی بہت سے خیالات دل میں آنا یہ بے چاری مجبور نہیں۔

رات یونہی بیت گئی صبح اٹھ کر میں نے ناشتہ تیار کیا اور پھر روشن آراء کو پکارا بڑی مشکل سے اس کی آواز ابھری۔

''کون ہے کیا ہے۔''

''میں ہوں ناشتہ تیار ہو چکا ہے آ کر کر لیجیے گا۔''

کچھ پر کوئی جواب نہ ملا پھر ایک دم اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کیا مصیبت ہے ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔''

''ہاں میں نے ناشتہ بنا لیا ہے۔''

''تو میں کیا کروں خود کر لو میں دیر میں اٹھتی ہوں۔''

اچانک میری عقل ٹھکانے آ گئی مجھے طوائف کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن معلوم تھا کہ وہ کوئی گھریلو عورت نہیں ہے طوائف کے لیے تو یہ سونے کا وقت ہے بہر حال آئندہ خیال رکھوں گا۔ چنانچہ ناشتہ کیا اور تیار ہو کر دفتر چل پڑا۔

شام کو دفتر سے آتے ہوئے کچھ ضروری سامان خریدا جس میں چارپائی وغیرہ بھی شامل تھی روشن صحن میں بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

''آپ نے دوپہر کو کھانا کھا لیا تھا۔''

''ہاں۔'' اس کے خشک لہجے میں کہا۔

''پڑوسیوں میں سے تو کوئی نہیں آیا۔''

''تین عورتیں آئی تھیں بڑی اچھی تھیں مجھے بڑی اچھی لگیں۔''

لاہور ہو یا کراچی ہر جگہ لوگوں کا ایک مزاج ہے جو مالی طور پر اچھے ہوتے ہیں اعلیٰ درجے کے گھروں میں رہتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ملنا پسند نہیں کرتے ہاں چھوٹے چھوٹے گھروں میں پیار رہتا ہے گھروں کو ایک دوسرے سے دلچسپی ہوتی ہے بعد میں کچھ اور تفصیلات معلوم ہوئیں یہ ہمارے مکان مالک جناب شمس الدین شیخ کے بارے میں تھیں' اس محلے میں ان کے پانچ مکان تھے جو کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔

شیخ صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ شریفوں کا محلہ ہے وہ غیر شادی شدہ لوگوں کو گھر نہیں دیتے لیکن شیخ صاحب جو تھوڑے عرصے پہلے اس شریفوں کے محلے میں رہتے تھے اپنی پہلی بیگم اور بچوں کے ساتھ اس وقت وہ بھی چھوٹے لوگوں میں تھے پھر وہ بڑے ہو گئے اور انہوں نے ایک چھوٹی لڑکی سے دوسری شادی کر لی لیکن چھوٹی لڑکی کو بڑا شوہر اچھا نہیں لگا اور اس نے شیخ صاحب ہی کے ایک کرائے دار نوجوان سے جو غیر شادی شدہ تھا رسم بڑھائی اور شیخ صاحب کی نیک کمائی کا بہت بڑا حصہ لے کر نوجوان کے ساتھ فرار ہو گئی۔

اس طرح شیخ صاحب کو غیر شادی شدہ نوجوانوں سے نفرت ہو گئی۔ انہوں نے سیدھے یہ کیا کہ شریفوں کا یہ محلہ چھوڑ کر ایک بڑے محلے میں بنگلہ بنا لیا اور تیسری شادی کر لی۔ اب وہ کسی غیر شادی شدہ شخص کو گھر نہیں دیتے تھے۔

پتہ نہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آئے تھے خیر یہ تو الگ بات ہوئی لیکن میرا خون ہمیشہ خشک رہتا تھا محترمہ روشن آرا کے رنگ' ڈھنگ ایسے تھے کہ کسی بھی وقت اس

شریف محلے میں کوئی غیر شریفانہ عمل ہوسکتا تھا گھر حاصل کرنے کے لیے نقلی بیوی حاصل کی تھی اس بات کی توقع کے سوا کچھ نہیں تھی کہ روشن آراء گھر کے کاموں سے دلچسپی لیں گی رقص و موسیقی کی رسیا بی بی سے جھاڑو برتن کا کیا واسطہ انہیں کیا پتہ کہ کوئی کام کیسے جاتا ہے۔

اس سارے کھیل کی میری ذمے داری تھی جھاڑو برتن کرتے ہوئے بڑی شرم آتی تھی لیکن کرنا تو تھا۔

چھٹی کا دن تھا دلاور تاش کی گڈی لے کر آ گیا اور ہم تاش کھیلنے لگے دلاور میرا بچپن کا دوست تھا' کراچی آ کر وہ غنڈہ گردی کی طرف مائل ہوگیا تھا لیکن دل کا بہت اچھا تھا میری اس سے بہت سی باتیں ہوتی تھیں وہ کہا کرتا۔

''بس یار۔ ماں کے پیٹ سے کوئی برا نہیں پیدا ہوتا شرافت بہت اچھی چیز ہے مگر اب وقت بدل گیا ہے میری مان تو شرافت سے توبہ کرلے۔''

''تو پھر کیا کروں۔''

دلاور مدبرانہ انداز میں خاموش ہوگیا کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تو پڑھا لکھا آدمی ہے تجھے کیسے سمجھاؤں تم نے کتابوں میں خواب دیکھے ہیں صرف خواب حقیقت بالکل الگ چیز ہے خواب صرف خواب ہوتے ہیں میری جان۔''

''مطلب۔'' میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''زندگی صرف رومانی کہانی نہیں ہوتی ہے۔''

''پھر کیا ہوتی ہے۔''

''ایک غریب آدمی روٹی کو ترستا ہے صرف اس لیے کہ وہ اپنی غربت سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ وہ شرافت سے رہنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے لیکن میں۔''

''ہاں۔ بولو۔'' میں نے اس کی باتوں میں

اندازِ فکر

☆ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح اور سب سے آسان کام دوسروں پر نقطہ چینی ہے۔

☆ جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ سب سے محبت کرتا ہے۔

☆ بدگمانی تمام فائدوں کو بند کردیتی ہے۔

☆ والدین کی طرف محبت کی نظر سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔

☆ بچپن میں علم سیکھنا پتھر پر نقش اور بڑھاپے میں پانی پر نقش۔

☆ تحریر ایک خاموش آواز اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔

☆ غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور ندامت پر ختم ہوجاتا ہے۔

☆ اللہ جس کو دوست رکھتا ہے اس پر مصیبت نازل ہوتی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہر قسم کے ڈر کو دور کردیتا ہے۔

☆ اللہ سے محبت کرنے والوں کا وہ مقام ہے جو ملائکہ کو بھی نصیب نہیں ہوا۔

☆ کسی بھی چیز کو طے کرنے کے لئے بہت سی تکالیف اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

☆ اچھا حکمران وہ ہے جو عوام میں بے حد مقبول ہو اور عوام اسے تہہ دل سے چاہتی ہو۔

☆ سچی دوستی یہ ہے کہ مفلسی میں دوست کی مدد کی جائے۔

☆ کسی کو پالینا محبت نہیں بلکہ کسی کے دل میں جگہ بنالینا محبت ہے۔

☆ دکھوں میں بھی ہنسنا سیکھو ورنہ دنیا تم پر ہنسے گی۔

☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔

☆ غرور سے آدمی کا دین ضائع ہوجاتا ہے۔

☆ جو تیرے سامنے دوسروں کی برائی کرتا ہے وہ دوسروں کے سامنے تیری برائی کرے گا۔

☆ زندگی دکھوں کا گھر ہے۔

دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''میں نے شرافت اور بدمعاشی دونوں کو قریب سے دیکھا ہے۔''

''پھر۔'' میں نے سوال کیا۔

''جس کے اندر چھین لینے کی صلاحیت ہے وہی زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے۔''

''تم کیا کرتے ہو۔''

''چھین لیتا ہوں۔''

''کیا یہ اچھی بات ہے۔''

''ہاں۔ یہی اچھی بات ہے تم اچھائی اور برائی کا تعین کرتے ہو۔ میں مانتا ہوں لیکن ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو۔''

''نہیں۔ ضرور کہو۔''

''یار اگر ہم جیسے برے لوگ دنیا میں نہ ہوں تو پھر اچھائی بے معنی ہو جائے' ہماری وجہ سے تو شرافت اور اچھائی کا تعین ہوتا ہے۔''

میں دنگ رہ گیا' کیا فلسفیانہ بات تھی جو دلاور جیسے کم کوش شخص کی زبان سے نکلی تھی لیکن ایک ٹھوس حقیقت تھی بہرحال اب یہ حالات زندگی بن چکے تھے دفتر اور پھر گھر کے کام کاج دلاور آتا رہتا تھا روشن آرا ابھی آرام سے زندگی گزار رہی تھی خدا کا شکر تھا کہ اس کی وجہ سے ابھی تک کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی بلکہ اب وہ کسی حد تک بردبار نظر آنے لگی تھی اسے لکھنے پڑھنے سے بہت دلچسپی تھی اس کی فرمائش پر میں نے اخبار لایا تھا اور کچھ رسالے بھی وہ زیادہ تر لکھنے پڑھنے میں لگی رہتی تھی کھانا وغیرہ میں ہی پکاتا تھا اس نے کبھی اس معاملات میں دلچسپی نہیں لی تھی کبھی کبھی اس کا انداز بہت نرم ہو جاتا تھا ایک دن موسم ابر آلود تھا۔ وہ کچھ اداس سی بیٹھی تھی ایک بار میری نظریں اس کی طرف اٹھیں تو وہ مجھے دیکھ رہی تھی غیر ارادی طور پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سنو!'' وہ بولی۔

''ہوں۔''

''تمہیں آلو کے پراٹھے پکانے آتے ہیں۔''

''نہیں۔''

''جانے میرا کتنا دل چاہ رہا ہے۔''

''بازار سے آلو کے نان لے آؤں۔ اب تو کراچی میں بھی ملنے لگے ہیں۔''

''تم کہاں کے ہو۔''

''لاہور سے کراچی آیا ہوں۔''

''ائے لاہور بہت اچھا ہے بارش میں ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔''

''تم نے لاہور دیکھا ہے۔''

''ہاں۔ ایک دفعہ گئی تھی تم نے کبھی مجھ سے میرے بارے میں نہیں پوچھا۔''

''ہاں۔''

''تو پوچھو نا۔'' اس کے انداز میں شرارت سی ابھر آئی۔

''بتاؤ۔''

''کیا بتاؤں۔ طوائف ہوں۔ ناچتی گاتی ہوں پیشہ کرتی ہوں کیونکہ ناچ گا کر ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔''

''روشن آراء تمہارا اصلی نام ہے۔'' میں نے پوچھا تو وہ ہنس پڑی۔

''ہمارے ہاں نام نہیں ہوتے یہ صرف پہچان کے لیے رکھ لیے جاتے ہیں۔ ہماری ادائیں اور عاشقوں کی زیادہ تعداد میں اصل حقیقت ہوتی ہے ہمارا اصل کام ہمارا بدن ہوتا ہے۔''

میں خاموش ہو گیا بڑی تلخ بات کہی تھی اس نے۔

لیکن بعد میں بھی میں اس کا تجزیہ کرتا رہا وہ ذہنی طور پر مکمل طوائف تھی' ان دنوں کوٹھے پر نہیں تھی لیکن اس کی حرکتیں وہی تھیں' میک اپ کر کے کبھی کبھی کمرہ بند کر کے ناچ گا لیتی تھی ایک دن

گانا گا کر مجھ سے پوچھا۔
''کیسا گاتی ہوں میں۔''
''کافی اچھا۔''
''جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ ہنس کر بولی۔
''کیوں۔'' میں نے پوچھا۔
''تم سن ہی نہیں رہے تھے میں نے دیکھا تھا چلو چھوڑو یہ بتاؤ تم نے کبھی کسی سے پیار کیا۔ ماں باپ بہن بھائی کا نام۔''
''نہیں۔'' میں نے کہیں کہا۔
''میں نے کئی عشق کیے ہیں ان لاہور کے جو طوائف کے کوٹھے پر محبت کی تلاش میں آتے ہیں بتاؤ ہم عشق کریں تو کھائیں گے کیا۔''
''پھر بھی تم اسے عشق کا نام دیتی ہو۔''
''تو پھر کیا کہوں۔ وہ تو یہی کہتے ہیں محبت کیا ہے عشق کیا ہے صرف ایک رات کی عیاشی۔''
''نہیں روشن۔ محبت بہن بیٹی ہی نہیں بیوی بھی ہے شام کو جب شوہر تھکا ماندہ گھر آتا ہے تو بیوی کی پیار بھری مسکراہٹ اسے نئی زندگی دیتی ہے۔''
''معلوم ہے معلوم ہے لیکن محبت روٹی نہیں جو پیٹ بھر لے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ میں خاموش ہو جاتا۔
ایک دن دلاور نے تشویش سے کہا۔ ''ایک خطرناک اطلاع ہے چاند خاں میری طرح روشن آرا کو تلاش کر رہا ہے۔''
''کون چاند خاں۔''
''بتایا تھا نا۔ روشن آرا کا دشمن۔'' اس وقت روشن آراء آ گئی۔
''کیا ہوا چاند خاں کا۔''
''ہمیں بھوکے کتے کی طرح تلاش کرتا پھر رہا ہے میرے پاس بھی آیا تھا میں سوچ رہا ہوں اسے ٹھیک کر دوں۔''
''ارے نہیں خود ٹھیک ہو جائے گا سسرا۔ ہمارے ایسے جھگڑے اور دشمنیاں چلتی ہی رہتی ہیں۔ ویسے گھر والے بھی کوشش کر رہے ہیں کہ چاند خاں سے صلح ہو جائے۔'' روشن آراء نے اسے منع کر دیا۔
''سنو۔ میں دم گھٹنے سے مر جاؤں گی۔''
''کیا بات ہے۔''
''مجھے باہر لے چلو۔''
''اوہ لیکن۔''
''تمہاری بات سمجھ رہی ہوں برقع اوڑھ کر جاؤں گی میری بات مان لو ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' مرتا کیا نہ کرتا مجبوراً میں اسے برقعہ پہنا کر باہر لے گیا آئس کریم وغیرہ کھلائی لیکن دوسری صبح اسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا چہرہ حدت سے سرخ تھا اور وہ پلنگ پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی پہلے تو میں گھبرا گیا کہ میں کیا کروں کسی عورت کی تیمارداری کرنے کا موقع زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔
میں نے دو چار الٹی سیدھی حرکتیں کیں تو وہ بولی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو دوا لا کر دو نا مجھے۔''
''اوہو اچھا۔''
تھوڑے ہی فاصلے پر ایک محلہ ڈاکٹر موجود تھا میں نے اسے حال بتا کر دوا لا کر دی اور پھر دوا کے ساتھ گرم دودھ کا ایک پیالہ اسے دیا تو وہ پرسکون ہو گئی۔
میں اس کے سرہانے بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا تو وہ بولی۔
''دفتر نہیں جاؤ گے۔''
عجیب سا انداز تھا مجھے بڑا اجنبی اجنبی لگا میں نے کہا۔
''نہیں۔ آج چھٹی کروں گا۔''
اس کے چہرے پر ایک لہری آئی ایک اجنبی لہر اور اس نے آنکھیں بند کر لیں نجانے کیوں آج وہ مجھے اچھی لگی چونکہ اس کی آنکھیں بند تھیں اس لیے میں نے اسے غور سے دیکھا اس وقت اس کے چہرے پر پیشہ ورانہ کرختگی نہیں تھی

بلکہ ایک نرمی سی پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ اگر وہ گھٹیا میک اپ اور بھڑک دار کپڑے استعمال نہ کرے تو خاصی اچھی لگے۔ میں نے اس کا ماتھا چھو کر دیکھا بخار بہت تیز تھا چنانچہ میں نے پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھیں اور اس کا بخار ہلکا ہوگیا اچانک ہی اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور بولی۔

''سنو۔''

''ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں فلم دیکھوں گی۔''

''کیا۔'' میں حیران رہ گیا۔

''ہاں میرا بہت دل چاہ رہا ہے برقعہ اوڑھ کر جاؤں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔''

نجانے کیا ہو رہا تھا مجھے وہ اچھی لگ رہی تھی میں بار بار غور سے اسے دیکھتا رہا میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر ممونیت کے آثار ہیں پھر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا میں نے اس کے لیے مونگ کی کھچڑی پکائی اور جب میں نے اسے کھانا دیا تو وہ چونک پڑی اور مجھے دیکھ کر بولی۔

''یہ آپ نے پکائی ہے۔''

''ہاں۔''

''نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''کیوں۔'' میں نے اسے دیکھا تو اس نے آنکھیں جھکالیں اور کچھ نہ بولی۔

پھر میں نے اسے دوا پلائی اور وہ دوا پینے کے بعد سوگئی۔ میں اسے سوتے ہوئے دیکھتا رہا ایک الجھن سی طاری ہو رہی تھی مجھ پر۔ ایک عجیب سی بے قراری۔ پورا دن گزر گیا میں نے اس کی بھرپور تیمارداری کی تھی اور پھر جب وہ رات کو سوگئی تو میں باہر صحن میں نکل آیا ستاروں بھرا آسمان یوں نظر آرہا تھا جیسے کسی حسینہ کا ستاروں بھرا آنچل فضا میں پھیل گیا ہو رات کا طلسمی اندھیرا اور نشاط انگیز سکوت بہت دل کش لگ رہا تھا۔ رگ و ریشے میں ایک عجیب کسی بے چینی میں وہ چند گز کے فاصلے پر تھی پتہ نہیں سو رہی تھی کہ جاگ رہی تھی خوب صورت انتہائی دل کش بدن کی مالک۔

میں نے سگریٹ جلائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا چند لمحوں کے بعد یوں لگا جیسے میں سگریٹ کے دھوئیں میں کھو گیا ہوں۔ یہ دھواں مختلف شکلیں بنا رہا تھا ایک حسین چہرہ جو پہلے کبھی حسین نہ لگا تھا لیکن جو روشن آراء کا تھا پھر مرمریں بانہیں پھر مخروطی گردن پھر سانچے میں ڈھلا ہوا صندلی بدن یہ روشن آراء ہی تھی اچانک دھوئیں میں لپٹا چہرہ مسکرا دیا اور اس کے بازو کھل گئے۔

''آخر مجھ سے دور کیوں کھڑے ہو۔ صرف ایک دروازہ درمیان میں ہے۔ میں تم سے دور کہاں ہوں میری سانسیں تمہارے چہرے سے ٹکرانے کے لیے بے چین ہیں میرا سینہ تمہارے سینے سے مس ہونے کے لیے بے قرار ہے۔ آؤ یہ دروازہ عبور کرلو۔ یہ دروازہ زندگی کا ہے۔ تم سمندر کے کنارے رہ کر کب تک پیاسے رہو گے۔'' اور پھر اچانک میرے اندر دوسرا احساس جاگا اس کے الفاظ یاد آئے وہ دل میں ان کا مذاق اڑاتی تھی جو اس کے بدن کے طلب گار تھے۔

میرے اندر جھرجھری سی پیدا ہوئی اور میں خود کو سمجھانے لگا۔ سونے کی کوشش کرنا چاہیے ورنہ یہ جذباتی ہیجان نہ جانے کون سا طوفان لے آئے۔ چنانچہ میں سو گیا صبح ایک عجیب سی آواز سے آنکھ کھلی چونک کر سامنے دیکھا تو روشن آراء پر نگاہ پڑی اور میں بوکھلا کر اٹھ گیا۔

بات ہی ایسی تھی کچھ دیر تک تو یقین نہ آیا کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ سچ ہے کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خواب نہیں تھا۔ روشن آراء صحن میں بیٹھی برتنوں کا ڈھیر قریب رکھے برتن

مانجنے میں مصروف تھی' سفید کپڑے پہنے پوری توجہ سے برتنوں پر مصروف تھی بالوں کی ایک موٹی سی لٹ ماتھے پر جھول رہی تھی اور چوڑیوں کی جھنکار سے ترنم اٹھ رہا تھا۔

میں جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھا۔

''ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو۔''

اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''کیوں' کیا ہوا۔''

''یہ..... یہ..... آپ برتن کیوں صاف کر رہی ہیں۔''

''اس لیے کہ یہ گندے ہو گئے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ۔''

وہ ایکدم ہنس پڑی۔

''ہاں میں نہیں میرا مطلب ہے آپکو تو بخار آیا ہوا تھا۔''

''آیا تھا چلا گیا۔ برتن گندے تھے میں نے سوچا کچھ کام ہی کروں چلو تم منہ دھو لو میں ناشتہ بناتی ہوں۔'' وہ ہاتھ دھو کر اٹھنے لگی۔

تو میں نے کہا۔

''میں ناشتہ بناتا ہوں۔''

''جی نہیں۔ میں بناؤں گی۔''

سر کھجانے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

ناشتہ بے تکا تھا شاید اس نے زندگی میں پہلی بار بنایا تھا۔ پراٹھے ملک ملک کے نقشوں کے مطابق تھے۔ آملیٹ میں پیاز نہ ہونے کے برابر تھی البتہ اس کی جگہ نمک نے پوری کر دی تھی چائے بھی بالکل بدمزہ تھی۔

لیکن ایک بات کہوں مجھے یہ سب کچھ بہت لذیذ معلوم ہو رہا تھا۔ روشن آراء اس طرح مسرور دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی بچے نے اسکول میں پہلا امتحان پاس کیا ہو۔

''مجھے معلوم ہے ناشتہ کتنا برا بنا ہے مگر میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ آگ کبھی نہیں جلائی۔ جھاڑو کبھی پہلے نہیں دی۔ برتن بھی نہیں مانجھے۔ پر یہ سب کچھ بڑا اچھا ہوتا ہے۔ پہلے تو مجھے اس کا پتہ ہی نہیں تھا۔''

''نہیں ناشتہ بہت اچھا ہے اور گھر بھی بالکل بدلہ بدلہ نظر آ رہا ہے۔ روشن روشن۔''

''میرے جیسا۔'' اس نے کہا اور ہنس پڑی۔

''ہاں بالکل۔''

''آج سے گھر کے سارے کام میں کروں گی جب کوئی کام خراب کروں تو تم مجھے بتا دینا۔''

''تو پھر ایک بات میں بھی کہوں۔''

''ہاں کہو۔''

''گھر عورت کا ہوتا ہے اور جب اسے عورت کے ہاتھ ملتے ہیں تو وہ خود بخود مسکرا اٹھتا ہے۔''

وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر جلائی اور دوسری اسے پیش کی تو اس نے گردن ہلا دی۔

''نہیں۔''

''کیوں۔''

''گلے میں خراش ہے۔''

اشیا کے بدلنے کا تجربہ تھا لیکن شخصیتیں بدل سکتی ہیں اس کا کچھ تجربہ نہیں ہوا تھا اب ہو رہا تھا پھر ایک ہفتہ گزر گیا۔ روشن آراء جانے کیا ہو گئی تھی اس نے سگریٹ چھوڑ دی اور گھر کے سارے کام کرنے لگی جب میں گھر میں ہوتا تو سارے کام مجھ سے پوچھتی جاتی تھی میں نے کئی بار اس سے باہر چلنے کے لیے کہا مگر وہ ٹال گئی۔

البتہ اس دن سے اسے فلم دکھانے کا فیصلہ کر لیا اور اسے فلم دکھانے لے گیا وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ دوسرے دن اتوار تھا چھٹی کا دن لیکن مجھ سے غلطی ہو گئی شاید کسی نے اسے میرے

ساتھ دیکھ لیا' دوسرے دن صبح صبح ہمارے گھر پر حملہ ہوگیا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور جونہی میں نے دروازہ کھولا کرخت چہرے اور لمبے چوڑے بدن کا مالک ایک شخص کو دیکھا جو خونی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''روشن آراء کہاں ہے۔''

''تم۔تم کون ہو۔''

''چاند خاں۔'' اس نے کہا اور میری جان نکل گئی۔

روشن آراء شاید کمرے میں تھی اس نے چاند خاں کی آواز سن لی اور جلدی سے دروازہ بند کرلیا۔

چاند خاں پھر بولا۔

''بتایا نہیں تم نے۔''

''کیا۔؟''

''کہاں ہے وہ۔''

''کون۔؟''

''روشن آراء۔''

''یہاں کوئی روشن آراء نہیں ہے۔''

''بکواس کررہے ہو۔وہ یہیں ہے۔''

''تمیز سے بات کرو۔''

''شرافت سے اسے کمرے سے باہر نکالو۔ ورنہ۔''

''کمرے میں میری بیوی ہے سمجھے۔''

''وہ روشن آراء ہے اور وہ تمہاری بیوی نہیں ہے سمجھے۔اسے میرے حوالے کردو ورنہ اس کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔'' اس کا لہجہ بے حد خونخوار تھا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔اندر میری بیوی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔'' میں نے کہا مگر اس وقت اس نے ایک لمبا چاقو نکال لیا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا میں نے اس کے چاقو کی پرواہ کیے بغیر اس پر حملہ کردیا۔وہ تنہا نہیں تھا

اندازِ فکر

☆ زندگی ایک لالچ ہے۔

☆ زندگی ایک خوبصورتی کا نام ہے۔

☆ ماں کی آنکھ سے گرا ہوا ایک آنسو سات آسمانوں کو ہلا دیتا ہے۔

☆ علم کے راستے پر جو مرتا ہے اسے شہید کا مرتبہ ملتا ہے۔

☆ زبان ایسی چیز ہے جو پل میں دوست اور پل میں دشمن بنا دیتی ہے۔

☆ یہ ضروری نہیں کہ انسان خوب صورت ہو، ضروری ہے کہ انسان خوب سیرت ہو۔

☆ دوسروں کی عزت کرو اگر تم عزت دار بننا چاہتے ہو۔

☆ کوشش نہ کرنے سے کوشش کر کے ناکام ہوجانا بہتر ہے۔

☆ استاد کا احترام انسان کو دنیا کی سیر کرا دیتا ہے۔

☆ میٹھے بول غصے کو دور کردیتے ہیں۔

☆ جو زیادہ پوچھتا ہے وہ زیادہ سیکھتا ہے۔

☆ دولت عزت تو دے سکتی ہے مگر سچی خوشی نہیں۔

☆ دولت شہرت تو دے سکتی ہے مگر سکون نہیں۔

☆ دولت مسجد تو بنا سکتی ہے مگر ایمان نہیں۔

☆ دولت عینک تو دے سکتی ہے مگر بینائی نہیں۔

☆ یتیم کی بدعا آسمانی بجلی کی طرح گرتی ہے۔

☆ جنت چاہتے ہو تو اپنی ماں کے قدم چومو۔

☆ خدمت کرنا چاہتے ہو تو اپنے ماں باپ کی کرو۔

☆ عزت چاہتے ہو تو ایمانداری سے کام کرو۔

☆ جل کر کباب ہونے بہتر ہے کہ کھل کر گلاب بن جاؤ۔

☆ جو دوسروں کے لئے برا سوچتا ہے اس کا خود برا ہوتا ہے۔

☆ کامیابی کے لئے دعا اور دوا دونوں چاہئیں۔

☆ سچے دل سے مانگی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

☆ سب سے اعلیٰ اور بہترین پکار اذان ہے۔

اس کے دو ساتھی اور آئے اور میں اس تینوں سے بھڑ گیا۔ وہ سب کے سب مل کر گھونسوں اور لاتوں سے میری مرمت کر رہے تھے اور ظاہر ہے میں ٹارزن نہیں تھا کہ ان تینوں کو مارتا اور چند لمحے گزر رہے تھے کہ چاند خاں مجھے مار پیٹ کر کمرے میں گھس جاتا کہ میری تقدیر کا ستارہ جگمگا اٹھا اچانک ہی معمول کے مطابق دلاور آ گیا اور اس کی دھاڑ سنائی دی۔

''رک جا چاند خاں رک جا۔''

کچھ ایسی آواز تھی اس کی کہ چاند خاں رک گیا۔

''تو نے میرے یار پہ ہاتھ اٹھایا ہے میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں تھا لیکن اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

''اس نے روشن آراء کو رکھا ہوا ہے۔''

''کچھ نہیں جانتا میں چل آ ذرا دیکھوں تیری مردانگی۔'' یہ کہہ کر دلاور چاند خاں پر جھپٹ پڑا وہ تین تھے اور ہم دو دلاور تو خیر لڑائی بھڑائی کا ماہر تھا مگر میں چکر میں آ گیا' آٹھ انچ لمبا چاقو میرے شانے میں اتر گیا شدید درد کی ایک لہر نے میری بینائی متاثر کر دی اور میں فرش پر گر پڑا لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے چاند خاں کی چیخ سنی تھی دلاور نے اسے گرا لیا تھا۔

پڑوسیوں کو اس لڑائی کا علم ہو گیا تھا اور کسی نے پولیس کو فون کر دیا تھا کہ چونکہ جونہی چاند خاں نیچے گرا' پولیس کے بہت جوان اندر گھس آئے کچھ پڑوسی بھی اندر گھس آئے تھے۔

پولیس انسپکٹر نے سب کو للکارا اس نے فوراً ہی چاند خاں اور اس کے ساتھیوں کے چاقو اور انگلیوں میں پہننے والے آہنی کڑے قابو میں کر لیے۔ دلاور کا چاقو بھی چھین لیا گیا اور اس کے بعد سب کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس دوران روشن آرا باہر نکل آئی۔ اس نے مجھے دیکھا اور بے اختیار میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا سر اٹھا کر پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرے پر خوف۔

انسپکٹر نے میرا زخم دیکھا' پھر بولا۔

''ایمبولینس آنے والی ہے' کیا آپ اپنا بیان دے سکتے ہیں۔''

میرے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے مختصراً چاند خان کی آمد اور جھگڑے کی وجہ بیان کی۔ انسپکٹر شدید حیران نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے روشن آرا کی طرف دیکھا' پھر مجھ سے بولا۔

''اب یہ آپ کے ساتھ رہتی ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''آپ نے کسی سے شادی کی ہے۔''

''نہیں۔''

''آپ دونوں کے درمیان۔''

''کوئی رشتہ نہیں ہے' لیکن انسپکٹر صاحب کیا یہ کوئی قانونی جرم ہے۔ چاند خان ہم دونوں کو قتل کر دیتا' اگر میرا دوست دلاور نہ آ جاتا۔''

انسپکٹر نے ہمارا بیان لکھوایا' پھر چلا گیا' مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور دوسری پیشی میں ختم ہو گیا۔ چاند خان اور اس کے ساتھیوں کو قاتلانہ حملے کے جرم میں سزا ہو گئی۔ دلاور کو خطرناک ہتھیار رکھنے کے جرم میں تھوڑا سا جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ ہاں مقدمے کی کارروائی کے دوران یہ بات عیاں ہو گئی کہ روشن آرا طوائف ہے۔ میں نے روشن آرا کے چہرے پر ایک عجیب سی افسردگی محسوس کی تھی۔

ابھی یہ سب کچھ ہوا تھا کہ ایک صبح شمس الدین شیخ صاحب گھر آ گئے۔

''یہ تمہاری بیگم ہیں۔''

''نہیں۔''

''کچھ شرم' غیرت ہے تمہارے اندر' میں تم پر مقدمہ کر سکتا ہوں۔''

''مجھے کیا کرنا' یہ بتائیں۔''

''گھر خالی کردو ورنہ۔''

''ایک بات بھی فضول نہ کرنا' ورنہ میں جو کچھ کروں گا تم سوچ بھی نہیں سکتے شیخ صاحب۔''

''ارے یہ تو وہی مثال ہوئی کہ الٹا چور کوتوال کو۔''

''ابھی چور اور کوتوال کا فرق سمجھاؤں.....'' میں آگے بڑھا تو شیخ صاحب ارے ارے کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

''مکان خالی ہو جائے گا اور بس۔''

''مکان خالی کردو..... ورنہ میں تم پر مقدمہ کردوں گا۔''

''خالی کردوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

شیخ صاحب تو چلے گئے' لیکن پڑوسیوں کا رویہ میری طرح بدل گیا۔ ہر آنکھ میں نفرت پیدا ہوگئی' جسے میں اور روشن آرا پوری طرح محسوس کررہے تھے' ایک دن روشن آرا نے کہا۔

''میں واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''جی۔''

''اب میرے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' میری آواز خود بخود سسکی میں بدل گئی۔

اس نے تیاریاں کرلیں۔ دلاور ٹیکسی لینے چلا گیا۔ روشن آرا کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ اس روشن آرا سے بالکل مختلف تھی جو اس گھر میں آئی تھی۔ میں نے کہا۔

''آپ کا بے حد شکریہ روشن آرا' آپ مجھے ہمیشہ یاد آئیں گی۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا' پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''میں بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

''آپ اپنے گھر جارہی ہیں' چاند خان کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے' میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں گی۔''

''گھر۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''جی..... اپنے گھر۔''

''میرا گھر کہاں ہے۔''

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے ایک نگاہ اپنے گھر کی دیواروں پر ڈالی۔ مجھے اس کی ویرانی صاف محسوس ہوئی اور اچانک میرے دل میں ایک طوفان سا اٹھا' وہ طوفان جو نہ جانے کب سے میرے سینے میں متلاطم تھا۔

''میں نے کہا۔

''روشن آرا۔''

''جی.....'' وہ آنسو بھری آواز میں بولی۔

''آپ واقعی جانا چاہتی ہیں۔''

''کیا مطلب۔'' وہ چونک پڑی۔

اندازِ فکر

☆ موت ایک ایسا دروازہ ہے جس سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔

☆ سب سے بڑی فتح اپنے آپ پر فتح ہے۔

☆ جسے ہارنے کا خوف ہے وہ ضرور ہارے گا۔

☆ دنیا میں مہنگی ترین چیز عزت اور دوستی ہے۔

☆ اگر عافیت اور امن درکار ہو تو آنکھ اور کان سے زیادہ کام لو اور زبان بند رکھو۔

☆ پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

☆ مسکراہٹ کے بے شمار فائدے ہیں لیکن اس پر خرچ کچھ نہیں ہے۔

☆ اس شخص سے بچو، جو تمہیں تمہاری حیثیت سے بڑا کہے۔

☆ چند لمحوں کی وقتی خوشی کے لئے کسی کو غمزدہ نہ کرو۔

☆ مت طلوان سے جو خود غرض ہوں۔

☆ مت چلوان کے ساتھ جو راہ وفا میں دھوکہ دیں۔

☆ مت سنو ایسی بات جو زندگی کو ویران کردے۔

☆ بے اعتمادی سے کام کرنا اندھے کنوئیں میں گرنے کے مترادف ہے۔

☆ کسی کو پالینے کا نام محبت نہیں، دل میں بسا لینے کا نام محبت ہے۔

میں نے کچھ بولنا چاہا' لیکن زبان اکڑ گئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ تاہم دل کی بات کہنا ضروری تھی' میں نے کہا۔

''روشن آرا میں نہیں جانتا کہ یہ بات مجھے کہنی چاہیے یا نہیں۔ بے شک اتفاقات نے ہمیں ملایا تھا' لیکن میری آرزو ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھی بن جائیں۔''

''جبکہ تم جانتے ہو کہ..... کہ.....'' اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''ہاں میں جانتا ہوں' مگر مجھے تمہارے ماضی سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔''

روشن آرا پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور وہ شدید کرب کا شکار تھی۔ بمشکل تمام اس نے کہا۔

''تم بہت اچھے ہو' میں نہیں جانتی تھی کہ انسان اتنے اچھے بھی ہوتے ہیں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے مجھے ایک دم کچھ سے کچھ بنا دیا' لیکن میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔''

''کیوں۔'' میرا دل جیسے رکنے لگا۔

''کیونکہ میں جانتی ہوں' میں کیا ہوں۔'' اس کی آواز میں ہلکی ہلکی آنچ تھی۔ جیسے وہ اندر ہی اندر جل رہی ہو۔

''میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میرا کوئی کردار نہیں ہے' میں بازار میں بکنے والی شے ہوں۔ کوٹھے پر رہنے والیوں کے پاس کوئی پھول نہیں ہوتا۔ ان کے سارے وجود پر بدنما داغ ہوتے ہیں۔ اگر میں تم سے شادی کرلوں تو تمہیں دنیا بھر کی تذلیل کا سامنا کرنا پڑے گا اور تم اپنی جذباتی کیفیت سے زندگی بھر نادم رہو گے۔ میں قلاش ہوں' بارگراں ہوں۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔''

''یہ فیصلہ کیسے کیا جائے کہ کون کیا ہے۔ دنیا کے بازار میں کون اپنے آپ کو کس طرح بیچ دیتا ہے۔ وہ لیڈر جو اپنی ذات کی دکان پر ملک وقوم کی خدمت کا بورڈ لگاتا ہے۔ وہ ملا جس کی زبان پہ خدا کا نام ہوتا ہے' کیا وہ سفید پوش شرفا اپنی ذات کا سودا نہیں کرتے۔ کون جانتا ہے کہ ان کے سفید لباسوں کے نیچے کتنی گندگی ہے۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا بازار ہے روشن آرا' اس بازار میں سب برائے فروخت ہیں۔''

''نہیں' مجھے جانا ہے۔''

وہ آگے بڑھی اور پہلی بار میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر میرے ہونٹوں کو چوما' میں نے کہا۔

''روشن آرا یہ چراغ اس وقت تک میری روح کو منور رکھے گا جب تک میں زندہ ہوں۔''

وہ چلی گئی۔

ہاں وہ چلی گئی۔ میں نے وہ گھر چھوڑ دیا اور ایک گندے سے ہوٹل میں منتقل ہوگیا۔ وہ ہی تنہائی' وہی ویرانی' وہی انجانے خواب' جن میں روشن آرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صبح' شام دفتر' سب کچھ وہی تھا' مگر میں نہیں تھا' اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش بے سود ہوتی ہے' آدمی خدا کو تلاش کرسکتا ہے' اپنے آپ کو نہیں' ٹھیک ہے منزل نہ سہی راستہ تو ہے' پیروں میں لڑکھڑاہٹ سہی' چل تو رہا ہوں۔

دلاور سے ملاقات ہوتی رہتی تھی اور اس سے روشن آرا کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ ہر لمحے وہ یاد آتی تھی۔ ابتدائی دنوں کے بعد اس نے جو روپ بدلا تھا۔ اس نے مجھے دیوانہ کردیا تھا۔ اس نے میرے کپڑے دھوئے تھے۔ میرے لیے کھانا بنایا تھا۔ میری قمیض کے بٹن ٹانکے تھے۔ نہ جانے یہ کون سا رشتہ تھا میرے اور اس کے درمیان۔ پھر کچھ اور ہوا' دلاور نے کسی غنڈے کو چھرا مار دیا اور موقع پر ہی گرفتار ہوگیا' کیونکہ وہ باقاعدہ مجرم تھا۔ اس لیے اسے لمبی سزا ہوگئی۔ مجھے بہت دکھ ہوا اور اب میں

روشن آرا کی خیریت سے بھی محروم ہوگیا تھا۔ خود مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی کہ میں بازارحسن جا کر اسے دیکھ آتا۔

پھر بالکل اتفاقیہ طور پہ مجھے ایک چھوٹا سا گھر مل گیا' کچی آبادی میں یہ گھر تھا۔ پھر وہی روٹی ہانڈی کا چکر' رات ہوئی تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑا ہوٹل میں جا بیٹھتا۔ کچھ لوگوں سے شناسائی بھی ہوگئی۔ ہوٹل کا مالک اللہ بخش مجھ سے بہت مانوس ہوگیا تھا۔

ایک دم اللہ بخش میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ایک بات بتانی ہے بابو جی۔''

''ہاں اللہ بخش' خیریت تو ہے۔''

''ہاں جی..... خیریت ہے' کل شام وہ عورت پھر آئی تھی۔''

''عورت۔''

''وہ جی..... جس کے بارے میں' میں نے پہلے بھی آپ کا گھر بتادوں۔ مگر اس وقت آپ گھر پر موجود نہیں تھے۔''

''تو پھر اس نے کچھ کہا۔''

''نہیں۔''

''یہ بھی نہیں بتایا کہ کیوں میرے پاس آئی تھی۔''

''نہیں۔''

میرا دل رو پڑا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ سوائے روشن آرا کے وہ کیوں میرے پاس آئی تھی۔ بہت دن سے اس کی خیریت نہیں معلوم ہوئی تھی۔ کیا کروں' کیسے پتا چلے کہ وہ کیوں آئی تھی۔ کوئی ذریعہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ خود اس کے پاس جاؤں۔

''مگر کہاں۔ کیا بازارحسن۔''

میں اس کے بعد سکون نہیں ملا تھا۔ آخر میں کیوں آئی تھی۔ دوسرے دن دفتر گیا' مگر وہاں دل نہ لگا۔

پورے دن روشن آرا کی تصویر ذہن میں روشن رہی۔ اس کی آواز کانوں بس آتی رہی۔

''میرا تمہارا کیا رشتہ ہے۔''

''میں تمہاری کون ہوں۔''

دفتر میں پورا دن یوں ہی گزر گیا۔ وہ بہت یاد آرہی تھی۔ دفتر سے نکلا اور پھر میری دیوانگی مجھے وہاں لے گئی جہاں کبھی جانے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یعنی بازارحسن' یہ وہ جگہ تھی جہاں معاشرے کے ناپسندیدہ اور ٹھکرائے ہوئے لوگ رہتے ہیں۔ حیا بیچنے والی عورتیں اور ان کی عصمت کی کمائی پر پلنے والے بے ضمیر دلال۔

میں نے جب گلی میں قدم رکھا تو دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں آرہے تھے۔ گلی روشنی میں نہا رہی تھی۔ طوائفیں بنی سنوری نظر آرہی تھیں۔ پھول فروش ہر طرف نظر آرہے تھے۔

میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ شاید روشن آرا نظر آجائے۔ کسی سے اس کا پتا پوچھوں۔ دفعتاً پان کی ایک دکان پر نگاہ پڑی۔ وہاں کوئی گاہک نہیں تھا۔ میں نے وہاں پہنچ کر سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا۔ پان لیا اور پھر رازدارانہ انداز میں دکان والے سے پوچھا۔

''روشن آرا کا کوٹھا کون سا ہے دوست' بتا سکتے ہو۔''

''روشن آرا کے پاس جانا چاہتے ہو بابو۔''

''ہاں یار۔''

''پہلے کبھی نہیں نظر آئے۔''

''ہاں..... پہلی بار آیا ہوں۔''

''وہ اس کا کوٹھا'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن بابو.....'' وہ رک گیا۔

''ہاں' لیکن۔'' مجھے کچھ عجیب سا لگا۔

''تمہیں دیر ہوگئی۔''

''کیوں۔''

''کل ہی کی بات ہے' وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔''

''کیا مطلب۔''

''بھاگ جانے کا مطلب بھاگ جانا ہی ہوتا ہے بابو جی۔'' وہ طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''بھائی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس پڑا۔

''تم اکیلے نہیں ہو بابو جی' بات کسی بھی سمجھ نہیں آئی' نہ اس کی' نا ئیکہ سمجھی اور نہ اس کے استاد' یہاں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ کسی کا خیال ہے فلموں میں کام کرنے کے شوق میں رفو چکر ہوئی ہے' اب سچ کیا ہے یہ مولا جانے۔''

''تو پتا کیسے چلا کہ وہ۔''

''اور بابا کل دو بجے گھر سے سینما دیکھنے گئی تھی۔ پلٹ کر واپس نہیں آئی۔''

''لیکن وہ۔''

پان والے نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا' پھر بولا۔

''اب میں اس کا چاچا تو نہیں ہوں۔''

''جو مجھے سب کچھ بتا کر جاتی اور بابو جی ان کوٹھے والیوں کا کیا بھروسہ' کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کیا کر بیٹھیں' ایک اور بات بتاؤں۔'' پان والا اب مجھ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

''ہاں بتاؤ۔''

''یار تم اس کے کوئی پرانے عاشق لگتے ہو۔''

''تم کیا بتا رہے تھے۔''

''یہ کہ کچھ دن پہلے اس کا چاند خان نامی ایک بدمعاش سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے وہ کسی شریف آدمی کے گھر چھپ گئی تھی۔ پلٹ کر آئی تو ماں کی جنی کا دماغ پھر چکا تھا۔ بات بات پر اپنی ماں اور استاد سے لڑتی تھی۔ دو چار بار تماش بینوں سے بھی جھگڑا ہو گیا تھا اور پھر کل بھاگ گئی۔''

وہ رکا تو میں نے کہا۔

''اور کچھ بتاؤں بھائی۔''

''ایک بات کہوں تم سے۔'' وہ رازداری سے بولا۔

''ہاں بولو۔''

''میرا تو خیال ہے کہ وہ اسی بندے کے گھر چلی گئی۔''

''کس بندے کے گھر۔''

''ابے یار اسی کے گھر جہاں وہ چھپی تھی' اسی سالے نے اس کا دماغ بگاڑ دیا ہوگا۔''

میرا دل پھٹنے لگا' روشن آرا بھاگ گئی' مگر کیوں اوہ میرے خدا' وہ میری تلاش میں کیوں گئی تھی۔ کیا مجھ سے آخری بار ملنے کے لیے' شاید ایسا ہی تھا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے بابو جی۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔''

''ایک بات کہوں۔''

''ہاں کہوں' اس میں کون سے لال ٹکے تھے۔ تم کہو تو اس سے ہزار درجے اچھی لونڈیا کا انتظام کر دوں۔''

''ایں.....'' میں نے بے دھیانی سے کہا۔

''سولہ سال کی چھوکری ہے' نگینہ ہے نگینہ' چکھ کر دیکھو ایک بار' سب کچھ بھول جاؤ گے' مگر کچھ پیسے زیادہ لگ جائیں گے۔'' وہ ایک آنکھ دبا کر بولا۔

''پھر آؤں گا کسی دن۔'' میں نے بدحواسی سے کہا اور واپس پلٹ پڑا۔

دل کو ایک عجیب سا رنج تھا۔ لیکن ہر غم قابل برداشت ہوتا ہے۔ وقت گزرتا رہا پل پل دن بنے' دن مہینے اور مہینے برس' پھر دوبارہ بھی بازار حسن نہ گیا۔ خود پہ ہنسی آتی تھی۔ کیونکہ میں

اندازِ فکر

☆ کیا اس وجہ سے تم حد عبودیت سے باہر ہو گئے ہو کہ ہم تمہاری اصلاح سے بے تعلق ہو کر نصیحت کرنا چھوڑ دیں گے۔

☆ کہہ دو بس میں خالصاً اللہ ہی کی اطاعت کرتے ہوئے اس کی عبادت کرتا ہوں اور بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

☆ جو شخص عزت کا خواہاں ہے اس کو چاہئے کہ اللہ کی اطاعت کرے۔

☆ شرط فرمانبرداری یہ ہے کہ اسی پر (یعنی اللہ) پر بھروسہ رکھو۔

☆ اے نبیؐ! کہہ دو کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔

☆ دنیا کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ۔ لیکن بے اعتدال سے۔ بچو مصیبت کا سرچشمہ دنیا نہیں دنیا کا بے اعتدلانہ استعمال ہے۔

☆ بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو تو تمہارے چھوٹے چھوٹے قصور نامہ اعمال سے محو کر دیئے جائیں گے اور تم کو مقام عزت میں لے جا کر جگہ دیں گے۔

☆ جن لوگوں نے تفرقہ کیا۔ ان کا معاملہ اللہ کے حضور پیش ہے اور ان کو ان کے اعمال سے خبر دے گا۔

☆ مال و اولاد دنیا کی چند روزہ زندگی کے بناؤ سنگار ہیں اور نیک اعمال جن کا اثر دیر تک باقی رہنے والا ہے۔ تمہارے پروردگار کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں اور توقعات آئندہ کے اعتبار سے بھی بہتر۔

☆ اللہ ظالموں کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

☆ میں وہ اللہ ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس نے میری قضا کو تسلیم کیا اور میری بلا پر صبر کیا اور میری نعمتوں پر شکر ادا کیا میں اس کو اپنے پاس صدیق لکھتا ہوں اور جس نے ایسا نہیں کیا پس اسے چاہئے کہ وہ میرے سوا کسی اور رب کو تلاش کر لے۔

☆ احکام اللہ کو ہنسی کھیل نہ سمجھو اور اللہ نے تم پر جو احسان کئے ہیں ان کو یاد کرو۔

☆ اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے رہو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

☆ دوزخ کے عذاب سے ڈرتے رہو جو نافرمانوں اور منکروں کے لئے تیار ہے۔ اللہ اور رسول کا حکم مانو عجب نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔

☆ جنہوں نے اللہ کی راہ میں کوشش کی اللہ ان کو اپنا راستہ بتاتا ہے۔

☆ اللہ اگر تم کو کسی قسم کی تکلیف پہنچانی چاہے تو اس کے سوا کوئی تکلیف اس تکلیف کو دور کرنے والا نہیں اور اگر تم کو کسی قسم کا فائدہ پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

☆ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

☆ اللہ کسی اترانے والے شیخی خور کو پسند نہیں کرتا۔

☆ کیا تمہارا خیال ہے کہ تم بے فائدہ پیدا کئے گئے ہو اور تم اللہ کی طرف نہ پھرو گے۔

☆ جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لئے وجہ خروج بنا دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔

☆ اللہ سے تو اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اللہ کے آثار قدرت کا علم رکھتے ہیں۔

اسے نہ بھول سکا۔ بارہا دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ بازار حسن جاؤں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کروں کہ وہ واپس تو نہیں آ گئی۔

پھر زندگی نے کروٹ بدلی۔ وہ فرم بند ہوگئی۔ نوکری چھوٹ گئی اور دوسری نوکری کی تلاش میں ناکام رہا۔ کراچی سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ دلاور جیل میں تھا۔ چنانچہ آوارہ گردی کرنے لگا۔ وہ بہت یاد آتی تھی۔ میرا تو اس سے بھی کوئی رشتہ نہیں تھا' مگر نہ جانے وہ کیوں میرے دل کے کسی گوشے میں جم گئی تھی۔ میری سوچیں اس کے اردگرد تھیں۔

اب وہ کیسی ہوگی' نہ جانے کہاں ہوگی۔

کیا وہ اب بھی اپنی اداؤں کے جادو جگا رہی ہوگی۔

کیا اب بھی اس کا چمپئی جسم ویسا ہی ہوگا۔

اس کی چال کا بانکپن ویسا ہی ہوگا۔

اس کی اداؤں کا سحر ویسا ہی ہوگا۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ ظالم وقت نے سب کچھ بدل ڈالا ہو۔

اس کے گالوں کے گلابوں پر خزاں اتر آئی ہو۔

آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی ہو۔

اس کی مسکراہٹ مرجھا گئی ہو۔

آہ۔

جیسا میرے ساتھ ہوا ظالم وقت نے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے میری طرح بدل دیا ہو۔

جیسے میں خود اپنا سایہ بن گیا ہوں۔

بے رونق چہرہ۔

ڈھیلا ڈھالا بدن۔

کنپٹی کے آس پاس سفید بال۔

اب مجھے آئینہ دیکھنا اچھا نہیں لگتا تھا' کیونکہ کم بخت آئینے سچ بول دیتے ہیں۔ کہہ دیتے ہیں کہ پت جھڑ کا آغاز ہو چکا ہے۔ پتے زرد ہونے لگے ہیں اور کچھ دن کے بعد سوکھی شاخیں رہ جائیں گی اور گلشن ویران ہو جائے گا۔

آہ کہیں روشن آرا کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا ہو۔ کہیں اس کے صحن حیات میں بھی زرد پتے نہ گرنے لگے ہوں۔ پھر اتفاق سے ایک اخبار میں نوکری مل گئی۔ اخبار کے مالک شوکت علی صاحب تھے۔ جو اخبار کے سب کچھ تھے۔ ایڈیٹر' ڈائریکٹر' سب کچھ خود ہی تھے۔ میں وہاں نوکری کرنے لگا۔ شوکت علی صاحب کا ایک ماضی تھا۔ بیس سال پہلے وہ ایک معمولی سے ملازم تھے۔ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے تھے' مگر اب کروڑ پتی تھے' جوڑ توڑ' سازشوں اور بلیک میلنگ کے ذریعے انہوں نے بے انتہائی دولت جمع کر لی تھی۔ جبکہ دوسری طرف میں تھا۔ دیانت دار' شریف اور اصول پرست' اس کے نتیجے میں میرے جسم پر معمولی کپڑے تھے اور آنکھوں میں تاریکیاں میں ایک کھوکھلا آدمی تھا۔ میری روح خالی تھی۔ میرا پیٹ خالی تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اب اس دوزخ کو ٹھنڈا ہو جانا چاہیے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ زندگی بدلوں گا اور اس سلسلے میں میرا شکار شوکت علی صاحب ہوئے۔ میں نے انہیں ہی اپنا ٹارگٹ بنایا' ان کی حرکتیں نوٹ کرتا رہا اور پھر ایک دن میں نے ان کا کچا چٹھا ان کے سامنے رکھ دیا۔ یہ ان کی تمام حرکتوں کا ریکارڈ تھا۔ ایک لمحے کے لیے ان کا رنگ بدلا' مگر دوسرے لمحے چہرے کی رونقیں بحال ہو گئیں۔

ان کا گھن گرج قہقہہ میرے لیے حیران کن تھا۔

میں خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا' تب وہ بولے۔

''دھوکہ کھا گیا' سچ مچ دھوکہ کھا گیا' تم چہرے سے بہت شریف نظر آتے تھے' مجھے امید نہیں تھی کہ تم ایسا کرو گے۔''

''مجبوری تھی شوکت صاحب۔''

''نہیں' ہونہار ہو' اور سنو مجبوری ہی انسان کو نکھارتی ہے۔ اسے جلد بخشتی ہے' زندگی بخشتی ہے' اگر تم یہ نہ کرتے تو بے وقوف ہوتے اور میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ عیش کرو' مجھے بلیک میل کرواور اپنی زندگی بناؤ۔''

میں حیرانی سے شوکت صاحب کو دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کا ذہنی توازن خراب ہوگیا ہو۔ پھر انہوں نے ایک اور حرکت کی۔

نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر میرے سامنے ڈال دی اور بولے۔ ''جاؤ اپنی ضرورتیں پوری کرو۔''

چنانچہ میں نے نوٹوں کی وہ گڈی اٹھائی جیب میں رکھی اور وہاں سے چل پڑا' میرا رخ شہر کے سب سے فیشن ایبل بازار کی طرف تھا۔

پھر سیٹھ صاحب کی بڑی بڑی رقمیں میری جیب میں منتقل ہونے لگیں۔

سب سے پہلے میں کوٹھری نما تنگ و تاریک کمرے سے نکل کر ایک کشادہ فلیٹ میں پہنچا' پھر میرے جسم پر بیش و خوب لباس آئے۔ پھر بیش و قیمت انگوٹھیاں' سونے کے بٹن اور ٹائی پن' شراب کی بوتل' قیمتی سگریٹ وغیرہ۔

سیٹھ شوکت اب میری مٹھی میں تھے۔ میں ان ہی کے کندھے پر بیٹھ کر ترقی کا سفر کررہا تھا۔

کچھ تبدیلیاں ہورہی تھیں' چہرے کی پژمردگی رخصت ہوگئی تھی۔ سرخ و سفید رنگ' بھاری بدن' میرے احساسات تک بدل گئے تھے۔ اب اگر کبھی ماضی کی طرف دیکھتا تو سخت تعجب ہوتا تھا۔ کتنا وقت ضائع کردیا تھا میں نے' اصولوں اور دیانت داری کی دیمک زدہ بیساکھیوں کے سہارے کس قدر کمزور ہوتے ہیں۔

ماضی کے بہت سے دروازے بند کرچکا تھا۔ لیکن ایک دروازہ کم بخت بند ہونے کا نام نہیں لیتا تھا' وہ تھا روشن آرا کا خیال۔

اندازِ فکر

☆ اعتماد روح کی طرح ہوتا ہے جو ایک دفعہ چلا جائے تو واپس نہیں آتا۔

☆ مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے اس لئے اللہ پاک کی رحمت کے ہمہ وقت امیدوار رہیں۔

☆ وقت کو ضائع کردینا سب سے مہنگی فضول خرچی ہے۔

☆ تیرا اپنے بھائی سے مسکرا کر بات کرنا بھی صدقہ ہے۔

☆ کسی کام میں بھی جلدی نہ کرو تاکہ پھر ''کاش'' نہ کہنا پڑے۔

☆ جو جہالت کے اندھیرے کو علم کی روشنی سے مٹاتا ہے وہ اس کے لئے ہمیشہ کے لئے نور بن جاتا ہے۔

☆ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ہاتھ سے کسی بے گناہ کو نقصان نہ پہنچے تو ''شک'' کرنا چھوڑ دو۔

☆ اگر دشمن بنانا چاہتے ہو تو اپنی برتری جتاتے پھرو اور اگر دوست چاہئیں تو دوسروں کی برتری تسلیم کرو۔

☆ کسی کا دل مت دکھاؤ، ہوسکتا ہے اس کے آنسو تمہارے لئے سزا بن جائیں۔

☆ جھوٹ بولنے سے بہتر ہے کہ سچ بولو اور ہار جاؤ۔

☆ بڑا بننے کیلئے پہلے حالات بدلنے پڑتے ہیں۔

☆ دوسروں کی عزت کرو اس سے تمہاری عزت کا قیام مضبوط ہوگا۔

☆ سکون پانا ہے تو دوسروں کی برائی کرنا اور قرض لینا چھوڑ دو۔

☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔

☆ حقیر سے حقیر پیشہ بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔

☆ توبہ کرنا آسان ہے اور گناہ چھوڑنا مشکل۔

☆ میں علم کے اس درجے تک یوں پہنچا کہ جو کچھ مجھے معلوم نہ تھا وہ میں نے معلوم کرنے میں شرم محسوس نہ کی۔

☆ اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے بلکہ ہر شخص کو اپنے سے بہتر سمجھنا چاہئے۔

☆☆

کہاں ہوگی۔
کس کے ساتھ بھاگی تھی۔
کون ہوگا۔
ایسی تو نہ تھی۔
پھر کیا ہوا۔
میرا اور اس کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا۔
لیکن..... وہ میری زندگی کی پہلی عورت تھی' جس نے میرے دل میں اپنی تصویر سجائی تھی۔ اس تصویر کو ان قید خانوں کے باوجود میں اپنے دل سے نہیں نکال سکا تھا۔
ایک شام سیٹھ شوکت نے مجھے طلب کیا۔
''جی سر!'' میں نے ان کے سامنے بیٹھ کر ادب سے کہا۔
''تمہیں معلوم ہے الیکشن ہونے والے ہیں۔''
''جی جناب۔''
''یہی وقت ہماری کمائی کا ہے۔''
''کمائی کا۔''
''ہاں۔''
''کیا آپ الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔''
''بے وقوف سمجھتے ہو کیا۔''
''نہیں۔''
''بے وقوف' الیکشن میں کھڑے ہونے کا وہ مزا نہیں' جو کسی کو الیکشن لڑانے کا ہے۔'' شوکت صاب مسکرا کر بولے۔
''مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے۔''
''ہمیں یہی کرنا ہے۔ چوہدری احمد یار خان کا نام سنا ہے۔''
''نہیں۔''
''غضب کی چیز ہیں' ہمیں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔''
''کیسے۔''
''وہی بتا رہا ہوں۔ وہ حلقہ نمبر 7 2 سے کھڑے ہو رہے ہیں' لیکن وہاں ان کا مقابلہ سخت ہے' ہمیں یہی سختی دور کرنی ہے۔''
''وہ کیسے۔''
''ہاں..... وہی بتا رہا ہوں' حلقہ نمبر 7 2 کے علاقے کا نام ہاشم نگری ہے۔ ہاشم نگری میں ایک عورت بڑی ماں کے نام سے رہتی ہے' یوں سمجھو ہاشم نگری کے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں' اسے دیوی مانتے ہیں۔''
''دیوی۔''
''ہاں..... اوتار' بزرگ' ماں' سب کچھ مانتے ہیں وہ اسے۔''
''لیکن کیوں۔''
''وہ ہے بھی اسی قابل' اس نے وہاں ایک اسکول بنایا ہوا ہے۔ وہاں کے عوام کی ہر مشکل میں کام آتی ہے اور یہاں کے لوگ اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔''
''گڈ..... پھر۔''
''اگر تم کسی طرح اسے شیشے میں اتار لو تو سمجھو احمد یار خان الیکشن جیتے ہی جیتے۔ وہاں کے لوگ بڑی ماں کے اشارے پر احمد یار خان کے علاوہ کسی کو ووٹ نہیں دیں گے۔''
''ہمیں کیا ملے گا۔''
''ہاں..... وہی بتا رہا ہوں۔'' سیٹھ صاحب مسکرا کر بولے۔
''جی۔''
''نیاز پوری پل کا ٹھیکہ ہمیں ملے گا' کم از کم دس کروڑ کا کھرا منافع' احمد یار خان لکھ کر دے چکے ہیں۔''
''میرا کیا ہوگا۔''
''پورے پانچ کروڑ اور تم جانتے ہو کہ میں کچا سودا نہیں کرتا ہوں۔'' شوکت صاحب نے کہا۔

یہ حقیقت تھی سیٹھ صاحب سودے کے کھرے تھے۔

بستی ہاشم نگری نچلے طبقے کے لوگوں کی بستی تھی۔ زیادہ تر لوگ ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے تھے' بہت بڑی آبادی تھی اور واقعی کسی کو الیکشن جتانے میں بھرپور کردار ادا کرسکتی تھی۔ میں نے اس بستی کا پہلا دورہ کیا۔

بہت ہی گندی اور تعفن زدہ بستی تھی' کچی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے بھدے گھر' جن کے گرد گندی نالیوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ میں نے لوگوں سے بڑی ماں کے گھر کا پتا پوچھا تو لوگوں کے چہروں پر عقیدت کے آثار دیکھے' مجھے بڑے احترام سے سفید دیواروں والے ایک گھر کے سامنے پہنچا دیا گیا۔

میں نے دھڑکتے دل سے گھر کا دروازہ بجایا اور کسی نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے دروازہ کھولنے والے کو دیکھا اور میرے بدن کا سارا خون کھنچ کر چہرے پر آ گیا' کنپٹیاں تڑک اٹھیں' نہ جانے کیسے منہ سے نکلا۔

''تم۔''

جواب میں آواز سنائی دی۔

''آپ۔''

''ہاں..... ایسا بھی ہوتا ہے' ہم جو خواب دیکھتے ہیں وہ کبھی کبھی اس طرح پورے ہوتے ہیں کہ یقین نہ آئے۔''

وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ کوئی فرق نہیں آیا تھا اس میں' وہی چمپئی رنگت' بڑی بڑی روشن آنکھیں' سیاہ بال' شفاف مسکراہٹ' بڑا پاکیزہ چہرہ ہوگیا تھا اس کا' سنجیدہ' باوقار۔

''تم..... روشن آرا۔''

''جی..... آیئے۔'' اس نے مجھے اندر آنے کی جگہ دے کر کہا۔

میں نے اندر قدم رکھا۔ سادہ اور نفیس گھر' دو کمرے' کشادہ آنگن' ایک گھنا درخت جس

اندازِ فکر

☆ عیاری اور مکاری چھوٹے کمبل کی مانند ہیں کہ سر چھپاؤ گے تو پاؤں ننگے ہوجائیں گے۔

☆ غریب کی تعریف کرنا آسان ہے مگر اس کو برداشت کرنا مشکل۔

☆ عادت اکثر ضرورت میں بدل جاتی ہے۔

☆ سونا کان سے کان کنی کے بعد نکلتا ہے اور بخیل کے ہاتھ سے جان کنی کے بعد۔

☆ یہ غلط ہے کہ وقت گزر جاتا ہے وقت ٹھہرا رہتا ہے ہم گزر جاتے ہیں۔

☆ صورت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی دوا ہے۔

☆ آدمی مطالعے سے بیدار ہوتا ہے مکالمے سے تمیز آتی ہے اور لکھنے سے اس کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔

☆ خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیاروں کے کام آتی ہیں۔

☆ انسان کا یہ گناہ کافی ہے کہ اسے کہا جائے اللہ سے ڈرو اور وہ کہے جا اپنا کام کر۔

☆ جو انسان اپنے خلوص کی قسمیں کھائے اس پر کبھی اعتبار نہ کرو۔

☆ کسی کو آزمانا مت آزماؤ کہ وہ تنگ آ کر تمہاری دوستی چھوڑ دے اور تم اچھے دوست سے بھی محروم ہوجاؤ۔

☆ اچھے لوگ، اچھی باتیں، اچھی یادیں اور اچھے خیالات زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

☆ جو ہوش میں ہو وہ کبھی تکبر نہیں کرتا۔

☆ ناکامی کامیابی کی طرف پہلی سیڑھی ہے۔

☆ عقلمند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔

☆ پردہ کرو اس لیے کہ ہمارا خدا بھی پردے میں ہے۔

کے نیچے ایک میز اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ میں کتنا ہی بدل گیا تھا۔لیکن اسے نہیں بھولا تھا۔

''بیٹھیں۔'' اس نے کہا اور میں درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ روشن آران جسے اب بھولتا جارہا تھا میرے سامنے ہے۔

وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''روشن۔'' میں نے اسے پکارا۔

''ہوں۔'' وہ بھی اس اتفاق پر سحر زدہ تھی۔

''یہ سب کچھ عجیب ہے نا۔''

''ہاں۔''

''کیسی ہو۔''

''ٹھیک ہوں' تھوڑی دیر کی اجازت دو گے۔''

''ہاں...... ضرور۔'' میں نے کہا اور وہ اندر چلی گئی۔ اتنی ہی پرکشش' اتنی ہی جوان' لیکن پہلے سے بالکل مختلف اب اس کے چہرے پر وہ خشونت نہیں محترم اور سادہ چہرہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ جاکر آ گئی۔

''میرے ہاتھ کی چائے پی چکے ہو۔''

''ہاں۔''

''بہت خراب ہوتی تھی نا۔''

''ہاں۔''

''مگر تم نے کبھی کہا نہیں تھا کہ چائے خراب ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرادی۔

''ہر بات میں ہاں' اب میں نے چائے بنانا سیکھ لی ہے' یاد ہے کتنے سال بیت گئے۔''

''بہت۔''

''میں یاد آتی تھی۔''

''ہاں...... میں تمہارے گھر گیا تھا۔''

''میرے گھر' کب' کیوں۔''

''تمہارے پاس' تمہیں واپس لانے کے لیے' لیکن اس سے ایک دن پہلے تم گھر چھوڑ چکی تھیں۔ انہوں نے کہا تم کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو' تم میری تلاش میں بھی گئی تھیں۔''

''ہاں...... تم سے ملنا چاہتی تھی۔''

''مجھے پتا نہیں تھا کہ تم دوبارہ کبھی مجھے مل جاؤ گی۔''

''ہاں...... مجھے بھی نہیں تھا۔''

''یہ سب کیسے ہوگیا' تم بڑی ماں کیسے بن گئیں۔''

''زندگی میں شاید کبھی کوئی نیک کام کرلیا تھا' اس کا صلہ ملا۔''

''ہے۔''

''تمہارے پاس سے جانے کے بعد کوٹھا برا لگنے لگا' کشمکش میں رہی' آخر گھر چھوڑ دیا' پھر تقدیر کی ٹھوکریں کھائیں اور پھر ایک بزرگ ملا' جس نے بیٹی بنالیا اور پھر آہستہ آہستہ کچھ ہوگیا' ایک بات کہوں۔''

''ہوں' کہوں۔''

''تم بہت بدل گئے' بہت پیارے لگ رہے ہو۔''

''نظریہ زندگی بدلا اور خود بھی بدل گیا روشن۔''

''مجھے روشن نہ کہو۔''

''تو پھر۔''

''روشن کو میں نے اسی وقت دفن کردیا تھا جب تمہارے گھر سے آئی تھی' اس کے بعد کچھ اچھا نہیں لگا' زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''

''تمہیں کیا کہوں۔''

''عائشہ......اب یہی میرا نام ہے۔''

میں اسے دیکھنے لگا' بہت بدلی ہوئی لگ رہی تھی وہ' میں نے کہا۔''میرے ایک سوال کا جواب دو گی عائشہ۔''

''ہاں......'' وہ مسکرا کر بولی۔

...ی نہیں کی۔''

...ہمارا عائشہ کہنا بہت اچھا لگا

...س کی۔''

...ا چاہتی تھی۔''

...ن کو نہیں بھایا۔''

...ئے میں ڈوب گیا' اپنے الفاظ کو کوس رہا تھا۔ منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو اسے ناگوار گزرے۔ وہ دوبارہ بولی۔

''سچ کہوں۔''

''ہاں۔''

''عادت بگڑ گئی تھی۔''

''سمجھا نہیں۔''

''میری بہت سی...... اب میں طوائف نہیں کہلاؤں گی...... نہ کبھی گھر دیکھا تھا' تمہارے ساتھ میں نے گھر دیکھا۔ جب میں کوٹھے پر تھی تو مجھے گھر کا راستہ نہیں معلوم تھا اور جب گھر سے دوبارہ کوٹھے پر پہنچی تو مجھے کوٹھے سے نفرت ہوگئی۔ گھر بہت اچھا ہوتا ہے۔ عورت خود کو عورت نہیں کہہ سکتی۔ وہاں تمہارے گھر میں عورت دیکھی میں نے' اس کے بعد کوٹھے لے گئے' عقوبت خانہ بن گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ گھر تلاش کرلوں' نہ ملا تو خودکشی کرلوں گی' ایک فیکٹری میں کام کیا' بہت سی نوکریاں کیں' پھر عمر بابا مل گئے۔ میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے اور اب مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مجھ سے دگنی عمر تک کے لوگ مجھے بڑی ماں کہتے ہیں۔''

میں نے اس کے چہرے پر اعتماد کی روشنی دیکھی۔

وہ بولی۔

''اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے' کتنے پیارے ہوگئے ہو۔'' اس کے لہجے میں پیار تھا۔

اندازِ فکر

☆ جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے سب کام آسان کردیتا ہے۔

☆ جو آدمی ہدایت پا گیا اس کا فائدہ اس کے نفس ہی کو پہنچے گا۔

☆ جو آدمی سیدھے راستے پر چلتا ہے وہ اپنے ہی ذاتی فائدے کے لئے چلا اور جو بھٹکا تو اس کے بھٹکنے کا خمیازہ بھی اس کو بھگتنا پڑے گا۔

☆ کوئی آدمی دوسرے کے بار گناہ کو اپنے اوپر نہیں لے گا۔

☆ جو آدمی نیک بات کی سفارش کرے قیامت کے دن اس نیک کام کے اجر میں سے اس کو بھی حصہ ملے گا اور جو بری بات کی سفارش کرے۔ وہاں میں بھی وہ شریک ہوگا۔

☆ ہم موت کے وقت آدمی کو جتادیں گے کہ یہی وہ حالت ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

☆ جو آدمی برے کام کررہے ہیں ان کی وجہ ہی سے روئے زمین پر خرابی پھیل گئی ہے۔

☆ اگر کوئی آدمی نادانی سے برا کام کرے اور پھر توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔

☆ کسی آدمی سے بے رخی نہ کرو اور نہ ہی زمین پر اترا کر چلو۔

☆ جو شخص راہ ہدایت پر چلے گا اس کے لئے دنیا میں کوئی ڈر ہے اور نہ آخرت میں۔

میں نے اسے اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ ایک بات بھی نہیں چھپائی۔ اپنے یہاں آنے کا مقصد بھی اسے بتایا تو وہ بولی۔

''وہی احمد یار خان' جو پہلے بھی وزیر رہ چکے ہیں۔''

''ہاں' شاید۔''

''ہوں' تم نے شادی کیوں نہیں کی۔''

''بس...... میری بھی کیفیت تمہاری جیسی رہی۔''

"یعنی۔"
"کوئی دل تک نہیں پہنچی۔"
"اب کیا کرو گے۔"
"غور......" میں نے کہا' پھر بولا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ بڑی ماں تم ہو' مجھے بتاؤ کیا تم میری مدد کرو گی۔ جس حد تک ممکن ہو سکا۔"

عائشہ ایک بار پھر میری زندگی کا مرکز بن گئی۔ الیکشن کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ میں ہر روز عائشہ کے گھر جاتا۔ وہ کسی بیوی کی طرح میری خدمت کرتی۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ میرے دل میں اس کی چاہت بڑھتی جا رہی تھی اور میں نے آخرکار فیصلہ کیا کہ اگر زندگی میں کوئی لڑکی میری بیوی کی حیثیت سے آئی تو وہ عائشہ ہو گی۔

پولنگ کا دور گزر گیا۔ احمد یار خان کامیاب ہو گئے۔ ان کی کامیابی میں سو فیصدی بڑی ماں کا ہاتھ تھا۔ جیت کی خوشی میں احمد یار خان نے ایک عظیم الشان پارٹی دی' جس میں شراب و شباب کی فراوانی تھی۔ میں بھی اس پارٹی میں شریک تھا لیکن اچانک مجھے عائشہ کا خیال آیا اور میں پارٹی چھوڑ کر اپنی کار دوڑاتا اس کے گھر پہنچ گیا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ ماحول بے حد خوب صورت تھا۔ عائشہ نے جب معمول میرا استقبال کیا۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی' میں اسے غور سے دیکھتا رہا' تو وہ مسکرا کر بولی۔
"کیا بات ہے' ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔"
"کچھ نہیں۔"
"ہوں......" اس نے کہا۔ "احمد یار خان الیکشن جیت گئے۔"
"ہاں...... مجھے معلوم ہے۔"
"ایسا تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"
"آپ نے مجھ سے کہا تھا۔"
"تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں' اور کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"
"جی۔" واپس لانے کے
"عائشہ...... میں تم سے تم گھر چھوڑ چکی ہوں' بس میری زندگی میں تمہار۔ تھ بھاگ گئی ہے۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ ہیجان کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے کبھی مجھے مل رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی
"آپ کسی پارٹی سے آ رہے ہیں۔"
"ہاں۔"
"آپ نے شراب بھی پی ہے۔"
"ہاں...... ہاں۔"
"آپ کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔"
"ہاں...... لیکن۔"
"بات یہ ہے کہ...... کہ میں نے برائیاں چھوڑ کر یہ زندگی اپنائی ہے اور اس کے رہنما آپ ہیں۔ آپ نے مجھے عورت اور نیکی کی شناخت کرائی۔ میں نے اپنے دل میں آپ کو عظمت کا مینار بنایا لیکن یہ مینار زمین بوس ہو چکا ہے' آپ وہ نہیں رہے' جو تھے۔ اب آپ کا کوئی کردار نہیں ہے' آپ نے اپنا کردار بیچ دیا ہے' اب میں آپ سے برتر ہوں اور...... اور۔"
"اور کیا......" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
"میں اپنے سے کسی کمتر شخص سے شادی نہیں کر سکتی' آپ میرے قابل نہیں رہے' خدا حافظ۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر دیا۔

Pakistanipoint
Waqar Azeem